

سالگرہ نمبر 2

گھر کے ہر فرد کے لئے

کراچی

# پاکیزہ

ماہنامہ

مئی 2013

نگرانِ اعلیٰ  
معراج رسول

عنیزہ سید اور رفعت سراج کے سلسلے وار ناول  
عہدِ عشق راضی سا جدہ حبیب کی دلشیں باتیں  
شیم فضل خالق رضوانہ پرنس، نیلام احمد بشیر دیگر قلم کاروں کی پڑاثر کاوشیں



مدیر اعلیٰ  
عبدالرسول  
مدیر  
انجم انصار  
معاون  
آمنہ حیدر

### اداریہ

مدیرہ 15 مجھے کچھ کہنا ہے

### افسانے

شہناز وسیم 51 بالی پڑ

### سلسلے وار ناول



100

عنزیزہ سید شام شہر یاران



18

رفعت سراج امانت

85 اس کی شہرہ کی سحر پری رضوانہ پرنس

93 محبت بڑا شہر قانتہ رابعہ

141 وہ کھڑکی نیلم احمد بشیر

153 توقیر عائشہ

177 ام طیفور مان کی دعا

183 نوشین ناز اختر اجڑا تیرا

205 عقیلہ حق میرا گھر میرا شہر میرا ملک

219 شمیم فضل خالق چھوٹی سی بات

229 دردانہ نوشین تین پہر کا جیون

237 نسرین خالد اس کی بارگاہ

241 رفاقت جاوید وہاں خیر

### خصوصی مضامین

252 ..... نزہت اصغر وہاں کے بڑے بڑے

266 شائستہ زریں ساکھو کا اہمیت

### مستقل عنوانات

16 ادارہ دیک کی باتیں

272 مدیرہ بہنوں کی محفل

288 عظمی آفاق سعید پاکیزہ وارثی

292 انجم انصار جلیترنگ

295 صغری زیدی میل اکبر گنگا تپ

297 پاکیزہ بہنیں خوش واقفہ

298 پاکیزہ بہنیں سدا ہے

300 ادارہ رخانی شہزاد

302 ہومیو پتھک ہومیو پتھک

### ناولٹ



56

قصر حیات



158

سائرہ رضا

شعبہ نمبر اشتہارات نمبر اشتہارات نمبر اشتہارات نمبر اشتہارات  
0333-2168391 نمبر اشتہارات نمبر اشتہارات نمبر اشتہارات نمبر اشتہارات  
0333-2256789 نمبر اشتہارات نمبر اشتہارات نمبر اشتہارات نمبر اشتہارات  
0323-2895528 نمبر اشتہارات نمبر اشتہارات نمبر اشتہارات نمبر اشتہارات  
0332-4214400 نمبر اشتہارات نمبر اشتہارات نمبر اشتہارات نمبر اشتہارات  
مائل : رائینہ ..... میک اپ : روز بیوٹی پارلر ..... فوٹو گرافر : موسیٰ رضا  
جلد 41 • شمارہ 02 • مئی 2013 • برس سالانہ 700 روپے • قیمت فی پرچہ پاکستان 60 روپے •  
پتا : پوسٹ بکس نمبر 662 کراچی 74200 • فون : 35895313 (021) نیکیس (021) 35802551 (021) E-mail: jdpdgroup@hotmail.com

پبلشر پروپرائٹر: نیشنل رسالہ: مقام اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیڈل ایکس ٹینشن، ڈیفنس مین کورنگی روڈ کراچی 75600  
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی





ایک تازہ طبی تحقیق کے نتائج سامنے آئے ہیں کہ جن لوگوں کے دوست زیادہ ہوتے ہیں، وہ خوش رہتے ہیں، بیماریوں سے بھی دور رہتے ہیں اور دیگر لوگوں کے مقابلے میں عمر بھی زیادہ پاتے ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ وہ لوگ خوش قسمت ہوتے ہیں جن کے بے لوث دوست ہوتے ہیں اور بعض دوست تو اتنی محبت کرنے والے ہوتے ہیں کہ وہ خون کے رشتوں پر سبقت تک لے جاتے ہیں۔

ہم لوگ جب کسی سے دوستی کرتے ہیں تو ایک بات ہمارے ذہن میں ضرور رہتی ہے کہ ہم کسی ایسے فرد سے دوستی کریں جو کسی نہ کسی طور پر ہم سے زیادہ بااثر ہو، جس کو کسی سے ملوا کر ہم فوقیت یا کسی قسم کی بڑائی حاصل کر سکیں جبکہ دوستی کرنے کے لیے دوا فرد کی ذہنی مطابقت ہونا ضروری ہوتا ہے اور وہ دوستیاں زیادہ پروان چڑھا کرتی ہیں، جہاں ایک دوسرے کو بے لوث چاہئے کا جذبہ بھی موجود ہو..... ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ ان تمام لوازمات کی موجودگی میں بھی دوستی ٹوٹ جایا کرتی ہے۔ وہ لوگ جو ایک دوسرے کی موجودگی میں خوش دکھائی دیا کرتے تھے.....

ایک دوسرے کی شکلوں تک سے بیزار ہو جاتے ہیں اور اس میں مرد اور عورت کی کوئی تفریق نہیں ہوتی..... ماہرین نفسیات کا یہ کہنا ہے کہ جھگڑا عموماً اس وجہ سے ہوتا ہے کہ ایک پارٹی دوسری پارٹی پر بالادستی قائم کرنے کی کوشش کرتی ہے جو کہ بالکل غلط طریقہ ہے۔ اگر آپ کی کوئی دوست آپ سے روٹھ گئی ہے تو اپنی انا ایک طرف رکھ دیں اور کوشش کریں کہ صلح کا ہاتھ آپ کی جانب سے بڑھے۔ میں یہ بات بھی گوش گزار کرنا چاہوں گی کہ لڑکیوں کو لڑکیوں سے اور لڑکوں کو لڑکوں سے ہی دوستی کرنی چاہیے۔ آفس اور تعلیمی اداروں کی دوستی جو مرد و زن میں ہوتی ہے وہ اس ادارے کے تقدس کے تحت روارکھنی چاہیے..... اور اسے اپنے گھر تک بھی نہیں لانا چاہیے۔ اگر آپ کے گھر کے ماحول میں اس بات کی اجازت ہے..... تو ٹھیک ہے مگر پھر بھی اتنی احتیاط تو ضرور ملحوظ رکھیں کہ اپنے سارے راز کسی دوست کو بتا کر اس سے یہ التجا کریں کہ کسی سے کہنا نہیں..... کہ اس طرح کی باتوں کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ جاؤ اور سب کہہ دو..... جی ہاں.....!



اور (اے مسلمانو!) اللہ کی نعمت جو تم پر ہے (اس کو) یاد کرو اور اللہ کے عہد کو یاد کرو جس کا تمہیں اس نے پابند کیا ہے جب تم نے (یہ) اقرار کیا کہ سمعنا واطعنا (یعنی ہم نے سنا اور ہم مطیع ہیں) اور اللہ (کے عہد کی خلاف ورزی) سے بچو بے شک اللہ دلوں کے اسرار سے (بھی) باخبر ہے (۷) اے ایمان والو انصاف پر قائم رہنے والے (اور) اللہ کے لیے (امر حق کے) گواہ بن جاؤ اور تمہیں کسی قوم کی عداوت اس جرم کا مرتکب نہ بنائے کہ تم (ان سے) نا انصافی کرو تم انصاف کیا کرو (اور یقیناً) انصاف پر ہیزگاری سے بہت نزدیک ہے اور اللہ (کے غضب) سے بچتے رہو بے شک اللہ تمہارے اعمال سے باخبر ہے (۸) جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کیے ان سے اللہ نے وعدہ فرمایا ہے کہ ان کے لیے (اللہ کے ہاں) بخشش ہے اور (انہیں ان کے نیک کاموں کا) بڑا (اچھا) بدلہ (ملے گا) (۹) اور جن لوگوں نے کفر کیا اور ہمارے احکام کو جھٹلایا وہی لوگ دوزخی ہیں (۱۰) اے ایمان والو اللہ کا احسان اپنے اوپر یاد کرو جس وقت ایک قوم نے یہ چاہا کہ تمہارے اوپر دست درازی کرے پس اللہ نے ان کے ہاتھوں کو تم (تک پہنچنے) سے روک دیا اور اللہ سے ڈرتے رہو اور مسلمانوں کو چاہیے کہ اللہ ہی پر بھروسہ کریں (۱۱)

(سورہ مائدہ آیت نمبر ۱ تا ۱۱)



سیدنا احمد علیہ السلام

۲. فَإِذَا فَرَغْتَ فَانصَبْ (۴) وَإِلَىٰ رَبِّكَ فَارْغَبْ (۸) (المنہرج)

ترجمہ: اے محمد ﷺ جب تجھے فرمت ملے تو عبادت میں محنت کیا کرو اور اپنے رب سے دل لگاؤ

۳. ظَهَرَ مَا أَتَزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْآنَ لِتَشْقَىٰ (۲) (الأنزل) كَذِبًا لِّئَلَّا تُدْرِكُوا لَبِئْسَ الْفِتْنَىٰ (۳) (المنزل)

ترجمہ: اے محبوب ﷺ! ہم نے یہ قرآن تم پر اس لیے نہیں اتارا (کثرت عبادت) کہ تم مشقت میں پڑ جاؤ ۴. یٰٓأَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفْرَ وَالْمُنَافِقَ وَاغْلِبْ الْكُفْرَ إِنَّ الْكُفْرَ وَالْمُنَافِقَ هُمُ الْبَاطِلُونَ (۱) (المنزل)

ترجمہ: رات کو قیام کرو مگر تھوڑی سی رات ۵. یعنی نصف رات یا اس سے کچھ کم

۳۔ الحمدیث: (احمد علیہ السلام)

۱۔ حضرت انسؓ سے ایک طویل حدیث منقول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ سے ایک بار اپنے کلام میں فرمایا کہ بنی اسرائیل کو مطلع کرو کہ جو شخص مجھ سے اس حالت میں ملے گا کہ وہ احمد علیہ السلام کا منکر ہوگا تو میں اس کو دوزخ میں داخل کر دوں گا خواہ وہ کوئی ہو۔ موسیٰؑ نے عرض کی۔ احمد علیہ السلام کون ہیں؟ ارشاد ہوا۔ اے موسیٰؑ! قسم ہے مجھے اپنی عزت و جلال کی میں نے کوئی مخلوق ایسی پیدا نہیں کی جو ان سے زیادہ میرے نزدیک مکرم ہو۔ میں نے ان کا نام عرش پر اپنے نام کے ساتھ آسمان زمین، شمس و قمر پیدا کرنے سے بیس لاکھ سال پہلے لکھا تھا۔ قسم ہے مجھے اپنی عزت و جلال کی کہ جنت میری مخلوق پر حرام ہے جب تک کہ محمد علیہ السلام اور ان کی امت اس میں داخل نہ ہو جائیں۔ قیصرہ حیات کی کتاب انوار اسماء النبی ﷺ سے اقتباس

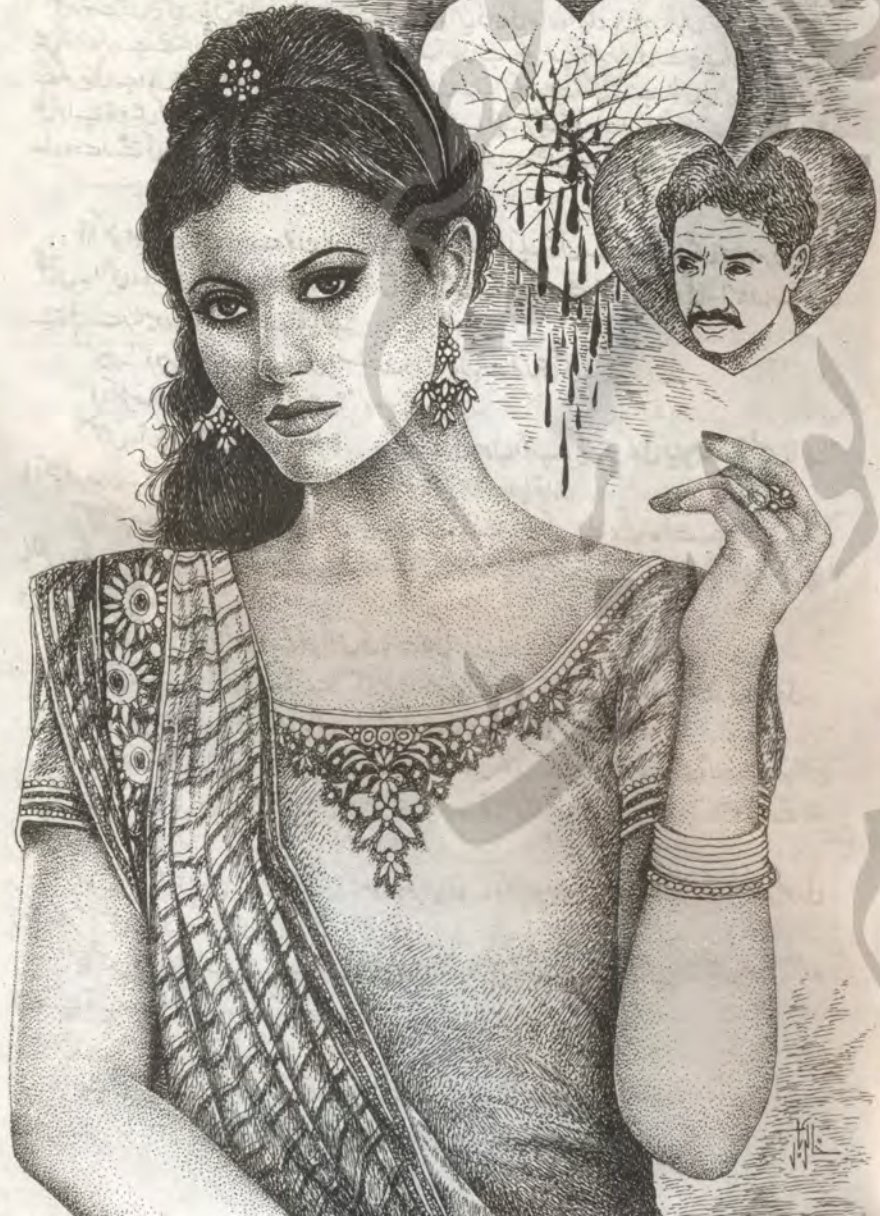




لہو سے سینچے پڑتے ہیں برگ و بار کے موسم  
بظاہر یوں لگا دینا شجر آسان کتنا ہے  
جنہوں نے دھوپ کی دشواریاں جھیلیں بتائیں گے  
بدن پر سائے دیوار و در آسان کتنا ہے  
شکست خاک سے لے کر غمو یابی کے منظر تک  
ذرا دشوار ہے رستہ مگر آسان کتنا ہے

بات ایک امانت ہے، ذات ایک امانت ہے عفت ایک امانت ہے، زندگی خدا کی امانت ہے،  
زمین کے وجود پر سورج کی روشنی امانت ہے، تاروں کا نور..... چاند کی چاندنی  
امانت..... امانت کو خیانت سے بدل دیا جائے تو چہار سو اندھیروں کا راج ہے۔ اسی  
اندھیرے میں امانت کی تابانیاں پھر سے روشنی کی کرنیں بکھیرتے ہوئے  
چہار سو اجالا کر دیتی ہیں۔

امانت و خیانت کو واضح کرتی ایک پُروردہ گر خوب صورت تحریر





جابر علی نے اسے بڑی عزت کے ساتھ اپنے ڈرائنگ روم میں بیٹھایا اس کی عمر اس کے چہرے سے صاف پتا چل رہی تھی۔ اسی ایک نکتے پر جابر علی سوچ میں بھی پڑ گیا تھا لیکن بہت جلد ہی وہ ایس پی کے جملوں کی زد میں آ گیا۔ اس کے کانوں میں ایس پی کے جملے گونجنے لگے۔

”بہت نیک، پرہیزگار، دین دار..... ٹھیک ہے عمر سے کیا فرق پڑتا ہے، انسان کے اخلاق کے ساتھ زندگی گزرتی ہے۔ اب کسی جوان لڑکے سے کر دیں، اس کا کیا بھروسہ کیا بیٹھک ہے، کیا پتا چھپ چھپ کر نشہ کرنے والا ہو، کم از کم اس بندے کے بارے میں ہمیں سب پتا تو ہے۔“ وہ اپنے آپ کو خود ہی سمجھانے لگا۔

اس نے برہان اور صابرہ کو مطلع کر دیا تھا اس لیے برہان وقت سے پہلے ہی گھر آچکا تھا۔ اسے خود بھی کھوج لگ رہی تھی کہ اس کا باپ کیا کرنے جا رہا ہے، اس کی بہن کی تقدیر کا فیصلہ ہونے جا رہا تھا۔ ایک بے چینی نے اسے اپنے گھر سے میں لیا ہوا تھا۔

جب وارث علی گھر میں داخل ہوا تو برہان اپنے کمرے میں تھا..... اور ستارہ اسے بتانے آئی تھی کہ مہمان آگئے ہیں، یہ سنتے ہی وہ بڑی سرعت سے تقریباً زینہ پھلانگتے ہوئے ڈرائنگ روم میں آیا تھا اور ڈرائنگ روم کے دروازے پر کھڑا ہو کر مہمانوں کی طرف دیکھنے لگا۔ اسے فی الحال یہ سمجھ نہیں آئی کہ ان تینوں میں سے امید وار کون ہے۔ جابر علی کی نظر جیسے ہی بیٹے پر پڑی وہ بڑی گرم جوشی سے اس سے مخاطب ہوا۔

”آؤ..... آؤ.....“ وہ بھی وہاں کیوں رک گئے، دیکھو تو سہی اتنے معزز مہمان آئے ہیں، بس تمہارا ہی انتظار ہو رہا تھا۔ میں نے بتایا تھا، میرا بیٹا NED یونیورسٹی میں پڑھتا ہے، ماشاء اللہ بہت قابل اور لائق بچہ ہے، بہت اچھے نمبروں سے پاس ہوتا رہا ہے۔“ اب وہ تعارف کو دہا رہا تھا۔

”یہ ہیں، وارث علی۔“ وارث علی اپنا نام سننے ہی اپنی جگہ سے اٹھا اور بڑی گرم جوشی سے مصافحے کے لیے برہان کی طرف اپنا ہاتھ بڑھایا۔ وارث علی کا اٹھنا تھا کہ برہان کو جیسے چکرا گئے۔ ایک اچھی عمر کا پختہ مرد اس کے سامنے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا۔ کھڑا تھا۔ برہان کی حالت غیر ہونے لگی۔ جی تو یہی چاہا کہ اس شخص سے مصافحے کے بغیر ڈرائنگ روم سے باہر چلا جائے اور واپس پلٹ کر ادھر نہ آئے لیکن صورت حال اتنی نازک تھی کہ اسے سینکڑوں میں فیصلہ کرنا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے، اس نے طو بآکر ہا وارث علی کا ہاتھ تھام لیا۔

”آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی اور آپ کے والد صاحب نے تو آپ کے سامنے ہی آپ کی اتنی تعریف کی ہے کہ بس طبیعت خوش ہو گئی۔“ وارث علی نے بھی شاید اس کی بے دلی کو محسوس کر لیا تھا۔ زبردستی کی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجھا کر بولا۔

وہ بات کر رہا تھا اور برہان ایک ٹک اس کی شکل دیکھ رہا تھا۔ وارث علی اس کی نظروں سے خاصا گھبرا سا گیا تھا۔ برہان نے جیسے پوری قوت اکٹھی کر کے وارث علی کو بیٹھنے کے لیے کہا۔

”تشریف رکھیے.....“ وارث علی جلدی سے بیٹھ گیا۔ برہان کا تو اب بیٹھنے کا پروگرام ہی نہیں تھا۔ وہ تو لٹے پاؤں وہاں سے چلے جانا چاہتا تھا۔ جابر علی نے ہی اس کی مشکل آسان کر دی۔

”برہان جاؤ اپنی ماں سے ہو کہ وہ چائے بھجوا دیں۔ میرا مطلب ہے کہ اگر چائے تیار کر لی ہے تو چائے لے آؤ۔“ برہان یہ سنتے ہی تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔ وہ باہر آیا تو صابرہ اس کی منتظر کھڑی تھی اور اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ کیونکہ جس وقت برہان ڈرائنگ روم میں گیا تھا تب سے ہی وہ اس کے باہر آنے کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ کچھ کہتا یا نہ کہتا..... صابرہ نے اس کے چہرے سے ہی سب کچھ پڑھ لینا تھا کہ وہ اس کی ماں تھی۔

## گزشتہ اقساط کا خلاصہ

ڈاکٹر مہر جان نیوروسرجن تھیں۔ اپنی بہن گل جان اور بیٹیوں رابعہ اور رومانہ کے لیے ایک سخت کمر بہن اور ماں تھیں۔ وہ ہر کسی کو شک کی نگاہ سے دیکھتی تھیں..... اصل خان ان کے گھر کا ایک ملازم اور معتد خاص تھا۔ مہر جان، رابی کی شادی سہرا خان سے طے کرتی ہیں جو عمر میں رابی سے کافی بڑا ہے۔ اس شادی پر رابی تیار نہیں ہوئی۔ کا ناز اپنے دادا شاہ عالم کے ساتھ ڈاکٹر مہر جان کے پڑوس میں رہتی ہے۔ وہ اور رومانہ بیٹھ فریڈ ہیں لیکن مہر جان کو رومانہ کی اتنی دوستی بھی پسند نہیں۔ سب انسپکٹر جابر علی نے آج تک کسی رشوت نہیں لی تھی۔ رزق حلال کی کمائی سے اپنے گھر کو چلایا اس کی بیوی صابرہ، بیٹا برہان اور بیٹیاں شبنم اور ستارہ اسی کمائی میں گزارہ کر رہے تھے لیکن کبھی کبھی ستارہ اپنے حالات سے تنگ آ جاتی ہے۔ شبنم اپنے والد جابر علی سے چھپ کر اپنی دوست فائزہ کے گھر جاتی ہے وہاں اس کی ملاقات فائزہ کے بھائی احمر سے ہوتی ہے۔ احمر کو وہ بہت اچھی لگتی ہے۔ ایس بی شیر زمان خان، جابر علی کو اپنے قابو میں کرنے کے لیے اس کی بیٹی کی شادی کے لیے اپنے ایک شریک کاروبار وارث علی کا رشتہ دیتا ہے۔ جابر علی، صابرہ سے رشتے کی بات کرتا ہے تو صابرہ اسے گھر ملانے کو اور بیٹے برہان سے مشورے کا کہتی ہے۔

## اب آگے بڑھیں

ڈاکٹر مہر جان کافی دیر سے فون پر مسلسل مصروف تھیں۔ ایک کال سے فارغ ہوئیں تو دوسری ملانے لگیں۔ ابھی وہ چھٹی یا ساتویں کال کر کے فارغ ہوئی تھیں کہ ریسپورر رکھتے ہی کھٹی بجنے لگی۔ انہوں نے بڑی بے تابی سے ریسپورر اٹھا کر کان سے لگا یا تھا۔

”ہیلو۔“ دوسری طرف سے ان کی اسسٹنٹ ڈاکٹر ناز بات کر رہی تھی۔

”ڈاکٹر صاحبہ کیا آپ آج لیٹ ہیں؟“ وہ پوچھنے لگی۔

”نہیں، آج میں نہیں آ رہی ڈاکٹر ناز..... بہت بڑی ہوں، آپ دیکھ لیں کوئی نیا پیسٹٹ تو نہیں آیا۔“

ڈاکٹر مہر جان نے بڑی عیاری کی سی کیفیت میں ڈاکٹر ناز کو جواب دیا تھا۔

”ڈاکٹر صاحبہ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی ایک مریض آیا ہے، اس کی بہت بری حالت ہے، یوں سمجھ لیں بالکل پاگل ہو چکا ہے، اس کے گھر والے اسے زبردستی پکڑ کر اسپتال تک لائے ہیں، اتنا چیخ رہا تھا کہ پورا اسپتال گونج رہا تھا۔“

ڈاکٹر ناز بتا رہی تھی، انہوں نے فوراً اس کی بات کاٹی دی۔

”کیوں، کیا اس کی بیٹی بھاگ گئی ہے؟“ ڈاکٹر ناز، مہر جان کا یہ جملہ سن کر بری طرح سے شپٹا گئی اور بولی۔

”جی ڈاکٹر صاحبہ.....“ ڈاکٹر مہر جان نے اس کی بات سن کر فوراً ہی خود کو سنبھالا۔

”وہ پیسٹٹ پاگل خانے کا مسئلہ ہے، میں نیوروسرجن ہوں، اس کے انٹینڈنٹ سے کہیں کہ وہ اس مریض کو پاگل خانے لے جائیں۔ ویسے بھی کسی کی سیریس پیسٹٹ کو ٹائم نہیں دے پاؤں گی.....“ انہوں نے فقط اتنا ہی کہا۔

”اوکے میم!“ ڈاکٹر ناز نے یہ کہہ کر ریسپورر رکھ دیا تھا۔ ڈاکٹر مہر جان چند لمحے ریسپورر کی طرف گھورتی رہیں پھر آہستگی سے اسے کریڈل پر رکھ دیا۔

”پتا نہیں کون بد نصیب ہے، شاید مجھ سے بھی بڑی افتاد اس پر ٹوٹی ہے، میں تو ابھی پاگل نہیں ہوئی۔“ وہ جیسے اپنے آپ سے باتیں کرنے لگی تھیں۔

☆☆☆

وارث علی اپنے دو دوستوں کے ساتھ بڑھکھوے کے لیے جابر علی کے گھر پہنچ گیا تھا۔



وہ ایک دم حواس باختہ سی ہو کر مہر جان کو جھنجھوڑنے لگی لیکن ان کے وجود میں کوئی حرکت نہ ہوئی۔ تب اس نے اپنے ڈوبتے ہوئے دل پر ہاتھ رکھا اور زور سے روم کو آواز دی۔

”روما..... روم کہاں ہو تم، بیٹا خدا کے لیے جلدی سے آؤ۔ دیکھو..... دیکھو تو سہی آ کر بی بی جان..... کو کیا ہو گیا ہے۔“ وہ اتنی زور سے چلائی تھی کہ یوں لگتا تھا کہ اس کی آواز گھر کی اونچی اونچی دیواروں کو چیرتی ہوئی باہر تک چلی گئی ہوگی اور اس وقت روم کے بجائے اسمیل خان کمرے میں حواس باختہ سادھل ہوا تھا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی جو منظر اس نے دیکھا اسے دیکھ کر جیسے وہ چکرا کر رہ گیا۔

”کیا ہوا گل جان بی بی..... ڈاکٹر صاحبہ بے ہوش ہیں؟“ وہ تیزی سے ان کے قریب آ کر بولا۔

”ہاں اسمیل خان، لگتا ہے بی بی جان بے ہوش ہوئی ہیں۔ میں نے ان کی نبض چیک کی ہے۔ شکر ہے نبض تو چل رہی ہے بس جلدی سے انہیں اسپتال لے کر چلو۔ مجھے تو..... مجھے تو طرح طرح کے وہم آرہے ہیں۔“ گل جان گہرائے ہوئے انداز میں بہن کو دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

”ہمت سے کام لیں گل بی بی..... بیگم صاحبہ کے ذہن پر شاید بوجھ بہت زیادہ ہو گیا تھا۔ برداشت نہیں کر سکیں۔“

”اسمیل خان ایک منٹ کی دیر نہیں کرو، جلدی سے کسی بھی طرح انہیں گاڑی میں لٹاؤ، فوراً اسپتال لے کر چلو، میں بھی ساتھ چلتی ہوں، مجھے یہاں چین کیسے آئے گا۔“

”ٹھیک ہے..... ٹھیک ہے، میں نذیر محمد کو کہتا ہوں کہ وہ میرے ساتھ آ کر ڈاکٹر صاحبہ کو اٹھائے، آپ حوصلہ رکھیں انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ اسمیل خان یہ کہہ کر بڑی تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔ گل جان..... ڈاکٹر مہر جان کی تسلیوں کو سہلانے لگی۔ وہ آنسو بھری آنکھوں سے ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”بی بی جان..... بی بی جان آپ کے بغیر میں بالکل لکیلی ہوں، خود کو سنہالیں دیکھیں تو سہی بی بی جان..... میری طرف دیکھیں تو سہی۔“ وہ پاگلوں کی طرح بے ہوش مہر جان سے باتیں کرنے لگی۔

☆☆☆

جابر علی بستر پر لیٹا تھا۔ سر ہانے پیڈل فین چل رہا تھا۔ وہ بہت پرسکون دکھائی دے رہا تھا۔

”ارے بھئی برہان کی ماں کہاں ہو تم..... ایک گلاس ٹھنڈا پانی تو پلاؤ۔“ اس نے صابروہ کو آواز دے کر پانی لانے کے لیے کہا۔

”یہ پانی لے لیں۔“ چند لمحوں بعد ہی صابروہ ایک گلاس ہاتھ میں لیے اس کے قریب آئی تھی۔

جابر علی اس کی آواز سننے ہی اٹھ کر بیٹھ گیا کیونکہ واقعی اسے شدید پیاس لگی تھی۔ صابروہ کے ہاتھ سے پانی کا گلاس لے کر اس نے شرعی طریقے سے تین سانس میں گلاس خالی کر دیا۔

”یہ گلاس رکھ کر میرے پاس آؤ..... تم سے بات کرنی ہے۔“ وہ خالی گلاس صابروہ کو تھاتے ہوئے بولا۔

صابروہ جو غیر حاضر دماغی کی کیفیت میں کوئی رو بوٹ محسوس ہو رہی تھی خالی خالی آنکھوں سے جابر علی کی طرف دیکھنے لگی۔ جیسے جابر علی کی بات کے کوئی معنی ہی نہیں ہوں اور وہ کچھ سمجھ ہی نہیں پاتی کہ اس سے کیا کہا گیا۔

”ارے بھئی یہ ٹکر ٹکر کیا میری شکل دیکھ رہی ہو؟ جاؤ گلاس رکھ کر آؤ مجھے تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے.....“ اس نے ذرا بلند آواز میں کہا تو صابروہ اپنے دھیان سے چونک پڑی اور چپ چاپ گلاس رکھنے چلی گئی۔ وہ بستر پر دوبارہ لیٹ گیا تھا۔

برہان ماں کو سامنے دیکھ کر کانپیں بلکہ تیزی سے چلتا ہوا شینہ اور ستارہ کے مشترکہ کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ صابروہ کا دل بیٹھ گیا۔ برہان کے چہرے پر جو لکھا تھا وہ اس نے پڑھ لیا تھا وہ ڈوبتے ہوئے دل کو سنبھالتی ہوئی برہان کے پیچھے پیچھے چلی آئی۔

”کیا ہوا بیٹا؟“ اس کی آواز میں کمزوری نمایاں تھی۔

”امی، آپ اباجان سے کہیں کہ ہمیں یہ رشتہ منظور نہیں ہے۔“ برہان نے پلٹ کر ماں کی طرف دیکھا اور بڑے سپاٹ لہجے میں گویا ہوا۔

صابروہ کے دماغ میں جیسے ایک زبردست دھماکا ہوا یعنی اس کے اندیشے درست نکل آئے، کوئی گڑ بڑ تو ضرور تھی جو مستقل دل میں ایک کھٹک سی ہو رہی تھی۔

”کیوں بیٹا، ایسی کیا بات ہے کہ بغیر سوچے سمجھے، بغیر چھان بین، اس رشتے سے انکار کر دیں۔“ پھر بھی اس نے پوچھا۔

”امی میں کہہ رہا ہوں ناں کہ بس آپ منع کر دیں۔ یوں سمجھیں کہ وہ مشکل سے اباجان کا چھوٹا بھائی لگتا ہے اور مجھے کوئی خاص پڑھا لکھا بھی محسوس نہیں ہوا۔ ایک خاص اعتماد جو اچھا کام کرنے والے پڑھے لکھے انسان میں ہوتا ہے وہ مجھے اس میں نظر نہیں آیا۔ ہاں اباجان نے چائے کے لیے کہا ہے، وہ تو میں اندر لے جاؤں گا۔ اس سے زیادہ میں آپ سے کچھ نہیں کہنا چاہتا۔“

صابروہ تو جیسے دھلے ہوئے کپڑے کی طرح پخڑ کر رہ گئی تھی۔ اعصاب جواب دے رہے تھے۔ چائے تو ستارہ تیار کر رہی تھی۔ اس نے کیا کرنا تھا لیکن اسے یوں محسوس ہوا کہ قدم اٹھانا بھی ایک بھاری کام ہے۔

”عمر زیادہ ہے بیٹا..... کیا پتا کوئی بہت نیک بندہ ہو ایک دم سے کیسے انکار کر دوں..... تمہیں اپنے ابا جان کا تو پتا ہی ہے۔“ صابروہ اسی کمزور آواز میں بیٹے سے مخاطب ہوئی تھی۔

”امی اب قیامت آئے بلکہ آہی جائے ہم نے یہاں شادی نہیں کرنی۔ اگر آپ کو اپنی اولاد سے تھوڑی سی بھی محبت ہے تو آپ کبھی یہ رشتہ منظور نہیں کریں گی۔ آپ مجھے چائے دے دیجیے۔ میں چائے رکھ کر آ جاتا ہوں۔“

صابروہ نے جیسے خود کو بڑی مشکل سے سنبھالا تھا۔ اب اس میں مزید کچھ پوچھنے اور بات کرنے کی ہمت باقی نہیں رہی تھی۔ وہ تقریباً خود کو ہیشٹی ہوئی کمرے سے باہر جا رہی تھی۔

”آ جاؤ بیٹا چائے تو تیار ہے، لے جاؤ۔“ اس نے کمرے سے نکلتے نکلتے اتنا ضرور کہا تھا۔

برہان ماں کے پیچھے ہی چل پڑا تھا۔

☆☆☆

گل جان، ڈاکٹر مہر جان کے بیڈروم کے دروازے پر دستک دے کر اندر چلی آئی تھی کیونکہ بہت دیر ہو گئی تھی، اس نے مہر جان کی آواز نہیں سنی تھی..... نہ انہیں دیکھا تھا۔ ایک تشویش کی لہر اس کے اندر اٹھنے لگی تو وہ رہ نہ سکی اور سوچا پتا تو کرے کہ آخر بی بی جان کیا کر رہی ہیں، اتنی خاموشی کیوں ہے؟

دروازہ کھولتے ہی اس کے منہ سے ایک زوردار چیخ نکلی تھی کیونکہ اس کے سامنے ڈاکٹر مہر جان بے ہوش و حواس آدمی صوفے پر اور آدمی کارپٹ پر گری ہوئی دکھائی دی تھیں۔ گل جان دیوانہ وار بھاگتی ہوئی ان کے قریب پہنچی۔

”بی بی جان..... بی بی جان کیا ہو گیا آپ کو..... اس طرح سے کیوں لیٹی ہوئی ہیں، اٹھیے بی بی جان۔“



تاریخ طے ہو جائے گی تو تیاریاں شروع کر دینا۔“ جابر علی ایک دم اٹھ کر بیٹھ گیا تھا اور اس نے انگلی کے اشارے سے صابرہ کو جانے کے لیے کہا۔

”شادی تو نہیں ہوگی..... میرا مطلب ہے وارث علی سے نہیں ہوگی۔“ صابرہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی اس نے دو ٹوک فیصلہ سنایا تھا۔

جابر علی کا پورا وجود شدید غصے کی زد میں آ کر کسی تینکے کی طرح لرزرنے لگا اس نے شعلہ بار نظریں صابرہ کے چہرے پر جمادیں۔ چند لمبے خون کے گھونٹ پیتا رہا پھر گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا جس طرف برہان کا کمر اٹھا اور دبی ہوئی آواز میں گویا ہوا۔

”جوان بیٹے پر رات رہی ہے، تیرا وہ بیٹا بھی اس وقت تک اس گھر میں ہے جب تک میری مرضی ہے۔“ ”یہ ظلم ہوگا، برہان نے آپ کا کیا لگاڑا ہے..... گھر کے لوگ آپس میں صلح مشورہ کرتے ہی ہیں۔ سب کی بات ایک نہیں ہوتی لیکن جس پر زیادہ کا اختلاف ہو وہ بات خود بخود ختم ہو جاتی ہے۔“

”ارے تم لوگ ہوتے کون ہوا اختلاف کرنے والے۔ میں اس وقت کو کوستا ہوں جب میں نے تمہیں مشورے کے قابل سمجھا تھا۔ جاؤ جا کر اپنا کام کرو۔“ جابر علی اب ضبط نہ کر سکا۔ بری طرح دھاڑ کر بولا تھا۔ اور اس کے دھاڑتے ہی برہان سامنے آ گیا۔ ”لے جاؤ اپنی ماں کو یہاں سے دماغ خراب کر دیا ہے تم لوگوں نے.....“ جابر علی نے غصے بھری نظریں برہان کے چہرے پر جمائیں اور بولا۔

”کیا ہو گیا ہے ابا جان.....؟ ایسا کیا کہہ دیا ہے ہم نے کہ آپ اتنی رات کو اتنی بلند آواز سے چیخ رہے ہیں۔ آس پڑوس کا ہی خیال کر لیا کریں۔“ برہان کو باپ کے دھاڑنے پر غصہ تو بہت آیا ہوا تھا لیکن معاملہ کنٹرول بھی اسی نے کرنا تھا۔ اسی لیے وہ بہت دھیمی آواز میں بات کر رہا تھا۔

”تمہاری شہ پر تہیاری ماں مجھ سے ٹکرا رہی ہے، میرے فیصلوں سے اختلاف کر رہی ہے۔“ برہان نے باپ کی فقط اتنی بات سنی تھی اور فوراً ہی برجستہ گویا ہوا تھا۔

”اس لیے اختلاف کر رہی ہیں کہ ماں ہیں، ان کا بھی حق ہے۔“

”جاؤ..... جاؤ اپنی ماں کو بھی یہاں سے لے جاؤ تم دونوں آئندہ مجھے نظر نہ آنا۔ میری بیٹیاں ہیں، میری ذمے داریاں ہیں، میں خود کوٹھ لوں گا۔ میں خود دیکھ لوں گا۔ مجھے تم دونوں کی..... کسی سہارے کی کسی تعاون کی کوئی ضرورت نہیں، چلو نکلو یہاں سے۔“

”یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟“ صابرہ تو جیسے بھونچکی رہ گئی۔ ”کتی آسانی سے گھر کے باہر کا راستہ دکھا دیا۔“ یہ تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ اتنی جلدی فیصلہ کن پوزیشن اختیار کرے گا اور پچیس چھپیس سال کے تعلق کا بھی لحاظ نہیں کرے گا۔

”جاؤ بیٹا، جاؤ تم آرام کرو، بعد میں بات ہو جائے گی تمہیں اپنے باپ سے سوال جواب کرنے کی ضرورت نہیں۔“ صابرہ نے برہان کو بازو سے پکڑ کر ایک طرف دھکیلتے ہوئے کہا۔

”رہنے دیں امی، بات آج ہی ختم ہوگی۔ چاہے اس کا نتیجہ ہمارے حق میں ہو یا ہمارے خلاف۔ اب یہ روزانہ کی چیخ و جھج نہیں چلے گی۔ مجھے ابا جان سے بات کر لینے دیں۔“ برہان اپنا بازو پوری قوت سے ماں سے چھڑاتے ہوئے بولا۔

جابر علی نے برہان کے تیور بھانپ لیے تھے۔ اندر سے تو وہ کافی پریشان ہوا لیکن فوراً ہی اس کا اپنا اعتماد

صابرہ واپس آ کر خاموشی سے اس کے پاؤں دبائے لگی۔

”وہ..... پھر تم نے برہان سے بات کر لی ناں..... لڑکا تو اچھا ہے اور بھی آج کے زمانے میں ایک نیک، شریف اور دین دار رشتہ ملنا بہت مشکل ہو گیا ہے، سمجھ نہیں آتی کہ ان لڑکوں کو ہو کیا گیا ہے، ہاتھ میں کڑا پسینے ہیں، کان میں بالی..... عورتوں کی طرح چٹیا باندھتے ہیں۔ لا حول ولاقوة..... اللہ نے مرد دنیا کر دینا میں سمجھا ہے تو مرد کو مردانہ نظر آنا چاہیے۔ ماشاء اللہ وارث علی میں مردانگی بھی ہے اور محنتی بھی ہے اور یہ تو ہماری خوش قسمتی ہے نمازی پر بہتر گزار بھی ہے۔“

جابر علی بول رہا تھا۔ صابرہ سر جھکائے خاموش بیٹھی سن رہی تھی۔ جب صابرہ جواب میں کچھ نہیں بولی تو جابر علی نے اپنی بند آنکھیں کھول کر بیوی کی طرف دیکھا۔

”میں کیا کہہ رہا ہوں، ایسا لگ رہا ہے تمہیں تو سانپ سو گھ گیا۔ کچھ بولتی کیوں نہیں، جاتے ہوئے میں نے تمہیں اس کی ایک جھلک دکھائی تھی ناں.....“

”وہ تو ٹھیک ہے لیکن شبینہ کی عمر ابھی بہت کم ہے، اس کی عمر کے حساب سے وارث علی کی عمر بہت زیادہ ہے۔“ صابرہ نے آخر ڈرتے ہوئے ذل کی بات کہہ ہی دی۔

”دس بارہ سال تو تم بھی چھوٹی ہو مجھ سے۔“ جابر علی کی پیشانی پر لاتعداد گہری شکنوں کا جال بچھ گیا۔ وہ بڑے کڑے تیوروں کے ساتھ بیوی کی طرف دیکھ کر بولا۔

”دس بارہ سال کا فرق تو چل جاتا ہے کیونکہ عورت جلدی ڈھل جاتی ہے۔“ صابرہ نے جلدی سے جابر علی کی بات کاٹ کر کہہ دیا۔ بہر حال وہ ایک ماں تھی جو اولاد کے لیے اپنی جان تک قربان کرنے کے لیے ذہنی طور پر تیار رہتی ہے۔ اب تو اس کی بیٹی کے مستقبل کا سوال تھا اور ساری زندگی ڈرتے رہنے سے اسے ملا ہی کیا تھا۔ اب اولاد کے حصے کا معاملہ تھا اسے یوں لگتا تھا کہ تیر چل چکا ہے آ رہا ہے پھر کچھ تو ہونا چاہیے۔

”تم کم عقل، ان پڑھ، بے وقوف عورت ہو، باہر نکل کر دنیا دیکھو تو تمہیں پتا چل جائے گا کہ کتنی بڑی نعمت اللہ پاک نے تمہارے گھر میں اتاری ہے اور تم ناشکری کر رہی ہو۔ عمر کا کوئی مسئلہ نہیں ہوتا اور تم نے ابھی خود ہی کہہ دیا کہ عورت، مرد کے مقابلے میں جلدی ڈھل جاتی ہے اور وہ کہتے ہیں ناں کہ مرد تو ساٹھا اور پاٹھا ہوتا ہے۔“ ”میں یہ کب کہہ رہی ہوں کہ آپ کی بات غلط ہے لیکن ہر ماں کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کی بیٹی کا جوڑ اچھا بنے جو بھی اس کے ساتھ ہو ج جائے۔“

”ہاں بس تم انہی سجادوں کے چکر میں رہنا کوئی ایسا ویسا ڈیکوریشن نہیں مل گیا ناں ساری زندگی روٹے گزر جائے گی، میں کوئی اپنی اولاد کا دشمن ہوں؟“

”آپ باپ ہیں، میں ماں ہوں۔ دونوں کے سوچنے کا انداز مختلف ہے، دیکھیے ناں شبینہ تو اپنے منہ سے کچھ نہیں کہے گی یوں سمجھیں میری اس بچی کے منہ میں تو زبان ہی نہیں ہے..... لیکن میں اپنی بیٹی کے جذبات کو سمجھ سکتی ہوں اس کی پسند اور نا پسند کو پرکھ سکتی ہوں۔“ صابرہ بہت نرمی سے شوہر کو قائل کرنے کی کوشش کر رہی تھی مگر ادھر الٹ ہی معاملہ ہوا تھا۔

”جلی جاؤ تم یہاں سے تم سے مشورہ کرنا بیکار ہے اور وہ جو کہتے ہیں ناں کسی بے وقوف سے مشورہ کرنا تباہی ہے۔ چلو جاؤ مجھے یہاں کرنا تم سے کوئی مشورہ و شورہ..... بس جو میں نے طے کر لیا ہے اب وہی ہوگا۔ میں تمہاری بے وقوفیوں کی وجہ سے اپنی اولاد کو غلط ہاتھوں میں نہیں پہنچا سکتا۔ جاؤ جا کر آرام کرو، سو جاؤ۔ شادی کی



”ختم ہو گئی تمہاری تقریر؟ اور تم کون سا تجربے کی اس عمر میں پہنچ گئے ہو جہاں بندے پر ایک نظر ڈالو اور پورا ایک سرے نکال کر رکھ دو۔ جا کر آرام کرو، میں نے جو فیصلہ کیا ہے تمہاری ماں کو سنا دیا ہے۔“ جابر علی نے نظریں اٹھا کر برہان کی طرف دیکھا۔ اور خلاف توقع بہت نرمی سے بات کی تھی۔

”کوئی فیصلہ نہیں ہوا ابا جان، آپ کا فیصلہ ہے کہ شادی وارث علی سے ہوگی میرا اور امی کا فیصلہ ہے کہ شادی وارث علی سے نہیں ہوگی۔“

جابر علی نے غضبناک نظروں سے برہان کی طرف دیکھا مگر چلایا نہیں صرف اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ برہان کا بازو پکڑا اور اسے ایک طرف دھکیلتے ہوئے بولا۔ ”مرضی ہے اپنے بستر پر جا کر سو جاؤ، مرضی ہے اسی وقت کہیں اور اپنا ٹھکانا بنالو۔ اب تم سے کوئی بات نہیں ہوگی میں نے تمہارا ارمان پورا کر دیا۔ جو تم نے کہنا چاہا وہ میں نے سن لیا۔ اب بات ختم۔“

”ابا جان آپ کو دوسروں کی بات اتنی آسانی سے سمجھ میں آ جاتی ہے، اپنے گھر والوں کی اپنی ہی اولاد کی بات آپ کو سمجھ میں نہیں آتی۔“ برہان اسی طرح نرمی اور ادب سے بات کر رہا تھا۔

”نہہ دیا ناں نہیں آتی، کرلو جو کرتا ہے، شہینہ کی شادی کے بعد مجھ پر تیل چھڑک کر آگ لگا دینا۔ ٹھیک ہے؟ یہ شادی تو ہوگی۔“

”تو ٹھیک ہے ابا جان! میں اپنی موجودگی میں تو یہ ظلم ہوتا ہوا نہیں دیکھ سکتا اور ایک باپ کے فیصلے سے عکرا کر دور تک کوئی تباہی بھی دیکھنا نہیں چاہتا۔ شہینہ آپ کی بیٹی ہے، مجھ سے زیادہ آپ ہی کا اس پر حق ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ زندگی بھر آپ کو اپنی شکل نہ دکھاؤں۔“ یہ کہہ کر برہان اپنی جگہ سے اٹھا اور باپ کے تاثرات دیکھنے کے لیے صرف چند لمحے اس کی طرف دیکھا تھا۔ ایک مضبوط باقوت رشتے نے تھوڑی سی آس بندھائی تھی کہ شاید باپ اسے جاتے ہوئے روک لے مگر ایسا نہیں ہوا۔

جابر علی بالکل خاموش سر جھکائے یوں بیٹھا تھا جیسے اس کی سماعت کام نہ کر رہی ہو اور جو کچھ برہان نے کہا ہے وہ ہوا میں اڑ گیا ہو۔

برہان نے باپ کی یہ بے نیازی دیکھی تو دکھ کی لہر کو ضبط کرتا ہوا چپ چاپ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ چند ضروری چیزیں سمیٹ کر اس نے اس گھر کو ہمیشہ، ہمیشہ کے لیے خیر باد کہنے کا فیصلہ آخر کار کر ہی لیا تھا۔

☆☆☆

رومانے ماں کو اس حال میں دیکھا کہ اصل خان اور ڈرائیور انہیں یہ مشکل اٹھائے پورچ کی طرف جا رہے تھے۔ اس کی تو آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ چند لمحوں کے لیے تو کچھ سمجھ بھی نہیں آئی۔ دوڑتی ہوئی وہ باہر کی طرف بھاگی۔ دیکھا تو گل جان پہلے سے وہاں موجود تھی اور بڑی بے قراری سے اپنی گھڑی پر نظر ڈال رہی تھی۔ اس کی بے قراری اور بے تانی کا اندازہ اس بات سے تھا کہ وہ دروازہ کھولے ہوئے بالکل تیار کھڑی تھی۔ ڈرائیور نے زچہ اور اصل خان نے گل جان کو کار کی بیک سیٹ پر لٹا دیا۔

”گل جان بی بی آپ اس طرف سے آجائیں اور ڈاکٹر صاحبہ کا سہرا اپنی گود میں رکھ لیں۔“ اصل خان گل جان سے مخاطب ہوا تھا۔ گل جان بہت سراسیمگی کی کیفیت میں گاڑی کے اندر بیٹھ گئی اور بہت محبت اور احتیاط سے بے ہوش، بے خبر مہر جان کا سہرا سسکی سے اٹھا کر اپنی گود میں رکھ لیا۔ ڈرائیور اور اصل خان پلک جھپکتے میں اگلی سیٹوں پر بیٹھ چکے تھے۔

بحال ہو گیا جو اسے اپنی عقل اور اپنے اختیارات پر تھا۔

”کرسی لے آؤ اور میرے سامنے بیٹھ کر مجھ سے بات کرو، میں خود بھی چاہتا ہوں کہ آج جو بھی بات ہو وہ اپنے انجام کو پہنچے۔ چلو بیٹا کرسی لا کر ادھر بیٹھو، آرام سے بات کرتے ہیں۔ دیکھتا ہوں کتنے پانی میں ہوتم۔ میری اولاد پر مجھ سے زیادہ اختیار..... یہ تو میں برداشت نہیں کروں گا۔“ جابر علی اب بہت ٹھہر ٹھہر کر چپا چپا کر ایک، ایک لفظ ادا کر رہا تھا۔

”امی جائیں آپ آرام کریں۔ ضروری نہیں ہے جب میری اور ابا جان کی بات ہو تو آپ بھی اس میں حصہ لیں۔“ برہان نے صابرہ کی طرف دیکھا۔

”بیٹا میں کیا کہہ رہی ہوں؟ مجھے سننے تو دو کہ تم لوگ کیا باتیں کر رہے ہو۔“

”امی آپ نے صرف سنا ہی ہے ناں، اس سے زیادہ آپ کچھ نہیں کر سکتیں اور صرف سننے سے آپ کی ٹینشن ہی بڑھے گی۔ حاصل کچھ بھی نہیں ہوگا۔ میرے کہنے سے آپ جائیں۔ آرام کریں پلیز..... ویسے بھی ابا جان کو غصہ آ جاتا ہے۔ جب آپ میری بات سے اتفاق کرتی ہیں بہتر یہی ہے کہ میرے اور ابا جان کے درمیان جو بات ہونے جا رہی ہے آپ درمیان میں نہ بولیں۔“

صابرہ نے اپنے جوان، پرامن اور بیٹے کی طرف دیکھا پھر جابر علی کی طرف ایک نظر دوڑائی جو اپنے دونوں ہاتھوں کا بوجھ بستر پر ڈالے سر جھکا کر حیرت انگیز طور پر بڑی خاموشی سے برہان کی بات سن رہا تھا۔

”جائیں امی..... پلیز جائیں مجھے ابا جان سے بات کرنے دیں۔ آپ سچ میں بولتی ہیں تو اس وجہ سے معاملہ خراب ہو جاتا ہے۔“

”اچھا بیٹا ٹھیک ہے لیکن دیکھو آرام سے بات کرنا، باپ ہیں تمہارے۔“

”امی میں نے بھی ابا جان سے بدتمیزی نہیں کی، ماں کوئی بات کرنے کا موقع ملا تو بات ضرور کی ہے، بات کرنے اور بدتمیزی کرنے میں بہت فرق ہوتا ہے، چائیں آپ جا کر سو جائیں۔“

صابرہ نے ایک گہری سانس لی اور جیسے اپنے وجود کو ہینٹنی ہوئی آگے بڑھنے لگی۔ دل کو طرح، طرح کے اندیشوں نے گھیر لیا تھا۔

”یا اللہ مجھ پر رحم کرنا اب میرے اندر سہارا نہیں ہے مجھے کسی بڑی مشکل میں نہ ڈالنا..... وہ دعا کر رہی تھی۔ صابرہ کے جاتے ہی برہان نے دور پڑی ہوئی ایک کرسی صیقلی اور باپ کے قریب بلکہ اس کے عین مقابل بیٹھ گیا۔ جابر علی اب بالکل خاموش تھا۔ جیسے وہ برہان کی پہل کرنے کا منتظر تھا۔

”ابا جان مجھے آپ سے کوئی بہت لمبی چوڑی بات نہیں کرنی لیکن آپ سے اتنا ضرور کہنا ہے کہ لوگ دشمنیوں میں تو ظلم کرتے ہیں، محبتوں میں ظلم کرنا تو بہت بڑی قیامت ہے، شہینہ آپ کے سامنے کبھی نہیں بولے گی۔ وہ کوئی بڑا دلانہ حرکت بھی نہیں کرے گی۔ میرا مطلب ہے زہر بھی نہیں کھائے گی، آپ کے ہر فیصلے پر سر جھکا دے گی لیکن ایک سسکتی ہوئی زندگی اس کا مقدر بن جائے گی۔ میں اپنے ہر معاملے کو آپ پر چھوڑتا ہوں، چاہے میری گزراؤات کا معاملہ ہو، میری فیسوں کا معاملہ ہو، میرے مستقبل، میری شادی بیاہ کا معاملہ ہو۔ آپ جو فیصلہ کریں گے میں کبھی اختلاف نہیں کروں گا۔ چاہے وہ میرے دل کو اچھا لگے یا نہیں لگے لیکن ابا جان ایک بے زبان مگر جذبات اور احساسات رکھنے والی بیٹی پر آپ کو رحم کرنا ہوگا۔ آپ نے اس شخص کی بہت تعریف کی جو مجھے اس کے سہراپے میں کہیں جھلکتی ہوئی نظر نہیں آتی۔“ اتنا کہہ کر برہان خاموش ہو گیا۔



☆☆☆

رابی مری کے ایک خوب صورت ہوٹل کے کمرے میں بیٹھی اپنے موبائل سے سم نکال رہی تھی۔ موبائل سے سم نکال کر اسے ایک کاغذ میں لپیٹ کر اپنے بیک میں ڈالا پھر موبائل کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگی اور خود کلامی کے سے انداز میں کہا۔

”اب یہ موبائل میرے کس کام کا۔ اللہ میاں سے رابطہ تو بغیر موبائل کے ہو جاتا ہے۔ باقی دنیا میں اب کسی سے کوئی رابطہ نہیں ہے، تعلق اور رابطے تو ایک بوجھ ہوتے ہیں جو میں نے اتار کر پھینک دیے ہیں۔ آج تو مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے میں نے اس مٹی کے جسم کا لباس بھی کھین اتار کر پھینک دیا ہے اور میں صرف روح ہوں جو فضاؤں میں اڑتی پھر رہی ہے۔ یہ سارے بوجھ اتار کر میں کتنی خوش اور مطمئن ہوں، کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا..... چھوڑ دیا سب کچھ..... توڑ دیا وہ گلاس جس میں مجھے زہر پیش کیا جا رہا تھا۔ اب میں محسوس کر سکتی ہوں کہ میں زندہ ہوں اور ایک وجود رکھتی ہوں..... میرے پاس خوشی ہے، نہ کوئی غم، اس وقت جو میری کیفیت ہے وہ تو کوئی غلام ہی سمجھ سکتا ہے اور ایسا غلام جس نے اپنے مالک کو منہ مانگی قیمت ادا کر کے آزادی حاصل کر لی ہو..... ڈاکٹر صاحبہ میں نے بھی آپ کو قیمت ادا کی ہے لیکن ایسی قیمت ایسی نقدی جس سے زندگی بھر آپ اپنے اس کھدی دوا خریدیں گی اور کوئی بھی ایسی دوا نہیں ملے گی جو آپ کے دکھ کا مداوا کر سکے، آپ لا علاج ہی رہیں گی۔“ رابی کی آنکھوں میں ایک سفاکی کا تاثر تھا۔ جیسے اس کے زخم نئے سرے سے ہرے ہو رہے ہوں، اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی تھی اور وہ چونک پڑی تھی۔

”کون ہے؟“ خاصی بدحواس ہو کر اس نے پوچھا تھا۔

”جی..... روم سروس چائے لے کر آیا ہوں۔“ رابی نے ویٹر کی آواز سن کر سکون کی سانس لی اور بیڈ سے اتر کر دروازہ کھول دیا۔ ویٹر اندر داخل ہوا کر ٹیبل پر چائے لگا رہا تھا اور وہ ہنوز اپنی جگہ پر اسی طرح کھڑی تھی اور ویٹر کے واپس جانے کا انتظار کر رہی تھی۔

☆☆☆

شبینہ، جابر علی کے سامنے ناشتا رکھ چکی تھی۔ یہ خلاف معمول عمل تھا۔ اس لیے جابر علی نے چونک کر پوچھا تھا۔

”تمہاری ماں کہاں ہے؟“

”امی یکن میں ہیں ابا جان۔“

”اچھا تو کیا تم آج لیٹ نہیں ہو گئیں۔ کالج جانے کا ارادہ نہیں ہے؟“

”وہ ابا جان کیا میں کالج چلی جاؤں؟“ شبینہ نے باپ کی بات سن کر سر اٹھایا پھر نظریں اٹھا کر بہت آہستگی سے سوالیہ انداز میں بولی۔ جابر علی کو جیسے اس کے سوال کی سمجھ نہیں آئی تھی۔ اس نے ابھی ابھی نظروں سے شبینہ کی طرف دیکھا۔

”کیوں آج مجھ سے پوچھ کر کالج جاؤ گی؟ مجھے تمہاری بات کی سمجھ نہیں آئی۔“ جابر علی نے ابھی ابھی کیفیت میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”وہ ابا جان میں سمجھی کہ شاید مجھے بھی کالج نہیں جانا۔“ شبینہ نے جھجکتے ہوئے کہا۔

”بھئی وہ میں نے تمہارے کالج جانے پر مابندی نہیں لگائی۔ مجھے تم سے کوئی شکایت ہے نہ تم پر کوئی غصہ..... جی بات ہے مجھے تو تم ہی اپنی اولاد لگتی ہو۔“ جابر علی کو جیسے اب سب کچھ سمجھ آ گیا وہ بڑا بد مزہ سا ہو کر بولا۔

چوکیدار اور گن مین دروازہ کھولے منتظر تھے۔ ڈرائیور نے ایک لمحے کی تاخیر کے بغیر گاڑی اشارت کی اور ایک سیلر ٹرڈ باکریزری سے پورچ سے باہر نکل گیا۔

روما دیمچی کی دیمچی ہی رہ گئی۔ وہ یہ منظر دیکھ کر بری طرح سہم گئی تھی جیسے قوت گویائی ہی سلب ہو کر رہ گئی تھی۔ جب گاڑی باہر نکل گئی اور چوکیدار نے گیٹ بند کر دیا تو رومایک دم جیسے اپنے حواسوں میں واپس آ گئی۔ وہ اندر کی جانب بڑھی اور لاؤنج میں پہنچتے ہی شاہ عالم کا نمبر ملایا تھا اور حسن اتفاق تھا کہ فون شاہ عالم نے خود ہی ریسیو کیا تھا۔

”دادا جان..... دادا جان، اماں جان کو ہٹا نہیں کیا ہو گیا ہے، وہ بالکل بے ہوش تھیں ابھی ہمارا ڈرائیور اور امیل خان ان کو اسپتال لے کر گئے ہیں، خالہ جان بھی ان کے ساتھ گئی ہیں۔ میں تو خالہ جان سے کوئی بات بھی نہیں کر سکی۔ مجھے سمجھ ہی نہیں آ رہی تھی کہ یہ کیا ہو گیا ہے، اماں جان ایک دم سے بے ہوش کیسے ہو گئیں۔ دادا جان میں بہت پریشان ہوں، میں کیا کروں؟“ رومائے اتنے تواتر سے بولی کہ دل کے مریض شاہ عالم نے بے ساختہ اپنے دل پر ہاتھ رکھ لیا تھا۔ جیسے انہیں خود کو سنبھالنا مشکل ہو رہا ہو پھر بھی اپنی تمام توانائی اکٹھی کر کے وہ بے مشکل گویا ہوئے۔

”بیٹا..... بیٹا مجھے کچھ سمجھ نہیں آئی، آپ آرام سے بات کریں، بیٹا میں کچھ سمجھ نہیں۔“

”دادا جان میں کہہ رہی ہوں کہ میری اماں جان کی طبیعت بہت زیادہ خراب ہو گئی ہے، وہ بے ہوش تھیں۔ خالہ جان انہیں اسپتال لے کر گئی ہیں۔ پتا نہیں کیا ہو گیا ہے انہیں..... مجھے، مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی میں کیا کروں؟“ رومائے اتنے ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی کیونکہ واقعی اس وقت تو اس پر قیامت ہی گزری تھی ایک تو رابی گھر سے غائب تھی، دوسرے اب مہر جان بھی بے ہوشی میں گھر سے جا چکی تھیں۔ گھر میں سوائے دو چار نوکروں کے اور اس کے کوئی نہیں تھا۔

”ٹھیک ہے بیٹا تو آپ ایسا کریں میرے پاس آ جائیں۔ کوئی زیادہ دور تو نہیں گھر، آپ دوڑتی ہوئی میرے پاس آ جائیں اور گھبرانے کی ضرورت نہیں، بندہ بیمار بھی ہو جاتا ہے، کوئی بات نہیں بیٹا، آپ کی اماں جان بالکل ٹھیک ہو جائیں گی۔“ دادا جان نے اسے تسلی دی۔

”دادا جان گھر پر کوئی نہیں ہے۔ اگر اسپتال سے فون وغیرہ آیا تو مجھے کیسے پتا چلے گا کہ وہاں کیا پجوشن چل رہی ہے؟“ رومایہ کی بات سن کر شاہ عالم سوچ میں پڑ گئے۔ بات تو رومائے ٹھیک کی تھی۔ اتنی خطرناک پجوشن میں گھر میں کسی فرد کا ہونا بہت ضروری تھا۔

”ٹھیک ہے بیٹا..... میں آ جاتا ہوں، آپ بالکل پریشان مت ہونا، آپ اکیلی نہیں ہیں۔ میں صرف کاٹناز کا دادا انہیں آپ کا بھی دادا ہوں۔ میرے ہوتے ہوئے آپ کو بالکل پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔“ شاہ عالم اگرچہ خود بہت گھبرانے ہوئے تھے مگر رومائے اپنی اخلاقی ذمے داری بھی سمجھ رہے تھے ان کے اعصاب تو خود ان کا ساتھ چھوڑ رہے تھے کیونکہ رومائے جس انداز میں بات کی تھی اور پھر جس طرح سے وہ روٹی تھی یہ سب کچھ ان کے لیے بہت ناقابل برداشت تھا۔ انہیں پلائی ان کی ہو چکی تھی۔ ذرا ذرا سی بات پر ان کے اعصاب جواب دینے لگتے تھے۔ وہ جلدی سے ریسیور رکھ کر کھڑے ہو گئے۔ وال کلاک کی طرف دیکھا پھر نوکر کو آواز دی۔

”شیر میں تھوڑی دیر کے لیے گھر سے باہر جا رہا ہوں۔“



وقت گھر سے نکلا ہے۔

صابرہ کی حالت غیر ہونے لگی۔ وہ گرنے کے انداز میں برہان کے بستر پر بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھارہا تھا۔ اس کا دل کہہ رہا تھا کہ کوئی مسئلہ ہو گیا ہے۔ یہ بات بہت ہی انوکھی اور نرالی تھی کیونکہ جب سے برہان نے اسکول جانا شروع کیا تھا آج تک کوئی دن ایسا نہیں گزرا تھا جب اس نے ماں کو خدا حافظ نہ کہا ہو۔

”مجھے بتائے بغیر برہان کب چلا گیا، کیسے چلا گیا، میں تو بچے کام کرتی پھر رہی ہوں۔ وہ وہاں سے گزرتا تو میں اسے دیکھتی، دروازہ کھلتا تو مجھے آواز آتی۔ کہیں وہ رات کو تو کہیں نہیں چلا گیا۔ کہیں جابر علی نے تو اس سے کوئی ایسی بات نہیں کی۔ اسے گھر سے تو نہیں نکال دیا۔“ یہ خیال آتے ہی جیسے اس کے پورے وجود میں بجلیاں سی دوڑنے لگیں۔ ایک صدمے اور غم کی قوت تھی جس نے اسے اٹھا کر کھڑا کر دیا تھا۔ وہ گرتی پڑتی نیچے آئی تھی۔

جابر علی ناشتا ختم کر کے اٹھ چکا تھا اور واش بیسن پر کھڑا ہوا تھا۔ صابرہ کو اب ہر مصلحت سے نجات مل چکی تھی۔ وہ دیوانہ وار دوڑتے ہوئے جابر علی کے پاس آئی تھی۔

”برہان کہاں ہے؟“ اس کے انداز سے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ اپنی توازن کو ہلکی ہے۔

”مجھ سے کیا پوچھ رہی ہو؟ مجھے کیا بتا کر جاتا ہے؟ اس نے جیتے جی باپ کو تو مار ہی دیا ہے بس اب تو اس کی ماں ہے اور وہ ہے۔“ جابر علی نے بوے غصے سے اس کی طرف گھورا تھا۔

”وہ اپنے کمرے میں نہیں ہے جابر علی۔“

”تو نگرے دکھا رہا ہوگا، ناشتا کیے بغیر چلا گیا یونیورسٹی،“ جابر علی نے اسی اکھڑپن سے جواب دیا اور تویسے سے ہاتھ پوچھنے لگا۔

”میں تو نہیں ہوں صبح سے..... جو بھی ادھر سے جائے گا تو مجھے نظر آئے گا وہ میرے سامنے سے گزرے گا۔“ صابرہ بدحواس ہو کر جلدی جلدی بول رہی تھی۔ اس پر تو جیسے ایک وحشت کی طاری تھی۔ دل ڈوبتا جاتا تھا۔

”بھئی ہو سکتا ہے تم واش روم میں ہو، ہو سکتا ہے تم نماز پڑھ رہی ہو اس ٹائم چلا گیا ہو۔“ جابر علی نے جیسے جان چھڑانے والے انداز میں کہا۔

”پھر گیسٹ کھلتا ہے بند ہوتا ہے، آواز تو آتی ہے ناں!“

”اپنے دماغ کا علاج کراؤ، پتا نہیں کہیں پہنچی ہوئی ہوگی۔ اب اتنا پریشان ہونے کی ضرورت کیا ہے، اس کے موبائل پر فون کرو پتا چل جائے گا کہاں ہے وہ۔ پوچھ لینا کہ ناشتے کے بغیر کیوں چلا گیا۔“ وہ یہ کہہ کر اپنے کمرے کی طرف پڑھا جہاں سے اس نے اپنی چھتری، ٹوپی اور ضروری چیزیں اٹھائیں۔

صابرہ کو اس نے تسلی یاد لا سانس نہیں دیا تھا مگر ایک راستہ بچھا دیا تھا۔ جو مارے بدحواسی کے اس کی سمجھ میں ہی نہیں آیا تھا۔ وہ جلدی سے ستارہ کے کمرے کی طرف بھاگی کیونکہ اسے برہان کا موبائل نمبر زبانی یاد نہیں تھا۔

”ستارہ بیٹا جلدی سے بھائی کا نمبر ملاؤ، پوچھو تو وہ کس وقت چلا گیا اور بغیر بتائے کیوں چلا گیا۔ ایسی بھی کیا مصیبت آ رہی تھی۔“

ستارہ نے ماں کی طرف دیکھا اور خاموشی سے لاؤنج میں چلی آئی۔ جہاں فون سیٹ رکھا ہوا تھا کیونکہ ان دونوں بہنوں اور ماں کے پاس موبائل نہیں تھا۔ جابر علی کی اجازت نہیں تھی کہ وہ موبائل فون استعمال کریں۔ ستارہ نے برہان کا نمبر ملایا، دوسری طرف موبائل کے پاور آف ہونے کی ریکارڈنگ چل رہی تھی۔

صابرہ کچن میں کھڑی سن رہی تھی۔ اس کے دل کو کچھ ہوا۔ یوں جیسے بھرے بازار میں اس کے سر سے چادراتا کر پھینک دی ہو۔ اس نے درد کی ٹیڑھوں کو دبا کر پھر اپنا کام شروع کر دیا اور سوچنے لگی۔ یہ تو میرا مقدر ہے۔ آخر میں اپنے مقدر پر کب سمجھوتا کروں گی۔

باہر خاموشی چھا گئی تھی اس کا مطلب تھا کہ شینہ، جابر علی کو ناشتا دینے کے بعد وہاں سے چلی گئی ہے۔ صابرہ کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ وہ جابر علی کے سامنے سے گزر کر برہان کے کمرے میں جائے اور پتا کرے کہ آخر وہ ابھی تک ناشتا کرنے کے لیے نیچے کیوں نہیں آ رہا پھر اس نے آخر کار ہمت کر لی اور کچن کے دروازے میں کھڑی ہو کر ستارہ کو آواز دینے لگی۔

”ستارہ دیکھو بیٹا..... بھائی ابھی تک نیچے نہیں آیا، دیر ہو جائے گی تو ناشتے کے بغیر ہی چلا جائے گا۔“

”جی امی..... میں دیکھتی ہوں، میرا خیال ہے آج بھائی کا یونیورسٹی جانے کا پروگرام نہیں ہے، ورنہ وہ تو اس ٹائم تک تو چلے جاتے ہیں۔“ ستارہ کی آواز اس کے کمرے سے آئی تھی۔

”لیکن پھر بھی بیٹا پتا تو کرو ناں، کہیں ایسا تو نہیں اس کی طبیعت خراب ہو.....“

وہ جابر علی پر نظر ڈالے بغیر کچن میں آ کر اپنا کام کرنے لگی۔

”بہت فکر رہتی ہے اپنے لاڈلے کے ناشتے کی۔ ارے کھاتے ہوئے مرتے دیکھا ہے، آج تک کسی بھوکے کو مرتے نہیں دیکھا۔“ جابر علی ناگوار سی سے بڑبڑا رہا تھا۔ صابرہ پھر ضبط کے کڑے مرحلے سے گزری اور ایک ٹھنڈی سانس سینے سے خارج کی۔

”امی میں نے آپ سے کہا تھا ناں کہ بھائی جان چلے گئے ہوں گے۔ وہ چلے گئے ہیں، کمرے میں نہیں ہیں۔“ چند لمحوں بعد ہی ستارہ تقریباً بھاگتے ہوئے کچن میں آ گئی تھی۔ صابرہ کے ہاتھ میں چائے کا برتن تھا۔ جو اس کے ہاتھ سے چھوٹے چھوٹے بچا۔ وہ تو اندھیرے سے اٹھی بیٹھی تھی۔ برہان اس کے سامنے سے گزرے بغیر کیسے جاسکتا تھا۔ اس نے آنکھیں پھاڑ کر ستارہ کی طرف دیکھا۔

”ارے بیٹا وہ شاید نہار ہا ہوگا۔ تم کمرہ خالی دیکھ کر چلی آئیں۔“

”امی واش روم کا دروازہ پورا کھلا ہوا تھا۔ اوپر بھائی جان نہیں ہیں۔“ صابرہ نے کانپتے ہاتھوں سے چائے کا برتن رکھا اور بڑی مشکل سے اپنے ڈوبتے ہوئے دل کو سنبھالا۔ یہ بہت انہونی بات تھی۔ برہان اسے خدا حافظ کہے بغیر کیسے جاسکتا تھا؟

”میں خود دیکھتی ہوں۔ تم ہر وقت جلدی میں رہتی ہو۔“ وہ پریشانی کی کیفیت میں کچن سے باہر نکل گئی اور بڑی تیزی سے جابر علی کے سامنے سے گزرتی۔

جابر علی نے جاتی ہوئی صابرہ کی طرف گردن موڑ کر دیکھا تھا اور ایک بڑی تلخ مسکراہٹ اس کی طرف روانہ کی تھی۔

صابرہ نے برہان کے کمرے میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے ہاتھ روم میں جھانکا، ہاتھ روم تو واقعی خالی تھا۔ وہ بدحواس سی ہو کر چاروں طرف کمرے میں نظر دوڑانے لگی۔

برہان اپنے کمرے کے علاوہ کہاں جاسکتا تھا۔ زیادہ سے زیادہ شینہ اور ستارہ کے کمرے میں لیکن ستارہ تو خود اپنے کمرے سے تھوڑی دیر پہلے باہر آئی تھی اگر وہ اس کے کمرے میں ہوتا تو وہ اسے بتاتی کہ برہان اس کے کمرے میں ہے لیکن وہ تو اس کی آواز سنتے ہی اوپر دوڑ گئی تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ ستارہ کو بھی نہیں پتا کہ وہ کس



”امی بھائی جان کا موہا بل تو آف ہے۔“ ستارہ نے فکر مند سی ہو کر ماں کی طرف دیکھا۔

”ہائے میں مر گئی۔ کہاں ہے میرا بچہ.....“ صابرہ نے دو ہنر سینے پر مارے۔

جابر علی نے گھر سے باہر جانے کے لیے قدم بڑھا دیے تھے۔ صابرہ کی آواز سنی تو وہیں سے آواز لگائی۔

”لو کیوں اپنی ماں کو ٹھنڈا پانی پلاؤ، ایسا نہ ہو بیٹے غم میں آج ہی دنیا سے رخصت ہو جائے۔“ یہ کہہ کر

وہ گیٹ پار کر گیا تھا۔ ستارہ، شبینہ اور صابرہ نے گیٹ کھلنے اور بند ہونے کی آواز سنی۔ جیسے رکی ہوئی سانسیں اپنے سینے سے خارج کیں۔

”امی آپ پریشان نہ ہوں، بھائی جان اتنے غیر ذمے دار نہیں ہیں، ہو سکتا ہے ان کے فون میں بیٹری ختم

ہو گئی ہو کیونکہ جب بیٹری ختم ہو جاتی ہے تو فون خود بخود آف ہو جاتا ہے۔ آپ تھوڑی ہمت سے کام لیں، بھائی

جان آپ کو خود فون کریں گے۔“

صابرہ کے پاس شبینہ کی بات کا جیسے کوئی جواب نہیں تھا۔ اسے تو اندیشے اور وسوسوں نے اس بری طرح

سے گھیر لیا کہ جیسے وہ کسی کھنچے جنگل میں راستہ بھٹک گئی ہو اور اب اس اندھیرے جنگل سے نکلنے کے لیے دیوانہ وار

ادھر ادھر دوڑ رہی تھی۔

☆☆☆

برہان ایک ستے سے خستہ حال ہوٹل میں بیٹھنا تاشا کر رہا تھا۔ اس کے چہرے پر دکھ کے سائے بھی تھے

اور گہری سوچ کا عکس بھی..... وہ سوچ رہا تھا۔ ”امی کو بتا کر نکلتا تو ابھی اس گھر سے نہ نکل پاتا۔ جب میں اپنی

بہنوں کے لیے کچھ کہیں سکتا تو مجھے ان کے سامنے رہنے کا کوئی حق بھی نہیں ہے اور میں جانتا ہوں کہ ابا جان

کے فیصلے کو بدلنے کے لیے قوت میرے پاس نہیں..... زیادہ مزاحمت کرتا تب بھی یہی ہوتا تھا، آخر کار گھر سے تو

نکلنا تھا۔“ اس نے چائے کے دھبوں سے آٹے ہوئے کپ پر نظریں جمادیں، اب اسے سوچنا تھا کہ اسے کس

راستے پر چلنا ہے اور منزل کہاں ہے۔

☆☆☆

گل جان بڑی بے قراری سے اسپتال کے کارڈور میں ٹہل رہی تھی۔ مہر جان کو ابھی تک ہوش نہیں آیا

تھا۔ ڈاکٹر زبیری کہہ رہے تھے کہ ان کے دماغ کی کوئی ٹس پھٹ گئی ہے اور خون جم گیا ہے۔ انہیں برین ہیمرج

ہوا ہے، صورت حال بہت نازک اور خطرناک تھی۔ اسی لیے گل جان ایک سکیئنڈ کے لیے بھی کرسی پر بیٹھ نہیں

پارہی تھی۔ مسلسل کھڑے کھڑے اور ٹپٹے ٹپٹے اس کے پاؤں سن ہو کر بے جان ہو رہے تھے۔ اصل خان اسے

سامنے سے آتا دکھائی دیا تو وہ بھاگ کر اس کے قریب گئی۔

”وہ رپورٹ آگئی؟ کچھ اور برپورٹ بھی تو آتا نہیں ناں.....!“

”نہیں بس ٹی اسکیئن کی رپورٹ آگئی ہے۔ وہی کافی ہے۔ آپریشن ہی ہوگا۔“

”آپریشن!“ گل جان نے دہل کر اصل خان کی طرف دیکھا۔ ”میں نے سنا ہے کہ دماغ کے آپریشن

میں بہت خطرہ ہوتا ہے، بہت نازک آپریشن ہوتا ہے۔“

”جی گل جان بی بی..... میں نے کبھی یہی سنا ہے لیکن اس آپریشن کے بعد بے پناہ لوگ دوبارہ سے زندگی

کی دوڑ میں شامل ہو جاتے ہیں، اچھے ہو جاتے ہیں۔ آپ اللہ سے اچھی امید رکھیں۔“ یہ کہہ کر اس نے آئی سی

یو کی طرف قدم بڑھا دیے۔



”کیا کہہ رہی ہو بیٹا.....؟ رابی کہاں چلی گئی ہے؟ بتا کر تو گئی ہوگی ناں؟“ وہ بہ مشکل اتنا ہی کہہ سکے۔  
 ”دادا جان اگر بتا کر جاتی تو اماں کی یہ حالت کیوں ہوتی۔ سارا مسئلہ یہی ہے۔ میں نے کاناز کو تو بتا دیا تھا اور اسے کہا تھا کہ وہ آپ کو نہ بتائے کیونکہ آپ بھی تو بوڑھے ہیں ناں اور آپ کی اسنجو پلاٹی بھی ہو چکی ہے..... تو کاناز نے اس وجہ سے آپ کو نہیں بتایا ہوگا۔“

شاہ عالم نے حیرت سے رومانی طرف دیکھا ان کے لیے یہ بڑی حیرت انگیز بات تھی کہ کاناز ان سے اتنی بڑی خیر چھپا گئی۔ اس کے پیٹ میں تو کچھ رکنا ہی نہیں ہے۔ البتہ انہیں یاد آ رہا تھا کہ صبح وہ بہت چپ، چپ تھی اور ناشتا بھی اس نے برائے نام کیا تھا..... انہوں نے پوچھا بھی تھا لیکن وہ ٹال مٹول کے انداز میں جواب دے کر کانچ چلی گئی تھی۔

”یہ تو بہت بڑا حادثہ ہے، شاید ہی اس سے بڑا کوئی حادثہ ہوتا ہوگا۔ جب بیٹی بغیر بتائے گھر کی دہلیز پھلا گئی ہے تو یہ حادثہ موت سے بڑا حادثہ ہوتا ہے۔ حد ہوگئی..... ڈاکٹر صاحبہ کتنی ہی مضبوط اور ذمے دار..... یہی انسان بھی ہیں اور ایک عورت بھی اور پھر تنہا عورت..... میں نے تو آج تک آپ کے گھر میں کسی مرد درشتے دار کو نہ آتے دیکھا نہ جاتے۔“

”دادا جان ہمارا..... تو کوئی ہے ہی نہیں تو ہمارے گھر کون آئے گا؟“ رومانے بڑی برجستگی اور بے ساختگی سے کہا تھا۔

شاہ عالم رومانی مصومیت پر دیکھتے ہی رہ گئے۔ کچھ ایسے سوالات ذہن میں ابھرے تھے جو وہ سمجھتے تھے کہ رومانے کیے جا میں تو بہت معیوب بات ہوگی۔ انہوں نے ایک طویل سانس اپنے سینے سے آزاد کی اور اپنے دکھ کو ضبط کرتے ہوئے رومانے کو بایا ہوئے۔

”بیٹا جب ہم کسی حادثے کے بعد زندہ نظر آتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ حادثہ ہماری قوت سے بڑا نہیں۔ ہمیں اس موقع پر اللہ سے رحم کی بھیک مانگنی چاہیے۔ خدا کرے کوئی معجزہ ہو جائے اور بات سن لیں۔“ وہ بڑی دلسواری سے خود کلامی کی کیفیت میں کہہ رہے تھے۔ رومانے تو بیٹھے بٹھائے ان سے سکون اور چین کی بچی کھچی گھریاں بھی چھین لی تھیں۔ ان کا بوڑھا ذہن تو برف ہو رہا تھا۔ ساکن و جامد۔

☆☆☆

رابی شام ہونے سے ذرا پہلے ہوٹل سے باہر آئی تھی۔ اس کا رخ مری کے پنڈی پوائنٹ کی طرف تھا۔ دور، دور تک لوگوں کا جم غفیر نظر آ رہا تھا۔ ٹولیوں، گروپوں میں بکھرے ہوئے لوگ یوں نظر آ رہے تھے جیسے یہاں آنے کے بعد ان کی ساری فکریں ٹپکے پھیلنے لگتی با دلوں کے ساتھ ہی اڑ گئی ہوں۔ وہ بے سوچے سمجھے سیدھی روڈ پر چلتی چلی جا رہی تھی۔ دائیں بائیں مختلف اشیا فروخت کرنے والے پتھارے لگائے بیٹھے تھے۔ کوئی خالص شہد لیے بیٹھا تھا کسی کے پاس ہاتھوں کے رنگین پتھریں، نوکریاں اور چھائیں تھیں کوئی طوطے سے فال نکال رہا تھا۔ کہیں کوئی شکرے کو کندھے پر بٹھا کر تصویریں کھینچ رہا تھا۔ ایک عجیب گہما گہمی تھی۔ چاروں طرف لوگ مست و مگن نظر آ رہے تھے۔ رابی چلتے چلتے نسبتاً ایک ڈھلوانی جگہ پر پہنچ گئی جہاں جگہ جگہ بے ترتیب گھاس اگی ہوئی تھی۔ وہاں اس نے ایک ضعیف عورت کو چادر بچھا کر کچھ شفا کی شاہکار لیے بیٹھے دیکھا۔ بڑھیا کے پاس مٹی کے برتن ہاتھ کے پتھرے شیشے کے کام کے خوب صورت بیگ، بچوں کے کھلونے وغیرہ نظر آ رہے تھے۔

رابی کو جانے اس ضعیف عورت میں کیا نظر آیا تھا کہ وہ کشاں، کشاں اس کی طرف کھنچی چلی آئی تھی۔

گل جان اپنی جگہ بے حس و حرکت کھڑی رہ گئی۔ دماغ تو جیسے اس کا ساتھ چھوڑ چکا تھا۔ سامنے کوئی رنگ کوئی منظر نہیں تھا۔ یہاں سے لے کر وہاں تک تاریکی کی چادر تن گئی تھی۔

☆☆☆

روما، شاہ عالم کے پہلو میں بیٹھی پچکیاں لے لے کر رو رہی تھی۔ شاہ عالم کا ہاتھ اس کے سر پر تھا اور چہرے پر انتہائی دکھ کے تاثرات۔

”بیٹا گھر میں کوئی تو ایسی بات ہوئی ہوگی۔ جس کا ان کے ذہن پر بہت برا اثر پڑا ہے۔ یہ برین ہیمریج وغیرہ اتنی آسانی سے نہیں ہوتا۔ یہ ایک ایسا حملہ ہوتا ہے جس کے سامنے بعض اوقات انسان بے بس ہو جاتا ہے۔ جو اس کی برداشت سے بہت زیادہ ہوتا ہے اور انسان کے حواس ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔“

رومانے پچکیاں لیتے ہوئے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر وہ صرف دادا جان، دادا جان کر کے ہی رہ گئی۔ شاہ عالم نے بڑی ہمدردی سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ رومانہیں بہت عزیز بیٹی کیونکہ رومانہیں ان کی پوتی کی جان انکی رہتی تھی۔

”بیٹا اب بس کر دو، اس طرح سے نہیں روتے اور نا امید کی کو کفر کہا گیا ہے۔ حالات کیسے بھی ہوں ہمت سے کام لینا چاہیے۔ انشاء اللہ تعالیٰ آپ کی اماں جان بالکل ٹھیک ہو کر اپنے پاؤں سے چلتی ہوئی گھر واپس آئیں گی۔“ ان کے لہجے میں یقین کی وہ کیفیت تھی جو انہوں نے لہجے بھر میں رومانے کو وجود میں منتقل کر دی تھی۔  
 ”دادا جان سچ بتائیں برین ہیمریج ہونے والے کو کوئی خطرہ تو نہیں ہوتا۔ میرا مطلب یہ ہے وہ..... سر وائیو survive تو کر جاتے ہیں ناں؟“ رومانے جلدی سے آنسو پونچھے اور پھینکی، ٹھیک آنکھوں سے شاہ عالم کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”ارے بیٹا یہ تو اب معمول کی بات ہوگئی ہے۔ ڈاکٹر تو اسے اب کوئی کام ہی نہیں سمجھتے۔ ہاں پرانے وقتوں میں کیونکہ میڈیکل نے ترقی نہیں کی تھی اور وسائل بھی محدود تھے۔ تب یہ چھوٹے چھوٹے حادثے بڑے حادثے بن جاتے تھے۔“ انہوں نے بہت محبت بھری نظروں سے رومانے کے چہرے کی طرف دیکھا تھا۔ وہ قوت یقین کے بل بوتے پر رومانے کو اندر امید کے بے شمار چراغ روشن کرنا چاہ رہے تھے۔

”دادا جان، اماں جان بہت غصہ کرتی ہیں، ہمیں ڈانٹتی ہیں، سب کچھ کرتی ہیں، انہوں نے ہمیں سب کچھ دیا بھی تو ہے۔ کسی چیز کی کمی محسوس نہیں ہونے دی..... حتیٰ کے باپ کی بھی نہیں۔“ وہ سسکیاں لیتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

”میں جانتا ہوں بیٹا تمہاری ماں خاتون آہن ہیں، مردوں کے لیے لفظ جواں مردی استعمال ہوتا ہے، میں تمہاری ماں کے لیے یہ لفظ استعمال کرتا ہوں۔ آفرین ہے ڈاکٹر صاحبہ پر کتنا بڑا اسپتال چلا رہی ہیں اور پورے گھر کی ذمے داریاں ان کے کندھوں پر ہیں..... بہر حال کوئی نہ کوئی ایسی بات ہوئی ہے جس سے انہیں بہت صدمہ پہنچا..... ورنہ اتنی باہمت خاتون اس طرح سے گرنے والی نہیں۔“ رومانے اب کسی حد تک اپنے حواس کنٹرول کر لیے تھے۔ اور کچھ شاہ عالم کی قوت یقین نے اس کے اندر توانائی بھر دی تھی اب اس کے اپنے ذہن نے کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس نے چوری، چوری شاہ عالم کی طرف دیکھا اور بہت جھجکتے ہوئے بولی۔  
 ”دادا جان.....! وہ رابی آپا ناں..... گھر سے چلی گئی ہیں تو شاید اس وجہ سے اماں جان کو شاک لگا ہے۔“  
 رومانے بڑے عام سے انداز میں بہت بڑا دھماکا کیا تھا..... وہ تو اس کی طرف آنکھیں پھاڑ کر دیکھتے ہی رہ گئے۔



”جھوٹی؟“ رابی کی بات سن کر بڑھیا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔  
 ”بیٹا زمین پر چادر بچھا کر یہ چیزیں بیچ رہی ہوں، تمہارا کیا خیال ہے میں کس محل میں رہتی ہوں گی۔“  
 ”نہیں، نہیں اماں میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ میرا مطلب تھا یہاں تو بڑا خراب موسم ہوتا ہے، آپ کو تو بڑا مسئلہ ہوتا ہوگا۔“ اس نے جلدی سے وضاحت کی۔  
 ”نہیں بیٹا، مجھے کوئی مسئلہ نہیں ہوتا کیونکہ میں نے پیسے جمع کر کے اپنا گھر کچا کچا کر لیا، اب بارش آندھی سے بچت ہوگئی ہے، ہاں پہلے ذرا سی بارش سے سارے گھر میں پانی پانی نظر آتا تھا۔“ بڑھیا نے جواب دیا۔  
 ”اماں تم کب سے اکیلی ہو اور تم نے یہ گھر اور سب کچھ اکیلے ہی بنایا ہے؟“  
 ”نہیں بیٹا! شوہر میرا، چچی جھوٹی تو اسی نے بنا کر دی تھی بعد میں میں نے محنت مشقت کر کے گھر کچا کر لیا۔“  
 ”تو کیا آپ اب بالکل اکیلی ہیں؟“ رابی پتا نہیں کیوں سوال پر سوال کیے جا رہی تھی۔ ایک کمزور تنہا بوڑھی عورت اسے انجانے میں بہت حوصلہ بخش رہی تھی۔

”بیٹا اب تو شام ڈھل رہی ہے، تم اکیلی جوان جہاں لڑکی ادھر ادھر گھوم رہی ہو، ادھر طرح طرح کے لوگ گھومتے ہیں تمہارا اپنا گھما کا کہاں ہے؟“ رابی بڑھیا کے سوال پر چونک پڑی اور زمین سے اٹھ کھڑی ہوئی۔  
 ”اماں یہ تو کم دوسروں پر بلکہ ایسا کرو یہ دوپٹے دے دو اور پانچ سو روپے لے لو۔“ رابی نے خواہ خواہ ہی بڑھیا سے دوپٹے لے لیے۔ اسے بھلا پنکھوں کی کیا ضرورت تھی اور اس کا کون سا گھر تھا۔ جہاں وہ یہ ڈیکوریشن پس کے طور پر ہی سجالیتی۔ بڑھیا کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں اس نے لپک کر پانچ سو کا نوٹ پکڑا اور بولی۔  
 ”بیٹی بہت بڑا دل ہے تمہارا پیسہ تو بہت سوں کے پاس ہوتا ہے لیکن اللہ دل کی کوئی کو دیتا ہے۔ میں تم سے فالتو میں منافع نہیں لوں گی۔“ لویہ پکڑا اپنے باقی کے پیسے۔ بڑھیا نے بڑی زبردست خودداری کا مظاہرہ کیا تھا۔  
 ایک ان پڑھ بوڑھی ضعیف عورت، رابی کو پتا نہیں کیوں اتنا متاثر کر رہی تھی۔ وہ اس کی طرف کئی لمحے دیکھتی رہی۔ یوں جیسے اس کا ذہن کہیں دور چلا گیا ہو، کتنی خوش قسمت ہے یہ عورت..... جبر اور دباؤ سے دور مل خود مختاری کی زندگی..... یہ تو دنیا ہی میں جنت میں رہتی ہے۔ رابی نے سوچا اور قدم بڑھانے لگی۔ بڑھیا نے پھر اسے ٹوکا۔  
 ”بیٹا یہ اپنا سو کا نوٹ پکڑو۔“ رابی اس سے کئی گز کے فاصلے پر پہنچ چکی تھی۔ اس نے بڑھیا کی طرف مڑ کر دیکھا اور بولی۔

”اماں میں نے کہا ناں یہ تم رکھ لو، یہ کچھ تمہارا آج کا منافع ہے۔ میں کل پھر آؤں گی تمہارے پاس۔“  
 رابی یہ کہہ کر اس راستے پر چل پڑی جو اسے ہول کی طرف لے جا رہا تھا۔  
 بڑھیا حیرت کی تصویر بنی اس کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔

☆☆☆

صابرہ کا رورو کر برا حال ہو رہا تھا۔ شبینہ اور ستارہ اسے سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ اُن کے چہروں پر ایسی بے بسی نظر آرہی تھی جیسے وہ اس بات سے مایوس ہوں کہ وہ ماں کو سنبھال لیں گی۔ صابرہ کبھی لپٹتی تھی کبھی اٹھ کر بیٹھ جاتی اور پاٹلوں کی طرح ہڈیاں انداز میں بولنا شروع کر دیتی تھی۔  
 ”وہ مجھے بتاے بغیر کبھی گھر سے نہیں گیا..... وہ پانچ منٹ کے لیے بھی گھر سے جاتا ہے تو مجھے بتا کر جاتا ہے۔ مجھے..... مجھے اس کے پاس لے کر جاؤ، مجھے اس کے پاس لے کر جاؤ، ورنہ میں مرنے لگی۔ اپنے باپ کو فون کرو، ارے وہ پولیس کے محکمے میں ہے کس دن کام آئے گا تمہارا یہ محکمہ، اپنے باپ کو فون کر کے کہو

بڑھیا اب تک کی ہونے والی سب گن رہی تھی۔ ہاتھ میں کچھ نوٹ تھے اور چادر پر کافی سارے سکے۔  
 ”اماں یہ کچھ کتنے کا دے رہی ہو، ویسے آج کل تمہارے پیسے تو بہت پکٹتے ہوں گے، لوڈ شیڈنگ جواتی ہو رہی ہے۔“  
 ”دوسروں کے کا۔“ بڑھیا نے جواب دے کام میں بے انتہا مستغرق تھی، چونک کر سر اٹھایا پھر بڑی بے نیازی سے بولی۔

”اتنا ہنگامہ؟“ رابی نے آنکھیں پھیلا کر کہا۔  
 بڑھیا نے دور پہلے ہوئے پکٹے ہاتھ بڑھا کر قریب کر لیے یوں جیسے اسے یہ خطرہ ہو کہ رابی کوئی پکھا بغیر قیمت دیے اٹھا کر بھاگ جائے گی۔

”میں تو بہت سے دیتی ہوں، آپ ادھر ادھر گھوم کر دیکھ لو۔ اس سے کم پیسوں کا ملے تو مجھ سے آکر کہنا، میں زیادہ منافع نہیں لیتی اس پکٹے پر مجھے دس ہندو روپے ملیں گے۔ لیٹا ہے لو ورنہ راستہ دیکھو۔“ بڑھیا نے دکانداروں والی مصنوعی خوش اخلاقی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا بلکہ ایک طرح سے پتھر پھوڑے تھے۔  
 رابی دوسری چیزیں اٹھا اٹھا کر دیکھنے لگی تھی۔ اسے ان چیزوں سے دلچسپی نہیں تھی۔ اس کے چہرے سے لگتا تھا کہ وہ کچھ اور سوچ رہی ہے۔ بڑھیا نے دیکھا کہ اس کی گاہک تو اس کی چھاؤں کی طرح اسی طرح سے بلکہ بڑی تسلی سے بیٹھی ہے اس نے خود بخود اپنے لمحے میں نری پیدا کر لی۔  
 ”بیٹا جو بھی چیز لوگی بہت مناسب دام لگیں گے۔ میں اپنے روز کا خرچہ نکالتی ہوں، میں نے کون سا بینکوں میں مال جمع کرنا ہے۔ آج مری کل دوسرا دن.....“

”اماں تم بہت خوش قسمت ہو، تمہیں تو مزید جیسے کی فکر ہی نہیں اور نہ سرمایہ ختم ہونے کی۔“ رابی نے بڑھیا کی طرف بڑی ستائش بھری نظروں سے دیکھا۔ بڑھیا رابی کی بات سن کر مسکرا دی۔ جیسے اسے رابی کی بات بہت اچھی لگی ہو۔

”بیٹا اکیلی گھوم رہی ہو، ماں، باپ کے ساتھ آئی ہو یا بال بچوں کے ساتھ؟“  
 رابی ایک دم گڑبڑا گئی مگر اس نے فوراً ہی خود کو سنبھال لیا تھا۔ ”اماں اکیلا ہی سمجھیں۔ میرا دنیا میں کوئی ہے ہی نہیں۔“ رابی کی بات سن کر بڑھیا نے یوں سر اٹھا کر رابی کی طرف دیکھا جیسے اس نے وہاں بیٹھے بیٹھے بم پھوڑ دیا ہو۔

وہ رابی کو بہت حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ وہ ایک خوب صورت جوان لڑکی جو دیکھنے سے لگتا تھا کہ کسی بہت امیر خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔

”کوئی نہیں ہے.....؟ ایسا کیسے ہو سکتا ہے بیٹا ماں، باپ نہیں رہتے تو دنیا میں اور بھی رشتے ہوتے ہیں، چچا، تایا پھوپھی، ماموں کوئی تو ہو گا ناں!“

”کوئی نہیں ہے اماں یقین کرو۔“ رابی کے اس جواب پر بڑھیا نے پھر فکر مندی سے اس کی طرف دیکھا تھا۔ اس کے حلق سے نیچے یہ بات اتر نہیں رہی تھی مگر جڑی ہو کر رہ گئی اور خود کو مزید سوال کرنے سے روک لیا۔  
 ”اماں تم کہاں رہتی ہو؟“ اس نے بڑھیا کی گم سمی کیفیت دیکھ کر کئی بات شروع کر دی۔

”بیٹا زیادہ دور نہیں رہتی۔ یہ سانسے پھاڑی پر گھر نظر آ رہے ہیں ناں وہیں پر میری جھوٹی پڑی ہے۔“ بڑھیا نے ایک گہری سانس لے کر گہری نظروں سے رابی کی طرف دیکھا اور کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔



یہ ہے کہ دوسروں کے معاملات میں دخل نہ دینا اور خواہش یہ کہ دوسرے بھی میرے ذاتی معاملات میں دخل نہ دیں۔ 90ء سے لکھنا شروع کیا اور مختلف ڈائجسٹوں میں شائع ہوتی رہی ہوں اور اب پاکیزہ کی اتنی تحریف سنی ہے کہ اب اس میں بھی آغاز کر رہی ہوں اور اس تعارف سے ہی میرا آغاز ہو رہا ہے، میں آزاد نظمیں لکھتی ہوں، کہانیاں ملتان کے اخبار سنگ میل میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ مجھے غصہ بہت کم آتا ہے، غصے کی حالت میں خاموش رہتی ہوں اور خود کو مصروف رکھتی ہوں، دوسری صورت میں، میں بولتی ہوں اور دوسروں کو خاموش رہنا پڑتا ہے، میں اکثر لوگوں کی زیادتیاں بھول جاتی ہوں۔ گھر میں مجھے بلو کہا جاتا ہے، مادری زبان سرائیکی ہے، عزیز ترین ہستی ایک تو چھوٹی بہن اور میری بیٹی پاکیزہ کوئی مجھے کچھ کہہ دے تو اسے شاید معاف کر دوں لیکن اگر کوئی میری بہن یا بیٹی کے متعلق کچھ کہے تو میں بہت مشکل ہے کہ اسے معاف کروں۔

کاجل شاہ، ملتان

تو اس کی یہ بدزبانی برداشت کرنے والا کوئی نہیں ہوگا۔ ماں سے بڑا دل کسی کا نہیں ہوتا اور ماں کے سوا اتنی باتیں کوئی سن بھی نہیں سکتا۔ یہ دنیا بڑی بے مروت ہے، ذرا لحاظ نہیں کرتی۔“ صابرہ نے شبینہ کی طرف دیکھا اور بڑی بے بسی کی کیفیت میں بولی۔

”امی آپ تو سمجھتی ہیں ناں کہ آپ ہمارے لیے کتنی ضروری ہیں، خدا نخواستہ آپ کو کچھ ہو گیا تو ہمارا کیا بنے گا۔ آپ خود کو سنبھالیں میرا دل کہتا ہے بھائی جان آپ کو تھوڑی دیر میں ضرور فون کریں گے۔ انہیں خود بھی احساس ہو رہا ہوگا۔ انہیں اندازہ ہوگا کہ اس وقت آپ کتنی تکلیف سے گزر رہی ہوں گی۔“ شبینہ نے صابرہ کا ہاتھ پکڑا اور اپنے گال سے لگاتے ہوئے بڑے پیار سے بولی۔

”بیٹا اسی بات کا تو دکھ ہے کہ رات سے اگر گیا ہوا ہے تو اب تک اسے ماں کا خیال نہیں آیا۔ اسے احساس نہیں ہوا کہ جس ماں کو ادھر چھوڑ کر آیا ہوں وہ جیتے جی مرجائے گی۔ اتنا سنگدل تو میرا بچہ نہیں ہے۔ مجھے تو طرح، طرح کے وہم آ رہے ہیں۔ مجھے خدا کے واسطے..... خدا کے واسطے مجھے اس کی آواز تو سنا دو..... اس کا نمبر ملاؤ کیا پتا اب اس نے بیٹری چارج کر لی ہو، دیکھو ہو سکتا ہے اس وقت اس کا فون کام کر رہا ہو، جلدی کرو۔“

”امی آپ یقینی رہیں، میں دیکھتی ہوں اگر بھائی نے فون اینڈ کر لیا تو میں آپ کو بلا لوں گی۔ آپ بس آرام کریں۔“ شبینہ اپنی جگہ سے اٹھی اور بہت زیادہ فکر مند نظروں سے ماں کو دیکھتے ہوئے باہر نکل گئی تھی۔

☆☆☆

جابر علی، ایس پی کے کمرے میں بیٹھا ہوا چائے پی رہا تھا۔ ایس پی کے چہرے پر پورے اطمینان کی کیفیت تھی۔ جیسے اسے اپنی کامیابی پر یقین ہو رہا ہو۔

”وہ سر آپ سے ایک ریکویسٹ ہے، جابر علی چائے کے گھونٹ بھر رہا تھا سوچ رہا تھا سوچتے سوچتے اس نے اپنا سر اٹھا کر ایس پی کی طرف دیکھا اور پچھتاوتے ہوئے گویا ہوا۔

”بولو، بولو، جابر علی۔ ہمارے اور تمہارے درمیان کچھ تکلف ہے؟ ایسی کیا بات ہے جو پچھلتے ہوئے بول رہے ہو۔“ ایس پی جو بڑی گہری نظروں سے اس کے تاثرات جانچ رہا تھا۔ جلدی سے بولا۔ بلکہ ایس پی نے جابر علی کا ایک طرح سے حوصلہ بڑھایا۔

”سر میں ایک تنخواہ دار آدمی ہوں اور ابھی تک بچوں کی شادی کے لیے کچھ نہیں جوڑ پایا۔“

مجھ سے ملیے

میرا نام کاجل شاہ ہے، میرا جنم دن سات جولائی ہے۔ میں نے ایف اے تک تعلیم حاصل کی۔ اس کے ساتھ عربی ٹیچر ٹینک کورس کیا ہے۔ شادی سے پہلے دو سال تک ملتان کے ایک پرائیویٹ اسکول میں ٹیچنگ کی پھر شادی کے بعد ملازمت چھوڑ دی۔ میرے مشاغل میں اچھی کتابیں پڑھنا، تصویروں بنانا یعنی مصوری، کہانیاں لکھنا، مختلف اشارز کے بارے میں جاننا، ہاتھ کی ریکھاؤں کے بارے میں معلومات رکھنا، ڈیکوریشن پیش بنانا شامل ہیں۔ ہنر میں سلائی، کڑھائی، بُنائی، کٹائی، صفائی کھانا بنانا اور گھر کے دوسرے کام وغیرہ میں نے دیوانگی کی حد تک گلاب، موتیا اور خوشبو میں کچے آگن کی مٹی کے علاوہ کسی بھی چیز کی خوشبو کو محسوس نہیں کیا۔ پسندیدہ لباس ساڑی اور شلوار قمیض ہیں، موسم مجھے خزاں کا پسند ہے۔ پسندیدہ شہر اپنا ملتان ہے۔ میری زندگی کا خوب صورت ترین لمحہ جب میں پہلی مرتبہ براڈ کاسٹنگ ہاؤس، ملتان گئی، میری ایک خواہش ہے کہ میرے بال بہت لمبے ہوتے۔ اپنی پسندیدہ عادت

میرے بچے کو ڈھونڈ کر لاؤ۔ ورنہ میں جان دے دوں گی شبینہ۔“

”امی بات تو سنیں، بھائی کوئی چھوٹے سے بچے تو نہیں ہیں۔ ماشاء اللہ جوان ہیں، اپنے لیے بہت کچھ کر سکتے ہیں اور وہ ان پڑھ جاہل بھی نہیں ہیں۔ آپ کیوں اتنی ٹینشن لے رہی ہیں۔“

شبینہ جیسے بولتے بولتے رو دی۔

”بیٹا اس نے تو گھر سے نکل کر ماں کو فون تک نہیں کیا۔ ارے میرا تو دل بیٹھا جا رہا ہے۔ خدا نخواستہ کچھ ہونہ گیا ہو ورنہ وہ فون تو کرتا ضرور..... دیکھو موبائل تو اس کے پاس ہوتا ہے۔ بتا کر نہیں گیا بعد میں فون کر دیتا۔ بتاؤ دیتا وہ ہے کہاں۔ مجھے ایک پل چٹکن نہیں آ رہا۔ میرا جی چاہ رہا ہے کہ میں ننگے پاؤں، ننگے سر اس گھر سے نکل جاؤں، ارے کس کام کی ایسی زندگی کہ اولاد کی شکل کو ترقی نہ رہوں۔“

ستارہ نے ایک دم ماں کے ہاتھ تھام لیے اور بہت محبت سے ہاتھ پر بوسہ دیا۔

”امی خود کو سمجھنا بہت مشکل ہوتا ہے اور اچھا ہوا بھائی چلے گئے یہاں سے۔ یہاں تو صبح، دوپہر، شام صرف ظلم کی کہانی ہے، وہ اس ماحول سے دور رہیں گے تو کچھ کر کے دکھائی دیں گے۔“ صابرہ ایک دم اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ اس نے ٹیچر مارنے کے انداز میں ہاتھ اٹھا کر ستارہ کو گھورا تھا۔

”تیری اس زبان نے گھر میں آگ لگا دی ہے۔ خاموش ہو جا، بالکل باپ پر گئی ہے کچھ نہیں سوچتی بولتے ہوئے۔“ ستارہ احتیاط کے ضمن میں ماں کے قریب سے اٹھ گئی کہ نہیں واقعی صابرہ اس کے ٹیچر ہی رسید نہ کر دے مگر وہ بولنے سے باز نہیں آئی۔

”امی، بچہ باپ پر پی جاتا ہے، ظاہری بات ہے ماں پر چائے گایا باپ پر پی جائے گا۔“

”ستارہ تم یہاں سے چلی جاؤ، دیکھ رہی ہو کہ امی کی حالت کتنی خراب ہے پھر بھی بولے چلے جا رہی ہو بولے جا رہی ہو۔“ شبینہ، ستارہ کی بات سن کر اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئی اور بڑی بے بسی کی کیفیت میں بولی۔ ستارہ نے غصے بھری نظروں سے شبینہ کی طرف دیکھا اور باہر جانے کے لیے قدم بڑھا دیے۔ جاتے ہوئے بھی وہ بڑبڑا رہی تھی۔

”سب کو غصہ آ رہا ہے، سب اپنا اپنا غصہ اتار رہے ہیں، میں اپنا غصہ اتارتی ہوں تو یہ غیر قانونی ہو جاتا ہے۔ جیسے باقی تو سب قانون کے دائرے میں رہتے ہوئے کام کر رہے ہیں۔“

”بیٹا اس لڑکی کی وجہ سے آج میرا بیٹا گھر سے بے گھر ہو گیا، دیکھو تم اسے سمجھا لو، اس کو بتا دو کہ ماں مر گئی



”اچھا تم اس وجہ سے فکرمند ہو، بھی تم نے یہ بات مجھ سے پہلے کیوں نہیں کر ڈالی۔ وارث علی کو تمہارے گھر کی کسی چیز سے دلچسپی نہیں ہے، وہ تو تمہارے گھر سے نکالنا بھی پسند نہیں کرے گا۔ ارے اس کا گھر بھرا پڑا ہے، اسے آنے والی کے جھینرے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ تم اتنی نیک کردار بیٹی اسے دے رہے ہو، کوئی بڑے سے بڑا جینز بھی اس بچی کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ جو بندہ اپنی نیک خصلت، نیک کردار بیٹی کی کوڑے دیتا ہے۔ وہ تو سمجھو اپنا خزانہ خالی کر دیتا ہے۔“ ایس بی بی ایک قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔ اس کے قہقہے نے جابر علی کو الجھا سادیا۔ ایس بی بی کی بات سن کر جابر علی نے جیسے ایک سکون کی گہری سانس کھینچی۔ بات بہت مختصر تھی اور اختصار میں ہی اس کے لیے بے پناہ آسانیوں کی خوش خبری تھی۔ وہ جیسے اندر سے جل اٹھا۔ ایک بہت بڑا ابوجھ اس کے سر سے ہر کا تھا۔

”بہت بہت شکریہ، سر آپ نے مجھے بالکل ریلیکس کر دیا ہے۔“

”بھئی تم جینز کی بات کر رہے ہو، اب میری سنو وارث علی مجھ سے کہہ رہا تھا کہ میں تم سے یہ بھی کہہ دوں کہ تم کھانے دانے کے چکر میں بھی مت پڑنا۔ ہم خود کسی ہوٹل میں بندوبست کر لیں گے۔ نکاح گھر پر ہوگا۔ ڈنر کی ہوٹل میں اور وہ بھی نام تمہاری طرف سے ہوگا۔“

جابر علی نے چونک کر سر اٹھایا جیسے اس کی خودداری بلبل کر رہی تھی۔

”سر میں جھوٹے نگیٹوں کے تاج اپنے سر پر سجانا نہیں چاہتا۔ آپ وارث علی سے کہیں کہ وہ ویسے کا ڈنر جدھر مرضی دے۔ بڑے ہوٹل میں دے یا چھوٹے ہوٹل میں دے اس کی مرضی لیکن میں اس کا اتنا بڑا احسان لے کر بیٹی نہیں دے سکتا۔ کچھ تو میری خودداری کا خیال کریں۔ آپ جانتے ہیں کہ اس مجھے میں میری عمر گزر گئی ہے۔ آپ نے کبھی نہیں سنا ہوگا کہ میں نے کبھی کسی سے دس روپے بھی لیے ہوں۔ مجھے تو کوئی یہاں بھی چائے پلا دیتا ہے تو میں چائے کے پیسے خود دے دیتا ہوں۔“ وہ بڑی آہستگی سے گویا ہوا۔

”جی سر انشاء اللہ تعالیٰ آج یہ تمام معاملات طے ہو جائیں گے۔ آپ فکر نہیں کریں۔“

”اوکے چلو پھر اب ہم اپنا، اپنا کام کرتے ہیں..... ٹھیک ہے۔“ جابر علی اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ ایس بی بی کو سیلوٹ کیا اور ایڈریو کے بل دروازے کی سمت گھوم گیا۔ اس کی پیٹھ ہوتے ہی ایس بی بی کے ہونٹوں پر فاختانہ مسکراہٹ ٹھیلنے لگی۔

☆☆☆

شاہ عالم ہنوز روم کے ساتھ اس کے گھر میں موجود تھے۔ کاناز بھی کالج سے آنے کے بعد وہیں چلی آئی تھی۔ وہ اپنی سہیلی کے غم پر اس سے زیادہ نڈھال نظر آرہی تھی لگتا تھا کہ وہ رو دے گی۔

روما کو تو پہلے ہی رورو کر برا حال ہو رہا تھا۔ دو حادثے کے بعد دیگرے اس گھر پر قیامت بن کر ٹوٹے تھے۔ رانی کا بغیر بنائے گھر سے چلے جانا اور پھر اس کے بعد ڈاکٹر مہر جان کا کوڑے میں چلے جانا۔ وہ تو محسوس کر رہی تھی جیسے کسی اجنبی جگہ پر تنہا کھڑی ہو اور گھر تک جانے والا راستہ سمجھ نہیں آ رہا ہو۔ شاہ عالم اور کاناز اسے بڑی ہمدردی سے سنبھالنے کی مسلسل کوشش کر رہے تھے۔

”روما دیکھو، رونے سے کچھ نہیں ہوگا تمہارے رونے کی وجہ سے میرا دل چاہ رہا ہے بس میں بھی رونا شروع کر دوں۔ رو ما مجھ سے تمہارا رونا دیکھا نہیں جا رہا۔ خدا کے لیے خاموش ہو جاؤ۔“ کاناز اسے گلے سے لگائے چپ کر رہی تھی مگر اس کی ہچکیاں قہقہے کے نہیں دے رہی تھیں۔ اسی وقت پورچ میں کار کے ہارن کی آواز گونجی تھی اور رومانے چونک کر کاناز کے کندھے سے سر اٹھایا۔ اس کی آنکھوں میں خوشی کی چمک لہرائی تھی۔

”مجھے لگتا ہے اماں جان آگئی ہیں۔“ یہ کہہ کر رومانہ دوڑ پورچ کی طرف دوڑی گئی۔

شاہ عالم نے کاناز کی طرف دیکھا مگر اس سے پیشتر کہ وہ کوئی بات کرتے وہ رومانے کی پیچھے سر پٹ بھاگی تھی۔ پورچ میں کھڑی کار سے گل جان اتر رہی تھی۔ رومانے گل جان کی پشت پر دیکھا اسے گل جان کے سوا اور کوئی دکھائی نہیں دیا۔ نہ اصل خان، نہ مہر جان..... وہ بھاگتے ہوئے گل جان کے گلے سے لگ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

”آپ اکیلی کیوں آئی ہیں، اماں کہاں ہیں؟ کیسی طبیعت ہے ان کی؟“ گل جان نے بہت محبت اور نرمی سے رومانے کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

”بیٹا آپ کی اماں جان اسپتال میں ایڈمٹ ہیں، سب لوگ دعا کر رہے ہیں، آپ بھی دعا کریں۔“ وہ

”اچھا تم اس وجہ سے فکرمند ہو، بھی تم نے یہ بات مجھ سے پہلے کیوں نہیں کر ڈالی۔ وارث علی کو تمہارے گھر کی کسی چیز سے دلچسپی نہیں ہے، وہ تو تمہارے گھر سے نکالنا بھی پسند نہیں کرے گا۔ ارے اس کا گھر بھرا پڑا ہے، اسے آنے والی کے جھینرے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ تم اتنی نیک کردار بیٹی اسے دے رہے ہو، کوئی بڑے سے بڑا جینز بھی اس بچی کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ جو بندہ اپنی نیک خصلت، نیک کردار بیٹی کی کوڑے دیتا ہے۔ وہ تو سمجھو اپنا خزانہ خالی کر دیتا ہے۔“ ایس بی بی ایک قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔ اس کے قہقہے نے جابر علی کو الجھا سادیا۔ ایس بی بی کی بات سن کر جابر علی نے جیسے ایک سکون کی گہری سانس کھینچی۔ بات بہت مختصر تھی اور اختصار میں ہی اس کے لیے بے پناہ آسانیوں کی خوش خبری تھی۔ وہ جیسے اندر سے جل اٹھا۔ ایک بہت بڑا ابوجھ اس کے سر سے ہر کا تھا۔

”بہت بہت شکریہ، سر آپ نے مجھے بالکل ریلیکس کر دیا ہے۔“

”بھئی تم جینز کی بات کر رہے ہو، اب میری سنو وارث علی مجھ سے کہہ رہا تھا کہ میں تم سے یہ بھی کہہ دوں کہ تم کھانے دانے کے چکر میں بھی مت پڑنا۔ ہم خود کسی ہوٹل میں بندوبست کر لیں گے۔ نکاح گھر پر ہوگا۔ ڈنر کی ہوٹل میں اور وہ بھی نام تمہاری طرف سے ہوگا۔“

جابر علی نے چونک کر سر اٹھایا جیسے اس کی خودداری بلبل کر رہی تھی۔

”سر میں جھوٹے نگیٹوں کے تاج اپنے سر پر سجانا نہیں چاہتا۔ آپ وارث علی سے کہیں کہ وہ ویسے کا ڈنر جدھر مرضی دے۔ بڑے ہوٹل میں دے یا چھوٹے ہوٹل میں دے اس کی مرضی لیکن میں اس کا اتنا بڑا احسان لے کر بیٹی نہیں دے سکتا۔ کچھ تو میری خودداری کا خیال کریں۔ آپ جانتے ہیں کہ اس مجھے میں میری عمر گزر گئی ہے۔ آپ نے کبھی نہیں سنا ہوگا کہ میں نے کبھی کسی سے دس روپے بھی لیے ہوں۔ مجھے تو کوئی یہاں بھی چائے پلا دیتا ہے تو میں چائے کے پیسے خود دے دیتا ہوں۔“ وہ بڑی آہستگی سے گویا ہوا۔

”جابر علی میں تمہاری اتنا اور خودداری کو نہیں پہنچاؤں گا۔ تم اطمینان رکھو۔ میں تمہیں پورا جھکے اور جہاں جہاں تم آج تک ٹرانسفر ہو کر گئے ہو وہ سب لوگ تمہاری ایمانداری کو جانتے ہیں اور اس وجہ سے پورا جھکے تمہاری عزت کرتا ہے۔“ ایس بی بی جابر علی کی بات سن کر مسکرا دیا اور اپنے شاعرانہ انداز چھپاتے ہوئے بڑی ہمدردی سے گویا ہوا۔

جابر علی نے انکساری کے انداز میں سر جھکا لیا۔

”تم فکر نہ کرو میں وارث علی سے کہہ دوں گا کہ بھی جابر علی نکاح والے دن شربت پلائے یا ہانی ٹی..... یا اپنے حساب سے کھانا کرے، ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔“

”سر آپ کے تعاون سے اتنا بڑا مرحلہ بہت آسان دکھائی دے رہا ہے، اللہ کرے کہ ایسا ہی ہو، سب کام بخیر و خوبی انجام پا جائیں۔“ جابر علی کے چہرے پر سکون اور خوشی کی کیفیت جھلکنے لگی اس نے چائے کا خالی کپ پرچ میں رکھا اور ایس بی بی کی طرف دیکھ کر مسکرایا جیسے شکر یہ ادا کر رہا ہو۔

ایس بی بی نے بہت دل سے آمین کہا تھا..... جابر علی اٹھنے لگا تو ایس بی بی نے اسے ہاتھ کے اشارے سے بیٹھنے کے لیے کہا۔ جابر علی اٹھتے اٹھتے پھر بیٹھ گیا اور سوالیہ نظروں سے ایس بی بی کی طرف دیکھنے لگا۔

”وہ جابر علی جب ساری باتیں طے ہو چکی ہیں تو نکاح کی تاریخ بھی دے دو۔“

”نکاح کی تاریخ؟“ جابر علی چونک کر ایس بی بی کی شکل دیکھنے لگا۔ ”سر وہ نکاح کی تاریخ تو میں گھر والوں



ایک ٹھنڈی آہ بھر کے بولی۔

کائنات ان کے قریب جا کر کھڑی ہو گئی تھی اور وہ بھی بڑی آس بھری نظروں سے گل جان کی طرف دیکھ رہی تھی لیکن گل جان کے چہرے پر چھائی مایوسی اور تشویش نے اسے ہر اسال کر دیا۔

”خالہ جان کیا اماں جان بے ہوش ہیں، ڈاکٹر زکیا کہہ رہے ہیں، خدا نخواستہ کوئی سیریس بات تو نہیں یہ رابی آپ نے کیا کر دیا، اب..... اب دیکھیں تو سہی کیا ہوگا، اس گھر پر پہلے ہی کوئی سی خوشیاں برس رہی تھیں۔ ہمارے قسمت میں یہی رہ گیا ہے، خالہ جان..... ہم زندگی بھر اسی طرح روتے رہیں گے۔“ یہ کہہ کر رومیا پھونک پھوٹ کر رونے لگی۔ گل جان کی آنکھوں سے بھی آنسو بہنے لگے اگرچہ اس نے چاہا تھا کہ رومیا کے سامنے کمزور نہ پڑے اس کی آنکھیں نہ بھیگیں..... مگر رومیا کی بات سن کر اس کے دل پر زبردست چوٹ پڑی تھی۔ اختیار کھو بیٹی تھی۔ بھرتی ہوئی آواز میں صرف اتنا بولی۔

”بیٹا بارہ برس بعد تو گھوڑی کے دن بھی پھرتے ہیں، یہ کس کتاب میں لکھا ہے کہ جو آج ہے وہ ہمیشہ ہو ایسا رہے گا۔ تم اپنا مقدر لکھوا کر لائی ہو، ضروری نہیں جو رابی کا، میرا تمہاری اماں جان کا مقدر تھا وہ تمہارا بھی ہو، ہر بچہ اپنا نصیب لکھوا کر لاتا ہے۔“ وہ رومیا کو سمجھانے کے انداز میں کہہ رہی تھی۔

”یہ بھی تو ہو سکتا ہے خالہ جان میرا مقدر سب سے زیادہ خراب ہو۔“ رومیا ہچکیاں روک کر بولی۔ گل جان نے دہل کر رومیا کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا..... کائنات آگے بڑھی اور رومیا کو گل جان سے الگ کرنے لگی۔

”کیا بے وقوفی کر رہی ہو رومیا، خالہ جان تو خود پہلے ہی اتنی پریشان ہیں، تم ایسی باتیں کر کے انہیں مزید پریشان کر دو گی۔ خدا نخواستہ ان کی بھی طبیعت خراب ہو گئی تو پھر کیا ہوگا۔ خود کو سننا لو۔“

”ماشاء اللہ تم چھوٹی سی عمر میں کتنی سمجھدار ہو کائنات..... اسے بھی کچھ عقل کی باتیں سمجھاؤ، یہ تو بچوں سے بھی گئی گزری ہے۔ ایسی الٹی سیدھی باتیں کرتی ہے کہ دل بیٹھ، بیٹھ جاتا ہے۔ میں دعائیں مانگ، مانگ کر تھک گئی ہوں کہ یا اللہ اس کی زندگی کو خوشیوں سے بھر دے، یا اللہ اس کے حال کو بدل دے۔“ گل جان نے کائنات کی طرف دیکھا اور بڑے شفیق لہجے میں بولی۔

”خالہ جان بس آپ اپنے آپ کو ایسے ہی بھلاتی رہیں، کہاں سے آئیں گی خوشیاں؟ اب تو رابی آپا بھی اس گھر سے چلی گئی ہیں، ساری زندگی کے لیے مسئلہ چھوڑ کر..... اب ہمارا کام ہی کیا رہ گیا ہے۔ بس بیٹھ کے روتے رہیں گے۔“ رومیا کہہ رہی تھی۔ کائنات نے پیار بھرے انداز میں ایک دھپ رومیا کی کمر پر لگائی۔

”تمہیں سمجھ نہیں آرہی، اپنی پریشانی کم کرنے کے بجائے خالہ جان کی پریشانیاں بڑھا رہی ہو، کیوں مایوس کر رہی ہو، خود بھی حوصلہ کرو۔ اور خالہ جانی کو بھی حوصلہ دو۔“

”کہاں سے لاؤں حوصلہ؟ کسی اچھی خبر کی امید بھی تو ہو۔ دیکھ تو رہی ہو، کیا ہو رہا ہے اس گھر میں۔“ رومیا نے اپنے آنسو پونچھے اور کائنات کی طرف دیکھا۔ گل جان نے رومیا کا بازو پکڑا اور اپنے سینے سے لگالیا۔

”بیٹا کیا خبر کل کچھ اچھا ہو جائے۔ رابی کو تلاش تو کر رہے ہیں اور تمہیں پتا ہے، تمہاری اماں جان کا بڑا اثر سوخ ہے، انہوں نے پورے ملک میں ٹیلیفون گھما دیے تھے۔ آج کل میں رابی کا پتا چل جائے گا، انشاء اللہ۔“ ”بس بھی کریں خالہ جان اب تو ہم خود کو، بہلا، بہلا کر بھی تھک گئے۔ آج تک اس ملک میں کسی مجرم کو سزا ہوتے دیکھی ہے آپ نے، کوئی جج مجھ کا مجرم پکڑا ہوا دیکھا ہے، خبریں آ جاتی ہیں کہ مجرم پکڑا گیا اگر پکڑا لیتے



ہیں تو سزا کیوں نہیں دیتے ہیں، کچھ نہیں ہوتا یہاں، فضول میں اپنے آپ کو بہلانا اور سمجھانا ہے۔“  
خدا کے لیے خالہ جان کا چھپا چھوڑو، چلو آؤ میرے ساتھ تمہیں میں کچھ کھلاتی ہوں، تمہارا نوکر بیمار ہاتھ  
کہہ رات سے بھوکے پیٹھی ہو، چلو آؤ کانا زانے اب رومہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور بہت دلسوزی سے گویا ہوئی  
اور پھر گل جان کی طرف متوجہ ہو کر بولی۔

”خالہ جانی، دادا جان بھی آگئے تھے۔ میں تو کالج گئی ہوئی تھی اور کالج سے میں نے رومہ کو فون بھی کیا تھا  
مگر اس کا سیل فون آف تھا تو میں سمجھ گئی کہ شاید یہ رات بھر کی جاگی ہوئی تھی سو رہی ہوگی اس لیے میں نے لینڈ  
لائن نمبر پر فون نہیں کیا وہ تو جب میں گھر آئی تو بتا چلا کہ رومہ نے دادا جان کو فون کیا تھا اور دادا جان، رومہ کے  
پاس ہیں، بس میں بھی کپڑے چننے کر کے یہاں آگئی اگر آپ کو اسپتال میں رہنا ہے اور آئی کو آپ کی ضرورت  
ہے تو آپ بڑی بے فکری سے وہاں رہ سکتی ہیں میں اور دادا جان رومہ کے پاس ہیں۔“

گل جان نے کانا زانے کی طرف دیکھا، بزرگوں کے انداز میں تسلی دیتی ہوئی کم عمر اور مصوصی لڑکی جیسے گل جان  
کے دل میں اتر گئی۔ اسے یوں لگا کہ جیسے اس بحرانی وقت میں ان دادا پوتی کا وجود کی نعمت سے کم نہیں ہے۔  
”جیتی رہو بیٹا..... اللہ تمہیں ہر طرح کی خوشیاں دیکھنا نصیب کرے۔“ وہ آگے بڑھی اور اس نے کانا زانے  
کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا۔ اب وہ تینوں اندر کی طرف جارہی تھیں۔ جہاں شاہ عالم ان کا انتظار کر رہے تھے۔

☆☆☆

برہان اپنے کلاس فیلو اور اپنے بہترین دوست نعمان کے ساتھ اس کے گھر کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا  
بات کر رہا تھا۔ وہ نعمان کو اپنا سارا دکھ درد کہہ کر ہلکا ہو گیا تھا۔ نعمان کے چہرے پر دوست کے لیے ہمدردی  
اپنائیت اور فکر مندی کے تاثرات نقش تھے۔ وہ ایک ننگ برہان کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”یار اس ملک میں تو پولیس انسروں کے بچے شہزادوں کی طرح زندگی گزارتے ہیں، من مانیاں کرتے  
پھرتے ہیں یوں لگتا ہے کہ جیسے سارا شہر ان کی جیب میں ہو اور تم اپنے آپ کو دیکھو، کچھ بھی نہیں ہے تمہارے پاس  
ایک چھتھی ہی وہ بھی نہیں رہی۔“ چند لمحے سوچنے کے بعد وہ آہستگی سے گویا ہوا۔

”لیکن میں ان میں سے نہیں ہوں نعمان جو خود پر ترس کھا کر زندگی گزار دیتے ہیں اور آتے جاتے  
لوگوں کی طرف یوں دیکھتے ہیں جیسے ان میں سے کوئی نجات دہندہ کوئی فرشتہ نکل کر باہر آئے گا اور اس کے  
سارے مسئلے ہلکے جھپکتے میں حل کر دے گا۔ ایسا نہیں ہوتا میری امی کہتی ہیں ہنتے کے ساتھ دنیا ہوتی ہے رونے  
والا اکیلا ہوتا ہے، میں وہ اکیلا انسان بن کر اس دنیا میں زندگی نہیں گزاروں گا۔“

نعمان کی آنکھوں میں ستاؤنی تاثرات بہت واضح تھے۔ اب اس نے برہان کی طرف دیکھتے ہوئے بڑی  
بے ساختگی سے کہا تھا۔

”یار تمہاری باتوں نے تو مجھے ایک نئی سوچ دی ہے اور تمہاری خود داری نے مجھے متاثر کیا ہے، تمہیں دیکھ  
کر مجھے اندازہ ہوا کہ زندگی کتنی مشکل ہے، تم تو جانتے ہی ہو میں جا رہا ہوں میں سب سے چھوٹا ہوں، سب  
لوگ میرا بہت خیال رکھتے ہیں۔ میری زندگی میں تو فی الحال کوئی مشکل نہیں آئی کہ کوئی مجھے حوصلے اور ہمت کا  
سبق دے لیکن تمہاری دوستی میں بہت جلدی میں نے بڑا قیمتی تجربہ حاصل کر لیا۔“  
برہان بے معنی سے انداز میں مسکرایا۔

”ہاں نعمان، ہمیں زندگی فرمائش سے یا بھیک میں نہیں ملی ہے۔ میں کیوں کسی کو اتنا اختیار دوں کہ وہ



نہیں گئی تو خدا خواستہ انہیں کچھ ہو جائے گا۔“  
”ٹھیک ہے، میں امی کو فون کرتا ہوں۔“ موبائل جیب سے نکالتے ہوئے برہان نے ابھی ابھی کیفیت میں نعمان کو کھلی دی تھی کہ وہ اس کی بات مان رہا ہے۔ اس نے اپنا موبائل نکال کر آن کیا۔  
نعمان جان بوجھ کر وہاں سے اٹھ گیا تاکہ وہ اپنی ماں سے کھل کر بات کرے۔

☆☆☆

صابرہ اپنے بستر سے اٹھ چکی تھی لیکن کمرے میں اس طرح سے ٹہل رہی تھی جیسے وہ کسی بجلی کے تار سے بندھی ہوئی ہو اور برقی روٹے ادھر سے ادھر دوڑا رہی ہو، ٹھٹھتے ہوئے وہ اپنے ہاتھ بھی مسکتی جا رہی تھی۔ بڑی اضطرابی کیفیت تھی۔ شبنم اس کے لیے فریض جوس نکال کر لائی تھی کیونکہ گھنٹوں گزر گئے تھے اور صابرہ کے منہ میں کوئی کھیل تک نہیں گئی تھی۔

”امی میری چھوٹی سی بات مان لیں، اس کے بعد میں آپ سے ضد نہیں کروں گی، بس یہ جوس پی لیں۔ دیکھیں امی جس طرح بھائی جان آپ کے لیے ضروری ہیں اسی طرح آپ بھی ہمارے لیے ضروری ہیں، ہمارا بھی تو خیال کریں ناں!“

صابرہ نے دونوں ہاتھ بلند کیے اور انکار کے انداز میں ہلانے لگی۔

”خدا کے واسطے شبنم چلی جاؤ یہاں سے، مجھے اکیلا چھوڑ دو، میں، میں اپنے حواسوں میں نہیں ہوں، میرا ذہن بالکل کام نہیں کر رہا۔ بیٹا بھوک محسوس ہو تو منہ میں کچھ ڈالوں ناں میں تمہیں کیسے یقین دلاؤں مجھے بھوک پیاس کچھ نہیں لگ رہی..... بلکہ مجھے تو کسی چیز کا بھی احساس نہیں، ڈر، خوف، بھوک، پیاس سب سے میری جان چھوٹ گئی ہے، میرا ذہن تو صرف اپنے بچے میں لگا ہوا ہے۔ اب مجھے مزید نہ ستاؤ۔“ اسی وقت فون کی گھنٹی بجی صابرہ کی آنکھوں میں ایک چمک سی پیدا ہوئی اس نے شبنم کی طرف بڑی بے ساختگی سے دیکھا تھا۔

”جلدی سے جاؤ، دیکھو شاید برہان کا فون ہے۔“ شبنم ایک سائنڈ پرکھی ہوئی چھوٹی سی ٹیبل پر جوس کا گلاس رکھ کر دوڑ گئی۔

ستارہ اپنے کمرے میں تھی۔ فون تو وہ بھی دیکھ سکتی تھی لیکن بے صبری اور بے قراری نے شبنم کے پیروں میں بجلیاں سی باندھ دی تھیں۔ اس نے بھاگ کر ریسپور اٹھا لیا تھا۔ دوسری طرف سے واقعی برہان بات کر رہا تھا۔

”بھائی جان آپ خیریت سے تو ہیں ناں؟ آپ بغیر بتائے کہاں چلے گئے امی اس وقت..... امی اس وقت بہت زیادہ پریشان ہیں، یوں سمجھیں کہ وہ اس وقت اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھی ہیں، کسی کی بات نہیں سن رہیں۔ صبح سے کچھ کھایا یا بھی نہیں۔ آپ کو امی کا خیال تو کرنا چاہیے تھا۔ امی کو تو بتا کر چلے جاتے۔“ شبنم تو جیسے ایک لمحے کے لیے بھی یقین نہیں آیا تھا۔ وہ ایک سانس میں بوٹی چلی گئی۔

صابرہ کے کان تو جیسے آنے والی فون کال پر ہی لگے ہوئے تھے۔ جیسے ہی اس نے شبنم کے منہ سے یہ الفاظ سنے اور اسے یقین ہوا کہ واقعی شبنم کی بات برہان سے ہو رہی ہے۔ وہ دیوانہ وار، بھاگتے ہوئے باہر آئی تھی اور اس نے جھپٹ کر شبنم کے ہاتھ سے ریسپور لے لیا تھا۔

”برہان، میرا بچہ، ماں صبر ہے، ماں واری، بیٹا..... بیٹا ماں سے اتنی ناراضی کہ مرنے کے لیے چھوڑ کر چلے گئے۔“ اس نے اتنی بے ساختگی اور بے رعبطی سے بات کی تھی کہ برہان کے ذہن سے تمام الفاظ پرندوں کی طرح اڑنے لگے اور اسے لفظوں کو سنبھالنا، پکڑنا، ترتیب دینا دشوار ہو گیا سمجھ ہی نہیں آئی کہ بات کس طرح

میری تمام صلاحیتوں کو زنگ لگا دے۔ مجھے جیتے جی مار دے اور میرے انسان ہونے کا حق چھین لے۔ بچی بات یہ ہے نعمان..... مجھے اپنی آخرت بھی بہت عزیز ہے۔ میں اپنے باپ کے سامنے ایک حد تک اپنی آواز بلند کر سکتا ہوں لیکن اپنے باپ کو باپ کے حق سے محروم کرنے کا حق نہیں رکھتا۔“  
”ویری گڈ..... تمہاری سوچ بہت پوزیٹو ہے برہان.....“ نعمان نے بے ساختہ انداز میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

”بس اسی لیے میں اس گھر سے چلا آیا اگر امی کے سامنے نکلتا تو وہ جان دے دیتیں مگر مجھے گھر سے قدم باہر نہیں نکالنے دیتیں اور میں واضح طور پر سمجھ رہا تھا کہ میں ابا جان کو نہیں روک سکتا، نہیں روک پاؤں گا، آخر میں ان کا بیٹا ہوں کیونکہ میں ان کے مزاج کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں، وہ فارمیٹی کی حد تک تو صلح مشورہ کر سکتے ہیں لیکن وہ اپنا ذہن پہلے ہی بنا چکے ہوتے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ ان کا فیصلہ کیا ہوگا۔ اس لیے میں نے وہ گھر چھوڑ دیا۔ جب میں ابا جان کے کسی عمل کو روکنے کی طاقت، قدرت نہیں رکھتا اور آخرت کا خوف مجھے باپ کے ساتھ انتہا پر جانے سے منع کرتا ہے تو میرا اپنی ماں بہنوں کے سامنے رہنا بڑا بے معنی سا ہے۔ میں کیوں ان کو چھوٹی آس دلاؤں کہ جوان بیٹا اور جوان بھائی ان کے ساتھ ہے جبکہ میں ان کے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔“

”برہان تمہارے حالات سن کر اتنا تو مجھے اندازہ ہوا کہ اگر تم خود نہ نکلتے تو نکال دیے جاتے۔“ نعمان نے بہت آہستہ آواز میں اپنے دل کی بات برہان تک پہنچائی تھی۔

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو نعمان لیکن میں سچ اپنی مرضی اور اپنے فیصلے سے گھر سے نکلا ہوں، اس خوف سے نہیں کہ میں نکال دیا جاؤں گا کیونکہ میرا باپ بڑی طرح سے نکالتا تو میری ماں مرجاتی۔“

”تم نے اپنی امی کو فون کر کے بتا دیا کہ تم خیریت سے ہو؟“ برہان، نعمان کی یہ بات سن کر چونک پڑا اور اس کی توجہ اپنے موبائل کی طرف گئی جو ابھی تک بند تھا۔

”نہیں، میں نے جان بوجھ کر انہیں فون نہیں کیا تھا۔ پتا نہیں کیوں میرے اندر حوصلہ نہیں ہو رہا کہ میں اپنی ماں کو کہوں کہ اب میں اس گھر میں دوبارہ نہیں آؤں گا۔ وہ میرا انتظار نہ کریں۔“

”لیکن برہان اتنا تو سوچو ماں پر کیا بیت رہی ہوگی، کم از کم انہیں یہ اطلاع تو ضرور پہنچ جانی چاہیے کہ تم خیریت سے ہو الحمد للہ۔“

”ہاں صبح، صبح مجھے خیال آیا تھا پھر میں نے سوچا تھا کہ گھر والے سمجھ رہے ہوں گے میں بغیر بتائے یونیورسٹی کے لیے نکل گیا ہوں لیکن امی کو پتا ہے کہ میں امی کو بتائے بغیر گھر سے نہیں جاتا۔“

برہان نے یہ بات خود کلامی کے انداز میں کہی تھی۔

”تو پھر دیکھو ناں ماں کتنی پریشان ہوگی۔ تم آئی کو فون کر کے بتاؤ کہ تم میرے پاس ہو اور تم نے ناشتا بھی کر لیا ہے اور دوپہر کا کھانا بھی کھا لیا ہے۔“

”میں اس رد عمل کو کیسے فیس کروں گا جب امی سنیں گی کہ میں نے وہ گھر چھوڑ دیا ہے، کہیں انہیں کچھ ہونہ جائے۔“ برہان چند لمحے کے لیے سوچ میں پڑ گیا پھر بولا۔ بہت اندیشے اور دوسو سے اس کے لفظوں میں سرائیت کیے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔

”اگر تم انہیں بتا دو گے ناں تو انشاء اللہ وہ خود کو سنبھال لیں گی اگر تمہاری طرف سے انہیں کوئی اطلاع



سے شروع کرے۔

”بیٹا چپ کیوں ہو؟ بات کیوں نہیں کرتے۔“

”امی میں بالکل خیریت سے ہوں، ٹھیک ٹھاک ہوں، آپ یقین کریں میں آپ سے ایک لفظ بھی جھوٹ نہیں بول رہا۔ میں نے ناشتا بھی کیا تھا اور میں نے دوپہر کا کھانا بھی کھالیا اور اب اپنے دوست کے گھر بیٹھ کر بہت آرام سے آپ سے بات کر رہا ہوں، آپ خود کو سنبھالیں کیونکہ آپ صرف میری ہی نہیں شہینہ اور ستارہ کی بھی ماں ہیں، میں بہت شرمندہ ہوں کہ میں آپ کے لیے اپنی بہنوں کے لیے کچھ نہیں کر سکتا اس لیے امی کہ جو آپ نے مجھے تعلیم دی ہے کہ باپ کی ناراضی خدا کی ناراضی ہے، میرا باپ اپنے عمل کا جواب دے گا اور میں اپنے عمل کا، میں جوان بیٹا ضرور ہوں مگر زندہ باپ کے ہوتے ہوئے ان کی جگہ نہیں لے سکتا میں ایک حد تک ان کو روک سکتا ہوں مزاحمت کر سکتا ہوں لیکن خدا آخو استہ ان کا اٹھتا ہوا ہاتھ نہیں روک سکتا اور نہ خود ان پر اپنا ہاتھ اٹھا سکتا ہوں، میرے ہوتے ہوئے بھی ابا جان کے فیصلے پر عمل درآمد ہوتا تھا اور میرے نہ ہونے کے بعد بھی انہی کا فیصلہ صادر ہوگا۔“ صابرہ آنکھیں پھاڑے برہان کی بات یوں سن رہی تھی جیسے برہان کی طرف سے لفظ نہ آرہے ہوں کا فون میں گھلا ہوا سیسہ تارا جا رہا ہو۔

”بیٹا ماں کا ذرا خیال نہیں کیا، یہ نہیں سوچا ماں پر کیا بیتی گی؟ ماں پر کیا گزرے گی۔“

”امی آپ کو مزید مشکلوں میں ڈالنے سے بچانے کے لیے میں نے وہ کھر چھوڑا ہے۔ میں بزدل نہیں ہوں، بے ہمت بھی نہیں ہوں لیکن میں کچھ نہیں کر سکتا کیونکہ سامنے باپ ہے، کوئی غیر ہوتا تو اچھی طرح پوچھ لیتا۔“

”بیٹا بس کرو، ماں پر رحم کرو، ذرا سوچو ماں تمہارے بغیر کیسے وقت گزارے گی، جوان بیٹے سے بڑی آس بڑی امید ہوتی ہے، بڑا حوصلہ رہتا ہے، مجھ پر رحم کرو میرا بیٹا، رحم کرو اس ماں پر۔“

”امی میں نے آپ پر رحم ہی کیا ہے کیونکہ خدا آخو استہ میری برداشت جواب دے جاتی تو ایک چھوٹی قیامت بڑی قیامت میں تبدیل ہو جاتی اور پھر کچھ ایسے نقصان بھی ہو سکتے تھے شاید جن کا ازالہ ہی نہ ہو پاتا۔ میری دنیا بھی برباد ہو جاتی اور آخرت بھی..... امی میں بالکل خیریت سے ہوں ٹھیک ہوں، بھوکا پیاسا بھی نہیں ہوں اور میں اپنا کوئی آرام دہ ٹھکانا بنالوں گا ہوم ٹیوشن کر کے اپنا گزارہ کر لوں گا۔ آپ میری بالکل فکر نہ کریں اور میں آپ سے فون پر بات بھی کرتا رہوں گا، میں آپ سے دور نہیں ہوں امی۔“

برہان ماں کو بہلانے لگا۔

”نہیں بیٹا نہیں، میں کوئی بچی نہیں ہوں کرتی مجھے بہلا لو گے۔ ارے یہ ایک ماں کا دل ہے، اپنی اولاد پر نظر نہ پڑے تو چین قرار نہیں آتا۔ میں تو صبح، صبح تمہیں خدا حافظ کہتی ہوں تمہاری پیشانی چومتی ہوں تو سارا دن میرے اندر ایک قوت ایک طاقت دوڑتی رہتی ہے، میں گھر میں بھاگتے دوڑتے کام کرتے نہیں گھٹتی اور ہر وقت گھر سے گئے بچوں کی آہٹوں پر میرے کان لگے رہتے ہیں، یہی تو میری زندگی ہے.....“ صابرہ بلک بلک کر رو دی تھی۔

جاری ہے



بال و پرک

شہناز وسیم

”ارے رخسانہ بھئی، کچھ لوگ ہمارے گھر ہمارے ساتھ رہنے کے لیے آگئے ہیں۔ ذرا ان کا خیال رکھنا، میرے عزیز بھائی خوشی سے چپکتی ہوئی آواز باہر آدے سے آئی۔ میں کمرے میں اپنی بیٹی کو فیڈر پلا رہی تھی۔ ان کی آواز سن کر لپک کر باہر آئی، انہوں نے مجھے کندھوں سے پکڑا اور برآمدے کے ستون سے لپٹی اور پر جانے والی پھولوں کی تیل کی طرف اشارہ کیا۔



گھوسلا صاف نظر آ رہا تھا۔ جو لمحہ نگہ رانی کے لیے بہت خوب تھا۔

☆☆☆

مجھے اس گھر میں آنے پانچ سال ہوئے تھے۔ میرے میاں جانی عزیز زناہر بہت پیارا اور عزت سے مجھے بپاہ کر اس گھر میں لائے تھے اور اپنے پیارے سے گھر کی یہ چھوٹی سی راجدھانی مجھے سوپ کر بے فکر ہو گئے تھے۔ میں یہاں سیاہ سفید کی مالک بنی ہوئی تھی، وہ کسی کام یا چیز میں کوئی مداخلت نہیں کرتے تھے۔ یہ گھر ان کے ماں باپ کا تھا وہ اب اس دنیا میں نہیں تھے۔ ایک بہن تھی جس کی شادی ہو چکی تھی وہ جب بھی آتی مجھے بے حد خوشی ہوتی۔ میرا دل چاہتا وہ ابھی نہ جانے بہت سارے دن میرے پاس رہے مگر میری ہی طرح اسے بھی اپنے گھر، میاں اور بچوں سے بے حد پیار تھا۔ وہ تھوڑے دن رہ کر ہی واپس چلی جاتی۔ مجھے اپنی نند نگہت سے بے لوث محبت تھی۔ ایک تو وہ تھی ہی بہت اچھی..... دوسرے مجھے ہر اس چیز سے بے حد پیار تھا جس کا تعلق میرے میاں جانی سے ہو اور نگہت سے میرے میاں کو بہت محبت تھی تو مجھے بھی وہ بہت لاڈلی تھی، دراصل مجھے اللہ میاں نے جس پیار اور محبت کی مٹی سے بنایا تھا اسی کا اثر تھا کہ میرے خون کے ہر قطرے میں محبت اور خلوص ہر شے کے لیے تیری پھرتی تھی۔ مجھے اپنے گھر کے کاموں سے بھی بہت لگاؤ تھا۔ جب میں اپنے گھر، اپنی بچی اور اپنے میاں کا کام کرتی تو میرا انتہاک دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ مجھے لگتا میں کام نہیں بلکہ عبادت کر رہی ہوں اور میرے شوہر عزیز تو تھے بھی بہت اچھے..... بہت اچھے اور نیک اطوار کے حامل، سب کا خیال رکھنے والے، سب کے کام آنے والے۔ گفتار کے غازی کردار کے دھنی والا حساب تھا۔ لوگ عزیز کی بے پناہ عزت کرتے تھے۔ وہ جب بھی کسی سے بات کرتے تھے تو مخاطب کو ایسا محسوس ہوتا کہ وہ اسی

”وہ دیکھو۔“ میں خوش ہو کر وہ منظر دیکھنے لگی پھر مڑ کر اپنے میاں سے کہا۔

”ارے اس کی تیاریاں تو میں دس چندہ دن سے دیکھ رہی ہوں۔“ وہ بہت محنت، لگن اور پیار سے اپنا گھر بنا رہی تھی۔ دن میں سیکڑوں بار وہ باہر جاتی اور اندر آتی ہر مرتبہ اس کی چونچ میں گھاس پھوس یا تنکا ہوتا اور آج گھر مکمل ہو چکا تھا۔ وہ بڑے مزے سے اپنے چڑے کے ساتھ ادھر ادھر چنبیلی کی نیل پر رقص کرتی پھر رہی تھی اس کو لہجہ ہی تھی اس کی چپکار سے میں سمجھ رہی تھی کہ وہ بہت خوش ہے..... بہت ہی زیادہ خوش تھی اپنا گھر بنا کر۔ وہ اپنے چڑے سے یقیناً یہی کہہ رہی ہوگی کہ ہم اپنے گھر میں بہت پیار سے رہا کریں گے۔ ہمارے بچے ہوں گے انہیں ہم بہت پیار سے پالیں گے۔ دونوں مل کر بچوں کے لیے کھانا لایا کریں گے۔ میں پُر خیال انداز میں بچوں کے لیے چڑیا، چڑے کی چپکار سن کر خوش ہو رہی تھی کہ میرے میاں نے پیچھے سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مجھے متوجہ کیا۔

”بھئی بہت ہی باذوق ہیں یہ چڑیا اور چڑے صاحب..... چنبیلی کی پھولوں سے لدی ہوئی نیل پر اپنا گھر بنایا ہے۔ تم ان کا خیال رکھنا۔ میں برآمدے کے دروں میں دو چھوٹی کوٹھیاں لٹکا دوں گا تم یاد سے دانہ پانی ڈالتی رہنا۔ میں آج ہی باجرے اور کوٹیلوں کا انتظام کرتا ہوں۔ تم صرف ان کا خیال رکھنا جو ہمارے ساتھ رہنے آگئے ہیں۔“ میں نے تائید میں گردن ہلا دی۔ میں بہت خوش تھی۔ خوشی کس طرح انسان کے خون میں گردش کرتی ہے۔ کس طرح جسم سے کرنوں کی طرح پھوٹی ہے۔ اس کا مجھے صبح، صبح اندازہ ہو رہا تھا۔ میرے میاں اپنی ڈیوٹی پر چلے گئے تو میں نے ناشتے کے برتن سیٹے اور برآمدے میں بڑے ہوئے تخت پر بیٹھ کر دوپہر کے کھانے کے لیے ہنری بنانے لگی یہاں سے چڑیا کا



## عورت کیا ہے.....؟

☆ ماں کے روپ میں رحمت ہے۔  
☆ بہن کے روپ میں شرافت ہے۔  
☆ بیٹی کے روپ میں باوفا دوست ہے۔  
☆ ویرانے میں چمن ہے۔  
☆ اندھیرے میں نور اور روشنی میں امید کی کرن ہے۔  
☆ بیوی کے روپ میں شوہر کا سکون ہے۔  
☆ سرسبز ہانہ عزیز، کراچی

محبوبوں اور نئے ساتھیوں کی تلاش میں نکل چکے تھے۔  
میں دل گرفتہ ہو کر نیچے اتر آئی۔ گیٹ کے سامنے  
اندر کی جانب پوسٹ میں خط ڈال کر چلا گیا تھا۔ یہ  
میری اماں کا خط تھا، فون اور انٹرنیٹ کی سہولت کے  
باوجود میری اماں آج بھی مجھے خط لکھتی تھیں۔ میں  
نے کمرے میں جا کر خط کھولا جیسے جیسے میں خط پڑھتی  
گئی میری آنکھوں کے کٹورے بھرتے چلے گئے۔  
اماں نے شکوہ کیا تھا۔

”پیاری بیٹی رخسانہ!

نئی دنیا میں مگن ہو کر شوہر، بچی اور گھر کو پا کر تم  
اپنی ماں کو بھول گئیں جس کی آنکھیں آج بھی تمہیں  
ڈھونڈتی ہیں جس کے لب پر آج بھی تمہارے لیے  
دعاؤں کے خزانے ہیں۔“ میں نے اپنی بیٹی کو اٹھا کر  
کلیجے سے لگایا اور دیوانہ وار اسے چومنے لگی۔

ابھی تو یہ میرے پاس ہے جب اس کے بال و پر  
آجائیں گے تو یہ بھی مجھے چھوڑ کر چلی جائے گی اپنے جیون  
ساتھی کی محبت میں مجھے بھلا دے گی، ایک نئی دنیا کی تلاش  
میں ہم دونوں کو چھوڑ جائے گی، ایک نئی محبت دریافت  
کرنے کے بعد ہمیں فراموش کر دے گی۔ میں نے کھڑکی  
پر بیٹھی چڑیا کو دیکھا مجھے اپنی ماں اور چڑیا کا ہم ایک سالگا۔

✽

اور آتے۔ بچوں کے لیے کھانا لے کر آتے۔ جیسے ہی  
وہ گھونسلے میں آتے گھونسلے کے اندر کی دنیا میں پھیل  
چھ جاتی..... آوازوں سے بھر جاتی، پیلی پیلی ہاتھوں  
والی منی منی پر بچیں اسپرنگ کی طرح اوپر نیچے گردش  
میں آ جاتیں۔

میرا کام بھی بڑھ گیا تھا۔ بار بار زینہ چڑھ کر  
اوپر جاتی اور انہیں دیکھتی۔ شام کو سارے دن کا  
احوال میاں کے گوش گزار کرتی۔ وہ بھی بہت دلچسپی  
اور توجہ سے سنتے۔ کئی سوال کرتے جن کے میں  
جواب دیتی۔ جیسے جیسے وقت گزرا ان کے جسم بڑے  
ہونے لگے۔ ان کی ماں انہیں اتنا کھلاتی کہ ان کے  
پھولے ہوئے پیٹ کی کھال تنی ہوئی نظر آتی تھی غرض  
یہ کہ پورا خاندان خوش نظر آتا۔

ایک دن میں دوپہر کا کھانا بتا رہی تھی کہ  
اچانک میرے پیر کے پاس کوئی شے آ کر گری، جھک  
کر دیکھا تو چھوٹے چھوٹے پروں میں چھپا چڑیا کا  
بچہ تھا۔ وہ اسے اٹھا کھاتا رہی تھی ظاہر ہے ابھی بچوں  
کے پاس مہارت نہیں تھی اس لیے بار بار گر رہے  
تھے۔ وہ یہ عمل روز دہرائی، بچے اب پیچی اڑان  
بھرنے لگے تھے۔ ایک دن مجھے نہ جانے کیا شرارت  
سوچھی میں نے بچوں کو پکڑ کر لال، پیلا اور ہارنگ  
ان پر مل دیا تاکہ مجھے پہچان رہے کہ اتنی بہت سی  
چڑیوں کے جھنڈ میں یہ ہماری چڑیا کے بچے ہیں۔  
ایک صبح جب میں بیدار ہوئی تو چڑیا اور چڑیا دونوں  
بہت اداس گھونسلے کے پاس بیٹھے تھے۔ کبھی اس  
شاخ پر بیٹھے کبھی اس شاخ پر۔ ان کے اڑنے میں  
بے چینی صاف عیاں تھی۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا  
بچے کہیں بھی نظر نہیں آئے۔

لاکھ چاہو مگر پھر وہ رکستے نہیں  
جن پرندوں کے بھی بال و پر آگئے  
نئے بچہ میں نے گھونسلہ چھوڑ دیا تھا اور ایک نئی  
دنیا دریافت کرنے کے لیے اڑان بھر چکے تھے۔ نئی

محبت میں سرشار لگتا تھا۔ اچانک میرے میاں کی  
ولکش آواز نے مجھے چونکا دیا۔

”بھئی لگتا ہے ان دونوں میں بھی اتنا ہی پیار  
ہے جتنا کہ ہم دونوں میں۔“ میں نے مڑ کر دیکھا نہ  
جانے کب سے عزیز احمد میرے پیچھے کھڑے ہو کر  
اس منظر سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

☆☆☆

دن دبے پاؤں گزرتے رہے، ہم دونوں کو  
ایک دلچسپ مشغلہ ہاتھ آ گیا تھا۔ آتے جاتے چینیلی  
کی تیل پر نگاہ ضرور جاتی کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔  
فجر کی اذان کے ساتھ ہی میری آنکھ کھلی۔ میں  
نے بچی کو الگ کر کے دھیرے سے بستر چھوڑ دیا۔ ابھی  
میں وضو ہی کر رہی تھی کہ عزیز نے مجھے آواز دی۔

”رخسانہ ذرا باہر آنا۔“ میں برآمدے میں آ گئی۔  
”دیکھو تو ذرا غور سے سنو، لگتا ہے کئی ننھے  
مہمان دنیا میں آچکے ہیں۔ سن رہی ہوں۔“ یہ معصوم  
آوازیں۔ ”یہ آوازیں گھونسلے سے آ رہی تھیں میں  
خوشی سے بے تاب ہو کر اور دیوانہ وار آگے بڑھی۔

”شی..... ش شی، ابھی نہیں۔ ابھی ان کے ماں  
باپ کو خوش ہونے دو۔ وہ ہم دونوں سے زیادہ خوش  
ہوں گے۔“ میں نے بے مشکل خود کو رکھ کر پھر مجھ سے صبر  
نہ ہوا فوراً زینہ چڑھ کر اوپر گئی وہاں سے گھونسلے کا منظر  
صاف نظر آ رہا تھا۔ میں نے دیکھا بغیر پروں کی چھوٹی  
چھوٹی گلابی رنگ کی بویاں ایک دوسرے میں مدغم  
ہو رہی تھیں اور وہ بہت پیار سے اپنی چوچ کی مدد سے  
ان کو سنہیال رہی تھی۔ اس کے چہرے پر مانتا کا فخر تھا،  
اپنی متاع جان کو وہ دنیا کی نظروں سے چھپا کر اپنے  
پروں کے اندر سمیٹ رہی تھی۔ مجھے لگا کہ یہ چڑیا نہیں  
میں ہوں۔ میں بھی تو اپنی بچی سے اتنا ہی پیار کرتی  
ہوں۔

بچوں کی وجہ سے ان کا کام بہت بڑھ گیا تھا۔  
ایک، ایک لمحے میں وہ دونوں باری باری باہر جاتے

کے ہیں۔ اسی لیے جب انہوں نے یہ بتایا کہ کچھ  
لوگ ہمارے ساتھ رہنے کے لیے آگئے ہیں ان کا  
خیال رکھنا تو مجھے اپنے شوہر پر بڑا فخر محسوس ہوا کہ وہ  
اللہ کی مخلوق سے کتنی محبت کرتے ہیں۔ میں نے چڑیا  
اور چڑے کا دل و جان سے دھیان رکھنا شروع  
کر دیا۔ ان کے دانے پانی کی خبر رکھتی۔ مجھے ایسا لگتا  
جیسے چڑیا اور چڑا ابھی میرے گھر میں خوش ہیں۔

☆☆☆

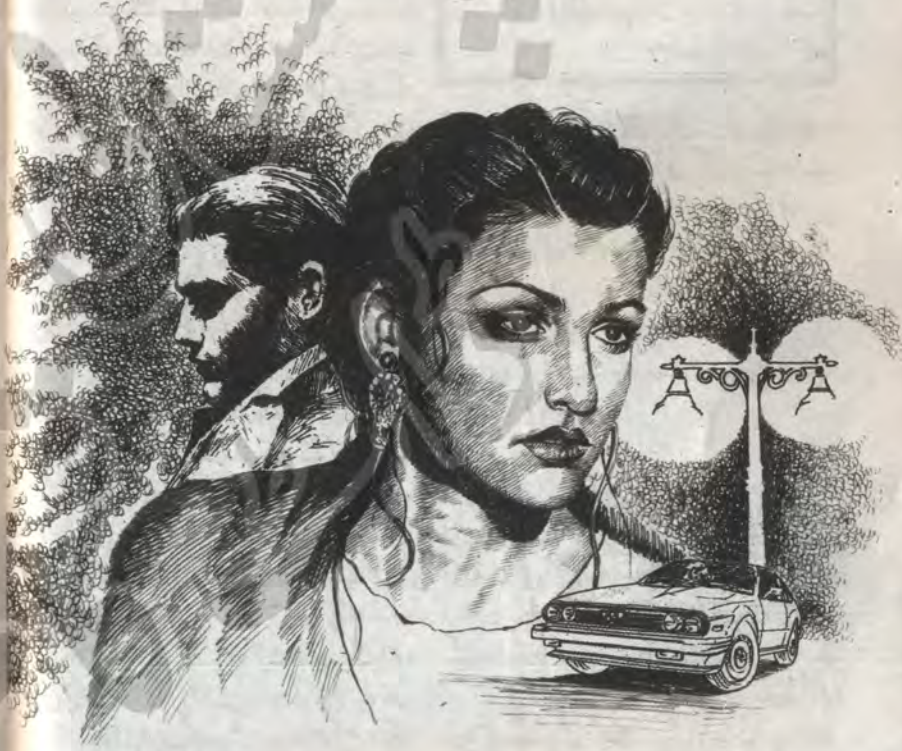
گرمی اپنے عروج پر تھی جس کا عالم تھا۔ میں  
کھانا پکا کر فارغ ہوئی تو برآمدے میں آ گئی۔ نہ  
جانے کہاں سے کالی، کالی گھٹاؤں نے آ کر پورا  
آسمان ڈھک دیا لگتا تھا جل جھل ہونے ہی والی  
ہے۔ میں نے چینیلی کی تیل کی طرف دیکھا۔ چڑیا  
بڑے مزے سے گھونسلے کے منہ پر بیٹھی تھی وہ آسمان  
کو تنک رہی تھی۔ لگتا تھا موسم کا البیلا پن اسے بھی  
اپنے حصار میں لیے ہوئے تھا۔ اس نے اپنے پردوں  
کو پھلایا ہوا تھا۔ گول منوں سی ہو رہی تھی۔ تھوڑی  
تھوڑی دیر میں اس کے بدن میں ایک حرکت سی ہوئی  
اور وہ ”چوں“ کر کے اپنی دلکش راگنی سے فضا میں  
جلترنگ سا بجا دیتی۔ چینیلی کے پھولوں کی مسکور کن  
مہک، چڑیا کا چچہانا، آسمان سے ٹپ ٹپ موٹی موٹی  
بونڈوں کا کرکڑ مین میں جذب ہو کر مہکتا مجھے مکمل  
طور پر اپنے سحر میں گرفتار کر چکا تھا۔ کسی شاخ کے  
پتوں سے نکل کر چڑا اپنی چڑیا کے پاس آ بیٹھا۔  
دونوں نے مل کر اپنی چپکار سے فضا کا سکوت توڑ دیا  
تھا۔ مجھے ان دونوں پر بے حد پیار آیا پھر وہ دونوں  
نیچے پرواز کر کے پانی کی کوٹھی کے کنارے پر بیٹھ  
گئے اور پھر اندر تر گر نہانے لگے اور اس قدر پانی کی  
چھینٹیں اڑائیں کہ نیچے کا سارا فرش گیلا ہو گیا۔ وہ  
دونوں بے حد خوش تھے ایک شاخ سے دوسری شاخ  
تک اڑان بھر رہے تھے۔ وہ اپنے چڑے کو بھر پور  
ادائیں دکھا رہی تھی۔ اسے بھارتی تھی اور وہ بھی اس کی



# کہیں دیکھ کر جاکہیں دل

قصہ حیات

آٹھواں حصہ



ماں جی، بیٹا، بہو کے ساتھ ڈانگ نیل پر  
ناشتا کرنے میں مصروف تھیں۔ ماں جی بہت محبت  
سے ردا کی طرف دیکھ رہی تھیں اور چیزیں اٹھا اٹھا کر  
اس کے آگے کر رہی تھیں۔

”بہو کی خوشی میں ماں جی نے مجھے بھلا دیا  
ہے، ایک بار بھی کچھ نہیں پوچھ رہیں۔“ روجیل نے  
مسکرا کر ردا کی طرف دیکھ کر شکایتی لہجے میں کہا۔  
”ہاں..... بیٹا یہ تو ہے، اپنی، اپنی اہمیت کی



قریب آ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔  
”کچھ نہیں..... بس یونہی.....“ روہیل نے  
گہری سانس لے کر اسے دیکھتے ہوئے کہا۔  
”یونہی..... کیا مطلب.....؟“ ردا نے چونک  
کر پوچھا۔

”سب لوگ تم سے کتنی محبت کرتے ہیں، سوچتا  
ہوں..... میں تم سے اتنی محبت کر پاؤں گا یا نہیں۔“  
روہیل نے اپنی شرٹ کے بازو فولڈ کرتے ہوئے  
معنی خیز انداز میں کہا۔

”یہ کیا بات ہوئی.....؟ آپ اپنی محبت کا  
comparison کسی اور سے مت کریں۔  
میرے لیے آپ کی محبت اور وہ جیسی نہیں۔“ ردا  
نے مسکرا کر اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

”کیا مطلب.....؟“ روہیل نے چونک کر پوچھا۔  
”آپ کی محبت سب سے ڈفرنٹ اور منفرد  
ہے۔“ ردا مسکراتے ہوئے بولی۔

”کیا مجھ جیسی محبت..... زندگی میں آپ سے  
کسی اور نے کی ہے؟“ روہیل معنی خیز انداز میں  
پوچھنے لگا۔

”کیا مطلب.....؟“ ردا نے ایک دم چونک  
کر پوچھا۔

”آئی مین کہ سب لوگ آپ سے محبت کرتے  
ہیں، یہاں تک کہ اجنبی لوگ بھی..... اب ممانے بھی  
تو آپ کو پہلی ملاقات میں پسند کر لیا۔ آئی مین.....  
میرے علاوہ شاید کوئی اور بھی آپ کی زندگی میں آیا  
ہوگا۔“ روہیل نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

”یہ..... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“ ردا نے  
ایک دم بوکھلا کر حیرت سے کہا۔

”اِس نیچرل..... ہر لڑکی کی زندگی میں شادی  
سے پہلے کوئی نہ کوئی مروضہ ہوتا ہے۔ جسے وہ پسند کرتی  
ہے۔“ روہیل نے اس کی طرف بغور دیکھ کر کہا۔

”نہیں..... میری زندگی میں آنے والے پہلے

شہید کی طرف دیکھ کر کہا پھر روہیل سے بولا۔  
”ہاں بھائی آپ لوگ چلیں میں ہاتھ دھو کر آتا  
ہوں۔“ روہیل بولا۔ جب وہ واش روم سے باہر نکلا  
تو شہید قبوے کی ٹرے پکڑے باہر ہی جا رہی تھی۔  
زادہ نے پہلے سے ہی قبوہ تیار کر لیا تھا۔

”آپ لوگ لکی ہیں، جنہیں ردا ملی ورنہ ہماری  
ردا کے پروپوزلز بھی بہت تھے اور چاہنے والے بھی بہت!“  
معنی خیز انداز میں شہید نے اس سے کہا تو روہیل  
چونک پڑا۔

”کیا مطلب.....؟“ روہیل نے ایک دم میڑ  
کر شہید کی طرف دیکھ کر کہا تو اسی وقت ردا مسکراتی  
ہوئی اندر آ گئی۔

”ارے، آپ کہاں رہ گئے بھائی بلار ہے ہیں۔“  
ردا نے مسکراتے ہوئے روہیل کی طرف دیکھ کر کہا تو  
شہید معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے وہاں سے  
چلی گئی۔

روہیل نے چونک کر ردا کی طرف دیکھا تو وہ  
مسکرا کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ روہیل لان کی  
طرف چلا گیا تو ردا بھی پیچھے پیچھے چلی گئی۔

سب لوگ لان میں بیٹھے کافی دیر باتیں  
کرتے رہے اور قبوہ پیتے رہے مگر روہیل ذرا چپ  
چپ رہا۔

☆☆☆

کافی دیر بعد وہ لوگ اندر آئے روہیل سلیپنگ  
ڈریس پہن کر واش روم سے باہر نکلا۔ ردا ڈریسنگ  
ٹیبل کے سامنے اسٹول پر بیٹھی جیولری اتار کر اپنا  
میک اپ صاف کر رہی تھی..... روہیل کے چہرے پر  
تجسس کی چھائی ہوئی تھی۔ وہ آکر بیڈ پر بیٹھ گیا۔ ردا  
نے ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں سے اسے دیکھا۔

”کیا بات ہے، آپ کچھ پریشان لگ رہے  
ہیں، کھانا کھانے کے دوران تو آپ اچھے موڈ میں  
تھے اور اب.....؟“ ردا نے سب کچھ چھوڑ کر اس کے

خوش تھے۔ سب لوگ کھانا کھانے میں مصروف تھے۔  
ردا نے فینسی سوٹ کے ساتھ جیولری پہن رکھی تھی  
اور ہلکے میک اپ میں بھی وہ بڑی خوب صورت لگ  
رہی تھی۔ سب لوگ کھانا کھاتے ہوئے ایک  
دوسرے سے مذاق کر رہے تھے۔ روہیل نے بار بار  
مسکراتے ہوئے ردا کو دیکھا تو شہید معنی خیز انداز  
میں آنکھیں گھما کر انہیں دیکھنے لگی اور اس کے  
چہرے پر خفگی کے تاثرات نمایاں ہونے لگے۔

”میرے ساتھ تو بہت برا ہوا ہے۔ ردا میرے  
گھر کیا گئی ہے، میری ماں جی نے تو مجھے بھلا ہی دیا  
ہے۔ انہیں تو یاد بھی نہیں کہ ان کا کوئی بیٹا بھی ہے۔  
بس ہر وقت بہو یاد رہتی ہے۔“ روہیل نے مسکراتے  
ہوئے کہا تو ردا مسکراتے لگی۔

”ردا خوش قسمت ہے جسے آپ کی ماں جی جیسی  
ساس ملی ہیں۔“ خدیجہ نے مسکراتے ہوئے کہا تو  
شہید نے چونک کر سب کو دیکھا۔

”ہم نے ہمیشہ ردا کو ایک سوئٹ ڈول کی  
طرح ٹریٹ کیا ہے اور میری بہن نے بھی کبھی ہمیں  
مایوس نہیں کیا..... اس جیسی پیاری بہن شاید ہی دنیا  
میں کوئی ہو۔“ فہام نے مسکراتے ہوئے روہیل کی  
طرف دیکھ کر کہا۔

”اور اس کا پلس پوائنٹ یہ ہے کہ اس نے  
ہماری محبت کو کبھی ایکسپلائٹ نہیں کیا۔ she is  
very humble and down to  
earth“ عاصم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ارے، ارے یہ کیا آپ سب میری اتنی  
تعریفیں کیوں کر رہے ہیں۔“ ردا نے مسکراتے  
ہوئے کہا۔

”میری گڑیا ہے ہی تعریف کے قابل۔“ فہام  
نے مسکراتے ہوئے کہا تو سب مسکراتے لگے۔

”شہید..... اچھا سا قبوہ تو پلاؤ، ہم لوگ باہر  
لان میں بیٹھتے ہیں۔ آؤ بھی روہیل!“ فہام نے

بات ہوتی ہے اور میری بہو اب میرے لیے تم سے بھی  
زیادہ اہم ہے۔“ ماں جی نے مسکرا کر جواب دیا۔  
”ماں جی.....!“ روہیل نے مصنوعی خفگی سے  
کہا تو تینوں مسکراتے لگے۔

”بیٹا..... ابھی تم دونوں ردا کی ماما کے گھر چلے  
جاؤ، ویسے کے بعد یہ بھی ایک رسم ہوتی ہے اور میں  
نے ردا کی ماما سے وعدہ کیا تھا کہ صبح تم دونوں کو بھیج  
دوں گی۔“ ماں جی نے روہیل کی طرف دیکھ کر کہا۔

”نہیں..... ماما..... مجھے یوں جانا پسند نہیں۔“  
روہیل نے خفگی سے منہ بنا کر کہا۔

”بیٹا..... ان کی خوشی کی خاطر تم آج چلے جاؤ  
اور کل میں، فضیلت اور عبید کے ساتھ تمہیں لینے  
آ جاؤں گی۔“ ماں جی نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”تو کیا مجھے رہنا بھی پڑے گا اور آپ گھر میں  
اکیلی.....؟ نہیں نہیں..... میں نہیں جاؤں گا، یہ  
کہاں ہوتا ہے ماں جی؟“ روہیل نے حیرت سے  
آنکھیں پھیلا کر کہا۔

”فضیلت میرے پاس ہی ہوگی..... اور تمہیں  
ہر حال میں جانا ہوگا۔ یہ میرا حکم ہے۔“ ماں جی نے  
ٹھوس لہجے میں کہا تو ردا خاموشی سے دونوں کی باتیں  
سنتی رہی۔

”اگر نہ گیا تو.....؟“ روہیل نے منہ بنا کر کہا۔  
”پھر میں تم سے ناراض ہو جاؤں گی۔“ ماں  
جی نے سخت لہجے میں کہا۔

”افوہ..... ماں جی۔“ روہیل نے جھنجھلا کر  
جواب دیا۔

”بیٹا! ان رسوں میں بھی محبت ہوتی ہے، تم  
جاؤ اور دیکھنا وہاں تم کتنا انجوائے کرو گے۔“ ماں جی  
نے مسکراتے ہوئے کہا تو روہیل بھوس چڑھانے لگا۔  
ماں جی اور ردا اسے دیکھ کر مسکراتے لگیں۔

☆☆☆

بیٹی داماد کے آنے سے وہ سب گھر والے بہت



فادر آرمی میں جزل تھے ایک چچاڑی آئی جی پولیس اور ایک فٹربک ایک ماموں بھی سول سرونٹ تھے۔ اس کے سب کزنز انجو کیڈ اور انتہائی اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے۔ اس کے نانا کی اپنی فیکٹری تھی..... اور وہ شہر کے کامیاب بزنس مین سمجھے جاتے تھے۔ کلاس کے اکثر اسٹوڈنٹس اس کے بیک گراؤنڈ سے متاثر تھے اور اس کے بیک گراؤنڈ کے بارے میں بہت باتیں ہوتی رہتی تھیں مگر کول کو اس بات کا ذرا سا احساس برتری نہ تھا۔ وہ بہت نامل رہتی اور ہر ایک سے اچھی طرح بات چیت کرتی۔ ان کا کالج شہر کا مہنگا ترین کالج تھا۔ اس لیے اس میں پڑھنے والے سب اسٹوڈنٹس زیادہ تر اچھی تعلیم سے آتے تھے۔

حنہ کو اس کے جانے کا بہت افسوس ہو رہا تھا مگر اس سے زیادہ یہ افسوس تھا کہ آزر نے اس پر الزام لگایا تھا اور کول اس الزام سے بالکل بے خبر تھی..... اور جاتے ہوئے یہی نے بھی اس سے بات نہیں کی تھی۔

☆☆☆

کالج میں اینول ایگز امر سے پہلے اسٹوڈنٹس کو پریپ لیو دے دی گئی تھی اور سب پڑھائی کرنے میں مصروف تھے۔ اس لیے ایک دوسرے سے ملاقات بھی کم ہو رہی تھی..... حنہ کو کچھ نوٹس کی ضرورت تھی تو وہ یہی نے گھر آئی۔ وہ کچھ بھی سمجھتی تھی اور آنکھوں میں شکوہ بھی تھا۔ وہ نوٹس لے کر جانے لگی تو یہی نے اس کی طرف بغور دیکھنے لگی۔

”تم کچھ خفا خفا سی لگ رہی ہو، کیا بات ہے، طبیعت خراب ہے یا مجھ سے ناراض ہو۔؟“ یہی نے جان بوجھ کر پوچھا۔

”تم سے ناراض ہوں۔“ حنہ نے صاف گوئی سے بتایا۔

”کیوں.....؟“ یہی نے چونک کر پوچھا۔

”تم نے کول کے ساتھ اچھا نہیں کیا..... وہ

کبھی بیک نہیں کیا اور ویسے بھی وہ یہی نے کے ساتھ کیڈ ہے مجھے کیا ضرورت ہے دونوں کے درمیان آنے کی۔“ کول اپنی ہی لے میں قدرے بے پروائی سے بولی تو حنہ چونکی گویا اسے اپنی ساعت پر یقین نہیں آ رہا ہو۔

”ابنی ویز..... میں نے تمہیں اس لیے فون کیا ہے کہ میں آج رات پشاور جا رہی ہوں۔ ڈیڈی کی پوسٹنگ آگئی ہے اور انہیں وہاں فوراً چارج لینا ہے ویسے بھی کل سے کالج میں بھی چھٹیاں ہو رہی ہیں تو ممانے مجھے بھی ساتھ چلنے کو کہا ہے۔ آئی ایم ناٹ شیور ایگز امر کہاں سے دوں گی..... لیکن ہم سب جا رہے ہیں، یہی کو میرا اسلام دینا..... اس دن اس کا موڈ کچھ آف لگ رہا تھا۔ یار..... اسے کلیر کرنا..... آئی ایم وری فیر پرسن..... اوکے فیک کیئر.....“ کول نے مسکراتے ہوئے فون بند کیا تو حنہ سوچ میں پڑ گئی۔

”کول جھوٹ نہیں بولتی۔“ وہ بہت تھوڑے ٹائم کے لیے ان کے پاس آگئی تھی مگر اس نے اپنی اچھی باتوں اور عادتوں سے سب کے دل موہ لیے تھے۔ تمام کلاس فیلوز اور ٹیچرز بھی اسے پسند کرتے تھے۔ وہ لائق اسٹوڈنٹ ہونے کے علاوہ بہت خوش مزاج بھی تھی۔

”کول نے کبھی غلط بیانی سے کام نہیں لیا۔ وہ یہی کو ڈانچ نہیں کر سکتی اور آزر کے ساتھ بھی کبھی اسے اتنا فریک ہوتے نہیں دیکھا پھر آزر نے کیوں کول کے بارے میں اتنی بڑی بات کہہ دی۔“ حنہ کا دماغ اٹھتے اٹھتے بیٹھے کام کرتے، پڑھتے ہوئے اس کا ذہن انہی باتوں میں الجھا رہتا..... اور وہ سوچ سوچ کر پریشان ہو رہی تھی۔

☆☆☆

کول کا تعلق انتہائی بااثر فیملی سے تھا۔ اس کے

باتیں کرو۔“ ماں جی نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”وہ اپنی ماما کے ساتھ بڑی ہے۔“ روچیل نے بتایا۔

”تو اس کے بھائیوں کے ساتھ کپ شپ کرو، وہ لوگ کیا کہیں گے۔ عجیب بدتمیز داماد ہے۔ بیٹا جہاں جاتے ہیں، وہاں کے طور طریقوں کے مطابق ٹائم گزارتے ہیں۔“ ماں جی اسے محبت سے سمجھانے لگیں۔

☆☆☆

کول، یہی کو بار بار فون کر رہی تھی مگر یہی نے جان بوجھ کر اس کی کال نہیں اٹھینڈ کر رہی تھی۔ اس نے کئی بار یہی کو فون کیا، رسپانس نہ ملنے پر اس نے حنہ کو فون کیا۔

”حنہ ڈیر! کیسی ہو یار.....؟ میں یہی کو اتنی بار کال کر رہی ہوں مگر وہ میری کال نہیں لے رہی.....“ کول نے اس سے شکوہ کرتے ہوئے کہا۔

”وہ بڑی ہوگی.....“ حنہ نے آہستہ آواز میں بہانہ بناتے ہوئے کہا۔

”راکٹ کے ساتھ..... یار یہ راکٹ بھی کیا چیز ہے..... یہی جیسی sensible لڑکی کا دماغ ماؤف کر دیا ہے۔“ کول نے ہنستے ہوئے کہا۔

”محبت سمجھی ایسے ہی پاگل کر کے رکھ دیتی ہے۔ کول..... کیا تمہیں کسی سے کبھی محبت نہیں ہوئی؟“ حنہ نے جان بوجھ کر اسے کریدنا چاہا۔

”یار..... میں تو باز آئی اس اسٹوڈنٹ ایکٹوٹی سے..... پہلے اسٹوڈنٹ کپٹن کروں گی پھر سوچوں گی محبت کے بارے میں..... اگر ٹائم ملا تو۔“ کول نے ہنستے ہوئے کہا تو حنہ کے چہرے پر حیرت کے تاثرات نمودار ہوئے۔

”آزر تمہیں کیسا لگتا ہے؟“ اچانک حنہ نے سوال کیا۔

”کون..... راکٹ.....؟ ایک دم اسٹوڈنٹ یار..... اب پلےز یہ مت کہنا کہ کول کیا تم اس سے محبت کرتی ہو..... نیور..... ایور..... یار مجھے اس نے

مرد صرف آپ ہیں اگر میں کسی کو پسند کرتی تو اس سے ضرور شادی کرتی کیونکہ میرے بھائیوں اور ماما نے کبھی..... مجھ پر ایسی کوئی پابندی نہیں لگائی تھی۔“ روانے کہا۔

”ہاں یہ تو ہے۔“ روچیل نے چونک کر اسے دیکھا اور گہری سانس لی۔

”لیکن..... آپ کے ذہن میں یہ سب کیوں آیا؟“ روانے قدرے روپاکی ہو کر پوچھا۔

”یونہی..... آپ کے گرد ذاتی زیادہ محبتوں کو دیکھ کر ویسے اگر آپ نے مانڈ کیا ہے تو سوری۔“ روچیل نے ایک دم موڈ بدل کر مسکراتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

”نہیں..... ایسی کوئی بات نہیں۔“ روانے مسکرا کر کہا۔

☆☆☆

فضیلت لاؤنچ میں موجود دیکھری چیزوں کو سیٹ رہی تھی۔ ٹیبل پر پڑا ماں جی کا موبائل بجنے لگا۔

”آہ! روچیل کا فون آ رہا ہے.....“ فضیلت نے ماں جی کو آواز دیتے ہوئے کہا تو ماں جی جلدی سے لاؤنچ میں آئیں۔

”روچیل بیٹا! خیریت تو ہے۔“ ماں جی نے موبائل کان سے لگاتے ہوئے کہا۔

”ماں جی میں بہت بور ہو رہا ہوں۔ آپ کب ہمیں لینے آئیں گی؟“ روچیل نے منہ بنا کر جھنجھلاتے ہوئے پوچھا۔

”کیوں بور ہو رہے ہو..... بیٹا ہم لوگ شام کو آئیں گے۔“ ماں جی نے ہنستے ہوئے کہا۔

”کیا..... شام کو.....؟ نہیں، نہیں آپ ابھی آئیں۔ میں بہت بور ہو رہا ہوں، ورنہ میں خود آ جاتا ہوں۔“ روچیل نے غصے سے کہا۔

”خبردار جو تم آئے..... کیا ایک دن بھی تم اپنی سسرال میں نہیں رہ سکتے۔ روا کہاں ہے، اس کے ساتھ







اس کا بیک گراؤنڈ کیا ہے؟“ جمال صاحب نے گہری سانس لے کر سنجیدگی سے پوچھا۔  
”آزر عظیم..... میرا کلاس فیلو ہے، اس کے parents امریکا میں سیٹلڈ ہیں، قادر پزیر میں ہیں۔“ یعنی نے آہستہ آہستہ بتانا شروع کیا تو وہ ایک دم چوٹے۔

”آزر عظیم..... نام سنا ہوا لگتا ہے، آئی تھنک..... یہ وہی لڑکا ہے ناں جسے ایکشن کمپین میں کالج سے expel کیا گیا تھا؟“ انہوں نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا تو یعنی ایک دم پوچھا لگئی۔

”ہاں..... آزر وہی ہے..... لیکن پاپا..... اب اس نے اپنے آپ کو بہت چٹخ کر لیا ہے، now he is a different person اپنے کیے کی جگہ سے کئی بار معافی مانگ چکا ہے۔“ یعنی آزر کے فیور میں اس قدر جذباتی ہو کر بول رہی تھی کہ جمال صاحب نے ایک بار چونک کر اسے گہری نظروں سے دیکھا تو وہ خاموش ہوئی۔

”ٹھیک ہے، اسے کسی روز گھر پر انوائٹ کرو، میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔“ انہوں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

”ک..... کیوں.....؟“ یعنی نے چونک کر پوچھا۔  
”اماں جی تہہ مارے لیے جو پروپوزل بتایا ہے، آزر سے ملنے کے بعد میں اس کے بارے میں کوئی فیصلہ کروں گا۔“ جمال صاحب نے کہا۔

”لیکن ڈیڈی..... ابھی تو ہم سب ایگزامز کی تیاری کر رہے ہیں۔“ وہ جلدی سے بولی۔

”ٹھیک ہے ایگزامز کے بعد..... کسی روز انوائٹ کرنا۔“ انہوں نے آہستہ سے کہا اور اٹھ کر کمرے سے باہر چلے گئے لیکن یعنی نے محسوس کیا کہ آزر کے بارے میں سن کر ڈیڈی خوش نہیں ہوئے تھے۔  
”لیکن اب ڈیڈی آزر سے مل کر ضرور خوش ہوں گے۔“ اس نے مسکرا کر سوچا اور اپنے دل کو تسلی

”نہیں، تمہیں ہر صورت میں آنا ہوگا۔ اگر تم نہ آئیں تو میں ہمیشہ کے لیے تم سے ناراض ہو جاؤں گا۔“ اس نے کہہ کر فون بند کر دیا۔ یعنی گہری سوچ میں ڈوب گئی۔

☆☆☆

صبح آفس جانے سے پہلے جمال صاحب، یعنی کے کمرے میں آئے تو وہ بیڈ پر بیٹھی بڑھنے میں مصروف تھی۔ انہیں دیکھ کر وہ بری طرح چوٹی۔

”ڈیڈی آپ.....؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔  
”ہاں بیٹا..... اسٹڈیز کیسی جا رہی ہیں؟“ انہوں نے پوچھا۔

”انس فائن۔“ اس نے جواب دیا۔  
”بیٹا مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے، دراصل آپ کے لیے ایک پروپوزل آیا ہے۔“ جمال صاحب نے اس کی جانب بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

”پروپوزل.....؟“ اس نے انتہائی حیرت سے پوچھا۔

”ہاں..... میں آپ کی رائے جاننا چاہتا ہوں، وہ ابا جان کے دوست کا بیٹا ہے اور امریکا میں ڈاکٹر ہے۔“ انہوں نے نرم لہجے میں اسے بتایا۔

”نہیں..... ڈیڈی میں یہ پروپوزل accept نہیں کر سکتی۔“ یعنی نے جواب دیا۔

”کیوں.....؟ اس انکار کی کوئی شوش وجہ بھی ہونی چاہیے۔“ جمال صاحب نے اس کی جانب بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں..... وہ..... میں.....؟“ وہ نظریں چراتے ہوئے بولی۔

”کیا تم کسی اور کو پسند کرتی ہو؟“ انہوں نے اس کی جانب بغور دیکھتے ہوئے پوچھا تو یعنی نے ایک دم چونک کر ان کی طرف دیکھا اور خاموشی سے سر جھکا لیا۔

”کون ہے وہ.....؟ کیا نام ہے اس کا..... اور

”کیا۔ وہ کوئل پر بہت ٹرسٹ کرتی ہے۔“ یعنی نے صاف گوئی سے اسے بتایا۔

”اور تم..... کیا تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں کیا میں نے جو کچھ تمہیں بتایا وہ سب جھوٹ ہے؟“ آزر نے انتہائی غصے سے چلا کر کہا۔

”معلوم نہیں، حقیقت کیا ہے۔“ یعنی نے جھنجھلا کر جواب دیا۔

”تمہارے خیال میں، میں جھوٹ بول رہا ہوں اور کوئل پر الزام لگا رہا ہوں۔ مجھے کیا ضرورت ہے یہ سب کرنے کی۔ میں اتنا گھٹیا اور ضیعت انسان نہیں۔“ آزر چیخ چیخ کر اپنی سچائی کا یقین دلانے لگا اور یعنی خاموشی سے اس کی باتیں سنتی رہی۔

”اگر تمہیں میری باتوں پر یقین نہیں آ رہا تو میں تمہیں ٹھوس ثبوت دے سکتا ہوں پھر تمہیں یقین آجائے گا کہ کون سچا ہے۔“ آزر نے کہا۔

”کیسے ثبوت؟“ یعنی نے چونک کر پوچھا۔

”وہ ثبوت جنہیں دیکھ کر تمہیں خود بہ خود یقین آجائے گا کہ کون سچا ہے اور کون جھوٹا۔ کل تم میرے ڈینش والے گھر میں آنا تو میں تمہیں سب کچھ دکھاؤں گا۔ کوئل کیا کچھ کرتی رہی ہے اور اس نے مجھے کس طرح ٹریپ کرنے کی کوشش کی ہے اور وہ ثبوت بھی دوں گا جو اس نے تمہارے بارے میں میرے دل میں نفرت ڈالنے کے لیے بھیجے تھے۔

تم سوچ نہیں سکتیں کہ کوئل کیا تھی۔ اوہ مائی گاڈ..... تمہیں میں کیسے یقین دلاؤں تم سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھو گی پھر تمہیں یقین آئے گا اور یہ سب کچھ تمہیں ابھی دکھانا بہت ضروری ہے ورنہ ہم دونوں کے درمیان فاصلے بڑھتے جائیں گے۔“

آزر نے کہا تو وہ خاموش ہو گئی۔

”تم آؤ گی یا نہیں؟“ آزر نے اصرار کرتے ہوئے پوچھا۔

”کل بتاؤں گی۔“ یعنی نے جواب دیا۔

”لیکن میرے لیے یہ سب کچھ ہے۔“ یعنی نے محسوس لہجے میں جواب دیا۔

”میں آؤں گی۔“ آزر نے کہا۔

”نہیں، مجھے زیادہ باتیں۔“ آزر ضد کرنے لگا۔

”آزر پلزز آج نہیں۔ مجھے نوٹس مکمل کرنے ہیں۔“ یعنی نے کہا۔

”نہیں..... اگر تم مجھ سے محبت کرتی ہو تو آج

”لیکن میرے لیے یہ سب کچھ ہے۔“ یعنی نے محسوس لہجے میں جواب دیا۔

”میں آؤں گا۔“ آزر نے کہا۔

”نہیں، یار ایسی کوئی بات نہیں۔ ایگزامز کے بعد میں تم سے بات کروں گی۔“ یعنی نے کہا۔

”نہیں، مجھے آج اور ابھی تم سے باتیں کرنی ہیں۔ بہت زیادہ باتیں۔“ آزر ضد کرنے لگا۔

”آزر پلزز آج نہیں۔ مجھے نوٹس مکمل کرنے ہیں۔“ یعنی نے کہا۔

”نہیں..... اگر تم مجھ سے محبت کرتی ہو تو آج

میں کوئی انکار نہیں سنوں گا۔“ آزر نے اتنے ٹھوس لہجے میں کہا تو یعنی خاموش ہو گئی۔

”اوکے، کیا کہنا چاہتے ہو؟“ یعنی نے کچھ سوچتے ہوئے گہری سانس لے کر پوچھا۔

”مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے تم مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش کر رہی ہو اور شاید اسی لیے مجھے avoid بھی کر رہی ہو؟“ آزر نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

”نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔“ یعنی نے جواب دیا۔

”یعنی مجھے صاف، صاف بتاؤ۔“ آزر نے کہا۔

”میرے بارے میں کیا کہا ہے؟“ آزر نے کہا۔

”نہیں.....؟“ یعنی نے چونک کر انتہائی حیرت سے پوچھا۔

”نہیں آف کورس۔“ آزر نے کہا۔

”نہیں آف کورس۔“ آزر نے کہا۔

”نہیں آف کورس۔“ آزر نے کہا۔

”نہیں آف کورس۔“ آزر نے کہا۔



دینے لگی۔

☆☆☆

”مما کیا آپ ریڈی ہیں میں آپ کو انٹرویو کر رہا ہوں۔“ تو قیر نے ماں کی طرف دیکھ کر کہا جو واپس امریکا جا رہی تھیں۔

”میں بہت کچھ سوچ کر آئی تھی مگر تم مجھے پھر یونہی پریشان اور مایوس بھیج رہے ہو۔“ نجمہ نے غم آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

”تھنک یو..... آپ امریکا سے اسپیشلی میرے لیے آئیں۔“ اس نے بڑی محبت سے انہیں تھام کر کہا۔

”تم اپنے اور میرے رشتے کو بہت قائل لیتے ہو، کاش کبھی تمہیں اندازہ ہو کہ جب اولاد بیمار یا دھکی ہوئی ہے تو ماں کے دل پر کیا گزرتی ہے۔“ نجمہ نے آہ بھر کر اسے اپنے ساتھ لگا کر کہا۔

”آئی ایم سوری..... آپ میری وجہ سے بہت اپ سیٹ رہتی ہیں۔“ تو قیر نے آنکھوں سے ان کی طرف دیکھ کر بولا۔

”تو قیر..... وہاں امریکا میں میرا دل نہیں لگتا، پلینز بیٹا پاکستان چلو..... ہم دونوں مل کر وہاں رہتے ہیں، اب رشنا بھی کینیڈا جانے والی ہے، اس کے ڈاکومنٹس کمپلیٹ ہو گئے ہیں، ورنہ وہی میرے پاس پاکستان میں رہ جاتی۔“ نجمہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر التجا سے انداز میں کہا تو قیر خاموش ہو گیا۔

”تمہاری اس خاموشی کا میں کیا مطلب سمجھوں؟“ انہوں نے ہنسی سے اسے دیکھ کر کہا۔

”میرے پاس آپ کے کسی سوال کا جواب نہیں۔“ تو قیر ان کی طرف دیکھے بغیر بولا۔

”پھر ٹھیک ہے آئندہ نہ میں تم سے کوئی بات کروں گی اور نہ ہی کسی بات کے لیے اصرار کروں گی۔“ نجمہ نے غصے سے کہا اور اپنا شولڈر بیک اور ہینڈ کیری پکڑ کر باہر جانے لگیں۔

”مما پلیز..... یوں ناراض ہو کر نہ جائیں۔“ اس نے پریشان ہو کر ان کے پیچھے بھاگتے ہوئے کہا۔ نجمہ اپنی آنکھوں کو ٹشو پیپر سے صاف کرتے ہوئے آگے بڑھتی چلی گئیں۔

☆☆☆

ردا کمرے میں موجود نہیں تھی۔ روجیل بیڈ کی بیک کے ساتھ ٹیک لگائے ٹی وی چینل پر ایک موسیقی دیکھنے میں مصروف تھا۔ سائڈ ٹیبل پر پڑا ردا کا موبائل بجنے لگا تو روجیل نے ایک ٹک دیکھ کر اسے اٹھایا unknown نمبر دیکھ کر کان سے لگا کر ہیلو کہا۔

”ہیلو..... آئی تھنک آپ روجیل بھائی ہیں ناں!“ رشنا خوشگوار لہجے میں بولی۔

”جی..... آپ کون؟“ روجیل نے چونک کر سنجیدگی سے پوچھا۔

”میں رشنا..... ردا کی فرینڈ ہوں، آج میں کینیڈا جا رہی ہوں، ردا سے بات کرنا چاہ رہی تھی۔ کہاں ہے وہ؟“ رشنا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”کچن میں۔“ روجیل نے کہا۔

”ردا اور کچن میں؟“ رشنا نے انتہائی حیرت سے پوچھا۔

”ہاں، تو اس میں حیرت کی کیا بات ہے، وہ میرے لیے چائے بنانے گئی ہے۔“ روجیل نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”اٹس امیزنگ..... مجھے اس نے کبھی خود سے چائے بنا کر نہیں پلائی مگر آپ کے لیے وہ خود چائے بنانے لگی ہے۔“ رشنا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ہاں“ رشنا نے مسکرتے ہوئے کہا۔

”یہ آپ کیسے کہہ سکتی ہیں؟“ روجیل نے چونک کر پوچھا۔

”جناب، میں پانچ سالوں سے اس کی



شادی کی تصویریں دیکھ رہی تھیں جیسی شہیلہ چائے کا گک پڑے لاؤنج میں آکر بیٹھ گئی۔

”اور روجیل بھائی بھی کتنے خوب صورت لگ رہے تھے۔ شادی ریسب یہی کہہ رہے تھے کہ چاند سورج کی جوڑی لگتی ہے دونوں کی۔“ زاہدہ ان کی طرف دیکھ کر بولی۔

”ہاں..... اللہ نظر بد سے بچائے۔“ خدیجہ مسکرا کر دعائے لہجے میں کہنے لگیں۔ ”اللہ میری بچی کا نصیب اچھا کرے۔“

”انشاء اللہ اچھا ہی ہوگا۔ ردا بی بی ہیں ہی بڑی نصیب والی۔ جہاں جاتی ہیں محبتیں ہی سمیٹتی ہیں، یہاں تھیں تو سب کی آنکھوں کا تارا تھیں اور اب ساس ملی ہیں کہ بلائیں لیتے نہیں تھکتیں۔ اتنی محبتیں بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہیں۔“ زاہدہ نے اچانک شہیلہ کی طرف دیکھ کر کہا۔

”زاہدہ..... یہ تم مجھے دیکھ کر کیوں بات کر رہی ہو؟“ شہیلہ خفگی سے بولی۔

”ک..... ک..... ک.....“ زاہدہ نے بولنا کر کہا۔ ”میں اچھی طرح تمہاری باتوں کا مطلب جانتی ہوں۔ آپ ان دو لکے کی نوکرائیوں کو اپنے ساتھ ملا کر میرے خلاف محاذ بنا رہی ہیں ناں؟“ شہیلہ نے ساس کی طرف دیکھ کر غصے سے کہا۔

”یہ گھر ہے بیٹی کوئی میدان جنگ نہیں..... جہاں میں محاذ بناؤں گی، تم فضول باتیں سوچنا چھوڑ دو۔“ انہوں نے ایک دم چونک کر خفگی سے کہا۔

”ہاں..... میں بھی فضول اور..... میری باتیں بھی فضول..... سب سے اچھی تو آپ اور آپ کی ردا ہے پامچیر نوکرائیاں.....“ شہیلہ طنزیہ لہجے میں بولی۔

”جو کچھ آپ میرے ساتھ کر رہی ہیں، اللہ کرے آپ کی ردا کے ساتھ بھی ہو۔ وہ بھی خوش نہ رہے۔“ شہیلہ نے اٹھتے ہوئے غصے سے کہا۔

”خبردار..... جو ردا کا نام لیا.....“ خدیجہ نے

”یہ موبائل تم میرے پاس چھوڑ جاؤ..... بعد میں تمہیں بتاؤں گا جو میں نے سوچ رکھا ہے۔“ حیدر نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

”ٹھیک یو یار..... تم نے بہت cooperate کیا۔ شادی پر بھی اپنے گارڈ بھیجے.....“ فہام نے مسکرا کر اٹھتے ہوئے کہا۔

”تمہاری بہن میری کچھ نہیں لگتی؟“ حیدر مسکراتے ہوئے بولا۔

”آف کورس.....“ فہام نے مسکراتے ہوئے کہا تو فہام باہر جانے لگا۔

”چلو اکٹھے چلتے ہیں، مجھے بھی ایک ضروری کام سے باہر جانا ہے۔“ حیدر نے اس کے ساتھ باہر جاتے ہوئے کہا اور دونوں کارڈرو میں سے گزرے۔ وہ باتیں کرتے جا رہے تھے۔ فرحان کو ایک سپاہی ہتھکڑی لگائے دوسری جانب لے کر جا رہا تھا۔ فرحان نے ایک دم چونک کر فہام کو دیکھا اور کچھ سوچتے ہوئے معنی خیز انداز میں آنکھیں گھمانے لگا۔

”اوہ..... تو یہ کارستانی تمہاری ہے۔“ فرحان نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے سوچا اور اس نے انتہائی انداز میں فہام کی طرف دیکھا..... سپاہی نے اسے لے جا کر لاک اپ میں بند کر دیا۔

فہام، حیدر علی کے ساتھ باتیں کرتا ہوا باہر چلا گیا اور پھر اس سے ہاتھ ملا کر اپنی گاڑی کی جانب چلا گیا۔ فہام مطمئن تھا کہ حیدر علی فرحان کو ایسی سزا ضرور دے گا جس کا وہ مستحق ہے..... لیکن فہام کو دیکھ کر فرحان کے اندر جو آگ بھڑکی تھی وہ اس کی جلن سے انتہائی مضطرب ہو کر دیوار پر کے مارنے لگا۔

☆☆☆

”جیک صاحب! ہماری ردا بی بی کتنی خوب صورت لگ رہی ہیں، بالکل پری لگ رہی ہیں۔ اتنی پیاری جیسے چاند کی ملکہ۔“ زاہدہ نے مسکراتے ہوئے تصویریں دیکھ کر خدیجہ جیکم سے کہا۔ وہ دونوں بیٹی ردا کی

”اوکے..... میں آتا ہوں۔“ فہام نے کہا جبکہ حاتم اس کے پیچھے کھڑا تمام باتیں سن رہا تھا۔ فہام مڑا تو حاتم کو سامنے پا کر چونک گیا۔

”اوہ..... حاتم تم.....؟“ فہام نے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا تو حاتم نے بغور اس کی جانب دیکھا۔ ”مجھے تمہارا وہ موبائل چاہیے..... جس پر تمہیں میسجز آتے رہے ہیں۔“

”کیوں.....؟“ حاتم نے چونک کر پوچھا۔ ”بس ضرورت ہے۔“ فہام نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

”کس کو.....؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔ ”جب میں کہہ رہا ہوں تو تمہیں argue کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ تم مجھے وہ موبائل دو۔ اب کے فہام خفگی سے بولا۔

”آپ مجھ سے وہ شخص کیوں چھپانا چاہ رہے ہیں، کیا آپ کو مجھ پر اعتبار نہیں؟“ حاتم نے عجیب انداز سے کہا۔

”اعتبار بہت ہے..... مگر مجھے تمہارے غے اور جذباتی پن سے ڈر لگتا ہے، جس پر تمہیں خود بھی کنٹرول نہیں ہوتا..... اس لیے تم مجھے وہ موبائل دے دو اور خاموش رہو۔“ فہام نے گہری سانس لے کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ خاموش ہو گیا اور اسے موبائل دے دیا۔

فہام پولیس اسٹیشن گیا تو حیدر علی اس کا ہی تھا۔ فہام نے اسے موبائل دیا اور وہ موبائل لے کر میسجز چیک کرنے لگا اور اس کے چہرے پر خفگی کے تاثرات نمایاں ہونے لگے۔

”فرحان بہت ہی گھٹیا انسان ہے، اس نے بڑی گہری چال چلی ہے اور چال بھی اس انداز سے چلی ہے کہ وہ آسانی سے پکڑا نہ جاسکے۔“ حیدر نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ”کیا مطلب؟“ فہام نے چونک کر پوچھا۔

دوست ہوں اور اچھی طرح جانتی ہوں کہ آپ اس کی زندگی میں آنے والے پہلے مرد ہیں، جس سے ردا نے شدید محبت کی ہے، آپ بھی میری فریڈ کی محبت کی بہت ویلیو کیجیے گا۔ اتنی سوئٹ لڑکی بہت نصیب والوں کو ملتی ہے۔“ رشٹا نے مسکراتے ہوئے کہا تو روجیل کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی اسی وقت ردا ٹرے میں چائے کے دو گلوں رکھ کر لائی۔ ”تمہاری فریڈ رشٹا کی کال ہے۔“ روجیل نے جلدی سے موبائل اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”اوہ..... رشٹا!“ ردا مسکراتے ہوئے بولی اور وہ فون لے کر اس سے باتیں کرنے لگی جبکہ روجیل مسکرا کر اسے دیکھتے ہوئے چائے پینے لگا۔

☆☆☆

فہام لاؤنج میں کھڑا موبائل پر حیدر علی سے بات کرنے میں مصروف تھا۔ ”یار، فہام اگر پائل ہو تو مجھے اپنے موبائل میں وہ میسج دکھا دو، جو فرحان نے تم لوگوں کو کیے ہیں۔“ ”کیوں..... خیریت تو ہے؟“ فہام نے چونک کر پوچھا۔

”ہاں، ہاں خیریت ہی ہے، اکیچو ٹیلی فرحان اس بات کو نہیں مانتا کہ اس نے کسی کو رانگ کالزیا میسج کے ذریعے پریشان کیا ہے۔“ حیدر نے اسے بتایا۔ ”لیکن یار..... اس سے تو ساری بات کھل جائے گی کہ ہم نے ہی اس کی شکایت کی ہے.....“ فہام نے حیرت سے کہا۔

”یار..... اب تم پولیس والوں کو اتنا بے وقوف بھی نہ سمجھو کہ ہم ساری بات اس پر ظاہر کر دیں گے۔“ ان فیکٹ میں ان میسجز کے ذریعے پوری ڈیٹیل لینا چاہتا ہوں، میں اپنی پوری کوشش سے ابھی اس کی ضمانت نہیں ہونے دے رہا..... تم بے فکر ہو کوئی..... گورڈ نہیں ہونے دوں گا۔“ حیدر نے مسکراتے ہوئے کہا۔



کون کہتا ہے کہ؟

# اولاد نہیں ہو سکتی

آج بھی لاکھوں گھرانے اولاد کی نعمت سے محروم سخت پریشان ہیں۔ مایوسی گناہ ہے۔ انشاء اللہ اولاد ہوگی۔ خاتون میں کوئی اندرونی پر اہلم ہو یا مردانہ جراثیم کا مسئلہ۔ ہم نے دیسی طبی یونانی قدرتی جڑی بوٹیوں سے ایک خاص قسم کا بے اولادی کدس تیار کیا ہے۔ جو آپ کے آنگن میں بھی خوشیوں کے پھول کھلا سکتا ہے۔ آپکے گھر میں بھی خوبصورت بیٹا پیدا ہو سکتا ہے۔ آج ہی گھر بیٹھے فون پر تمام حالات سے آگاہ کر کے بذریعہ ڈاک وی پی VP بے اولادی کورس منگوائیں۔

المسلم دارالحکمت جسرڈ (دواخانہ) ضلع و شہر حافظ آباد۔ پاکستان

0300-6526061  
0547-521787

فون اوقات

صبح 9 بجے سے رات 11 بجے تک

آپ ہمیں صرف فون کریں  
دوائی آپ تک ہم پہنچائیں گے

طرف دیکھ رہا تھا اور کھانا کھاتے ہوئے دونوں آہستہ آہستہ بائیں کر رہے تھے۔  
”رہا..... میں نے ماں جی کے ساتھ بہت بار ڈاؤن لائف لائف گزاری ہے، سوچتا تھا زندگی یوننی طرز پر جائے گی مگر تمہارے آنے سے ہمارے گھر میں ایک پلینٹ چھینچ آیا ہے۔“ روہیل مسکراتے ہوئے بولا۔  
”کیسا چھینچ.....؟“ روا مسکراتے ہوئے بولی۔  
”ماں جی..... بہت خوش دکھائی دینے لگی ہیں، ورنہ ہر وقت اداس رہتی تھیں۔ میں انہیں خوش رکھنے کی بہت کوشش کرتا تھا مگر کبھی ایسے خوش نہیں کر سکا جیسے تم نے کرویا ہے۔“ روہیل مسکراتے ہوئے بولا۔  
”ماں جی..... ہیں بھی تو بہت اچھی.....“ روا مسکراتے ہوئے بولی۔  
”اور..... تم؟“ روہیل نے جان بوجھ کر اسے ستانے کی خاطر پوچھا۔  
”یہ تو آپ کو معلوم ہونا چاہیے۔“ روا نے مسکراتے ہوئے کہا۔  
”ہاں..... دل تو کچھ اچھا، اچھا ہی بولتا ہے، تمہارے بارے میں۔“ روہیل نے محبت سے اسے دیکھتے ہوئے کہا اور ٹیبل پر پڑے پھولوں میں سے ایک خوب صورت پھول نکال کر روا کو دیا تو اس نے مسکرا کر پھول پکڑ لیا۔ کچھ فاصلے پر ایک آدمی کولڈ ڈرنک پیتے ہوئے مسکرا کر روا کو گھور رہا تھا۔ اچانک روہیل کی نظر اس پر پڑی تو وہ بری طرح چونکا۔  
”میرا خیال ہے اب ہمیں چلنا چاہیے۔“ روہیل نے ایک دم موڈ بدل کر سنجیدگی سے کہا۔  
”اوکے.....!“ روا نے مسکرا کر اٹھتے ہوئے کہا اور وہ اپنا بیگ کندھے پر ڈال کر اس کے ہمراہ باہر نکلی جبکہ روہیل اس آدمی کو قتل گھورتا ہوا باہر نکلا۔ اس کے چہرے پر خفگی کے آثار تھے جبکہ روا اس صورت حال سے بے خبر اپنی دھن میں مسکرا رہی تھی۔

جی نے بیٹے کو سمجھاتے ہوئے کہا۔  
”افوہ..... ماں جی..... آپ کن چکروں میں پڑ گئی ہیں، مجھے یہ ناز خرے اور چونچلے اٹھانا بالکل پسند نہیں۔“ روہیل نے جھنجھلا کر کہا۔  
”پسند ہیں یا نہیں..... مگر تمہیں یہ سب خرے اٹھانے ہیں، میری خاطر.....“ ماں جی نے خفگی سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔  
”اوہ..... گاڈ! اب بتائیے کیا کرنا ہے؟“ وہ سوالیہ انداز میں بولا۔  
”فی الحال تو تم بہو کو لے کر باہر جاؤ، اسے گھماؤ پھراؤ، کہیں کھانا کھلاؤ..... لاگ ڈرائیو پر جاؤ، اسے بہت بہت انجوائے کراؤ۔ شاپنگ کراؤ۔“ ماں جی نے کہا تو روہیل ہنس دیا۔  
”آپ کو اکیلے چھوڑ کر..... نہیں نہیں۔“ روہیل فوراً بولا۔  
”تم میری فکر نہ کرو، میں پہلے بھی تو گھر میں اکیلی رہی تھی ناں، تم اسے لے کر جاؤ۔“ ماں جی نے کہا تو روا اسی وقت اپنے کمرے سے باہر نکلی۔  
”رہا! جلدی سے تیار ہو جاؤ، روہیل تمہیں گھمانے کے لیے باہر لے کر جا رہا ہے۔“ ماں جی نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو اس نے چونک کر روہیل کی طرف دیکھا۔  
”اوکے جلدی سے تیار ہو جاؤ۔“ روہیل نے ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا تو روا مسکرا کر اندر چلی گئی۔  
”بیٹا! ایسی باتوں سے محبت بوھتی اور مضبوط ہوتی ہے۔“ ماں جی نے مسکراتے ہوئے کہا تو روہیل بھی مسکراتے لگا۔

☆☆☆

رہا اور روہیل ایک ریسٹورنٹ میں کینڈل لائٹ ڈنر کرنے میں مصروف تھے۔ روا بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ روہیل مسکرا کر اس کی

اسے غصے سے ڈانٹتے ہوئے کہا تو وہاں سے چلی گئی۔  
”نیگم صاحبہ! میرا تول ڈرنے لگا ہے، ان کی حاسد نظریں کہیں ردا بی بی کو.....“ زاہدہ نے گھبرا کر ان کی طرف دیکھ کر کہا۔  
”اللہ نہ کرے..... یہ لو ردا کا صدقہ نکال دینا..... اللہ میری بچی پر رحم کرے اور حاسدین کی بد نظریں سے بچائے۔“ خدیجہ نے گھبرا کر پیسے نکالتے ہوئے کہا اور زاہدہ گھبرا کر اٹھ گئی۔

☆☆☆

ماں جی لاؤنج میں جا نماز بچائے مغرب کی نماز پڑھ رہی تھیں۔ روہیل قدرے تھکے ہوئے انداز میں لاؤنج میں داخل ہوا اور آکر فریج میں سے پانی کی بوتل نکال کر پانی پینے لگا۔ ماں جی جا نماز لپیٹ کر اس کے پاس آئیں۔  
”روہیل تم دوپہر کو کھر سے گئے تھے اور اب آ رہے ہو، کہاں تھے تم.....؟“ ماں جی مصنوعی خفگی سے بولیں۔  
”آفس میں۔“ روہیل نے تھکے تھکے انداز میں جواب دیا۔  
”کیوں تم تو چھٹیوں پر ہو۔“ ماں جی نے چونک کر پوچھا۔  
”کچھ ڈاکومنٹس کا مسئلہ تھا اور بہت ارجنٹ کام بھی تھا۔“ اس نے کہا۔  
”جو بھی تھا، تمہیں ردا کو اکیلے چھوڑ کر نہیں جانا چاہیے تھا۔ بے چاری سارا دن اندر باہر پھرتی رہی۔“ ماں جی نہایت خفگی سے بولیں۔  
”تو کیا ہوا؟“ روہیل بے رخی سے بولا۔  
”بیٹا، ردا نئی ٹوبلی ڈھن ہے، یہ تو اس کے ناز خرے اٹھانے کے دن ہیں، بہو جب سسرال آتی ہے تو شوہر اور سسرال کی محبت اس کے لیے خوب صورت یادیں بن جاتی ہیں اور یہی یادیں اس کے دل میں شوہر اور سسرال کی قدر پیدا کرتی ہیں۔“ ماں



لگ رہی تھی۔

”بیٹا! تم لوگ اتنی جلدی آگئے..... میں تو ابھی نماز اور وظائف پڑھ کر فارغ ہوئی ہوں اور تم لوگ ابھی گئے۔“ ماں جی نے دونوں کو دیکھا اور مسکراتے ہوئے کہا۔

”کیا کہیں گھومنے پھرنے نہیں گئے؟“ ماں جی نے ردا کو بغور دیکھتے ہوئے پوچھا تو اس نے گھبرا کر رو جیل کی طرف دیکھا۔

”آپ گھر پر اکیلی تھیں، اس لیے ہم صرف کھانا کھا کر آگئے۔“ رو جیل جلدی سے بتانے لگا۔

”کیا بات ہے، ردا کا چہرہ کیوں اُترا ہوا ہے؟“ ماں جی نے ردا کو دیکھ کر کہا۔

”ک..... کچھ نہیں..... ماں جی! میں تو بالکل ٹھیک ہوں۔“ ردا نے بڑبڑا کر جلدی سے کہا۔

”جانتے وقت تو تم بہت خوش تھیں۔“ ماں جی اس کی طرف بغور دیکھ کر بولیں۔

”رو جیل! کیا تم نے ردا سے کچھ کہا ہے؟“ انہوں نے رو جیل سے پوچھا۔

”نہیں..... میں نے کیوں کچھ کہا تھا، آپ ردا سے خود ہی پوچھ لیں۔“ اس نے جھانپتے ہوئے کہا۔

”نہیں..... نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔ بس میں تھک گئی ہوں۔“ ردا جلدی سے بولی۔

”اچھا..... جاؤ آرام کرو۔“ ماں جی نے ردا کے سر پر پیار دیتے ہوئے کہا تو اس نے زبردستی مسکرا کر ماں جی کو دیکھا اور کمرے میں چلی گئی۔

”بیٹا! بہو کو خوش رکھنے کی کوشش کیا کرو، بہت اچھی لڑکی ہے۔“ انہوں نے بیٹی کی طرف دیکھ کر کہا۔

”کیوں..... اس نے کوئی شکایت کی ہے؟“ رو جیل نے چونک کر پوچھا۔

”بالکل بھی نہیں..... مگر نہ جانے کیوں مجھے اس کے چہرے کی اداسی دیکھ کر کچھ محسوس ہو رہا ہے۔“ ماں جی گہری سانس لے کر بولیں۔

”کیوں ناں..... beach کا پروگرام بنائیں۔ مزہ آئے گا۔“ عاصم نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

”ہاں، یہ ٹھیک ہے۔“ فہام مسکراتے ہوئے بولا تو شہیلہ انہیں دیکھ کر رہ گئی۔

”شہیلہ! کیا خیال ہے، اس سنڈے کو پروگرام ٹھیک رہے گا؟“ فہام نے شہیلہ کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

”ہاں، ہاں، ایز پوش..... اچھا ہے، سب مل کر خوب انجوائے کریں گے۔“ وہ زبردستی مسکراتے ہوئے بولی۔

”ہاں۔ تو بس ٹھیک ہے۔ میں سب اترتھن کرلوں گا۔“ فہام نے کہا اور جلدی سے ردا کا نمبر ملانے لگا۔ وہ دونوں ابھی گھر نہیں پہنچے تھے۔ ردا کے پاس میں پکڑا موبائل پھر بجنے لگا۔ فہام کی کال آ رہی تھی، ردا نے رو جیل کی طرف دیکھا اور رو جیل نے ایک ٹیک اس کے موبائل کی طرف دیکھا اور منہ پھیر لیا۔ کافی بیلز کے بعد کال ڈراپ ہو گئی۔ ردا کی آنکھیں نم ہونے لگیں اور اس نے موبائل آف کر کے بیک میں رکھ لیا اور ششے سے باہر دیکھنے لگی۔

”ردا کال اینڈ نہیں کر رہی..... آئی تھنک بڑی ہوگی۔ ماما! کل آپ اسے فون کر کے سنڈے کے پروگرام کے بارے میں بتا دیجیے گا اور آپ ان کی ماں جی کو بھی ساتھ چلنے کا کہہ دیجیے گا۔ بہت اچھی خاتون ہیں وہ۔“ فہام نے موبائل آف کر کے ماں کی طرف دیکھ کر کہا۔

”ہاں، کل میں خود ان سے بات کروں گی۔“ خدیجہ مسکراتے ہوئے کہنے لگیں۔

☆☆☆

ماں جی نماز کی چادر اوڑھے لاؤنج میں آئیں ان کے ہاتھ میں میڈیسنز کا لفافہ تھا۔ وہ فرنیچ میں سے پانی کی بوتل نکال کر وہیں صوفے پر بیٹھ گئیں۔

جب ردا اور رو جیل قدرے تھکے ہوئے انداز میں لاؤنج میں داخل ہوئے۔ ردا قدرے خاموش

رہی۔

”میں نے کہا تو تھا۔ وہ دونوں ڈنر کرنے باہر گئے ہوئے تھے۔“ فہام نے ماں کو بتایا۔

”ہم سے بھی مل کر چلی جاتی..... کئی روز سے اسے دیکھا نہیں تو دل بہت اداس ہو رہا ہے۔“ انہوں نے بیٹی کو یاد کرتے ہوئے کہا۔

”میں نے کہا تو تھا..... مگر رو جیل کی ماں جی گھر پر اکیلی تھیں۔ یا عاصم! کوئی آؤٹنگ کا پروگرام ہی بناؤ۔ ردا اور رو جیل کے ساتھ انجوائے کریں گے۔“ فہام نے عاصم کی طرف دیکھ کر کہا۔

”اچھا..... میں کوشش کروں گی اپنا خیال رکھے گا۔“ ردا نے رو جیل کی طرف دیکھ کر کہا۔

”فہام چننا.....“ فہام محبت بھرے لہجے میں بولا تو ردا نے مسکراتے ہوئے موبائل آف کر دیا۔

”فہام بھائی میرے بغیر بہت اداس ہو رہے تھے۔“ ردا نے افسردگی سے کہا۔

”ردا! اب تم شادی شدہ ہو اور اب تم میں سے یہ بچپنا ختم ہو جانا چاہیے۔“ رو جیل قدرے تنبیہی لہجے میں بولا۔

”تمہاری میلی کی تمہارے ساتھ بہت زیادہ اچھنٹ پیسا درمنٹ کے بعد ان کی فون کالز آتا..... ان کا تمہیں اور تمہارا ان کو س کرنا..... یار یہ سب کیا ہے، مجھے بہت آکڑو لگتا ہے، پلیز اب اپنے لائف اسٹائل میں چینج لاؤ..... اب مجھے اور ماں جی کو تمہاری توجہ کی زیادہ ضرورت ہے۔“ رو جیل نے کندھے اچکا کر کھٹکی سے کہا تو ردا خاموش ہو گئی۔

☆☆☆

سب لوگ ڈائننگ ٹیبل کے گرد بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ زاہدہ پانی کے گلاس اور سوٹ ڈش لا کر رکھ رہی تھی۔ فہام بھی موبائل آف کر کے کھانا کھانے لگا۔

”ردا سے بات کر رہا تھا۔ وہ دونوں ڈنر کرنے باہر گئے ہوئے تھے۔“ فہام نے ماں کو بتایا۔

”ہم سے بھی مل کر چلی جاتی..... کئی روز سے اسے دیکھا نہیں تو دل بہت اداس ہو رہا ہے۔“ انہوں نے بیٹی کو یاد کرتے ہوئے کہا۔

”میں نے کہا تو تھا..... مگر رو جیل کی ماں جی گھر پر اکیلی تھیں۔ یا عاصم! کوئی آؤٹنگ کا پروگرام ہی بناؤ۔ ردا اور رو جیل کے ساتھ انجوائے کریں گے۔“ فہام نے عاصم کی طرف دیکھ کر کہا۔

”اچھا..... میں کوشش کروں گی اپنا خیال رکھے گا۔“ ردا نے رو جیل کی طرف دیکھ کر کہا۔

”فہام چننا.....“ فہام محبت بھرے لہجے میں بولا تو ردا نے مسکراتے ہوئے موبائل آف کر دیا۔

”فہام بھائی میرے بغیر بہت اداس ہو رہے تھے۔“ ردا نے افسردگی سے کہا۔

”فہام بھائی اور میں بھی آپ کے بغیر بہت زیادہ اچھنٹ پیسا درمنٹ کے بعد ان کی فون کالز آتا..... اس کی طرف دیکھا۔ اس طرح کتا ہو رو جیل نے ناگواری سے اپنے بھائی سے ہی کر رہی ہوتی اسے اچھی نہ لگتیں۔

”اچھا تاہا، اس وقت تم کہاں ہو؟“ فہام نے پوچھا۔

”میں اور رو جیل باہر ڈنر کے لیے آئے تھے۔“ اب گھر واپس جا رہے ہیں۔“ ردا نے مسکرا کر رو جیل کی طرف دیکھ کر کہا۔

”تو پھر ہماری طرف سے ہو کر جاؤ ناں..... تمہیں دیکھنے کو میرا دل بہت بے چین ہو رہا ہے۔“ فہام جذباتی انداز میں بولا۔

”اوکے..... ایک منٹ ٹھہریں۔“ ردا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”فہام بھائی مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ آنے کو کہہ رہے ہیں۔“ ردا نے موبائل سائڈ پر کر کے رو جیل سے پوچھا۔

”نہیں، نہیں..... ماں جی گھر پر اکیلی ہیں۔“ رو جیل ساٹ لہجے میں بولا۔

”فہام بھائی! میں آج نہیں آسکتی، ماں جی گھر پر اکیلی ہیں، ویسے بھی کافی دیر ہو چکی ہے۔“ ردا نے بھائی کو بتا دیا۔

”اوکے..... پھر کل آ جانا۔“ فہام نے نرمی سے کہا۔

رو جیل گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا مگر اس کا موڈ کچھ آف تھا۔ ردا اس کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھی تھی جیسی فہام کا فون آ گیا اور ردا ان سے بات کرنے میں مصروف ہو گئی۔

”ارے..... نہیں نہیں فہام بھائی آپ کی سوٹ ڈول آپ کو بھلا کیسے بھول سکتی ہے۔ یہ آپ نے کیسے سوچ لیا۔“ ردا مسکراتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

”اتنے روز سے نہیں آئی ہو، تمہارے بغیر میں بہت اداس ہو رہا ہوں۔“ فہام نے فرط محبت سے کہا۔

”فہام بھائی اور میں بھی آپ کے بغیر بہت زیادہ اداں ہوں۔“ ردا نے مسکرا کر آنکھیں پھیلا کر بچوں کی طرح کتا ہو رو جیل نے ناگواری سے اس کی طرف دیکھا۔ اس طرح کی باتیں جا رہے وہ اپنے بھائی سے ہی کر رہی ہوتی اسے اچھی نہ لگتیں۔

”اچھا تاہا، اس وقت تم کہاں ہو؟“ فہام نے پوچھا۔

”میں اور رو جیل باہر ڈنر کے لیے آئے تھے۔“ اب گھر واپس جا رہے ہیں۔“ ردا نے مسکرا کر رو جیل کی طرف دیکھ کر کہا۔

”تو پھر ہماری طرف سے ہو کر جاؤ ناں..... تمہیں دیکھنے کو میرا دل بہت بے چین ہو رہا ہے۔“ فہام جذباتی انداز میں بولا۔

”اوکے..... ایک منٹ ٹھہریں۔“ ردا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”فہام بھائی مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ آنے کو کہہ رہے ہیں۔“ ردا نے موبائل سائڈ پر کر کے رو جیل سے پوچھا۔

”نہیں، نہیں..... ماں جی گھر پر اکیلی ہیں۔“ رو جیل ساٹ لہجے میں بولا۔

”فہام بھائی! میں آج نہیں آسکتی، ماں جی گھر پر اکیلی ہیں، ویسے بھی کافی دیر ہو چکی ہے۔“ ردا نے بھائی کو بتا دیا۔

”اوکے..... پھر کل آ جانا۔“ فہام نے نرمی سے کہا۔

”فہام بھائی اور میں بھی آپ کے بغیر بہت زیادہ اچھنٹ پیسا درمنٹ کے بعد ان کی فون کالز آتا..... اس کی طرف دیکھا۔ اس طرح کتا ہو رو جیل نے ناگواری سے اپنے بھائی سے ہی کر رہی ہوتی اسے اچھی نہ لگتیں۔

”اچھا تاہا، اس وقت تم کہاں ہو؟“ فہام نے پوچھا۔

”میں اور رو جیل باہر ڈنر کے لیے آئے تھے۔“ اب گھر واپس جا رہے ہیں۔“ ردا نے مسکرا کر رو جیل کی طرف دیکھ کر کہا۔

”تو پھر ہماری طرف سے ہو کر جاؤ ناں..... تمہیں دیکھنے کو میرا دل بہت بے چین ہو رہا ہے۔“ فہام جذباتی انداز میں بولا۔

”اوکے..... ایک منٹ ٹھہریں۔“ ردا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”فہام بھائی مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ آنے کو کہہ رہے ہیں۔“ ردا نے موبائل سائڈ پر کر کے رو جیل سے پوچھا۔

”نہیں، نہیں..... ماں جی گھر پر اکیلی ہیں۔“ رو جیل ساٹ لہجے میں بولا۔

”فہام بھائی! میں آج نہیں آسکتی، ماں جی گھر پر اکیلی ہیں، ویسے بھی کافی دیر ہو چکی ہے۔“ ردا نے بھائی کو بتا دیا۔

”اوکے..... پھر کل آ جانا۔“ فہام نے نرمی سے کہا۔



میں آ بیٹھی۔

بنا کر جواب دیا۔

”وہ تمہارے لیے ضروری ہوگا۔۔۔۔۔ میرے لیے نہیں، سوری میں نہیں جا رہی۔“ حسہ نے اپنی کتاب پکڑتے ہوئے کہا۔

”وہ تمہارے لیے بھی اہم ہے اگر نہ ہوتا تو میں تمہیں کبھی لینے نہیں آتی۔ حسہ بس مجھے کی کوشش کرو، کیا میں اتنی اسٹوڈ ہوں کہ کسی فضول اور غیر اہم کام کے لیے تمہیں ڈسٹرب کرنے آتی۔ why don't you understand

نہیں کرتیں؟“ یعنی نے خفگی سے کہا تو حسہ نے چونک کر اسے دیکھا۔

”اوکے۔۔۔۔۔ میں برق پہن لوں۔“ حسہ نے اس کا موڈ آف دیکھتے ہوئے کہا۔

”برق چھوڑو۔۔۔۔۔ بس دو پٹا اچھی طرح لے لو۔“ یعنی نے اس کا برق اس سے لیتے ہوئے کہا۔

”نہیں، میں اس کے بغیر کبھی باہر نہیں گئی۔“ حسہ نے اس کے ہاتھ سے برق واپس لیا۔

”کم آن یار۔۔۔۔۔ چھوڑو اسے، ہم کون سا پیدل جا رہے ہیں۔ اس کی کوئی ضرورت نہیں۔“ یعنی نے اس کے ہاتھ سے برق چھینتے ہوئے بیڈ پر پھینکا۔

”افوہ۔۔۔۔۔ تم کیا کر رہی ہو یعنی؟ میں برق پہننے بغیر نہیں جاؤں گی۔“ اس نے سختی سے کہا اور برق جلدی جلدی پہننے لگی۔ وہ اپنی چچی کو بتا کر گاڑی

کر سکوں گا۔ بس میری اس بات کو اچھی طرح سمجھنے کی کوشش کرو۔“ روئیل نے تحکمانہ انداز میں کہا تو ردا نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

”میری اتنی شدید اور بھرپور محبت کو تم اپنے لیے اک انعام سمجھو، اتنی محبت کی خوش نصیب عورت کو بھی ملتی ہے۔ so cheer up now روئیل نے مسکرا کر اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تو وہ بھی بھگی پلکیں اٹھا کر اسے مسکرا کر دیکھنے لگی۔

☆☆☆

حسہ کھانا کھانے کے بعد اپنے کمرے میں جا کر کتابیں اور نوٹس کھول کر پڑھنے لگی تھی کہ اس کی ملازمہ یعنی کے ہمراہ اچانک کمرے میں داخل ہوئی۔

”بی بی جی۔۔۔۔۔ آپ کی مہمان۔۔۔۔۔“ ملازمہ نے حسہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”یعنی! تم اور یہاں۔۔۔۔۔؟“ حسہ نے انتہائی حیرت سے چلاتے ہوئے کہا۔

”ہاں۔۔۔۔۔ میں بہت جلدی میں ہوں، تمہیں لینے آئی ہوں۔“ یعنی نے گاڑی کی چابی گھماتے ہوئے کہا تو وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔

”کہاں۔۔۔۔۔؟“ حسہ نے حیرت سے پوچھا۔

”بس تم جلدی سے چلو۔ راستے میں ہٹاؤں گی۔“ یعنی نے جلدی جلدی بولتے ہوئے کہا۔

”یعنی! ایگزامز کی تیاری کر رہی ہوں اور میں اپنی اسٹڈیز کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاسکتی۔“ حسہ نے خفگی سے کہا۔

”یار۔۔۔۔۔ ایگزامز میرے بھی ہیں مگر وہ کام اتنا ضروری ہے کہ مجھے بھی اپنی اسٹڈیز چھوڑ کر آنا پڑا ہے۔“ یعنی نے جواب دیا۔

”ایسا بھی کیا ضروری کام ہے؟“ حسہ نے جھنجھلا کر پوچھا۔

”ہے ناں۔۔۔۔۔ بہت ضروری۔“ یعنی نے منہ

”آپ کا وہم ہے، ایسی کوئی بات نہیں۔“ اس نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

”اچھا۔۔۔۔۔ اللہ تم دونوں کو خوش رکھے۔“ ماں جی دعائیہ لہجے میں بولیں اور اپنے کمرے میں چلی گئیں اور روئیل بھی اپنے کمرے کی جانب چلا گیا۔

☆☆☆

ردا واش روم سے نائٹ ڈریس پہن کر باہر نکلی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ٹاول تھا۔ جس سے وہ اپنا چہرہ پونچھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر اب بھی سنجیدگی چھائی تھی۔ وہ کمرے میں داخل ہوا اور اپنا کوٹ اتار کر بیٹنگر میں لٹکایا۔ ردا خاموشی سے بیڈ پر بیٹھ گئی۔

”ماں جی۔۔۔۔۔ تمہارے چہرے پر چھائی اداسی کو دیکھ کر پریشان ہو رہی تھیں۔“ روئیل گہری سانس لے کر بولا۔

”میں نے تمہیں اپنی فیملی کے ساتھ limited terms رکھنے کو کہا ہے۔ اس میں اتنا آپ سیٹ ہونے کی کیا بات ہے؟“ روئیل نے کہا۔

”کیا آپ نہیں جانتے کہ میرے بھائیوں کی مجھ میں جان ہے۔ وہ میرے ساتھ کتنا اسٹچڈ ہیں۔“ ردا منکاح لہجے میں بولی تھی۔

”یہی تو میں سمجھنا چاہ رہا ہوں کہ وہ phase گزر چکا ہے۔ اب تم صرف میری ہوا اور میں اپنی محبت میں بہت پوزیو ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ تمہیں میرے علاوہ کوئی اور دیکھے بھی۔“ روئیل نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

”لیکن۔۔۔۔۔ روئیل۔۔۔۔۔“ ردا اس کی بات کاٹتے ہوئے بولی۔

”تمہیں صرف میں ہی دیکھوں، میں ہی چاہوں اور میں ہی محبت کروں۔“ روئیل نے قدرے پوزیو انداز میں کہا تو وہ بے بسی سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”تیسرا کوئی بھی ہو، میں اسے برداشت نہیں

## قارئین کے لیے اہم اعلان

ملک بھر میں ادارے کے ماہنامے مندرجہ ذیل تاریخوں میں دستیاب ہوں گے

\* سسٹمز ڈائجسٹ: 17 تاریخ \* ماہنامہ پاکیزہ: 24 تاریخ

\* ماہنامہ سرگزشت: 28 تاریخ \* جاسوسی ڈائجسٹ: 03 تاریخ

مندرجہ بالا تاریخوں پر پرچہ دستیاب نہ ہونے کی صورت میں رابطہ کریں

شمر عباس: 0301-2454188



## نماز

☆ نماز کب کام آئے گی.....؟

☆ فجر۔ مرتے وقت۔

☆ ظہر۔ قبر میں

☆ عصر۔ منکر نکیر کے سوالات کے

وقت۔

☆ مغرب۔ حساب کتاب کے وقت۔

☆ عشا۔ پل صراط پر۔

مرسلہ: نفیہ آرا، یواسے ای

## بھڑپن تحفہ

دنیا کا سب سے اچھا تحفہ وقت ہوتا ہے

کیونکہ اگر آپ کسی کو اپنا وقت دیتے ہیں تو

آپ اسے اپنی زندگی کا وہ پل دیتے ہیں جو

کبھی لوٹ کر نہیں آتا۔

از: ناہ نور قیصر، راول پنڈی

”حنہ ابھی تک واپس کیوں نہیں آئی؟ اتنی

دیر ہوگئی؟“ اس نے پریشانی سے سوچا اور گھبرا کر حنہ

کو فون کیا مگر connect نہ ہو سکا۔ اس نے آزر

کو بھی فون کیا وہ بھی کال نہیں لے رہا تھا۔ یعنی

پریشان ہو کر گاڑی کو لاک کر تے ہوئے اس کے گھر

کی طرف گئی اور گیٹ نیل بجائی چوکیدار نے گیٹ

کھول کر حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

”آزر صاحب کہاں ہیں؟“ یعنی نے پوچھا۔

”آپ کون ہیں؟“ چوکیدار نے حیرت سے پوچھا۔

”ایک لڑکی کچھ دیر پہلے یہاں آئی تھی، وہ

کہاں ہے؟“ یعنی نے غصے سے پوچھا۔

”یہاں کوئی لڑکی نہیں آئی۔“ چوکیدار نے

جواب دیا۔

”کیا کہا..... یہاں کوئی لڑکی نہیں آئی۔ وہ

یہاں ہی آئی تھی۔ آزر کہاں ہے، میں خود اس سے

پوچھتی ہوں۔“ یعنی نے اسے پیچھے ہٹاتے ہوئے

اندراجانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

ہوئی اور چلی گئی۔ اوپر جا کر وہ ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

سارے کمروں کے دروازے بند تھے۔ صرف ایک

کمرے کا دروازہ تھوڑا سا کھلا تھا۔ اس نے آہستہ

آواز میں آزر، آزر پکارا مگر کوئی جواب نہیں ملا۔ وہ

کھلے ہوئے دروازے کو مزید کھول کر اندر داخل ہوگئی

وہ آزر کا ہی کمرہ تھا۔ ہر طرف آزر کے پورٹریٹس

آویزاں تھے۔ اس نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا۔

اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔

”آزر، آزر کہاں ہو؟“ حنہ نے اسے ادھر

ادھر دیکھتے ہوئے پکارا۔ آزر نے ایک دم ڈرینک

روم سے نکل کر دروازے کو لاک لگایا۔ اس نے ٹائٹ

گاؤن پہن رکھا تھا اور کافی زیادہ ڈر تک کر رہی تھی۔

اس نے پیچھے سے آکر حنہ کا نقاب زور سے کھینچا۔

”یہ، یہ تم کیا کر رہے ہو..... میں، میں حنہ

ہوں۔“ حنہ نے انتہائی گھبرا کر کہا۔ خوف کے

مارے اس کے حلق سے آواز نہیں نکل رہی تھی مگر آزر

اتنا وحشی ہو رہا تھا کہ اس نے اس کی ایک بات نہ

سنی۔ وہ چلاتی رہی اسے دھکے دیتی رہی۔ دروازے

کی طرف بھاگتی رہی مگر آزر تو اس وقت درندہ بنا ہوا

تھا۔ حنہ نے اپنا موبائل بیگ سے نکال کر یعنی کو فون

کرنا چاہا مگر آزر نے موبائل اس کے ہاتھ سے چھین

کر پیچیک دیا۔ حنہ اللہ رسول کے واسطے دیتی رہی مگر

اس نے اس کی ایک نہ سنی۔ وہ بلند آواز سے چلاتی

رہی مگر کسی نے اس کی پکار نہ سنی۔ آزر اتنا

aggressive ہو رہا تھا کہ وہ یعنی کے تمام

بدلے اس سے لینا چاہ رہا تھا۔

☆☆☆

شہیر سے باتیں کرتے ہوئے یعنی کو وقت کا

خیال ہی نہیں رہا۔ وہ اس سے اس کے حالات کے

بارے میں پوچھتی رہی اور وہ اس سے خوب گپ

شب لگاتا رہا۔ کال ختم کرنے کے بعد اس نے

چونک کر ٹائم دیکھا۔

نے خشکی سے کہا تو حنہ آزر کے گھر کی جانب

گئی۔ اسی لمحے یعنی کے کزن شہیر کا کراچی سے فون

آگیا جو انگلینڈ میں سیٹلڈ ہو چکا تھا اور کراچی آیا

تھا۔ اس نے بہت عرصے کے بعد یعنی کو فون کیا تھا

اسنے عرصے بعد شہیر کا فون سن کر وہ بہت اکیسا

ہوگئی اور گاڑی میں بیٹھ کر اس سے باتیں کرنے لگی۔

☆☆☆

حنہ نے ایک وسیع و عریض کوشی کے گیٹ

نیل بجائی تو ایک ٹیم جیم چوکیدار نے گیٹ کھول

حنہ کی طرف دیکھا۔

”کیا..... آزر صاحب، گھر پر ہیں؟“ حنہ

نے گھبرائے ہوئے پوچھا۔

”ہاں، وہ اوپر اپنے کمرے میں ہیں، آپ

اوپر چلی جائیں، وہ آپ کا ہی انتظار کر رہے ہیں۔

چوکیدار نے کہا۔

”میرا انتظار.....؟“ حنہ نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں..... انہوں نے کہا تھا ایک لڑکی آئے

اسے اوپر بھیج دینا..... کیا تم وہ لڑکی نہیں

چوکیدار نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

”ہاں..... مگر وہ.....“ حنہ نے رک رک کر

کہا۔ نقاب سے جھانکتی اس کی آنکھیں اس کے اندر

کی پریشانی کا پتا دے رہی تھیں۔

”آپ، آپ انہیں یہیں بلا دیں۔“ حنہ نے

آہستہ سے کہا۔

”صاحب کا جو حکم ہے وہ آپ کو بتا دیا ہے

کہنا ہے اسے اوپر جا کر کہو۔“ چوکیدار نے کہا اور اپنی

سیٹ پر جا بیٹھا۔ حنہ کو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ

کرسے، وہ قدرے پریشانی سے ہونٹ کاٹتی ہوئی

آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئے گھر میں داخل ہوگئی

لاؤنج میں داخل ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ چوکیدار

نے اسے اوپر جانے کو کہا تھا لاؤنج میں سے سیر ہوا

اوپر جاتی تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ سیڑھیاں

کا بالکل دل نہیں چاہ رہا..... اتنا ٹائم ویسٹ ہو جائے گا۔“

حنہ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد پھر سے بولی۔

”ہم جلدی واپس آجائیں گے.....“ یعنی نے

جواب دیا اور گاڑی کی اسپید بڑھادی..... وہ آزر

کے گھر سے کچھ فاصلے پر تھی کہ اچانک اس کی گاڑی

بند ہوگئی..... وہ پریشان ہو کر اسے بار بار اشارت

کرنے کی کوشش کرنے لگی مگر وہ اشارت ہونے کا

ٹائم نہیں لے رہی تھی۔ یعنی نے باہر نکل کر ہونٹ اٹھا

کر اس کا انجن چیک کرنے کی کوشش کی مگر اسے کچھ

سمجھ میں نہیں آیا۔

”کیا ہوا؟“ حنہ نے پریشانی سے پوچھا۔

”معلوم نہیں..... اسے کیا ہو گیا ہے، پہلے تو

کبھی ایسا نہیں ہوا۔ ٹھہرو میں آزر کو فون کرنی ہوں،

وہی آکر اسے دیکھ لے گا۔“ یعنی نے اپنے موبائل پر

آزر کا نمبر ملا دیا اس پر بیلز جاری تھیں مگر وہ کال اینڈ

نہیں کر رہا تھا۔

”حنہ! بیلز تم آزر کو بلا لاؤ، دیکھو وہ سامنے اس

کا گھر ہے۔ وہ فون نہیں اٹھا رہا۔ شاید اس کا موبائل

ساکٹ پر ہے۔“ یعنی نے اس سے اصرار کیا۔

”میں.....؟“ حنہ نے انتہائی حیرت سے پوچھا۔

”ہاں، میں اتنی دیر گاڑی دیکھتی ہوں۔“ یعنی

نے کہا۔

”نہیں..... نہیں میں اکیلے نہیں جاؤں گی۔“

حنہ نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

”کم آن یار..... بی کوئیڈنٹ، وہ تمہیں کھا

نہیں جائے گا اور میں ادھر ہی ہوں، گاڑی ٹھیک

ہوگی تو میں بھی ادھر ہی آ جاؤں گی۔“ یعنی نے اسے

تسلی دیتے ہوئے کہا۔

”تم بھی میرے ساتھ چلو۔“ حنہ نے قدرے

پریشان ہو کر کہا۔

”یار تمہیں کیا ہو گیا ہے، کیسے بی ہو کر رہی

ہو..... بی کوئیڈنٹ..... یو آر میچور اینڈ پینسیبل۔“ یعنی



”تم ہم اندر نہیں جاسکتیں۔“ چوکیدار نے پھر اسے روکنے کی کوشش کی۔

”کیوں..... تم کون ہوتے ہو مجھے روکنے والے؟“ یعنی نے غصے سے کہا۔

”صاحب کا یہی حکم ہے، کسی کو اندر نہ آنے دیا جائے۔“ بے ساختہ ہی اس کے منہ سے نکلا۔

”کیا آزر نے ایسا کہا ہے مگر کیوں.....؟“ یعنی نے چونک کر پوچھا اور اندر جانے لگی۔ چوکیدار نے اسے زبردستی روکنے کی کوشش کی۔

”میں نہیں جانتا مگر آپ اندر نہیں جاسکتیں۔“ چوکیدار نے غصے سے کہا تو یعنی نے کراٹے کرتے ہوئے ٹانگ اس کے پیٹ میں ماری۔ وہ وہیں تڑپنے لگا اور یعنی تیزی سے اوپر چلی گئی۔ آزر کے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ اس نے بار بار دستک دی مگر کسی نے دروازہ نہیں کھولا۔ اندر سے چیخنے اور رکاہٹ کی آوازیں آرہی تھیں۔ یعنی گھبرا گئی اور اس نے جوڑو کے ٹرکس اختیار کرتے ہوئے دروازے کو دو تین جھٹکے دیے تو دروازہ کھل گیا۔ حمزہ کا برا حال تھا۔ اسے دیکھ کر

یعنی کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

”یو چیف.....“ یعنی نے زور سے تھپڑ آزر کے چہرے پر لگایا تو اس نے گھوم کر یعنی کو دبوچنے کی کوشش کی۔

”آج..... میں تمہیں بھی نہیں چھوڑوں گا، آج تم سے اپنے سارے بدلے لوں گا۔“ چیل، کالی

چھوڑتو نے مجھے ہرانے کی کوشش کی تھی۔ آج تجھے سارا حساب چکانا پڑے گا۔“ آزر نے اس پر جھپٹنا

چاہا مگر یعنی نے گھما کر ٹانگ اس کے پیٹ میں ماری وہ گر کر تڑپنے لگا۔ حمزہ بری طرح رو رہی تھی اور چلا

رہی تھی۔ یعنی نے اس کا برج اس کی طرف پھینکا۔

”ہمت کرو، پلےز..... میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔“ یعنی نے حمزہ کو حوصلہ دیتے ہوئے کہا

اور آزر کو گریبان سے پکڑ کر مارنے لگی۔

”گھٹیا انسان..... تم نے مجھ سے محبت کا ڈراما

رچایا۔ اتنا عرصہ مجھ سے کھیل کھیلتے رہے۔ ایک پلانٹ کرتے رہے۔“ یعنی نے غصے سے کہا۔

”تم..... اور محبت کے قابل.....؟ اپنی عمر دیکھی ہے آئینے میں..... تمہاری کالی شکل کی طرح کوئی دیکھنا تو کیا تھوکتا بھی پسند نہیں کرے۔“ چکا ڈو..... کالی چیل.....“ آزر نے اسے تھپڑ چاہا تو یعنی نے جوڑو کے ٹرکس کرتے ہوئے

ٹانگ اس کے سر پر ماری۔ آزر وہیں گر گیا۔

”حمزہ چلو..... یہاں سے۔“ یعنی نے اسے سہارا دے ہوئے اٹھایا۔ آزر بہ مشکل اٹھ کر ان کی طرف لپکا۔

”ابھی میں حمزہ کی وجہ سے جا رہی ہوں۔“ اس کی فکر ہے مگر میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گی۔“ مت سمجھنا کہ میں تمہیں چھوڑ دوں گی۔ میں تمہیں مارنے دوں گی نہ جینے دوں گی۔ یاد رکھنا۔“ یعنی نے

حمزہ کی طرف دیکھتے ہوئے غم آنکھوں سے کہا۔

”کیا کرو گی تم..... میں تمہیں یہاں سے جانے دوں گا تو پھر ہے ناں.....!“ آزر نے اس کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

”تم.....! یعنی کی آنکھیں آنسوؤں سے بھرنے لگیں اور اس کی آواز کانپنے لگی۔ اس نے

مشکل اپنے آپ کو نازل رکھتے ہوئے حمزہ کو بازو سے اٹھایا اور تیز تیز چلتی ہوئی باہر نکلنے لگی تو آزر پھر ان کے پیچھے آنے لگا۔ یعنی نے دو تین ٹانگیں گھما کر اس کے پیٹ میں ماریں۔ وہ تڑپنے لگا وہ جلدی سے حمزہ کے ہمراہ گیٹ تک آئی۔ چوکیدار گیٹ پر نہیں تھا۔ وہ

گیٹ کھول کر باہر نکل گئی۔ حمزہ کو گاڑی میں بٹھایا اور ایبویلیس کو کال کیا۔ تھوڑی دیر بعد ایبویلیس آ گئی۔

اس نے حمزہ کو ایبویلیس میں بٹھایا اور خود بھی اس کے ہمراہ بیٹھ کر اسے اسپتال لے جانے لگی۔ اسے کچھ

سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیا کرے، حمزہ کی حالت بھی ٹھیک نہیں تھی۔ اس کی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہا رہے تھے اور وہ انتہائی تکلیف سے کراہ رہی تھی۔

78

ماہنامہ پاکیزہ

سنی 2013



## آنسو

☆ محبت مسکراہٹ سے شروع ہو کر  
آنسوؤں پر ختم ہوتی ہے۔

☆ آنسو ہر موسم کے ساتھی ہیں۔

☆ قدرت کے آگے آنسوؤں کا ڈھیر  
لگا تا جا، کوئی آنسو تو اسے پسند آ جائے گا۔

☆ جہنم کی آگ کو وہی آنسو بجھا سکتے  
ہیں جو وقتِ محرموں کی آنکھ سے نچکتے ہیں۔

☆ دنیا عاقل کی موت اور جاہل کی  
زندگی پر ہمیشہ آنسو بہاتی ہے۔

☆ تو یہ کرنے والے کا ایک آنسو  
دوزخ کی آگ کو شعفاً کرنے کی طاقت رکھتا  
ہے۔

☆ مصیبت کے وقت آنسو بہانا  
بہادری نہیں ہے۔

☆ مظلوم کی آنکھوں سے نکلا آنسو ظالم  
کے لیے سیلاب ثابت ہو سکتا ہے۔

مرسلہ: کرن فیاض..... راول پنڈی

لگیں۔ وہ بے صبری سے ان کا انتظار کرنے لگیں۔

یعنی کانبر ملا یا مگر موبائل ہی آف تھا۔

ٹیلیفون کی تیل بجی تو ایمین نے فوراً ریسپور اٹھایا۔

”ہیلو..... کون.....؟“ انہوں نے گھبرا کر پوچھا۔

”آپ کیا..... آپ مزہ جال ہیں؟“ دوسری

جانب کی عورت نے پوچھا۔

”جی..... جی..... میں بول رہی ہوں۔“

ایمین نے دھڑکتے دل کے ساتھ جواب دیا۔

”کیا میں آپ کی بیٹی یعنی سے بات کر سکتی

ہوں۔ میں اس کی دوستِ حمہ کی چچی بات کر رہی

ہوں۔“ عورت نے کہا۔

”یعنی تو اس وقت اسپتال میں ہے۔“ ایمین

نے سسکی بھر تے ہوئے کہا۔

”کیا..... لیکن وہ تو دوپہر کو بالکل ٹھیک تھی.....

ہمارے گھر آئی اور حمہ کو ساتھ لے کر چلی گئی۔ اب

”حوصلہ کرو..... پلیز مجھے معاف کر دو۔ میں  
ہی تمہاری مجرم ہوں۔“ یعنی نے حمہ کا ہاتھ پکڑ کر غم  
آنکھوں سے کہا تو حمہ بری طرح سسکنے لگی۔ یعنی بھی  
رونے لگی۔

”عمر.....“ وہ بہ مشکل بولی اور پھوٹ پھوٹ  
کر رونے لگی۔ یعنی اسے دلاسا دینے کی کوشش کرتی  
مگر حمہ کے آنسوئیں ختم رہے تھے۔ اس کا نقاب بری  
طرح بھیگ چکا تھا۔ اچانک ایمبولینس ریلوے  
سٹیشن کے پاس رکی۔ ٹرین جب قریب پہنچنے والی  
تھی تو حمہ نے انتہائی تیزی سے ایمبولینس کا دروازہ  
کھولا اور سرٹ بھاگے ہوئے ٹرین کے سامنے چلی  
گئی۔ یعنی اس کے پیچھے بھاگی اور وہاں پر موجود  
لوگوں نے بھی اس کے پیچھے بھاگنا چاہا مگر تب تک  
حمہ ٹرین کے نیچے آچکی تھی۔ ٹرین کے جانے کے  
بعد سب لوگ موقع پر اکٹھے ہو گئے، حمہ کا نام و نشان  
تک نہیں تھا۔ اس کے برقع کے چترے ادھر ادھر اڑ  
رہے تھے۔ ہر طرف خون اور گوشت کے لٹھوڑے  
تھے۔ نہ اس کا جسم باقی بچا تھا نہ اس کا سر اور نہ  
دھڑ..... یعنی یا گلوں کی طرح چلانے لگی۔ اپنے سر  
کے بال نوچنے لگی۔ ”حمہ، حمہ.....“ کہہ کر چلاتے  
ہوئے وہ ریلوے ٹریک پر بھاگ رہی تھی۔ لوگوں  
نے بہ مشکل اس کو ایمبولینس میں بٹھایا اور اسے  
اسپتال لے گئے۔

☆☆☆

”یعنی..... اور اسپتال میں..... یہ کیسے ممکن  
ہے؟“ جمال صاحب نے فون پر حیرت سے چلاتے  
ہوئے کہا۔ جب ایمین نے انہیں روتے ہوئے فون کر  
کے آفس میں اطلاع دی۔ انہیں یقین نہیں آ رہا تھا۔  
”مجھے کچھ معلوم نہیں..... اسپتال سے فون آیا  
ہے، خدا کے لیے مجھے اس کے پاس لے جائیں ورنہ  
میں مرجاؤں گی۔“ ایمین نے سسکتے ہوئے کہا۔  
”ٹھیک ہے، میں ابھی آ رہا ہوں۔“ جمال  
صاحب نے کہہ کر فون بند کر دیا اور ایمین روتے



رات ہونے کو ہے، حمنہ کبھی اتنی دیر تک گھر سے باہر نہیں رہی۔ اس کے چچا اور میں ہم سب بہت پریشان ہو رہے ہیں، پلیز یمنی سے پوچھ کر بتائیں کہ حمنہ کہاں ہے؟“ چچی نے فکر مندی سے کہا۔

”میں اور میرے شوہر ابھی اسپتال جا رہے ہیں، وہاں سب معلوم کر کے آپ کو انفارم کر دوں گی۔“ ایمین نے جواب دیا اور فون بند کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد جمال صاحب آگئے تو وہ ان کے ہمراہ اسپتال پہنچیں۔ یمنی ICU میں تھی اور اس کا نروس بریک ڈاؤن ہوا تھا۔ ڈاکٹروں نے اسے نیند کے انجکشنز دیے تھے۔

”یمنی کو اسپتال کون لایا؟“ جمال صاحب نے ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر سے انکوائری کرتے ہوئے پوچھا۔ ”ایمبولینس کا ڈرائیور.....“ ڈاکٹر نے جواب دیا۔ ”وہ اب کہاں ہے؟ میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔“ جمال صاحب نے کہا۔ ڈاکٹر نے ایمبولینس کے ڈرائیور کو بلایا۔ وہ ادھیڑ عمر کا آدمی تھا۔ ”آپ نے یمنی کو کہاں سے پک کیا اور آپ کو کس نے اطلاع دی۔ کیا یمنی کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آیا تھا۔ مجھے ساری بات تفصیل سے بتائیں۔“ جمال صاحب نے کہا۔

”بی بی کی دوست کی طبیعت خراب تھی۔ شاید اس کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آیا تھا۔ ریلوے پھانک پر میں نے گاڑی روکی تاکہ ٹرین گزر جائے مگر ان کی دوست نے ٹرین کے نیچے آکر خودکشی کر لی اور بی بی اس کو دیکھ کر اتنی بدحواس ہوئیں کہ پاگلوں کی طرح بھاگتی رہیں اور پھر گر گئیں۔“ ڈرائیور نے بتایا تو جمال صاحب اور ایمین پریشان ہو گئے۔

”کیا..... اس لڑکی نے خودکشی کر لی..... مگر کیوں.....؟“ ایمین نے گہرا کر پوچھا۔ ”معلوم نہیں..... شاید اسے کوئی حادثہ پیش آیا تھا۔“ ڈرائیور نے بتایا۔

”او تو.....“ جمال صاحب بڑبڑائے اور پھر خاموش ہو گئے۔

”آپ لوگوں نے ان لوگوں کو کہاں سے پک کیا تھا۔“ جمال صاحب نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔

”ڈیفنس کے ایک علاقے سے۔ میرے پاس اس کا ایڈریس لکھا ہے۔“ ڈرائیور نے اپنی جیب سے ایڈریس نکال کر دیا۔

”اور اس لڑکی کی لاش کہاں ہے؟“ ایمین نے پریشانی سے پوچھا۔

”لاش کیسا سر..... اس کا تو نام و نشان باقی نہیں رہا..... سوائے خون کے..... جو ریل کے پٹریوں پر لگا تھا۔ وہ بے چاری تو.....“ ڈرائیور آہ بھر کر خاموش ہو گیا۔

”یا خدا یا..... یہ سب کیا ہو گیا ہے۔“ ایمین روتے روتے بولیں اور ان کا موبائل بجنے لگا۔

”میں انہیں کیا جواب دوں.....“ حمنہ کی چچی کا فون آرہا ہے۔“ ایمین نے تاسف سے کہا۔

”کچھ نہ کچھ تو بتانا پڑے گا، تم انہیں اسپتال بلاؤ اور پھر آرام سے سمجھا دینا۔ میں اس جگہ جاتا ہوں۔ جہاں کا ایڈریس اس نے دیا ہے۔“ جمال صاحب نے اٹھتے ہوئے کہا اور ایمین پریشانی سے انہیں دیکھنے لگیں۔ ان کا موبائل مسلسل بج رہا تھا۔ انہوں نے پریشانی سے ہونٹ سکڑتے ہوئے موبائل کی طرف دیکھا اور گہری سانس لے کر بات کرنے لگیں۔

”آپ اسپتال آجائیں۔“ ایمین نے آہستہ آواز میں اسپتال کا نام بتا دیا۔

”کیا حمنہ اسپتال میں ہے، اسے کیا ہوا؟“ وہ ٹھیک تو ہے نا؟“ اس کی چچی بہت بے صبری سے پوچھتی رہیں مگر ایمین کے پاس کہنے کو کچھ نہیں تھا۔ خاموشی سے آنسو بہاتی رہیں اور موبائل آف کر دیا۔ (باقی آئندہ)

## اس کوشش کی سحر نہیں ک

### رضوانہ نپرس

نمرہ جیسے خوشی سے حواس باختہ ہوئی جا رہی تھی۔ چہرے پر اتنے خوب صورت رنگ بکھر رہے تھے کہ عباد کی نگاہیں اس پر سے ہٹ ہی نہیں پارہی تھیں لیکن وہ عباد کی وارفتہ نظروں سے بے نیاز ان چمکتی دمکتی چوڑیوں کو ہاتھوں میں لیے الٹ پلٹ کر بار بار دیکھ رہی تھی۔ کبھی ان چوڑیوں کو ہاتھوں میں پہنتی اور کبھی اتار دیتی۔ آنکھیں خوشی کے آنسوؤں سے جھلملہا رہی تھیں۔ بالکل ایک ایسی معصوم بچی کی



کو بنا کہے ہی عباد تک پہنچا دیتی تھیں۔ بازار میں کسی جیولر کی شاپ کے پاس سے گزرتے ہوئے اس کی نظریں بے ساختہ شوئیں میں لگی ہوئی چوڑیوں سے اچھ جائیں کسی تقریب میں عورتوں کے ہاتھوں میں جگمگانی سونے کی چوڑیوں کو دیکھتے ہوئے جو حسرت اس کی آنکھوں میں اترتی وہ جیسے عباد کے دل کو مل ہی ڈالتی..... سو آج اپنی پہلی ویڈیو گائیو سری پر وہ اپنی جان من کو اس کی زندگی کی ایک بہت ہی بڑی خوشی دے کر سرخرو ہو گیا تھا۔ کتنی یادگار بن گئی تھی ان کی شادی کی یہ پہلی سالگرہ.....

”عباد اگر رات کو آیا کی فیملی اور امی، ابا نہ آرہے ہوتے تو میں بھی بچن میں نہ جاتی بس چوڑیاں پہنے ایسے ہی بستر پر بیٹھی انہیں دیکھتی رہتی۔“ وہ کلائیوں میں پڑی چوڑیوں کو کھلکھلاتے ہوئے بولی تو عباد ہنس دیا۔

”میرا تو پہلے ہی دل چاہ رہا تھا کہ آج کا یہ.... یادگار دن صرف ہم دونوں کا ہو لیکن تم ہی نے سب کو ڈنر پر انوائٹ کر لیا۔“ عباد نے اس کے چہرے پر آئی لٹ کو چھینرتے ہوئے کہا تو وہ دھمے سے مسکرا دی۔

”مجھے کیا پتا تھا کہ آپ اتنا بڑا سر پرانز دینے والے ہیں۔ کتنی چھپا کر رکھی تھیں یہ چوڑیاں آپ نے کہ مجھے بھنک بھی نہ پڑی۔ خیر رات جب آپا اور امی کو یہ چوڑیاں دکھاؤں گی ناں تو وہ حیران رہ جائیں گی۔“ وہ ایک بار پھر ایکساٹڈ ہو گئی تو عباد نے اسے اپنی مضبوط ہانہوں میں سمیٹ لیا۔

”میں تمہاری اس خوشی پر قربان نہ ہو جاؤں تو کیا کروں، سچ نمرہ میرا اس چلے تو میں ہمراہ تمہیں ایسے ہی خوب صورت سر پرانز دیتا رہوں اور تمہارے چہرے پر بکھری خوشی کو اپنے دل میں اتارتا رہوں۔“

”نہیں بس یہ ایک خوشی ہی میری پوری زندگی کے لیے کافی ہے، ان خوب صورت لمحوں کو میں ہمیشہ

کی ایک جس کو وہ اپنے بھائی کے لیے پسند آگئی۔ بھانے سے ایک بار عباد کو بھی اس کا دیدار کرادیا اور عباد کی رضامندی پا کر وہ بنا وقت ضائع کیے نمرہ کے گھر رشتہ لے کر پہنچ گئیں۔ رشتہ اچھا تھا عباد ایک فرم میں منیجر کی پوسٹ پر کام کر رہا تھا۔ فیملی میں صرف وہی دو بہن بھائی تھے۔ ماں باپ کا انتقال ہو چکا تھا، بڑی بہن شادی شدہ اپنے گھر میں خوش باش اور بھائی کی جاب کے بعد اس کا گھر بسا نے کی فکر میں تھی۔ کالج کی پرنسپل کی گارنٹی نے مزید سونے پر سہاگ کا کام کیا کہ وہ ذاتی طور پر بھی اس فیملی سے واقف تھیں سب سے اہم بات یہ تھی کہ لڑکے والوں کی طرف سے جہیز کی قطعی کوئی فرمائش نہیں تھی۔ بلکہ عباد نے سختی سے منع ہی کر دیا تھا سو مہینے کے اندر اندر ہی نمرہ دلہن بن کر عباد کی زندگی میں آگئی۔ عباد کی بے رنگ زندگی میں جیسے رنگ ہی رنگ بکھر گئے۔ اس چاندنی جیسی لڑکی نے آکر اس کے فلیٹ میں ہر طرف چاندنی ہی بکھیر دی تھی۔ وہ خود بھی تو کسی سے کم نہیں تھا۔ چاند سورج کی جوڑی کا خطاب تو ان دونوں کو شادی والے روز ہی مل گیا تھا۔ نمرہ نے بہت پیار اور لگن سے اپنے گھر کی نئے سرے سے سیٹنگ کی جس میں عباد نے اس کا بھرپور ساتھ دیا۔ بازار سے چھوٹی موٹی چیزیں خرید کر اپنے گھر کو سجاتے ہوئے وہ اس خوشی کو ایسے انجوائے کرتی گویا وہ لاکھوں کا سامان خرید لائی ہو اور عباد کو اس کی یہ ادا بھی بہت اچھی لگتی۔ عباد کے دل میں اب صرف ایک ارمان رہ گیا تھا کہ وہ نمرہ کی گوری گوری کلائیوں میں کانچ کی چوڑیوں کی جگہ سونے کی چوڑیاں پہنا کر اپنی محبوب بیوی کی وہ خواہش پوری کر دے جس کا اظہار اس نے شادی کے دوسرے ہی دن بہت معصومیت سے کیا تھا لیکن پھر اپنی اس آرزو کو خاموش دکھ بنا کر اپنے دل کے اندر نہیں چھپا لیا تھا..... لیکن وہ اپنی ان آنکھوں کا کیا کرتی جو اس کے دل میں چھپی اس تمنا

کی ایک جس کو وہ اپنے بھائی کے لیے پسند آگئی۔ بھانے سے ایک بار عباد کو بھی اس کا دیدار کرادیا اور عباد کی رضامندی پا کر وہ بنا وقت ضائع کیے نمرہ کے گھر رشتہ لے کر پہنچ گئیں۔ رشتہ اچھا تھا عباد ایک فرم میں منیجر کی پوسٹ پر کام کر رہا تھا۔ فیملی میں صرف وہی دو بہن بھائی تھے۔ ماں باپ کا انتقال ہو چکا تھا، بڑی بہن شادی شدہ اپنے گھر میں خوش باش اور بھائی کی جاب کے بعد اس کا گھر بسا نے کی فکر میں تھی۔ کالج کی پرنسپل کی گارنٹی نے مزید سونے پر سہاگ کا کام کیا کہ وہ ذاتی طور پر بھی اس فیملی سے واقف تھیں سب سے اہم بات یہ تھی کہ لڑکے والوں کی طرف سے جہیز کی قطعی کوئی فرمائش نہیں تھی۔ بلکہ عباد نے سختی سے منع ہی کر دیا تھا سو مہینے کے اندر اندر ہی نمرہ دلہن بن کر عباد کی زندگی میں آگئی۔ عباد کی بے رنگ زندگی میں جیسے رنگ ہی رنگ بکھر گئے۔ اس چاندنی جیسی لڑکی نے آکر اس کے فلیٹ میں ہر طرف چاندنی ہی بکھیر دی تھی۔ وہ خود بھی تو کسی سے کم نہیں تھا۔ چاند سورج کی جوڑی کا خطاب تو ان دونوں کو شادی والے روز ہی مل گیا تھا۔ نمرہ نے بہت پیار اور لگن سے اپنے گھر کی نئے سرے سے سیٹنگ کی جس میں عباد نے اس کا بھرپور ساتھ دیا۔ بازار سے چھوٹی موٹی چیزیں خرید کر اپنے گھر کو سجاتے ہوئے وہ اس خوشی کو ایسے انجوائے کرتی گویا وہ لاکھوں کا سامان خرید لائی ہو اور عباد کو اس کی یہ ادا بھی بہت اچھی لگتی۔ عباد کے دل میں اب صرف ایک ارمان رہ گیا تھا کہ وہ نمرہ کی گوری گوری کلائیوں میں کانچ کی چوڑیوں کی جگہ سونے کی چوڑیاں پہنا کر اپنی محبوب بیوی کی وہ خواہش پوری کر دے جس کا اظہار اس نے شادی کے دوسرے ہی دن بہت معصومیت سے کیا تھا لیکن پھر اپنی اس آرزو کو خاموش دکھ بنا کر اپنے دل کے اندر نہیں چھپا لیا تھا..... لیکن وہ اپنی ان آنکھوں کا کیا کرتی جو اس کے دل میں چھپی اس تمنا

”اگر آپ سونے کا سیٹ دینے کے بجائے بس دو چار سونے کی چوڑیاں بری میں چڑھا دیں مجھے زیادہ خوشی ہوئی۔“

”اچھا..... کیا تمہیں ہمارا دیا ہوا سیٹ پسند نہیں آیا؟“ عباد نے کچھ افسوس سے پوچھا۔

”ارے نہیں، ایسی بات تو بالکل نہیں ہے دراصل امی نے بھی اچھا خاصا بھاری سیٹ خریدا جبکہ میں نے انہیں کتنا منع کیا تھا کہ اس کے بجائے مجھے خالی چوڑیاں بنوادیں لیکن وہ مانی ہی نہیں اور مجھے چوڑیوں کے لیے پیسے ہی نہیں بچے۔“ وہ بھولیوں سے بتاتے ہوئے کچھ رنجیدہ سی ہو گئی۔

”اوہو تم مجھے اگر پہلے ہی بتا دیتیں تو میں سونے کے بجائے چوڑیاں ہی آپا سے کہہ کر بری کے لیے بنوا لیتا۔“ وہ دل ہی دل میں اس کے بھولیوں پر دھاوا بھرتے ہوئے بولا۔

”واہ، کیسے بتا دیتی میں..... امی نے تو ڈیڑھ فکس ہونے کے بعد مجھ سے موبائل بھی لے کر رکھا تھا کہ کہیں آپ مجھے فون نہ کریں حالانکہ میری تو فرینڈز اپنی معافی یا شادی طے ہونے کے بعد اپنے منگیتروں کے ساتھ باقاعدہ شاپنگ پر بھی گئی تھیں۔ وہ اپنی امی کی باقاعدہ شکایت کرنے بیٹھ گئی تو عباد اپنی دلہن کی اس معصومیت پر بے طرح پیار آ گیا۔

”تمہاری یہ ہی ادا میں، معصومیت بھرا حسن اگر مجھے پاگل کر دیتا ہے تو اس میں میرا نہیں صرف اور صرف تمہارا قصور ہے۔“ عباد کے بچکے ہوئے لہجے پر نمرہ کو ایک دم سے اپنے دلہن ہونے کا احساس ہوا تھا اور اس نے شرم آمیز ٹھہراہٹ کے ساتھ یہ اختیار چہرہ جھکا لیا۔ نمرہ کا تعلق ایک بہت ہی متوسط گھرانے سے تھا۔ وہ تین بہنیں تھیں بھائی کوئی نہ تھا۔

ابا ایک سرکاری محکمے میں ملازم تھے اور بس سفید پوش کے ساتھ ہی گزارہ ہو رہا تھا۔ نمرہ اپنی بہنوں سے سب سے بڑی تھی ابھی وہ کالج میں آئی تھی کہ اس

طرح ایکساٹڈ ہو رہی تھی وہ جسے اس کا سن پسند کھلونا مل گیا ہو..... پھر اچانک وہ انہی اور عباد کے نزدیک آکر اس کے گلے میں ہانپیں ڈال دیں۔

”عباد آپ کتنے اچھے ہیں۔ میں کتنی لکی ہوں عباد..... میں کیسے شکریہ ادا کروں آپ کا۔“ جذبات میں وہ بے ربط جملے بول رہی تھی اور عباد مسکراتے ہوئے یک ٹک اس کے تہمتاتے ہوئے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ اپنے شانوں پر بکھری اس کی سیاہ زلفوں کو محسوس کر رہا تھا۔ حسین آنکھوں میں چمکتے آنسو اسے موتیوں سے بھی زیادہ جھلکلاتے ہوئے لگ رہے تھے۔ وہ اپنی نمرہ کی اس خوشی کی خاطر کتنے دنوں سے اوور ٹائم کر رہا تھا۔ اس کے علاوہ چھٹی والے روز تین چار بڑے گھروں کے بچوں کو ٹیوشن پڑھانے کی ذمہ داری بھی اس نے اپنے سر پر لی ہوئی تھی۔

نمرہ کتنی خفا، خفا رہنے لگی تھی اس کی اس مصروفیت سے بلکہ کافی سرد مہری بھی آگئی تھی اس کے مزاج میں لیکن عباد اسے کچھ بھی بتا کر اپنے خوب صورت سر پرانز کو خراب نہیں کرنا چاہ رہا تھا سو اس کی ناراضی سہتا رہا۔ جانتا تھا کہ نمرہ کی یہ خفگی، یہ غصہ، یہ لڑائی جھگڑا کچھ ہی دنوں کی بات ہے جب وہ اپنی ویڈیو گائیو سری پر اپنی آنکھوں میں مدتوں سے چھپے ایک خواب کو حقیقت کے روپ میں بالکل اچانک دیکھے گی تو اس خوشی کا تو شاید کوئی بھی نعم البدل نہیں ہوگا اور آج ایسا ہی ہو رہا تھا۔

حسب توقع پچھلے ماہ اسے بونس بھی مل گیا تھا جس کی ہوا بھی اس نے نمرہ کو نہیں لگنے دی تھی کہ یہ پیسے بھی اس نے اپنے اس خوب صورت سر پرانز میں شامل کر دیے تھے۔

☆☆☆

نمرہ جب بیاہ کر عباد کے اس چھوٹے سے فلیٹ میں آئی تو شادی کی دوسری ہی رات اس نے بہت معصومیت سے عباد سے شکایت کرتے ہوئے کہا تھا۔



سلیکٹ کرنے کے بعد سبزیز میں کوئی تفصیل سے سمجھایا تھا کہ ناموں کو کیسے اور کہاں ایک پر لکھنا ہے۔

”جی سر..... پھر میں اس کو پیک کر دوں؟“ سبزیز میں نے اس کی تجویز کو توڑتے ہوئے پوچھا تو اس نے اثبات میں سر ہلادیا..... ابھی اس نے پے منٹ کرنے کے لیے جیب سے والٹ نکالا ہی تھا کہ شدید دھماکے کی آواز نے جیسے اس کے کان کے پردے بھاڑ دیے۔ پوری بیکری بری طرح سے ہل گئی۔ شوٹیں میں رکھی کھانے کی اشیاء دھڑ دھڑ کرتی نیچے گر گئیں۔ شیشے کا دروازہ چھناکے سے ٹوٹ چکا تھا۔ بیکری میں موجود سب ہی لوگ سراسیمہ ہو کر باہر کی طرف بھاگے۔ عباد بھی ایک بھول کر بے حد پریشانی کے عالم میں باہر آ گیا۔ ایک خوف کا ساں تھا چارسو۔

”کہیں قریب ہی کوئی بہت بڑا بم بلاسٹ ہوا ہے۔“ لوگ آپس میں بات کر رہے تھے۔

”ہاں، ہاں وہ دیکھو کتنے گھرے دھوئیں کے بادل اٹھتے نظر آرہے ہیں۔“ کسی نے سامنے دیکھتے ہوئے خوفزدہ لہجے میں بتایا تو عباد کا دل دھک سے رہ گیا۔ اسی طرف تو اس کا قلیبت تھا۔

”اُف جب یہاں تک اتنی شدت کی آواز آئی ہے تو یہ بلاسٹ تو شاید میری بلڈنگ کے بالکل نزدیک ہوا ہے۔ نمرہ کتنا ڈر گئی ہوگی کاش وہ میرے ساتھ ہی آجانی۔“ عباد نے یہ سب سوچتے ہوئے تیزی سے .... اپنی بانیک اشارت کی اور اسے ہوا کی طرح اڑاتا ہوا جب اپنی بلڈنگ کے نزدیک پہنچا تو اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ حیرت، خوف اور شدید صدمے نے جیسے اس کے حواس معطل کر دیے۔ وہ بالکل ساکت سامنے دیکھتا رہ گیا۔ وہ کیاؤنڈ جہاں اب سے کچھ دیر قبل زندگی تھی، رونقیں تھیں، خوشیاں رقص کر رہی تھیں، ہنسی تھی، قہقہے تھے، بچوں کا شور شراب تھا، دکانیں گاہکوں سے بھری ہوئی تھیں۔ اب وہاں ہر طرف ملبہ ہی ملبہ

چاہ رہا تھا۔

”اوکے بیوی تو ہم چلتے ہیں۔“ وہ بادل ناخواستہ دروازے کی جانب بڑھا۔

”خدا حافظ.....“ نمرہ نے شرارت سے اس کے سامنے اپنی چوڑیوں کو کھنکھنایا۔

”یہ چوڑیاں کھنک کھنک کر تھک جائیں گی انہیں تھوڑا سا ریٹ دے دو۔“ عباد ہنستا ہوا باہر چلا گیا۔

”چوڑیاں بے شک تھک جائیں لیکن میں اپنی خوشی کا اظہار کرتے نہیں تھکوں گی۔“ نمرہ کی شوخ آواز اس نے سیڑھیاں اترتے ہوئے سنی اور مسکراتے ہوئے نیچے آکر موٹر سائیکل اشارت کرنے لگا۔ تبھی ایک گیند آکر اس کی بانیک پر لگی اس نے گیند اٹھا کر سامنے دیکھا تو چار سالہ ننھا عابدی بھاگتا ہوا اس کے سامنے آ گیا۔

”انگل میری گیند.....!“ اس نے معصومیت سے ہاتھ اگے پھیلا دیا۔

”اونہوں پہلے مجھے پیار کراؤ پھر گیند ملے گی۔“ عباد نے بے اختیار اسے گود میں اٹھا کر پیار کر لیا۔

گول مٹول سا ننھا عابدی ساری بلڈنگ کے لوگوں کی آنکھوں کا تار اٹھا پھر عابدی کی فرمائش پر عباد نے کیاؤنڈ میں ہی اسے بانیک کا ایک چکر دلا یا اور جب وہ گیٹ کی طرف جا رہا تھا تو کیاؤنڈ میں بکھری رونق بچوں کا کھیلنے ہوئے شور و غل کتنی خوب صورت سی خوشی بکھری ہوئی محسوس ہوئی تھی اسے۔ انسان کے اندر کا موسم اچھا ہو تو ہر چیز حسین لگتی ہے اس نے مسکراتے ہوئے بانیک آگے بڑھا دی تھی۔

☆☆☆

ایک بہت خوب صورت بنا ہوا تھا خاص طور پر نمرہ نے اپنا اور عباد کا نام جس اسٹاکش طریقے سے ایک کے اوپر لکھوا یا تھا وہ لکھے ہوئے نام بے حد اچھے لگ رہے تھے۔ عباد چند لمحے ان ناموں کو دیکھتا رہا بالکل نمرہ نے اس بیکری میں کتنی دیر لگا رکھی تھی۔ ایک

میں وہ بہت کھلی کھلی اور فریش نظر آ رہی تھی۔ گوری گوری کلائیوں میں کھنکھناتی سونے کی چوڑیاں جیسے اپنی قسمت پر ناز کر رہی تھیں۔ عباد کا پتا نہیں کیوں دل چاہنے لگا کہ وہ یونہی اس کے سامنے کھڑی اس سے لڑتی، خفا ہوتی رہے اور وہ اسے دیکھتا رہے۔

”ایسے کیا دیکھ رہے ہیں آپ؟“ وہ اس کی وارنٹی محسوس کر کے کچھ بلش کر گئی آج وہ تیار بھی تو بہت جی جان سے ہوئی تھی اور پھر چوڑیوں کی خوشی نے جبر سے پر مزید چمک بکیر دی تھی۔ عباد بھی وائٹ شلوار میس میں بہت اچھا لگ رہا تھا۔ نمرہ نے

چپکے سے اس کی نظر بھی اتار دی تھی۔ مہمانوں کے آنے میں کچھ ہی وقت رہ گیا تھا اور وہ کب سے عباد سے بیکری جا کر کیک لانے کا کہہ رہی تھی جو اس نے کل ہی آرڈر کر دیا تھا۔

”ایمان سے نمرہ آج تم کچھ زیادہ ہی پیاری لگ رہی ہو، تم پر سے نظریں ہٹانے کو دل ہی نہیں چاہ رہا۔“ عباد نے ایک دم ہی وی آف کر دیا اور اٹھ کر بے اختیار اسے اپنی بانہوں میں سیٹ لیا۔

”ارے عباد، آپ کو کیا ہو گیا ہے؟“ وہ کسمسا کر اس کی بانہوں سے باہر آتے ہوئے بولی، آنکھوں میں حیا کے رنگ اتر آئے تھے۔ عباد کی اتنی

والہانہ محبت پر خود اپنے آپ پر غرور آ رہا تھا۔

”اچھا پھر تم بھی میرے ساتھ چلو۔ یہ تمہاری فیورٹ بیکری اتنی دور ہے کہ مجھے بانیک سے جانا پڑے گا۔ تم ساتھ ہوگی تو مجھے بوریت نہیں ہوگی۔“

عباد کا دل جانے کو نہیں چاہ رہا تھا۔

”آپ بھی کمال کرتے ہیں، صرف پانچ منٹ کی ڈرائیو پر بے بیکری اور پھر وہ آپ نے کھانے کا آرڈر دیا ہے۔ ہوم ڈیوری والے کسی بھی وقت کھانا لے کر آگئے تو پھر.....؟“ نمرہ کی بات میں وزن تھا،

عباد نے دوپہر کو ہی ایک ریسٹورنٹ سے کھانا آرڈر کر دیا تھا کہ آج وہ ہر بل اپنی دہن کے ساتھ گزرا

میں وہ بہت کھلی کھلی اور فریش نظر آ رہی تھی۔ گوری گوری کلائیوں میں کھنکھناتی سونے کی چوڑیاں جیسے اپنی قسمت پر ناز کر رہی تھیں۔ عباد کا پتا نہیں کیوں دل چاہنے لگا کہ وہ یونہی اس کے سامنے کھڑی اس سے لڑتی، خفا ہوتی رہے اور وہ اسے دیکھتا رہے۔

”ایسے کیا دیکھ رہے ہیں آپ؟“ وہ اس کی وارنٹی محسوس کر کے کچھ بلش کر گئی آج وہ تیار بھی تو بہت جی جان سے ہوئی تھی اور پھر چوڑیوں کی خوشی نے جبر سے پر مزید چمک بکیر دی تھی۔ عباد بھی وائٹ شلوار میس میں بہت اچھا لگ رہا تھا۔ نمرہ نے

چپکے سے اس کی نظر بھی اتار دی تھی۔ مہمانوں کے آنے میں کچھ ہی وقت رہ گیا تھا اور وہ کب سے عباد سے بیکری جا کر کیک لانے کا کہہ رہی تھی جو اس نے کل ہی آرڈر کر دیا تھا۔

”ایمان سے نمرہ آج تم کچھ زیادہ ہی پیاری لگ رہی ہو، تم پر سے نظریں ہٹانے کو دل ہی نہیں چاہ رہا۔“ عباد نے ایک دم ہی وی آف کر دیا اور اٹھ کر بے اختیار اسے اپنی بانہوں میں سیٹ لیا۔

”ارے عباد، آپ کو کیا ہو گیا ہے؟“ وہ کسمسا کر اس کی بانہوں سے باہر آتے ہوئے بولی، آنکھوں میں حیا کے رنگ اتر آئے تھے۔ عباد کی اتنی

اپنے دل میں چھپا کر رکھوں گی۔“ نمرہ نے ہنستے ہوئے اس کے سینے پر سر رکھ دیا تب ہی موبائل کی بجتی بیل نے دونوں کو چونکا دیا..... دوسری طرف آیا

تھیں جو تیار ہی تھیں کہ رات کو وہ بھی نہاری بنا کر لا رہی ہیں۔ ان سے بات کرنے کے بعد عباد نے

شرارت سے نمرہ کو دیکھا۔

”یار اتنے خوب صورت روٹینگ ماحول میں آج پہلی بار نہاری کا ذرا کیک کوئین کی گولی کی طرح لگا ہے۔“ جواب میں نمرہ کی ہنسی کی جلتیگ سے کمر

گوج اٹھا۔

☆☆☆

”افوہ عباد ساڑھے چھ بج رہے ہیں، پلیز یہ بیچ دیکھنا بند کر دیں اور شرافت سے اٹھ جائیں، آٹھ بجے تک سب لوگ پہنچ بھی جائیں گے۔“ نمرہ

نے کچن سے جھانک کر کوئی تیسری مرتبہ اسے یاد دہانی کرائی۔

”یار اتنا انٹرٹینگ بیچ آ رہا ہے کتنے دنوں بعد پاکستان فارم میں نظر آ رہا ہے ایسی زیادتی تو نہ کرو میرے ساتھ۔“ وہ صوفے پر مزید دراز ہوتے

ہوئے بولا تو وہ کچن سے باہر آ کر بیوی کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

”آج ہماری شادی کی پہلی سالگرہ ہے عباد اگر آپ کا تھوڑا سا بیچ مس ہو جائے گا تو کیا ہوا..... میں

بھی تو نہیں دیکھ پارہی ناں حالانکہ میرا سادہ بیان اس بیچ میں لگا ہوا ہے۔“ وہ سر پر ہاتھ رکھ کر لڑا کا بیویوں

جیسے انداز میں بولی تو عباد کو بے ساختہ ہنسی آ گئی۔

”اسی لیے تو کہہ رہا تھا کہ آج کا دن صرف اور صرف ہم دونوں کا ہی ہونا چاہیے تھا۔“

”افوہ عباد سارا دن تو ہم دونوں نے ساتھ گزارا ہے اب کچھ گھنٹے کچھ اپنے اتنے چاہنے والے رشتوں کو بھی دینے چاہئیں وہ بھی ہماری خوشی شہر کرنا چاہ رہے ہیں۔“ وہ کچھ کھنکھاتی ہوئی گرین کلر کے کپڑوں



معصوم بے گناہ لوگوں پر قیامت توڑ کر کیسے سکون کی زندگی گزار سکتے ہیں۔ کیا انہیں نیند آجانی ہوگی؟ کیا کھانے کا ہر لقمہ انہیں خون میں ڈوبا ہوا نہیں نظر آتا ہوگا۔ یا اللہ انہیں نیست و نابود کر دے... میرے مولا انہیں عبرت ناک سزا دے... انہیں کیوں زندہ رکھا ہوا ہے تو نے؟ ہر دل سے بد دعاؤں کا طوفان اٹھ رہا تھا۔ گورنمنٹ جو اپنے وطن کے لوگوں کی محافظ ہوتی ہے وہ ان معصوم لوگوں پر پڑنے والی قیامت سے بے نیاز تھی اور اس قیامت کی رات میں لاشوں، زخمیوں اور لمبوں کے درمیان وہ لوگ ان مظلوموں کی مدد کر رہے تھے جو اس وقت کسی ایک مسلک کے نہیں تھے بلکہ دردمند دل رکھنے والے تھے۔

اس وقت صرف ایک مذہب کہ جس کا نام انسانیت تھا اس کے ناتے مدد کر رہے تھے۔ عباد کی جیب میں رکھا ہوا موبائل بار بار بج رہا تھا لیکن اسے تو جیسے کوئی آواز ہی نہیں آرہی تھی۔ وہ تو دوبارہ وارنہ کو پکارتے ہوئے اسے ڈھونڈ رہا تھا۔ بھی ایک صاحب نے اس کی توجہ موبائل کی بجتی تیل کی طرف کرائی۔ ”دیکھیے صاحب، ہو سکتا ہے موبائل پر کوئی آپ کی بیگم کے بارے میں کچھ بتانا چاہ رہا ہو۔“

عباد نے چونک کر اس آدمی کی طرف دیکھا۔ ”ارے ہاں آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں ہو سکتا ہے وہ اپنے ابا کے گھر چلی گئی ہو یا پھر آیا ہے پاس...“ وہ موبائل جیب سے نکالتے ہوئے کانپتے ہوئے لہجے میں بولا۔ دوسری طرف نمہ کے ابا ہی تھے۔

”ارے عباد تم فون کیوں نہیں اٹھا رہے تھے۔ تم لوگ کہاں ہو، نمہ کیسی ہے؟“ انہوں نے بہت بے تابی سے پوچھا تو عباد کا دل مایوسی سے بیٹھ گیا۔

”انگل میں برباد ہو گیا... ارے میں ختم ہو رہا ہوں، انگل میری نمہ ہل ہی نہیں رہی۔“ وہ زور زور سے رونے لگا۔ دوسری طرف سے بھی چیخوں کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ فون اس کے ہاتھ سے

وہیں براجمان رہتا۔ لوگوں نے شاید حمیدہ باجی کو ان کی زندگی کی بے حد حقیقت بتادی تھی بھی تو ان کی چیخیں آسمان کو چھو رہی تھیں۔

عباد ڈوبتے ہوئے دل سے آگے بڑھتا تو سامنے اسے اپنا وہ صوفہ سیٹ بُرے حال میں نظر آیا جس پر لیٹا وہ کچھ دیر پہلے ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ وہ پاگلوں کی طرح صوفے کے قریب آیا۔

”میری نمہ بھی یہیں کہیں ہوگی۔ وہ یقیناً لمبے میں دب گئی ہے۔ کتنی تکلیف میں ہوگی وہ۔ ارے کوئی ہے جو میری مدد کرے۔ میری بیوی اندر دبی ہوئی ہے۔“ وہ ایک بار پھر پاگلوں کی طرح چیخنے لگا۔ کسی ہمدرد نے اسے نارنج پٹا دی تھی۔

”ابو، ابو!“ کوئی لڑکی روتے ہوئے اپنے باپ کو پکارتی تھی لیکن عباد کو اب کسی آواز کا ہوش نہیں تھا۔ ”آخر لمبے اٹھانے کی مشین کیوں نہیں آ رہی... ارے کوئی فوج کو بلائے، گورنمنٹ کہاں ہے، کیوں نہیں بھیج رہی کسی کو۔ میری نمہ لمبے میں دبی ہوئی ہے۔“ وہ بچوں کی طرح روتے ہوئے پاس جمع ہوئے لوگوں سے کہہ رہا تھا۔ ہاتھوں سے لمبے بھلا کیسے اٹھا سکتا تھا اور صرف عباد ہی نہیں بے شمار لوگ روتے چلاتے اپنے پیاروں کو ڈھونڈ رہے تھے۔

”ارے یہ کون ظالم لوگ ہیں جو اتنی بے دردی سے معصوم لوگوں پر اتنی بڑی قیامت توڑ گئے۔ کیا ان کے بچے نہیں ہیں؟ کیا ان کے گھروں میں ان کی مائیں، بیٹیاں، بہنیں بھی ان کا انتظار نہیں کرتیں؟ معصوم بچوں اور عورتوں کو اسلام تو کیا کسی بھی مذہب میں مارتا جائز نہیں... لیکن ان لوگوں کو تو عورتوں اور بچوں پر بھی رحم نہیں آیا۔ زندگی سے پیار کرنے والے جوان ایک لمبے میں موت کے اندھیروں میں اتر گئے۔ لمحوں میں بے بسائے گھر جو کتنی محنت کے بعد خریدے گئے ہوں گے، بنائے گئے ہوں گے بالکل کھنڈر بن گئے۔ یہ کون لوگ ہیں مالک، اتنے

اب وہ دونوں سر جکے تھے۔ عباد چلا چلا کر رونے لگا۔ ”یا اللہ یہ کیا ہو گیا... یہ کیسے منظر ہیں، ارے میرے مالک مجھ پر رحم کرنا۔ میری نمہ کو کچھ نہ ہو۔“ وہ پوری آواز سے روتا ہوا نمہ، نمہ پکار رہا تھا۔ دیوانوں کی طرح ہاتھوں سے لمبے ہٹانے کی کوشش کر رہا تھا کہ شاید وہ اندر دبی ہوئی ہو بھی اس کے بڑوں کی حمیدہ باجی اپنے آٹھ سالہ بیٹے کو یہ مشکل تیار خود میں لادے جتنی ہوئی اس کے پاس آگئیں۔

”عباد بھیا، چلو جلدی سے میرے بچے اسپتال لے چلو، دیکھو آنکھیں نہیں کھول رہا... شاید بے ہوش ہو گیا ہے۔ اس کی ٹانگ بالکل کٹ گئی۔ عباد اسے جلدی سے اسپتال پہنچا دو آج سلطان مجر حیدر آباد گئے ہوئے ہیں۔ ایک منٹ کی بھی دیر نہ کرو، میرا بچہ شاید بچ جائے۔“ وہ دیوانوں کی طرح چلا رہی تھیں۔ بہت سے لوگ جو جی جان سے ان مظلوموں کی مدد کرنے میں لگے ہوئے تھے ان میں سے کچھ لوگ حمیدہ باجی کے نزدیک آ گئے۔ عباد کو خود اپنا ہوش نہیں تھا لیکن حمیدہ باجی کی بے قرار دیکھ کر ان نے لرزتے ہاتھوں سے شہزاد کو تھا تا موت کی کھنڈک نے ایک لمحے میں بتا دیا کہ شہزاد اب اس دنیا میں سے ہی نہیں۔ اس نے برقی آنکھوں سے اس ماں کی جانب دیکھا جو اپنے بچے کی زندگی بچانے کے لیے بے تاب ہو رہی تھی۔

”ارے تم لوگ دیر کیوں کر رہے ہو، دیکھ سامنے ایبوسینس کھڑی ہے جلدی لے چلو میرے بچے کو۔“ حمیدہ باجی نے بہت بے بسی سے رو کر کہا۔ مدد کے لیے آنے والے لوگوں نے شہزاد کو عباد کی گود سے لیا جو صرف رو رہا تھا، ایک عجیب ہڈیانی کیفیت ہو رہی تھی اس کی، شہزاد ہر روز شام کو ایک گھنٹا نمہ سے انگش پڑھنے آتا تھا اور اس دور عباد اس کی پیاری پیاری باتوں سے خوب لطف اندوز ہوتا رہتا تھا۔ نمہ لاکھ آنکھیں دکھائی لیکن

نظر آ رہا تھا۔ بالکل سامنے فرسٹ فلو پر ہی تو اس کا فلیٹ تھا۔ اس کی جنت، اس کا آشیانہ جس میں وہ اپنی نمہ کے ساتھ رہتا تھا اور جسے وہ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہنستا بولتا چھوڑ کر آیا تھا۔ اب وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ اس کے فلیٹ کا تو نام و نشان ہی مٹ چکا تھا۔ روشنی سے معمور وہ جگہ اب اندھیروں میں ڈوب چکی تھی۔ جگہ جگہ آگ کے شعلے پھڑک رہے تھے اور ان کی روشنی میں لٹے پٹے ہر اسال اور خوفزدہ لوگ چیختے چلاتے اپنے پیاروں کو آوازیں دیتے ادھر سے ادھر بھاگ رہے تھے۔ وہ بری طرح سے کانپنے لگا، اس کی بائیک ایک طرف گر چکی تھی لیکن اسے کچھ ہوش نہیں تھا۔

”نمہ، نمہ!“ دفعتاً وہ پوری قوت سے چیختا، چلاتا اس طرف دوڑا جہاں اس کی دنیا آباد تھی۔ اندھیرے میں مختلف اشیا سے ٹکراتا ہوا وہ دیوانہ وار صرف نمہ کو ہی پکار رہا تھا۔ کتنے انسانی جسم اس کے پیروں کے نیچے آئے وہ گھبرا گھبرا کر اپنے موبائل کی روشنی میں ان کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کرنے لگا کہ کہیں نمہ تو نہیں۔ اس کا رُواں رُواں نمہ کی زندگی کی دعا کر رہا تھا۔ آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے بھی کسی چیز سے ٹکرا کر وہ زمین پر گر پڑا تو اس کا ہاتھ ایک ننھے سے سر پر پڑا اور پھر خوف اور وحشت سے جیسے اس کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ موبائل کی روشنی میں سامنے ننھے عابی کا صرف سر پڑا ہوا نظر آ رہا تھا۔ وہ لرزتا ہوا زمین سے اٹھا، دل غم سے پھٹا جا رہا تھا۔ پتا نہیں عابی کے ماں باپ کہاں تھے کس حال میں تھے ہر طرف لوگوں کی چیخ و پکار اور آہ وزاری کی آوازیں نے ماحول کو مزید وحشت ناک بنا دیا تھا۔ کوئی اپنے بچوں کو پکار رہا تھا، کوئی اپنے بھائی کو پکار رہا تھا کسی کا شوہر نہیں مل رہا تھا اور کسی کو اپنی ماں کی تلاش تھی۔ سامنے ہی اسے ایک عورت پڑی ہوئی نظر آئی جس کے سینے سے اس کا بچہ چٹا ہوا تھا مگر



چھوٹ گیا۔ آنسو سے ترچہ کے ساتھ اس نے ادھر ادھر دیکھا، ایک عورت ادھر سے ادھر دوڑتے ہوئے نہ جانے کس کو پکار رہی تھی۔ کتنے لمبے چوڑے مرد بچوں کی طرح روتے ہوئے پتا نہیں اپنے کن پیاروں کو ڈھونڈ رہے تھے۔

بچن کا سامان ہر سو بکھرا ہوا تھا۔ بچے سجائے فلیٹ کیسے کھنڈر کا سامان پیش کر رہے تھے۔ اس کا چھوٹا سا فلیٹ بھی تو نمبرہ نے کتنی خوب صورتی سے سجایا تھا۔ آج ہی تو اس نے اپنی جان جان کو چوڑیاں پہنا کر اس کی زندگی کی ایک بڑی آرزو کو پورا کیا تھا۔ وہ ہنسی کھلکھلاتی زندگی سے بھرپور لڑکی پتا نہیں اس وقت کہاں تھی کن حالوں میں تھی..... شاید وہ زخمی ہو گئی ہو اور اسے اسپتال پہنچا دیا گیا ہو۔ ایک نئی سوچ نے امید کا چھوٹا سا دیار روشن کر دیا اس نے غلت میں زمین پر پڑا اپنا موبائل اٹھایا اور آپا کو فون کیا۔

”ارے عباد میرے بھائی یہ کیا ہو گیا۔ نمبرہ ملی کہ نہیں؟“ آپا اس کی آواز سن کر تڑپ کر دوں۔

”آپا میں کیا کروں، اگر نمبرہ نہیں ملی تو شاید میں بھی نہیں بچوں گا۔ خدا کے لیے آپا آپ ہر اسپتال میں جائیں شاید وہ زخمی ہو..... مجھے جلدی سے خوش خبری سنائیں آپا ورنہ میں مرجاؤں گا۔“ وہ بے قراری سے رو دیا۔ آپا نے جواب میں کیا کہا اس نے کچھ سنائی نہیں۔ وہ بس دیوانوں کی طرح نارنج کی روشنی ہر سو ڈال رہا تھا۔ یہ شام غربیاں جیسی کیفیت کیسی طویل ہو گئی تھی۔

ایسی راتیں بھی ہم نے دیکھی ہیں جن کی صدیوں سحر نہیں ہوئی نارنج کی روشنی میں اسے ایک بالکل نیا اور نوازا منا سا جو تا نظر آیا تو دل کھٹنے لگا۔ بھی بالکل اچانک اسے ایک کونے میں ایک شخص بیٹھا ہوا نظر آیا۔ اس نے بے اختیار نارنج کی روشنی اس طرف پھینکی تو جیسے ایک لمحے کو وہ ناقابل یقین کیفیت میں سکتے

عالم میں کھڑا رہ گیا۔ اس شخص کی گود میں نمبرہ کا ہاتھ رکھا ہوا تھا۔ جس میں پہنی ہوئی سونے کی وہ چار چوڑیاں اسے صاف نظر آ رہی تھیں جسے وہ شخص اتارنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”کیمنے.....“ عباد پوری قوت سے چلاتا ہوا اس شخص کے قریب آ گیا تو وہ آدمی گھبرا کر کھڑا ہو گیا اور اس کی گود میں رکھا ہوا وہ ہاتھ زمین پر گر گیا۔ عباد نے پھٹی پھٹی نظروں سے اس ہاتھ کی جانب دیکھا جو اس کی نمبرہ کا تھا۔ لیکن وہاں نمبرہ نہیں تھی۔ صرف نمبرہ کا یہ ہاتھ..... عباد تھر تھرا پنے لگا۔ وہ شخص گھبرا کر پیچھے ہٹا اور اس سے پہلے کہ وہ بھاگتا عباد نے جونہی انداز میں اسے پکڑ لیا۔

”تجھے یہ چوڑیاں چاہیے تھیں ناں، میں تجھے سب دے دوں گا۔ اپنی نمبرہ کو میں اور چوڑیاں بنوادوں گا بس تو یہ بتائے کہ وہ کہاں ہے۔ اسی وقت جلدی بتا دے ذیل انسان ورنہ میں ابھی تیرا گھونٹ دوں گا۔“ وہ جیسے اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا تھا۔ وہ آدمی بہت خوفزدہ ہو گیا۔

”مجھے معاف کر دیں جی، میں بہت غریب آدمی ہوں مجھے تو کوئی نہیں یہ ہاتھ پڑا ملا تھا۔ باقی مجھے کچھ نہیں پتا۔“ وہ آدمی ہاتھ جوڑ کر معافی مانگنے لگا۔ عباد کی نگاہوں کے سامنے اندھیرا اچھالنے لگا اس نے نمبرہ کے ہاتھ کو اٹھا کر سینے میں چھپالیا۔ دیوان وار وہ اس کے ہاتھ کو پیار کر رہا تھا۔

”نمبرہ دیکھو تمہاری چوڑیاں کھٹک کھٹک کر تھک گئیں۔ نمبرہ میری جان۔“ وہ اتنی بے کسی سے رو رہا تھا کہ اس پاس جمع ہونے والے لوگ بھی اس اندھ ناک منظر کو دیکھ کر رو پڑے۔ نمبرہ کے بے جان ہاتھ میں پڑی سونے کی چوڑیاں موت کے اس شہنشاہ اندھیرے میں جیسے اپنی کھٹک سے محروم ہو کر عباد کے ساتھ آنسو بہا رہی تھیں۔

## محبتِ تمام شدہ

دستِ اندازِ رابعہ

”اوہ میرے خدایا.....!“ سامعہ نے سر تھام لیا..... پورے سات ماہ اور تین دن سے اقصیٰ کی شادی کی تیاری میں بلکان..... چھوٹی، چھوٹی جزئیات کا خیال رکھا۔ دن کا آغاز تمام نشاۃِ والے کاموں کی پلاننگ سے ہوتا اور اختتام جائزے پر۔

ایم این اے کی اکلوتی بیٹی کی شادی اس میں کوئی کمی نہ رہنے پائے، جس طرح سے وہ اس تقریب کو مٹائی اور یادگار بنانے کے لیے کوشاں تھیں شادی سے ہفتہ قبل اس کے تعریفی کلمات ان تک پہنچنا شروع ہو گئے تھے۔

”میں مسز چٹھہ بات کر رہی ہوں۔“ میل فون پر کال آئی۔

”السلام علیکم بھائی کیسی ہیں آپ؟“ سامعہ کو خوشگوار سی حیرت ہوئی جب سے چٹھہ صاحب جیمبر آف کامرس کے صدر منتخب ہوئے تھے گھاس ہی نہیں ڈالتے تھے..... مسز چٹھہ نے اس تاثراتی کیفیت سے نکالا۔

”میں کل الحسنات جیولرز پر گئی تھی، وہاں بالکل شو اسٹائل میں چوڑیاں دیکھیں بہت پسند آئیں پتا چلا آپ کی ڈیزائننگ ہے، جیولر آپ کی چوائس کی بہت تعریف کر رہا تھا، کیا میں آپ کے ہاں آسکتی ہوں؟ اصل میں میرے بیٹے کی شادی ہے کوئی گولڈ سیٹ پسند نہیں آ رہا تھا۔“

”ضرور ضرور یہ کوئی پوچھنے والی بات ہے۔“ سامعہ نے مسکرا کر کہا ایسے ہی درجنوں تیرے انہیں





ایسی شاندار کہ بندہ دیکھتا رہ جائے..... چاہو تو ڈیکوریشن پس بنا کر سجالو۔

سامعہ کی اپنی سہن سے ایک دفعہ ہی ملاقات ہوئی تھی بس ٹیلی فونک رابطہ تھا، وہ کینیڈا میں بڑے بیٹے کے پاس ہوئی تھیں اب شادی پر واسطہ پڑا تو مقابلے کی ہی لگیں۔ رفعت پر اچانک ان کی سہن بیٹے کی بارات کے ساتھ سفید شیٹوں پر بڑے کے سوٹ میں ایسے سبک خرامی سے آئیں کہ جس نے دیکھا بس حسن، وقار اور نزاکت کے اس مجسمے کو دیکھتا رہ گیا۔

سامعہ کا سر فرسے مزید بلند ہو گیا..... اُدھر بھی کسی کسی چیز کی نہ تھی..... زوہیب کی سی اے کی ڈگری..... ملٹی نیشنل کمپنی میں جاب..... چار کنال کی امریکن اسٹائل کوٹھی..... اور پراچہ صاحب کے پلازے اور سینما ہاؤس۔

بس صرف ایک اڑتا پھرتا چھوٹا سا ننھا منافرہ رشتہ کروانے والے نے یہ کہا تھا کہ لڑکے کا مزاج کچھ تیز سا ہے..... جسے سن کر سب سے پہلے تو سامعہ ہنسی تھیں پھر جہانگیر صاحب نے خوب مذاق اڑایا..... اس لیے کہ ان کا تعارف بھی اپنی شادی کے وقت سرال میں انہی لفظوں میں پہنچا تھا۔ اسٹیج پر پہنچتے ہی سلامیوں کے ساتھ دودھ پلائی کی رسم شروع ہوئی..... بغیر کسی گھبراہٹ کے بڑے اعتماد کے ساتھ زارا اسٹیج پر آئی۔

”دولہا بھائی! دودھ پلائی۔“ بلیک میٹ کی لانگ شرٹ..... انتہا درجے کی خوب صورت کندھوں تک کی اسٹیپ کنگ کو بڑی ادا سے جھٹک کر اس نے دولہا کو مخاطب کیا اور دودھ کا گلاس پیش کرتے ہوئے کہا۔

”ارے واہ..... دولہا بھی اور ساتھ بھائی بھی، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ زوہیب ہنسا۔

”جی نہیں اپنے دولہا کو تو میں کبھی بھائی نہیں کہوں گی۔“ زار نے ٹہلے پردہ بلال مارا۔

انڈین فلموں کے وہ تمام گانے جو مہندی کی تقریب میں ہوتے ہیں آج سب کو سر دھنسنے پر مجبور کر رہے تھے۔ سبز اور پیلے جوڑوں پر انہی دورنگوں کی کچی کچی چوڑیاں پروٹی گئی تھیں۔

ایک اور بات..... روزانہ کی تقریب کا مینیو اگے ہوتا..... دیسی اور بدیسی سب کے ذوق کو مد نظر رکھا جاتا..... شوگر فری سویٹ کا ایسے وسیع پیمانے پر انتظام پہلی دفعہ دیکھنے میں آیا..... ڈائٹ کولا، کوکے سٹروں فری کوکنگ آئل کا خیال رکھا گیا تو جٹ بچے مرغن کھانوں والے بھی مایوس نہ ہوئے۔ جس نے کھایا..... پہلے یہی پوچھا کھانا کہاں سے بنوایا؟ شادی ہال میں پہنچتے سے قبل ہی سب شرکا کے لیے کورس کی مٹھائی کے پیک پیچھے چکے تھے۔

پیسہ پانی کی طرح بہانے کا سنا تھا، دیکھا اب..... کسی بھی تقریب میں کوئی ایک ایسا نہیں تھا کہ جو کی ڈھونڈ پاتا..... زبردست، واہ، بہت خوب، یہ کلمات سر ٹیفیکٹ تھے جو سامعہ اور اس کے شوہر جہانگیر چودھری ایم این اے کا ڈیروں خون بڑھا رہے تھے..... مہینوں کی پلاننگ، ان تھک محنت اور ٹیم ورک سے ہر چیز خوب سے خوب تر ہو گئی..... پھر دودھ پلائی کی رسم کیوں ذہن سے نکل گئی۔

”چہ چہ..... اب کیا کروں؟“ ایک دم ذہن میں کوئڈا سالہ کا۔

”نندگی بیٹی تو بہت چھوٹی ہے، دیواری کی بیٹی زارا کیا خوب رہے گی۔ ہے بھی بڑی چارمنگ، اور اور کوئی ڈرنٹ..... ہے تو اولیوں کی طالبہ لیکن لاکھوں میں ایک.....“ زارا کا نام آتے ہی ساری کوفت دور ہوئی اور میکس ہو کر زارا کی طرف بڑھیں..... داماد اسٹیج پر چڑھ چکا تھا اور فوٹو گرافرز کی فوج ظفر موج فوٹو شوٹ کے لیے موجود تھی۔

☆☆☆

ویسے تو نکاح کی بد بہت زبردست تھی، پیکنگ

سفید پر یاں بنی ہوئی تھیں۔ شیٹوں کے سفید سوٹ جس پر سفید موٹیوں انگوٹوں کا کام تھا۔ سفید ہینڈ بیگ وائٹ پرل کی چپرا اور یہ سب حسب توقع تھا۔ کارڈز پر فرمائش کی گئی تھی یہاں تک کہ سپاروں کی جلدیں تک سبز کروائی گئی تھیں۔

سفید موٹیوں کی لڑیاں دروازے پر لہرا کر سر کا استقبال کر رہی تھیں..... بعد میں کھانا تک سنا چائنا کر کری میں دیا گیا۔ دوسرے دن کی تقریب کا نام ”مغلی“ تھا جس میں انڈین فلموں کی شادی طرز پر اقصیٰ کو مایوس بٹھایا گیا۔

یہ تقریب کل کی تقریب سے بھی زیادہ حیران کن رہی..... اس تقریب کے کارڈز پر مدعوین کی انوکھی فرمائش تھی کہ مغلیہ طرز کے لباس پہن آئیں..... غیر شادی شدہ لڑکیوں کو پشتواز اور بچوں کو چوڑی دار پاجامہ جبکہ شادی شدہ کورا جھستانی پہن کر آنے کا کہا گیا۔

مردوں نے حیدر آبادی لباس، تنگ پاجامہ شیر وائیاں پہنی تھیں۔ انڈین فلم، محل اعظم نے اتنا تو بتا دیا تھا کہ سب کو کیسے استقبالیہ کلمات ادا کرنا ہیں۔ ماتھے ہاتھ لے جا کر کرکٹس بجالاکر..... ادب آداب لحاظ..... تشریف رکھیے۔ وغیرہ..... وغیرہ..... بہت حسین تقریب تھی..... امیر خسرو اور سین کی رو میں بھی وجد میں آگئی ہوں گی۔

تین گھنٹے کی تقریب..... ہر گانا گاننے کی طرح فٹ بہت سی داد و دھم لے کر لذت طعام دے مہمانوں کو ایک ملکہ کی طرح انہوں نے رخصت کیا تیسرے دن کی تقریب کا عنوان ”حنا“ تھا۔ مہندی ہو تو ایسی..... واہ.....!

ہال کے دروازے پر ایک مہندی کے درخت شہنشاہ اپنی مخصوص خوشبو کا اثر دے رہی تھیں۔

پورے شہر کے کونے کونے سے ملتے تھے۔ سامعہ کی چوٹیں، سامعہ کے ٹکڑے، ٹکڑے، سامعہ کا آرٹیکل اور کڑی ایوینج بس یہی فقرے کانوں میں رس گھولتے تھے..... پھر..... پھر یہ غلطی کہاں ہوئی؟ کیوں ان کے ذہن میں اس کا خیال نہیں آیا؟

”سمو دودھ پلائی کس سے کروانی ہے؟“ ایک لمحے کے لیے تو ان کا دماغ جھکا گیا تھا۔ جب ان کی تندرثوں نے دولہا کو اسٹیج پر بلانے کے بعد ان کے کان میں کہا۔

”اُف!“ دودھ پلائی کی رسم کا ان کے ذہن میں کیوں خیال نہیں آیا۔

”ک..... کیا..... دو..... دودھ پلائی؟“

زارا شاید بھلائی تھی۔

”ہاں تو کیا دولہا کو دودھ نہیں پلاتا؟“ مندرے ہنس کر کہا۔

”یہ کیا ہوا؟“ جب پچھلے ہفتے انہوں نے کالونی کی تمام بچیوں کو ہائی ٹی پر انوائٹ کیا تھا تو بارات کا استقبال ہی بس ایجنڈا تھا۔ ”پھولوں کے گجرے کس کس نے پہنائے ہیں۔“

”ہیکے کس نے پکڑا تا ہیں!“

”پھولوں کے ہار کس نے اور کس کو پہنائے ہیں!“

”پھولوں کی پتیوں کس کس پر ڈالنی ہیں۔“

”دیکھو ماہا کوئی کی نہ رہ جائے۔“ انہوں نے جی ایم کی بیٹی ماہا کو اس استقبالیہ ٹیم کا نگران بناتے ہوئے کہا۔

اور واقعی جب شادی کی تقریبات کا ہفتہ قبل آغاز قرآن خوانی سے ہوا تو سب حق دق رہ گئے۔ ”یہ..... یہ واہ! کیا زبردست سر پرانز ہے۔“ سفید چاند نیاں وائٹ پینٹ والا ہال دروازے کھڑکیاں چھت فانوس پینٹنگز ہر چیز سفید تھی۔ اس تقریب کے لیے سامعہ نے ان تمام بچیوں کو وائٹ سوٹ بنا کر دیے تھے۔ وہ اور اقصیٰ دونوں



”او..... او.....“ زوہیب نے سیٹی بجائی۔ ”میری دلہن آپ کی باجی اور میں آپ کا بھائی..... یہ تو ہمارا نکاح توڑ دیا آپ نے..... اب کیا کریں؟“  
 ”وہ زوہیب بھائی.....“ ایک لمحے کے لیے زارا ہکلا گئی۔

”افوہ پھر بھائی.....“ زوہیب بد مزہ ہوا۔  
 ”بس بھائی کے اگلے والا رشتہ کافی ہے۔“  
 اس نے سرگوشی کی اور ساتھ ہی گرم سلگلاتا تھ زارا کی کمر پر رکھ دیا۔  
 زارا کرنٹ کھا کر پیچھے ہٹی..... اس کی ساری بے باکی ختم ہو گئی۔

”دودھ پلائی تو لیتی جائیں۔“ کسی کا فقرہ سنائی دیا۔

”ناک آؤٹ ہو گئی ہیں ہمارے ہیرو سے.....“ لڑکے والوں نے ہنس کر کہا۔  
 چند منٹ کے بعد صورت حال سے بے خبر سامعہ اور ثروت نے زارا کو پھر بھیجا۔

”پاگل..... شادی بیاہ میں تو بہت کچھ چلتا ہے۔ دودھ پلاؤ..... اور دودھ پلائی بھی لے کر آؤ۔“ کچھ کچھ نفاسی زارا پھر اسٹیج پر آئی۔

”دودھ لے لیجیے دولہا صاحب۔“ اس نے چاچا جاکر کہا۔ دودھ لیتے ہوئے وہی فلمی پچویشن..... جان بوجھ کر گلاس کے بجائے زارا کا ہاتھ دیا۔

”زوہیب بھیا..... پلیز دودھ پلائی دیں۔“  
 ”صرف دودھ پلائی..... ہم تو آج بہت کچھ دینے پر آمادہ ہیں، آپ مانگ کر تو دیکھیں۔“

”نی الحال تو نیلا نوٹ دے دیجیے۔“ اس نے کہا۔

”ارے، ایک نیلا نوٹ کیا ناک آؤٹ ہو گئی ہیں؟“ زوہیب نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور پانچ پانچ ہزار کے کئی کڑکڑاتے نوٹ بغیر گنے اس کے آگے کیے۔ ”لیجیے آپ نے تو ہر نیلے نوٹ کا کہہ کر

ہری جھندی دکھائی تھی ہم نے جذبات سے بھر یہ کڑک نوٹ آپ کے حوالے کیے۔“  
 ”آج سے میرا دل اور یہ نوٹ آپ ہوئے.....“ دولہا کے سامنے نے تہہ پہن لگایا اور کہا۔  
 ”اوہ..... اوہ.....“ لڑکوں نے ہونٹک وا انداز میں سیٹی بجائی۔ زارا گھبرا کر اسٹیج سے اتری..... ایسی پچویشن تو اس نے فلموں اور ڈراموں میں بھی نہیں دیکھی تھی۔ اس کے ماتھے پر پسینہ آ رہا تھا۔ اسٹیج سے نیچے اترتے، اترتے دولہا کے دوست نے نشو اسے پکڑا لیا۔

زارا نے بغیر نظر ڈالے اسٹیج سے چھلانگ لگائی۔  
 ”اوئے کیا تو دولہا کے نوٹوں کی قیمت پوری کر چاہتا تھا جو اس کے پیچھے چلا گیا۔“ کسی سن چلے بھر پور تیرہ کیا۔ اس طویل ڈائلاگ سیشن سے اس نے پہلو بدلا۔ نہ جانے کیوں اسے کچھ عجیب سا لگا تھا۔  
 ”کیا آج وہ اتنی خوب صورت نہیں کہ اس سے نظریں نہیں اور زارا پر ٹک جائیں۔“ ایک سوچوں میں اس سوچ کے اضافے کے ساتھ اقصی زوہیب کے ساتھ رخصت ہو گئی۔

شادی کا ایک، ایک لمحہ مووی میکر کی مووی میں موجود تھا۔

☆☆☆

شادی کے اگلے دن ہی یہ نیا نیلا جوڑا بنگا کر یا پیرس کے بجائے کاغان، ناران روانہ ہو گیا۔ دونوں کو سی آف کرنے کے لیے سامعہ موجود تھی۔ ان کی نظریں بار بار اقصی کے چہرے کو ٹٹول رہی تھیں..... دل میں بس ایک ذرے جتنا شک رہا تھا۔

”کہیں اقصی ناخوش تو نہیں.....؟“ اسے شک کا گلا دبا کر انہوں نے ڈھیروں ڈھیر دعاؤں کے ساتھ رخصت کیا اور جہاز ٹیک آف کرنے تک انرپورٹ پر موجود رہیں۔ وہاں پانچ چھ دن کے قیام



گھٹنے بھر کی ہدایات لے کر وہ واپس گھر آگئیں، ان چھ سات دنوں میں زوہیب بس ایک دفعہ اسپتال آیا تھا۔ وہ ڈر کے مارے اقصیٰ سے شکوہ بھی نہ کر سکیں۔

”وہ اس سے دکھی ہوگی..... اور اس کے دکھ سے میں دکھی ہو جاؤں گی.....“ آنسو نے تو جیسے ان کی آنکھوں کو اپنا مسکن بنالیا..... موتیوں کی لڑی کی طرح بہہ نکلتے۔

اقصیٰ نے ماں کی حالت دیکھ کر اپنے آپ کو مطمئن اور پرسکون ظاہر کرنے کے لیے دل لگی کے چھوٹے چھوٹے فقرے بولنا شروع کیے لیکن سامعہ نے ٹھنڈی آہ بھری۔

اس کا چہرہ اس کی باتوں کا ساتھ نہیں دے رہا تھا اور دونوں ماں بیٹی اس بات کو بخوبی جانتی تھیں۔ بس صدمہ تھا صرف ایک بات کا، دکھ تھا تو صرف اس بات کا کہ کاش.....

اے کاش شادی کی تیاریوں میں سوئی کی ٹوک جتنی چیز کا بار یک بیٹی سے خیال رکھنے والی سامعہ نے ہمیشہ میں کشمیر کی شال اٹلی کے جوتے، جینوٹ کے فرنیچر خریدنے والی ماں نے ٹی سی ہال کی بکنگ سے باراتیوں کے استقبال کے لیے ہر چیز یادگار فراہم کرنے والی عورت نے داماد کے لیے برائڈ ٹھہری نہیں سوٹ سے انتیس لاکھ کی نئی گاڑی کے منفرد ماڈل منتخب کرنے والی حوا کی بیٹی نے بس حراج ذرا تیز سے کو مد نظر کیوں نہیں رکھا؟ محبوب علیؑ

خدا نے اخلاق (دین) کو ہی تو پہلے سامنے رکھنے کی تلقین کی تھی۔ اب اگر پتا چلا بھی کہ چیزوں کی دوچار دن واہ واہ ہو جائے گی قابل رشک ٹھہرائی جائیں گی فنا ہو جائیں گی، پر مزاج تو سدا ہی رہے گا اور بہت سی محنتوں، مشقتوں کے بعد فطرت نے تبدیلی کا لبادہ اوڑھا بھی تو گئے دنوں کا حساب کون دے گا؟

ہاتوں باتوں میں اتنا پتا چلا کہ زارا کے ساتھ اور بھی بہت سی لڑکیاں ڈکس رہتی ہیں۔

”ہماری کلاس میں ایسے تو ہوتا ہے۔“ بچے بچے انداز میں انہوں نے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

”نہیں ماما..... عورت کے اندر مرد کو نہانے کا جانچنے، برکھنے کا پیمانہ لگا ہوتا ہے، وہ بتا دیتا ہے کہ کون مرد کس عورت کے بارے میں کیا سوچتا ہے۔“

”یہ چار دن کی شادی شدہ زندگی کے مشاہدات ہیں آگے کیا ہوگا؟“ سامعہ کا دل دھک سے رہ گیا۔ سامعہ نے اپنے آنسو پونچھے..... اور دکھی دل سے سوچا۔

اس فن کال نے تو اس کے صرف عورت کے بارے میں نہیں بیوی کے بارے میں تاثرات واضح کر دیے تھے۔

”اف.....“ انہوں نے اپنے دل سے اٹھنے والی غصوں پر بے اختیار کہا اور درو سے بے حال جھکتی چلی گئیں۔

☆☆☆

بارٹ کیئر سینٹر کے آئی سی یو میں دو دن رہنے کے بعد ان کو اسپتال کے پرائیوٹ روم میں منتقل کیا گیا تو ان کے ذہن میں ایک ہی سوچ تھی۔

اقصیٰ! اقصیٰ کا شوہر..... اس کی بد مزاجی شک، طبیعت کی تیزی۔

”پتا نہیں اقصیٰ کیسے زندگی بسر کرے گی؟“ اگر حکومتی اختیارات یا مال کی وجہ سے مزاج بدلے جاسکتے تو وہ الدین کے جن کی طرح زوہیب کی بد مزاجی ٹھیک کر دیتیں۔

”پلیز آپ سوچے مت.....“ سسر آ کے انہیں ریلیکس کرتی۔

”کیسے نہ سوچوں..... ماں ہوں، اقصیٰ میرے وجود کا ٹکڑا ہے آنسو پینے سے دل کا بوجھ ہلکا نہیں ہوتا۔“

☆☆☆

”آہنی اقصیٰ سے کہیں تیار ہو جائے، میں بچنے والا ہوں۔“ زوہیب نے ساس کو کال کی۔

”لیکن بیٹے وہ تو سو رہی ہے۔ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں۔“ انہوں نے بڑے مسکین لہجے میں کہا۔

”لیکن وہ ہے کہاں، اس نے سیل آف کیا ہے۔“ وہ لفظ چاچا کر بولا۔

”بیٹے بتایا تو ہے وہ سو رہی ہے۔“ لہجہ کو حتی الامکان نرم بناتے ہوئے انہوں نے کہا۔

”تو یہ آواز کس کی باتوں کی آرہی ہے۔“ کڑوے لہجے میں اس نے کہا۔

”کون سی آواز.....؟“ حیرانی سے انہوں نے پوچھا۔

”جو آپ سنا نہیں چاہتیں..... اور فون اسی لیے آف کیا ہے کہ درمیان میں ڈسٹرکشن ہو۔“

”سپاٹ سے انداز میں زوہیب نے کہا۔“

”امیرے خدا.....! یہ تو ناک شوچل رہا ہے۔“

”کس سے؟“ زہر خند لہجے میں زوہیب بولا۔

”ٹی وی پر، سنواؤں؟“ قدرے سخت لہجے انہوں نے کہہ کر سیل ٹی وی اسکرین کے آگے کیا۔

غصے سے دوسری طرف سے فون آف ہو گیا۔ اس دو منٹ کی کال میں بہت سے بیگانہ تھے..... بہت سے ڈراؤنے پہلو تھے۔ اقصیٰ

زندگی کے مستقبل کے..... ابھی تو اسے شادی بعد میکے آئے صرف دوسرا دن تھا، ہنسی مومن واپسی پر دس بارہ دن کے بعد تین چار دن کی اجازت لے کر آئی تھی۔

”ماما..... میری طبیعت سخت خراب ہو رہی ہے، کچھ نیند لینے کے بعد میں آپ کے اور پیارے ساتھ چائے لوں گی، اچھی سی.....“ آتے ہی نے کہا۔ سامعہ نے نظراٹھا کی نہ تبسم نہ تکلم خالی چہرہ شروع دنوں کے کوئی ارمان اس کے چہرے گل و گلزار نہیں کر پارہے تھے۔

☆☆☆

میں اقصیٰ کا صرف دو دفعہ فون آیا اور حال احوال پوچھنے تک ہی رہا..... اب ان کو پتا چلا کہ بیٹیاں بیٹیاں کم ماں کی سہیلیاں زیادہ ہوتی ہیں..... ٹی تقریبات پر فیتے کاٹے..... مہمان خصوصی بنیں، دوبارہ جم جوائن کیا لیکن لمبے پہاڑ سے دن کٹنے میں نہیں آ رہے تھے..... وہ باؤلی باؤلی سی بنی گھر میں گھومتیں۔ ہر پانچ دس منٹ کے بعد سیل فون پر اقصیٰ کا نمبر نکالتیں پھر اپنے آپ کو جاہل، ایل میٹر ڈباور کر کے سیل فون ایک طرف رکھ دیتیں۔

”بھلا زوہیب کیا کہے گا یہاں بھی فلک پڑیں۔“

☆☆☆

ایئر پورٹ پر قدم رکھتے ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ فلائٹ پہنچ چکی ہے..... بے تابی سے سامعہ آگے بڑھیں۔

”اقصیٰ بیٹا.....“ انہوں نے لپک کر اس کے ماتھے پر بوسہ دیا۔

”زوبی بیٹا! آپ کیسے ہیں؟“ انہوں نے دور کھڑے داماد کے پاس جا کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرنا چاہا۔

”اٹس اوکے آئی.....“ زوہیب ایک قدم اور پیچھے ہو گیا۔

اقصیٰ کے چہرے پر واضح ناگواری کی لہر آئی۔ انہوں نے خوش دلی سے دونوں کو ساتھ چلنے کو کہا۔

”تو آئی..... ڈرائیور باہر ہے۔“ خدا حافظ کہہ بغیر بیک ہاتھ میں اٹھائے وہ آگے بڑھ گیا۔

”یہ کیا بات ہے؟“ بے ساختہ ان کے منہ سے جملہ نکلا، جسے انہوں نے دانتوں تلے ہی دبا لیا۔

سامعہ بری طرح ہرٹ ہوئیں۔ کہیں زوہیب سن نہ لے..... اقصیٰ نے مرکز ماں کو دیکھا۔

اب ناگواری کی واضح لکیر ان کے ماتھے پر تھی..... ماں سے گلے ملنے کے لیے وہ آگے ہوئی۔

”جلدی کرو، دیر ہو رہی ہے مجھے۔“ تیکھے لہجے میں زوہیب نے کہا..... اقصیٰ ہڑبڑا کر جلدی سے آگے بڑھ گئی۔

☆☆☆

ماہنامہ پاکیزہ 98 مئی 2013

ماہنامہ پاکیزہ 99 مئی 2013





## شہزادہ یارِ اکبر

عنیزہ سید

قسط 2

زندگی اور محبت کے رنگ کبھی کوئی گن نہیں سکا ہے... خیر و شر، نیکی اور بدی... زندگی کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں مگر ایمان کی طاقت... ہر برائی پر حاوی ہو جاتی ہے اور اسی طاقت کی بدولت صحرا بھی ستاروں کا آئین بن جاتا ہے۔ ہماری مایہ ناز مصنفہ عنیزہ سید نے اس ناول میں صحرا کی ریت میں کس طرح پھول اگانے ہیں یہ آپ کو ناول پڑھ کر ہی پتا چلے گا۔

رنگ و خوشبو کے حُسن و خوبی کے  
تم سے تھے جتنے استعارے تھے



”جب ایک بار زندگی میں غلطی ہو جائے تو پھر اس پر پچھتانے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا، غلطی کے نتائج چرچہ سامنے آئیں ان میں سے مثبت کی طرف نظر کرنا بہتر ہوتا ہے۔“ محمود درانی نے اپنے مخصوص نظریے کے لیے میں ہر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ اگرچہ اس بے وقت کی بڑبڑاہٹ کا پس منظر نہیں جانتے تھے جو مہرین نے ان دفتر سے واپس آنے کے بعد سے اب تک شروع کر رکھی تھی مگر اس کا مفہوم و مقصد ضرور سمجھ گئے تھے۔

”یہ لڑکا ہر جگہ مجھے شرمندہ کروانے کا تہیہ کیے بیٹھا ہے اگر اس کے انداز اتنے واضح نہ ہوتے تو سیدھا کیا مجال تھی کہ کرید کر اس کے بارے میں مجھ سے سوال کرتی۔“ مہرین کے لہجے میں غصہ اور بے بسی دونوں موجود تھے۔

”میرا نہیں خیال کہ وہ دانستہ ایسا کرتا ہے۔“ محمود نے بیٹی کی طرف داری کی جرأت کرتے ہوئے کہا۔

”آپ اس کے مزاج سے بہت اچھی طرح واقف ہیں۔ وہ اتنا ہی بے ساختہ اور سادہ ہے کہ بتا کر یا بڑبڑا کر کوئی بات اپنے بارے میں کرنا اس کے لیے نامکن ہے۔“

”وہ جیسا بھی ہے اسے کیا ضرورت پڑی ہے دوسروں کو یہ تاثر دینے کی کہ وہ ہم سب گھر والوں کے اپنے ماں باپ سے، اپنے بہن بھائیوں سے بالکل مختلف مزاج اور الگ شخصیت کا حامل ہے۔ صرف اس لیے کہ.....“ مہرین کے غصے اور بے بسی نے ان پر مکمل طور پر قابو پالیا اور وہ اپنی بات مکمل نہ کر سکیں۔

”صرف اس لیے کہ اسے اس کی ماں کے بجائے اس کی نانی نے پالا ہے۔ اس کی تربیت نانی کے ہاتھوں ہوئی ہے اور یہ کہ اس کی ماں اور نانی کے مزاج میں بہت فرق تھا اس لیے وہ اپنے ماں باپ اور بہن بھائیوں سے ایک بالکل مختلف شخصیت رکھتا ہے۔“ محمود نے کمال عمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے نرمی سے مہرین کی ادھوری چھوڑی بات کو مکمل کیا۔

”ہوں.....“ مہرین نے ہنکارا بھرا۔

”تو مانی ڈیر واقف.....“ محمود نے انہیں ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔ ”یہ کون سی بڑی بات ہے، ہمارے خاندان والے ہمارے عزیز واقارب کون نہیں جانتا کہ یہ ایک حقیقت ہے کہ حمزہ آپ کی گود میں نہیں اپنی نانی کے ہاتھوں میں پلا بڑھا ہے، اس نے اپنی زندگی کے کئی سال اپنے ماں باپ کے گھر سے ایک بالکل مختلف ماحول میں گزارے ہیں اس لیے اس کی شخصیت اور مزاج ہم لوگوں سے چنداں مختلف ہے۔ اس میں شرمندہ ہونے یا ناراض ہونے والی بات کون سی ہے۔ سب جانتے ہیں کہ حمزہ کو آپ نے بی بی اماں کے حوالے کیا جب کہ اس وقت آپ کتنی مجبور تھیں۔ آپ کی خرابی صحت اور پہلے سے دو چھوٹے بچوں کے ساتھ نے آپ کو اب کرنے کے لیے مجبور کیا اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بی بی اماں کون سا کوئی غیر خاتون تھیں۔ آپ کی اپنی والدہ تھیں، ایسے وقت میں انہوں نے کیسے آپ کا ساتھ دیا، ان کی عمر زیادہ نہ تھی، بہت ہمت والی اور ایکٹو خاتون تھیں، ایک بچہ پالنا ان کے لیے مشکل نہیں تھا سوائے انہوں نے حمزہ کو بہت اچھے انداز میں پالا۔ مہرین میں سمجھ بھگ پارہا کہ اس بچہ جھلا ہٹ کی وجہ کیا ہے؟“

”آپ اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ وجہ کیا ہے۔“ مہرین نے خفگی سے کہا۔ ”ہمارے سب رشتے دار ہمارے اسٹیشن اور رہن بہن سے خار کھاتے ہیں حالانکہ یہ اللہ کا دیا ہوا ہے مگر کیونکہ ان کی رسائی میں نہیں ہے اس لیے اپنے دلوں کے پھپھو لے یوں پھوڑتے ہیں کہ حمزہ کی شخصیت کے مختلف ہونے کا ذکر کر کے اسے ہمارے گھر کے ماحول میں ہٹ مٹ خیال کرتے ہیں اور وہ لڑکا جو میرا چنانچہ بیٹا ہے ان کی باتیں سن کر مجھے خود سے اور بھی درد

☆ ☆ ☆

نادیدہ نے زندگی کو ان تصورات سے مختلف پایا تھا جو لڑکپن اور اوائل جوانی میں ذہن میں آتے تھے۔ انہیں اپنی گزشتہ زندگی پر نظر ڈالنے کا کوئی خاص شوق تھا نہ ہی انہیں اس کی فرصت ملتی تھی مگر کبھی بکھارا یا ہوتا تھا کہ راتیں طویل ہو جاتیں اور نیند دور بھاگ جاتی تھی۔ نیند کی خواہش کرتے کرتے ذہن کی رو بھٹکتی لگتی اور بہت سی پرانی یادیں اور پرانی باتیں یاد آنے لگتیں۔ کبھی بکھار یہ یادیں اور باتیں احتساب کا درجہ اختیار کر لیتیں۔ ایک، ایک لمحے کا شمار ہونے لگتا۔ کب کہاں کیا غلط ہوا؟ کب، کہاں، کیا نہیں ہوتا چاہے تھا جو ہوا اس کے بجائے کیا کرنا چاہیے تھا؟ کہاں، کہاں ایک درست فیصلہ حالات کو بہتر شکل دے سکتا تھا؟ کہاں، کہاں جذبات سے کام لینے سے زندگی کا نقشہ بدل گیا؟ کہاں عقل نے ساتھ نہیں دیا؟ اور کہاں حالات کو مقدر جان کر تسلیم کرنا پڑا۔ رات کی گھڑیاں بیتی جاتیں اور احتساب کا دورانیہ بڑھتا جاتا۔

پھر انہیں خیال آتا کہ زندگی میں جو مختلف کردار انہیں نبھانے پڑے انہیں انہوں نے کیسا نبھایا۔ انہیں اپنی ہر پرفارمنس میں غلطیاں نظر آتیں، کبھی وہ ایک بیٹی اور ایک بہن تھیں۔ انہوں نے ان دونوں حیثیتوں کو بری طرح لیٹ و ڈاؤن کر دیا۔ ان دونوں حیثیتوں کو لیٹ و ڈاؤن کرنے کے پیچھے کسی کی بیوی بننے کی خواہش کو دھنسا تھا۔ وہ سعید کیانی کی محبت میں گرفتار ہو گئیں، یہ ان دنوں ہوا جب وہ دونوں میڈیکل کے فائل ایئر میں



”پچھتاوے، دکھ اور افسوس اپنے وقت پر ہی اچھے لگتے ہیں۔ وقت نکل جائے تو انسان کو ہر حال میں خوش رہنے کی عادت ڈال لینی چاہیے ورنہ بڑا نقصان ہو جاتا ہے۔“

اس وقت انہیں سعید کی بچی ہوئی ایک پرانی بات بھی یاد آئی مگر انہیں لگنے لگا تھا کہ اب ان کی زندگی میں پچھتاؤں کے سوا کچھ رہ نہیں گیا تھا۔ اس موقع پر بھی ان کو ان کے لواحقین نے نہیں پوچھا تھا گو یہ خبر دونوں کے گھر اپنے تک پہنچ چکی تھی۔ حالات کی اس سختی نے نادیہ کو حد درجہ حس بنا دیا تھا۔ انہیں اپنی زندگی میں کچھ خاص دلچسپی باقی نہیں رہی تھی۔ وہ ایک خاص قسم کی میکا کی زندگی گزارنے کی عادی ہونے لگی تھیں۔ اس مشینی زندگی کے اثرات ان کے اس مختصر گھر اور علیحدہ پر کس طرح اثر انداز ہو رہے تھے یہ انہوں نے بھی سوچا بھی نہیں تھا۔ انہیں صرف اتنا یاد تھا کہ ان کی زندگی کا ایک بڑا حصہ پچھتاؤں کا شکار ہو گیا تھا اور باقی کا حصہ اپنی بقا کی جنگ لڑنے گزار جاتا تھا۔ زندگی میں ان کا بہت بڑا نقصان ہو گیا تھا اور اس نقصان نے ان کے دل پر بہت بڑی طرح اثر کیا تھا۔ زندگی اسی ڈھنگ سے گزر رہی تھی اور اس کو اسی طرح گزار جاتا تھا مگر ان کو شاید بھی یہ خیال نہیں آتا تھا کہ ان کی اس ذہنی تنہائی نے علیحدہ کو کس قدر تنہا کر کے رکھ دیا تھا۔ وہ اپنی زندگی کے ڈرامے کے کسی کردار سے بھی انصاف نہیں کر سکتی تھیں۔ بیٹی کی حیثیت سے انہوں نے ماں باپ کو لٹ ڈاؤن کر دیا تھا، بیوی کی حیثیت میں انہوں نے وہ مختصر وقت پچھتاؤں میں گزار دیا اور ان کے کردار تک آتے، آتے بے حس ان کے گرد گھیرا انگ کر چکی تھی۔ وہ سوچتی تھیں، یاد کرتی تھیں، پچھتاتی تھیں مگر خود کو بدل ڈالنے کا عہد کبھی نہ کر پائیں، طویل تاریخ اور سرد راتیں یونہی بتتی چلی گئیں۔

☆☆☆

بینش نے کپڑے دھو کر بخوڑے اور رنگ برنگے کپڑوں سے بھری نیلے رنگ کی بالٹی اٹھائے بیڑھیاں چڑھنے لگی۔ چھت پر دھوپ تیز تھی، اس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ کندھے پر رکھے خشک کپڑے سے اس نے انگلی جھاڑی اور بالائی میں رکھے کپڑے ایک، ایک کر کے جھٹک، جھٹک کر سوکھنے کے لیے پھیلائے لگی۔ ساتھ ساتھ وہ اپنے ارد گرد کے منظر کا جائزہ بھی لے رہی تھی۔ اونچی نیچی چھتوں والے بے شمار گھر ایک دوسرے کے ساتھ بڑے کھڑے تھے۔ یوں جیسے صدیوں سے یونہی ایک دوسرے کے سہارے کھڑے ہوں۔ ان گھروں کے مکینوں کے دکھ، کھوشیاں اور غم ایک دوسرے سے منسلک تھے۔ دلوں میں کدورتیں کم پیار زیادہ تھا۔ نسل و نسل خاندانوں کی دوستیاں اور تعلقی ہوتے رہے تھے، مکینوں کے چہرے بدلتے رہے تھے مگر تعلقات کی نوعیت ہمیشہ سے ایک سی تھی۔ بینش کو یہ ماحول اور اس سے منسلک روایات اور تاریخ بہت اچھی لگتی تھی۔ وہ ان سے مانوس اور وابستہ تھی۔ وہ یہاں رہنے والے اپنے ہم عمران کو لوگوں کو بھی جانتی تھی جو اس ماحول سے نجات حاصل کرنا چاہتے تھے جنہیں یہ سب گھنا ہوا اور فرسودہ لگتا تھا۔ ان بچہ در بچہ تنگ گلیوں سے باہر کا ماحول انہیں کشادہ اور ہوا دار لگتا تھا، پرانے شہر کو چھوڑ کر وہ اس علاقے میں نوآبادی شہر کی طرف کوچ کر جانا چاہتے تھے جہاں کھلی سڑکیں، کھلی ہوا، جدید بستیاں، ہر آسائش کھلے گھر اور زندگی کی تمام جدید سہولیات میسر تھیں۔ یہاں رہنے والے کئی مکینوں نے اس کوچ کا اہتمام کر بھی لیا تھا اور نئی زندگی کی طرف پرواز کر چکے تھے مگر لوئر منڈل کلاس طبقے کے وہ خاندان جن کی زندگیاں اپنی بھائی جگہ لڑتے گزر جاتی ہیں اب بھی یہیں مقیم تھے اور انہی کے دم سے ان کی محلوں کی دنیا آباد تھی۔ یہاں رونق تھی، شور تھا، رنگ اور ہنگامے تھے۔ بینش کو رنگ بہت اچھے لگتے تھے۔ وہ اپنے ہاتھ سے دھوئے کپڑوں کے رنگوں میں کھوئی ہوئی اور محو تھی جب اس کی نظر آسمان

تھے۔ چار سال تک اکٹھے پڑھنے اور اٹھنے، بیٹھنے کے بعد ان پر انکشاف ہوا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو چاہتے تھے۔ نادیہ کے لیے یہ ایک انوکھا انکشاف تھا مگر سعید کیانی کے اظہار پر انہیں بالکل بھی برا نہیں لگا بلکہ محسوس ہوا کہ وہ خود بھی ایسا ہی چاہتی اور سوچتی تھیں۔ ہاؤس جاب کے دوران ان کی ذہنی ہم آہنگی بہتر لگی اور انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ ایک دوسرے کے بغیر ان کی زندگی ناممکن تھی۔

سعید نے اپنے بھائی کے ذریعے ان کے ہاں شادی کا پیغام پہنچایا جسے بری طرح مسترد کر دیا گیا۔ نادیہ شبیر محبت کرتے ہوئے بہت سے زمینی حقائق فراموش کر بیٹھی تھیں۔ انہیں بھول گیا تھا کہ ان کے خاندان میں ذات پات، خاندان اور پس منظر کو بہت اہمیت دی جاتی تھی۔ ذات، برادری سے باہر شادی کرنا ناقابل معافی سمجھا جاتا تھا، اسی لیے زیادہ تر اپنے خاندان میں ہی شادی کرنے کو ترجیح دی جاتی تھی۔ سعید ایک بالکل مختلف ذات اور برادری سے تعلق رکھتے تھے، ان کے بھائی کی تو ایک سے دوسری بات بھی نہیں لگتی۔ وہ زمانہ ایسے حالات کو من و عن تسلیم کر لینے کا تھا مگر نادیہ کے ذہن و دل نے بغاوت کر دی۔ انہوں نے اپنے والدین اور بھائیوں کے سامنے صاف الفاظ میں احتجاج کیا اور فیصلہ سنا دیا کہ وہ ہر صورت سعید کیانی کی شادی کریں گی۔ درمیان کے عرصے میں حالات نے کئی پلٹے کھائے، سعید کے گھر والوں نے نادیہ کے والد کی مرضی کے بغیر شادی کرنے سے انکار کر دیا مگر ان دونوں کو پھر بھی من مرضی کرنے سے نہ روکا جا سکا۔ اور بغاوت کو رٹ میرج پر منتج ہوئی اور ان دونوں کا اپنے والدین سے تعلق ختم ہو گیا جس طرح یہ کہانی ختم تھی اسی طرح اس کے نتائج و عواقب بھی ختم نہیں تھے۔ کورٹ میرج کے بعد زندگی میں قدم جمائے کام آیا۔ دونوں نے ایوب میڈیکل کالج سے ایم بی بی ایس کیا تھا، اس شہر سے دونوں ہی واقف تھے سودوئوں اسی شہر میں قیام کا فیصلہ کر لیا۔ دونوں کے خیال میں انہوں نے ایک جائز کام غلط طریقے سے کیا تھا۔ وہ ان کے ذہنوں پر اس کا بوجھ تھا، اس ذہنی بوجھ نے دونوں کو وہی سماجی زندگی سے دور کر دیا۔ لوگ ان کے بارے میں سو طرح کی باتیں سوچ سکتے تھے، وہ اتنے تنہا کیوں تھے، کوئی ان سے ملنے کیوں نہیں آتا تھا؟ ان والدین اور عزیز واقارب کہاں تھے؟ سعید سے زیادہ نادیہ کے ذہن پر اس کا بوجھ تھا، سعید کا ساتھ دنیا کی بڑی نعمت تھا مگر اس نعمت کے حصول کے لیے جو کچھ انہوں نے گنوا یا اس نقصان کا تخمینہ لگانا ناممکن تھا۔ ان نے خود کو اپنے کام میں بری طرح مصروف کر لیا۔

شادی کے تین سال بعد ان کے ہاں علیحدہ آگئی، دونوں کے لیے یہ موقع بھی خوشی اور افسوس کا احساس لے کر آیا۔ خدا تعالیٰ نے انہیں ایک نعمت سے نوازا تھا مگر اس نعمت کی خوشی منانے کے لیے اکیلے تھے۔ ان کے چند ایک انتہائی قریبی دوستوں نے ان کے والدین سے رابطہ کرنے اور انہیں منانے کی کوشش کی مگر ناکام رہے۔ یہ زندگی جس کے لیے دونوں نے ہی بڑی قربانی دی، دونوں کے لیے سب کچھ ہونے کے باوجود دونوں کو بوجھ محسوس ہونے لگی۔

”یا تو کوئی بڑا قدم اٹھاؤ نہیں، جب اٹھا لو تو پچھتاؤ نہیں۔“ نادیہ کی ایک پرانی دوست نے ایک بار سے کہا تھا مگر وہ ان الفاظ کی روح کو قبول نہ کر پائی تھیں۔ پچھتاؤں نے ان کے دل میں گھر کر لیا تھا افسردہ اور ناخوش رہنے کی تھیں مگر خدا کا شکر ہر حال میں کس قدر ضروری تھا، اس کا خیال انہیں اس وقت جب صرف تیس سال کی عمر میں سعید اچانک ہارٹ فیملر کا شکار ہو گئے۔ یہ اتنی غیر متوقع بات تھی کہ نادیہ ساتھ ساتھ وہ لوگ بھی گنگ رہ گئے جو انہیں صرف جانتے تھے۔



جانتا تھا کہ اس تاریخ میں سیکڑوں مظلوموں کی آہیں، سسکیاں اور دکھ رقم تھے۔ اسے اس تاریخ کو پڑھنے کی ضرورت بھی نہیں تھی کیونکہ اسے بغیر دیکھے، پڑھے ہی اس کا بھرپور احساس تھا، وہ اپنے باپ کے قتل کے بعد جب یہاں پہنچا تھا اس وقت بھی اس کو آنکھیں اور ذہن آنے والے دنوں کو دیکھ اور ادراک کر رہی تھیں۔ اسے بخوبی علم تھا کہ وہ چند گھنٹوں کے اندر تنہا سے ایوری تنہا بنا دیا جائے گا، اس کے سر پر وہ اونچا شلہ سجا دیا جائے گا جو علاقے کی سرداری کی علامت تھا۔ اس کے پاس اس روز اتنا بھی وقت نہیں تھا کہ وہ چند لمحے کے لیے اس بد قسمتی پر انفسوس کر لیتا کہ ایک سرداری کی میت کو دفن کرنے سے پہلے ہی دوسرے سرداری کی سرداری کا اعلان کیا جا رہا تھا۔ اسے اتنا بھی وقت نہیں ملا کہ اپنے مرے ہوئے باپ کے سر ہانے کچھ دیر بیٹھ کر اس سے ایک خاموش مکالمہ ہی کر لیتا۔ وہ شاید اسے بتانا چاہتا تھا کہ وہ اس ابدی حقیقت سے جا ملتا تھا جسے اس نے اپنی پوری زندگی فراموش کیے رکھا تھا اور اب وہ ان لمحوں کی طرف جا رہا تھا، جہاں اسے سر جھکا کر عمر بھر سناٹا کر زندگی گزارنے کا حساب دینا تھا۔ وہ یہ سب کرنا چاہتا تھا مگر اس وقت ساری غیر مرئی حقیقتیں کہیں پس منظر میں چلی گئی تھیں اور پیش منظر میں لوگوں کا جھوم تھا، بادشاہ گر تھے، میڈیا تھا، روشنیاں تھیں، سوال جواب تھے اور نعرے تھے۔ ”جب تک سورج چاند رہے گا مراد خان تیرا نام رہے گا۔ زندہ ہے مراد خان زندہ ہے، شہید ہے شہید ہے مراد خان شہید ہے“ جس نظام کے ہاتھوں وہ لوگ ستائے ہوئے تھے اور پس ہوئی زندگی گزارنے پر مجبور تھے اسی نظام کے ایک امین کی غیر فطری موت پر انہیں اس جذباتی انداز میں مشتعل کر دیا گیا تھا کہ وہ لمحوں میں اس کی جان کا انتقام لینے پر تیار ہو گئے تھے۔ علاقے کے بادشاہ گردوں کو اپنے فن میں کمال حاصل تھا۔ انہوں نے لمحوں میں صورت حال کو بھانپ لیا تھا اور شام ہونے سے پہلے، پہلے سردار مراد خان کو ایک تمثیلی کردار کے مانند دنیا کے سامنے لے آئے تھے یوں کہ نہ دیکھنے والوں کو کوئی اعتراض تھا اور نہ ہی مہر زاد نے اس معاملے پر دوسری سوچ سوچی تھی۔ نظام چلانے والے دنیا سے چلے جاتے تھے، نظام زندہ رہتا تھا، اس نظام کے امین اس علاقے سے باہر بھی ایک کردار رکھتے تھے۔ ملکی سیاست پر ان کو ہمیشہ سے ایک خاص قسم کا اختیار حاصل رہا تھا۔ اسٹیبلشمنٹ کی جڑوں میں ان کے بندے بیٹھے تھے جن کا کام مراعات کے عوض ان کی کاٹھی مضبوط کرنا تھا۔ اپنے باپ کے مرنے کے چند گھنٹوں کے بعد سردار مراد خان ملکی سطح پر ایک نئے لیڈر کی حیثیت میں متعارف ہو چکا تھا۔

مگر مہر زاد کو اس بات پر خود بھی حیرت محسوس ہوئی تھی کہ اس اچانک بدلی ہوئی صورت حال نے اس کے ذہن و دل پر کچھ خاص اثر نہیں چھوڑا تھا۔ اپنی اماں سے گفتگو سے پہلے وہ شاید بھی جان نہ پاتا کہ اب اسے ماں بول سے ایک خاص طریقے سے کیوں دور رکھا گیا تھا گو اس کی اٹھان اور پرورش ویسے ہی کی گئی تھی جیسے ہمیشہ سے یہاں کے سرداروں کی روایت تھی مگر شاید اماں کی سائیکس کا اثر اتنا تھا کہ اسے اس ماحول میں یوں رہنے کے مواقع نہیں ملتا تھا جو یہاں کی روایت تھی مگر اس کے باوجود اسے یوں زندگی کی تمام تر روش بدل جانے سے بھی کوئی فرق محسوس نہیں ہوا تھا۔ وہ بخوبی جانتا تھا کہ دوستوں کے اس جھوم میں جو ہر وقت اس کے ساتھ رہتا تھا، دوست بہت کم اور مارا آستین زیادہ تھے۔ اسے اچھی طرح اندازہ تھا کہ دوستوں کے اس جھوم میں اس کے باپ کے قاتل بھی موجود تھے اور وہ لوگ بھی جن کے لیے اس کی اپنی جان لینے پر تیار ہو جانا چنداں مشکل نہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ شطرنج کی جو بساط یہاں بچھی تھی اس کے مہرے کن کن لوگوں کے اشارے پر حرکت کرتے تھے، شرمات کون دیتا تھا اور بادشاہ کو چاروں طرف سے زرخ میں لے کر چپ کون کرتا تھا۔ دوستوں کے اس

برائوتی رنگ برنگی پتنگوں پر پڑی، یہ ایک محور کن منظر تھا، بسنت کے دن ختم ہو چکے تھے، بہار اپنی آمد کے آگے چھوڑ کر جا چکی تھی۔ دن طویل اور روشن ہو رہے تھے، فضا میں جدت بڑھ رہی تھی مگر ان کی محلوں میں رہنے والے بچوں پر موسم کی خنکی اور جدت سے کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ وہ اس گرم دوپہر میں بھی پتنگیں اڑا رہے تھے۔ بینش کو بلند فضاؤں میں اڑتی رنگ برنگی پتنگیں بھی بہت پسند تھیں۔

”تم بھی ایک بڑا گڈا منگوا لو شیدے پتنگ ساز کی دکان سے۔“ اسے یوں خود دیکھ کر سامنے والے گھر کی بالکنی میں آئی بانو نے کہا۔ وہ سبزی کے چھکلوں کی ٹوکری پکڑے ہوئے تھی جسے اس نے کھلے دل سے بچنے کے لیے لٹا دیا تھا۔ بچہ بہت نیچے یہ چھلکے کسی راہ گیر کے سر پر پڑیں یا کسی نالی کو بند کرنے کا سبب بنیں اسے کوئی پر نہیں تھی۔ اگر گلی میں چلتا کوئی راہ گیر سناٹا کر اس عزت افزائی پر مغفلات کبنے لگتا تو بھی بانو کو کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ اسے ان مغفلات کا جواب دینا بخوبی آتا تھا۔

”مجھے گڈے اڑانے نہیں آتے بانو،“ بینش نے مسکرا کر جواب دیا۔

”ہاں تمہیں ضدیں کرنی آتی ہیں اپنی اماں سے کہ تم نے کالج میں آگے پڑھنا ہے۔“ بانو نے اسے یاد دلایا۔

”یہ کوئی بری بات ہے کیا؟“ بینش نے بالٹی میں موجود پانی کو ایک ساڈ پر گرگراتے ہوئے کہا۔

”پر جب تمہاری اماں اور بھائی تمہیں آگے نہیں پڑھانا چاہتے تو تم کیسے پڑھو گی؟“ بانو نے جیسے اس مذاق اڑایا۔

”قسمت میں ہوا تو ضرور پڑھ لوں گی، نہیں ہوا تو نہیں پڑھوں گی۔“ بینش کے لہجے میں اطمینان تھا۔ باا کو اس کے اس اطمینان سے ہمیشہ سے چڑھی۔

”جو مرضی کرلو، مجھے نہیں لگتا کہ تم اس سے آگے پڑھ سکو گی۔“ اس نے بینش کو کسی حقیقت کا احساس دلانا چاہا۔ بینش زرب لب مسکرائی اور بالٹی اٹھا کر نیچے کی طرف چل دی۔ ”میں نے کر لے پکائے ہیں آج پیاز، ٹماٹر، ڈال کر کھاؤ گی۔“ اسے پیچھے سے بانو کی آواز آئی۔ بینش نے مسکرا کر پیچھے کی طرف دیکھا اور

اثبات میں سر ہلا دیا۔ آپس کی تمام تلخیوں کے باوجود ان کے درمیان پیار اور خلوص کا رشتہ قائم تھا۔

نیچے آ کر اس نے صحن میں رکھی واشنگ مشین دھوئی، واشنگ پاؤڈر، ٹیل اور صابن سمیٹ کر صحن دھوئے لگی۔ ابھی اسے بہت سے دوسرے کام بھی کرنے تھے۔ اماں نے ابھی تک اسے سبزی نہیں لاکر دی تھی اور

اسے دوپہر کا کھانا بھی بنانا تھا۔ اس کے دونوں بھائی ٹھیک ڈیڑھ بجے نماز اور کھانے کے وقفے کے لیے دکان بند کر کے آ جاتے تھے اور اس وقت تک کھانا تیار ہو جانا لازمی تھا۔ اس نے بیٹھک میں جا کر گلی میں کھٹنے والی

کھڑکی کھول کر باہر دیکھا، تنگ اور طویل گلی خالی تھی، اماں کا دور دور تک کچھ پتا نہیں تھا، اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اب تک جو وہ واپس نہیں آئیں تو ابھی کچھ دیر اور بھی واپسی کی توقع نہیں کرنی چاہیے تھی۔ وہ یقیناً کسی طویل گفتگو میں مصروف ہو چکی تھیں۔ اس نے مایوسی سے کھڑکی بند کی اور اندر کمرے میں جا کر فون کا ریسیور اٹھا کر بھائی کی دکان کا نمبر ملانے لگی۔ اسے اب بھائی کی صورت حال بتا کر پکانے کے لیے کچھ منگوانا تھا۔

☆☆☆

مہر زاد کو اپنے مزاج پر قابو پانے میں کوئی خاص دشواری پیش نہیں آ رہی تھی اور یہ بات اس کے اپنے بھی حیران کن تھی۔ اس کے باپ کا ترکے میں چھوڑا ہوا نظام پیچیدہ اور بے اصولیوں پر مبنی تھا۔ اس نظام کو پشت پر صدیوں پر محیط اقتدار اور حاکمیت کا احساس کھڑا تھا۔ وہ اس تاریخ کو کھولنا نہیں چاہتا تھا، وہ اچھی طرح



ہونے کا اس کا کوئی ارادہ تھا۔ اسے پروگرام کے دوران آنے والی کالز اسٹینڈ کرنے اور پوچھے جانے والے سوالات کے جواب دینے میں مزہ آتا تھا۔ خواتین اور لڑکیوں کی ہلکتی ہوئی پُرسرت آوازیں، اکثر متوقع اور کبھی بکھار غیر متوقع سوال اسے بہت اچھے لگتے تھے۔ وہ وقت کے ایک، ایک لمحے کو انجوائے کرنے کا قائل تھا اور یہی اس کی شخصیت کی کشش کا باعث تھا۔

مگر اس روز جب وہ اپنے پروگرام میں دو جاپانی ڈشز بنانا سکھا رہا تھا۔ اسے ایک بہت ہی غیر متوقع کال موصول ہوئی تھی۔ اس کے کان میں لگے اُر پیس پر آپریٹنگ آواز آئی۔ ”سراسر مس علیہ سعید فرام ایبت آباد“ ”اوهوئے بے اختیار اس کے منہ سے الفاظ نکلے تھے اور سبزی کاٹتے ہوئے پہلی بار اس کا ہاتھ چوکا تھا۔ شکر تھا کہ اسے کوئی زخم نہیں آیا تھا۔

”آن از مت کیجیے، ان کی بات کو صرف مجھ تک محدود رہنے دیجیے۔“ اس نے ہلکے سے آپریٹر سے کہا تھا اور بعد میں وہ کئی منٹ اس بات پر شکر ادا کرتا رہا کہ بروقت اسے یہ بات سوجھ گئی تھی، ورنہ اس فون کال کے لائیو ہوجانے کی صورت میں کیا ہو جاتا، وہ یہ سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا کیونکہ اس کال میں گفتگو کا آغاز ہی غیر متوقع انداز میں ہوا تھا۔

”آپ کو علم ہے کہ آپ کتنے بڑے گدھے ہیں۔“ دوسری طرف سے نسوانی آواز میں کہا جا رہا تھا۔ ”خواتین کے لیے مخصوص کام کرتے ہوئے شرم نہیں آتی آپ کو، بڑی بڑی باتیں کیا کرتے تھے ایک زمانے میں آپ۔ اب کبھی غور سے خود کو دیکھا ہے، یہ سبزیاں اور گوشت کاٹتے بھونتے کیسے للو لگ رہے ہوتے ہیں جناب، شرم نہیں آتی آپ کو، ہاں آپ کو نہیں آتی ہوگی مگر ہم تو شرم سے ڈوب، ڈوب جاتے ہیں کہ کبھی ہم بھی تم سے تھے آشنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو۔“

”کال کٹ گئی یا پھر شاید ٹھیک طریقے سے کنکٹ ہی نہیں ہوئی۔“ اس نے اپنی ساتھی میزبان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”مشتاق بھائی آپ ان کو میرا ذاتی نمبر دے دیجیے اگر دوبارہ کال آئے کیونکہ پروگرام کا وقت ختم ہونے والا ہے، دوبارہ شاید ان کی کال ملے نہ ملے۔“ اس نے آپریٹر کو یہ آواز بلند ہدایت کی اور ان الفاظ کے ساتھ ہی کال واقعی کٹ گئی۔ وہ بال بال بچا تھا، مگر اس کا دل خوشی سے سرشار تھا۔ ایک لمبے عرصے کے بعد وہ آواز اس کے کانوں میں آئی تھی جسے وہ اپنے بچپن کی ساتھی کہا کرتا تھا۔ وقت اس آواز کی مالک پر خاصا اچھا اثر ڈالنا تھا اس کے لہجے کے اعتماد نے اسے بتایا تھا۔ اچانک اس کا دل پروگرام کو جلد از جلد وائٹڈ کرنے کے بعد آپریٹر سے اس کال کا نمبر لینے کو چاہنے لگا تھا۔ فہر رضا کو اتنے برسوں میں پہلی مرتبہ کسی نسوانی آواز نے اپنی طرف کھینچا تھا۔

☆☆☆

تاؤ شریف کو زرنگار کے لیے آنے والی پے منٹ پر حیران ہونے کی کوئی ضرورت نہیں تھی مگر جس چیز نے اسے درحقیقت حیران کیا تھا وہ زرنگار کا یہ پے منٹ قبول کر لینا تھا۔ وہ گھبرا گیا تھا۔ وہ زرنگار سے بات کرنا چاہتا تھا اسے سمجھنا چاہتا تھا، اس نووارد کی پے منٹ زرنگار کے لیے اعزاز کی بات کیوں نہ ہو، اسے قبول کر لینے کے بعد زرنگار امرائے بیگم کی کوئی بات نال نہ سکے گی، پھر کسی پے منٹ کو واپس نہ بھجواسکے گی اور پھر وہ سلسلہ شروع ہو جائے گا جسے زرنگار سے منسلک کرتے ہوئے تاؤ شریف جیسے شخص کے لیے بھی انتہائی اذیت کا باعث تھا۔ اگرچہ وہ جانتا تھا کہ اس سنہری گل کے اصول بھی یہ تھے اور اس کا چلن بھی یہ ہی تھا۔ ان اصولوں

ہجوم میں کوئی بھی دوست نہ تھا، اس نے چند دنوں کے اندر فیصلہ کر لیا تھا اور اپنے من کے اندر اپنی دنیا بسا لیا۔ بھی اسے مشکل نہیں لگا تھا۔ من کی اس دنیا میں اسے مشورہ دینے والا بھی اس کا دل تھا، خطرات سے آگاہ کرنے والا بھی اس کا دل تھا اور ان سے بچانے والا بھی اس کا دل تھا۔ چند ہفتوں کی ذاتی مشق کے بعد اسے اس کام میں بھی مہارت حاصل ہوگئی کہ وہ انسانوں کے اس ہجوم میں اٹھتا، بیٹھتا تھا۔ سب کے مشورے لیتا تھا سب سے گفتگو کرتا تھا مگر ماننا اپنے دل کی تھا، یوں کہ اس کے گرد موجود بادشاہ گردوں کو کانوں کان خبر نہ ہوتی تھی۔ یہ وہ بادشاہ گرتے جن کی مجبوری تھی کہ اس خاندان کا بیٹا، ہی نظام کا سردار ہو سکتا تھا، علاقے کے لوگ کسی اور قبیلے اور خاندان سے تعلق رکھنے والے کو اپنا سردار ماننے پر کبھی تیار نہیں ہو سکتے تھے اس لیے انہیں اسی خاندان کے وارث کو اختیارات سونپنا پڑتے تھے مگر اس بار ان کے دلوں میں ایک خاص امیدھی۔ ان کا خیال تھا کہ کم عمر، نا تجربہ کار، مغرب پسند سردار مہرزاد خان کو ان تمام معاملات میں کوئی دلچسپی نہیں ہوگی، وہ اسے علامت کے طور پر پیش کر کے اختیارات اپنے ہاتھ میں رکھنے میں کامیاب ہو جائیں گے مگر ان کے فرشتوں کو بھی خبر نہ تھی کہ یہ نیاسر دار آنے والے وقت میں ان کے لیے سب سے ٹھیکہر ثابت ہونے والا تھا۔ وہ جانتا تھا، سمجھتا تھا، معاملات کو سلجھا سکتا تھا اور مسائل سے نبٹ سکتا تھا۔ جو زندگی کو میدان جنگ سمجھتے ہوئے محاذ کا سامنا کرنے کے فلسفے کا پیروکار تھا جسے سامنے سے آئے ہوئے وار کا مقابلہ کرنا اچھا لگتا تھا اور جو پشت پر کھائے ہوئے زخم کو اپنی توہین سمجھتا تھا، جو حملہ کرنا اور حملے کا سامنا کرنے کے علاوہ دفاع کی پالیسی کو بھی اچھی طرح سمجھتا تھا اور جسے یہ بھی معلوم تھا کہ ایسی شخصیت کا مالک ہوتے ہوئے اسے عمر بھر دوستوں سے زیادہ دشمنوں سے واسطہ پڑنے والا تھا۔

☆☆☆

اسے کوئٹہ کے پروگرام میں شامل ہونا بہت اچھا لگتا تھا۔ کوئٹہ اس کا جڑوقی مشغلہ تھا۔ ایم ای اے فنانس کی ڈگری رکھنے والے اس نوجوان کے پاس کوئٹہ کورسز کے ڈیڑھ دو ڈیڑھ سرٹیفیکیشن تھے۔ اس کا یہ انوکھا شوق اس کے گھر والوں اور دوستوں کی کو بھی پسند نہیں تھا مگر اس کا کیا، کیا جاتا کہ یہ شوق اس کے دل میں گھر کر چکا تھا۔ وہ اپنی تعلیم مکمل کر کے کچھ عرصہ پہلے ہی واپس وطن لوٹا تھا، اس کی ڈگری نے اسے ایک بڑے ادارے میں فوراً ہی بہت اچھی جاب دلوا دی تھی۔ جاب اور اس پرانے مخصوص ماحول میں ایڈجسٹ کرنے کے بعد اس نے اپنے مشغلے کے حوالے سے منظر پر نمودار ہونا شروع کر دیا۔ وہ ایک پانچ ستارہ ہوٹل کی طرف سے منعقد کیے گئے کھانا بنانے کے مقابلے میں شریک ہوا اور اس نے پہلا انعام جیت لیا۔ یوں یہ سلسلہ شروع ہو گیا۔ جلد ہی اس کا نام اس حوالے سے معروف ہونے لگا اور وہ ڈی وی چینل پر بلایا جانے لگا۔ ایک ایونٹ شو میں آدھے گھنٹے کے لیے مخصوص کوئٹہ پروگرام میں باقاعدہ شرکت کرنا اسے یہ بھی ایک آرٹ معلوم ہوتا تھا جب وہ مہارت سے سبزیاں کاٹ رہا ہوتا اور انہیں پکاتے ہوئے ان کے کلر اور ٹیکسچر کو برقرار رکھنے کی تلقین کر رہا ہوتا اور بنے ہوئے کھانے کو پیش کرنے کے طریقے سکھا رہا ہوتا تو اسے اپنا آپ کسی بڑے آرٹسٹ سے کم نہیں لگتا تھا۔ اسے آہستہ آہستہ اندازہ ہو رہا تھا کہ پروگرام کے دوران اس کی گفتگو اس کے اسٹائل اور اس کے کام سے لوگ خصوصاً خواتین متاثر ہو رہی تھیں، وہ خواتین خصوصاً کم عمر لڑکیوں میں مقبول ہو رہا تھا۔ پروگرام سے پہلے اور خاص طور سے پروگرام کے دوران آنے والی فون کالز اور پروگرام کے بعد ملنے والی ای میلز، خطوط اور فون اسے اپنی نظر میں ہی خاصا اہم بن رہے تھے۔ مگر وہ اس سب کو انجوائے کر رہا تھا۔ اسے نہ تو اس کام کو مستقل پیشہ بنانے کا شوق تھا اور نہ ہی اپنی بڑھتی ہوئی مقبولیت پر مفرد



سے انحراف کسی کے لیے بھی ممکن نہ تھا۔ امراؤ بیگم زرنگار کے بھلے لگنے ہی نخرے کیوں نہ اٹھا رہی تھی ایک ایک روز خود اس کے لیے آئی پے منٹ پکڑنا ہی تھی مگر یہ کام جتنا مؤخر ہوتا جا رہا تھا تاؤ شریف کا اطمینان بڑھتا جا رہا تھا مگر اب زرنگار نے پے منٹ کو خود شرف قبولیت بخشا تھا اور اس افتتاحی رات کو وہ پاگل کر دینے حد تک حسین نظر آ رہی تھی، اس نے دل لگا کر تیاری کی تھی، اس کا لباس اور بناؤ سنگار اس کی ذاتی توجہ کا مظہر تھے۔ امراؤ بیگم اپنے اس حسین ترین ہیرے کی بلائیں لیتے نہ چھٹی تھی۔ اس ہیرے کی آمد نے اس کے سینے پر.... کی قدر بڑھا رکھی تھی اور یہی ہیرا آئندہ آنے والے سالوں میں اس کے لیے چین ہی چین لکھنے والا تھا۔ اس نوادر اور اس کے دوستیوں کی آمد پر ان کی تواضع خوش رنگ مشروب سے کی گئی تھی۔ تاؤ شریف نے مخصوص جگہ پر بیٹھا تھا اور براہ راست نوادر کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ کم عمر تھا۔ اس کے چہرے پر زمانہ سار اور تجربے کا کوئی خاص عکس نظر نہ آتا تھا ہاں مگر اس کے چہرے پر ایک مخصوص قسم کا رعب داب تھا۔ جسے محسوس کرتے ہی کوئی بھی مرعوب ہو سکتا تھا۔ تاؤ شریف کی گھاگ نظروں نے محسوس کیا کہ اس کا تعلق کسی بڑے خاندان سے تھا جو محض کھانا پیتا نہیں تھا بلکہ اس کے پیچھے ایک اہم تاریخ تھی۔ اس کی آنکھوں میں حیاتیاتی اس نے ایک بار بھی آنکھ اٹھا کر امراؤ بیگم کی پالی ادھر ادھر پھرتی حسین و جمیل، شوخ و شگفتہ تیلیوں کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ اس کی منتظر نظریں بار بار اسی جانب اٹھتی تھیں جہاں سے زرنگار کی آمد متوقع تھی۔ امراؤ بیگم اس کے شوق کو تاؤ دینے کے چکر میں تھی اسی لیے دانستہ زرنگار کو بلانے میں تاخیر کر رہی تھی۔ اس تاخیر پر نو جوان کی نظروں میں الجھن اترنے لگی تھی اور بے چینی بھی۔ وہ بار بار اپنے موبال کو آن کر کے وقت دیکھتا تھا۔ زرنگار کی آمد پر روشنیوں کی لودھم کر دی گئی۔ اس کی آمد کو اس ڈرامائی انداز میں پیش کرنے کا تصور بھی امراؤ بیگم نے ہی سوچا ہوگا، تاؤ شریف نے قیافہ لگایا تھا مگر یہ بھی حقیقت تھی کہ زرنگار کی موجودگی میں اس وقت روشنیوں کی کوئی حقیقت رہی بھی نہیں تھی۔ وہ سراپا روشنی لگ رہی تھی۔ اس کے وجود سے اٹھنے والی خوشبو ماحول پر چھا گئی تھی اور دیکھ رہے پہلے اٹھنے والی آوازیں ایک دم خاموش ہو گئی تھیں پھر فضا میں موسیقی کی آواز ابھری، سازندوں کو موسیقی کے بارے میں پہلے سے ہی ہدایات دے دی گئی تھیں۔ زرنگار کیسا گاتی تھی، اس کے گلے میں کتنا سُر تھا، اس کا معیار کیا تھا، تاؤ شریف نے محسوس کیا کہ اس نوادر کے لیے یہ سب چیزیں غیر اہم تھیں۔ وہ زرنگار کا گانا سننے یہاں نہیں آیا تھا، اس کے چہرے پر کسی اور لگن کے آثار تھے مگر وہ اس آغاز کو ماحول کا اصول سمجھ کر صبر سے بیٹھا تھا۔ زرنگار کی وہ محفل موسیقی جو سراسر امراؤ بیگم کے ذہن کی اختراع تھی ڈیڑھ گھنٹے تک جاری رہی اور اس کے بعد زرنگار کو نوادر کے ساتھ اس آراستہ و پیراستہ کمرے میں بھیج دیا گیا جو ان کے لیے خاص طور سے تیار کیا گیا تھا۔ اس کمرے کے بند ہوتے دروازے کو دیکھتے دیکھتے تاؤ شریف کے دل کی دھڑکن بندی ہونے لگی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے بارات، نکاح اور رخصتی کے وہ منظر ناچنے لگے تھے جو اس نے مہذب اور قانونی لوگوں کے ہاں دیکھے تھے۔ اس کا دل روئے لگا تھا۔ فرق کچھ بھی نہیں تھا مگر بہت فرق تھا۔ اس نے یہ منظر بھی بہت دیکھ رکھے تھے مگر زرنگار کے تصور کے ساتھ ہی وہ قانونی غیر قانونی، روایتی غیر روایتی کے موازنے میں نہ گیا تھا۔ اس نے اپنی سرخ پڑتی آنکھوں کو انگلیوں کی پوروں سے خشک کرتے ہوئے اپنے ساز سمیٹے اور ان پر جھمیلیں پکڑا ڈال دیا۔

”بہت بڑی آسامی سے خانزادہ مہر زاد مراد خان!“ اس کے کانوں میں قریب کھڑے سلم کی آواز پڑی۔  
”زرنگار اور امراؤ بیگم کی قسمت چند سالوں کے لیے تو کھل گئی سمجھو۔“



”حزہ۔“ نگین نے اس کے گھٹنے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ”تم وعدہ کرو جب دل کو مناسب لگے۔ مجھے ضرور بتاؤ گے۔“

”اوکے۔“ حزہ زبردستی مسکرایا۔ ”تم جانتی ہو تمہارے علاوہ کسی اور کو بتاتا بھی نہیں ہوں۔“

”مجھے امید ہے کہ تم مجھے ضرور بتاؤ گے۔ میں تمہیں یوں ادا اس نہیں دیکھ سکتی۔“ نگین نے اسے احساس دلانا چاہا کہ وہ اکیلا نہیں تھا۔

حزہ کے جانے کے بعد نگین پر افسردگی چھا گئی۔ وہ بیٹے کا دن تھا اور اگلے دن چھٹی تھی۔ دن کے بیشتر کام وہ منہ بٹھاتی تھی اس لیے دوپہر کے وقت میں اسے اتنی فرصت تھی کہ وہ کچھ دیر کے لیے تہا بیٹھ سکے۔ وہ اکیلے بیٹھ کر سوچنا چاہتی تھی کہ وہ کون کی اتنی اہم ہستی تھی جس نے حزہ کو یوں پریشان کر رکھا تھا اور جس کے بارے میں وہ کچھ بھی نہیں جانتی تھی۔

تہا بیٹھ ہی اسے بہت سے پرانے دن یاد آنے لگے تھے۔ اس کا اور حزہ کا بچپن ایک ساتھ گزرا تھا۔ حزہ اس کی سگی بھوکا بیٹا تھا جو اسلام آباد میں رہتی تھی مگر حزہ نگین کے گھر کے بالکل ساتھ والے گھر میں نگین کی دادی جو حزہ کی نانی تھیں کے پاس رہتا تھا وہ لوگ انہیں بی اماں کہتے تھے۔ حزہ کا یہاں ہونا بھی ایک کہانی تھی۔ حزہ کی امی کے ہاں اوپر تین بچے میجر آپریشن سے ہوئے تھے، تیسرا بچہ حزہ تھا۔ جس کی پیدائش کے بعد وہ شدید بیمار ہو گئیں ان کے پاس پہلے سے دو بچوں کا ساتھ تھا، ایسے میں ان کی بی اماں یعنی نگین کی دادی ہی ان کے کام آئیں وہ ننھے حزہ کو اپنے پاس لے آئیں۔ یہاں اس چھوٹے سے بچے کو پالنے میں ان کی بہو یعنی نگین کی امی نے بھی بڑا ساتھ دیا تھا۔ حزہ ٹھوڑا بڑا ہوا تو اس کی اماں نے اسے اپنے پاس واپس لے جانا چاہا مگر اب حزہ نے جانے سے انکار کر دیا وہ بی اماں کے ساتھ اپنی اماں کے گھر ہو آیا تھا اور اسے وہاں چند دن رہنا بھی اچھا نہیں لگتا تھا، کچھ مستقل وہاں رہنے کا تصور، اس نے اپنی اماں کو صاف انکار کر دیا وہ ان کے ساتھ ہرگز نہیں جائے گا۔

”میں نے بھانپ لیا ہے مہرین، اسے وہاں رہنا ذرا بھی اچھا نہیں لگتا۔“ نگین کو اچھی طرح یاد تھا کہ اس کی دادی اور پھوپھی کے درمیان اس سلسلے میں کیا بحث ہوئی تھی۔

”ساری غلطی اور حماقت میری ہے، مہرین نے بی اماں کو بے ساختہ جواب دیا تھا۔“ میں ہی پاگل تھی جو بچے کو اچھے کھلے اور صاف ماحول میں پالنے کے بجائے یہاں ان گلی گلوں میں بیچ دیا۔ یہ گلی اور محلے کا کچر ہے جو اس کے مزاج میں رچ بس گیا ہے۔ یہ بی اماں سے وہاں نہیں ملا جب ہی وہاں جانے سے بد کہتا ہے۔“

”تمہارے بچوں اور حزہ کے مزاج اور تربیت میں فرق آگیا ہے مہرین تم سمجھ نہیں پائیں۔“ بی اماں نے غصے سے بولے لہجے میں سمجھانے کی کوشش کی۔

”تربیت؟“ وہ غصے سے بولی تھیں۔ ”تربیت نام کی کوئی چیز ہوئی ہے اس کی، سارا دن تو چھتوں کو پھلانگتا، کھیل اور کچے ٹوٹا پھرتا ہے۔ دوست اس کے ایک سے ایک چنڈال اور جنگلی ہیں، نہ آپ ان گلوں سے کھیل نہ ناصر (نگین کے والد) ان کے بچے بھی یہی ہی کچھ کرتے پھرتے ہیں اور یہ حزہ بھی ان کی مکمل کاپی بن کر رہ گیا ہے۔“

”اب تو بن گیا بہن جو بیٹا تھا اس کو، تمہیں اتنے سال میں خیال نہیں آیا کہ یہاں رہ رہا ہے، کیا بن رہا ہے، کیسے بلی بڑھ رہا ہے، اب جب اتنا بڑا اور سمجھ دار ہو گیا تو تمہاری متا چھوٹ پڑی۔“ بی اماں عجیب سے صدمے کی کیفیت میں نظر آ رہی تھیں۔

”خانزادہ مہر زاد اور اد خان! تاؤ شریف نے اپنے دل میں دہرایا۔“ اس کا شملہ اونچا عزت بڑی بلند۔“ اس نے سوچا۔

”فرق کیا پڑے گا؟“ وہ اپنے کمرے میں پہنچنے تک سوچتا رہا۔ ”فرق تو بہت پڑے گا۔“ پھر اس کے لئے جواب دیا۔ ”مگر کیسے؟“ یہ سوال بہت دیر تک اس کے دل میں اٹھتا رہا۔..... وہ اس کا جواب جانتا بھی نہ دینا نہیں چاہتا تھا۔

☆☆☆

”میری سمجھ میں نہیں آتا حزہ تم پر آفت کیا آن پڑی ہے۔“ وہ نگین تھی جو پچھلے چندہ منٹ سے مسلسل حزہ بحث کر رہی تھی، وہ اسی محلہ اور پچھتا اور آفس بھگت کے بعد نگین کی طرف آیا تھا۔ ”کون ہے یہ لڑکی میرال کے لیے تم نے میرے اتنے سوٹ اور بھل پسند میاں کو گھن چکر بنا رکھا ہے، وہ مسلم ٹاؤن والے صاحب سے پوچھتے ہیں تو وہ انہیں اکبری دروازے کے کسی محلے کا پتا پکڑا دیتے ہیں، وہاں جاتے ہیں تو انہیں بتایا جاتا ہے موصوفہ کے آثار ٹاؤن شپ میں پائے جانے کے امکان ہیں اور ٹاؤن شپ والے چور بچی کے کسی قدیم محلے کے پی کی چٹ پکڑا دیتے ہیں۔ وہاں سے راز کھلتا ہے کہ کبھی وہ یہاں آئی تھی اب تو یقیناً فیصل ٹاؤن کی کسی کوئی رہتی ہوگی۔ تم یہ بتاؤ کہ تم میرے میاں کو لاہور کا جغرافیہ پڑھانے کے چکر میں تو نہیں ہو؟“

نگین کے لہجے میں شکوہ کم اور اپنائیت بے حد زیادہ تھی، حزہ خاموشی سے بیٹھا اس کی بات سن رہا تھا۔ کی خاموشی نے نگین کو ایک دم چونکا دیا اور اس نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے اور آنکھوں میں تحسین کے آثار تھے، وہ پہلے کی نسبت کمزور اور افسردہ نظر آ رہا تھا۔ اس کا دل گھبرا گیا وہ جس بات کو اس طرح مذاق کے رنگ میں کر رہی تھی اس بات میں کوئی بہت اہم بات تھی، اسے اچانک احساس ہوا، وہ حزہ کو، اچھی طرح جانتی تھی، وہ کسی بات کی وجہ سے بہت بری طرح الجھا ہوا تھا، وہ اچھی طرح سمجھ گئی تھی۔ اس اپنی نگرار روک دی اور خاموش ہوتے ہوئے اس بات کی منتظر ہوئی کہ حزہ اسے خود کچھ بتائے گا مگر چندہ منٹ کی خاموشی کے بعد اس نے سنجیدہ سے لہجے میں معذرت کی۔

”مجھے افسوس ہے نگین، اشعر کو میری وجہ سے اتنی زحمت ہوئی، مجھے اندازہ نہیں تھا کہ انہیں اتنا ترزا پڑے گا۔“ نگین کو اس کی اس بات نے بری طرح چونکا دیا۔ حزہ کا انداز خاصا بدلا ہوا تھا۔ کوئی اور وقت وہ یقیناً کہتا۔ ”کتے جوتے گھس گئے تمہارے میاں صاحب کے، بتاؤ میں سنے دوا دوں گا۔“ مگر اس وقت نے غیر متوقع اور خلاف مزاج جواب دیا تھا۔

”حزہ کیا بات ہے؟“ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد نگین نے پوچھا۔ ”اچھا اگر تمہارا دل شیر کر نہیں چاہ رہا تو نہ ہی مگراتے سنجیدہ اور خاموش تو مت نظر آؤ نا پلیز۔“

”ایسا کچھ نہیں ہے نگین، میں صرف تھکا ہوا ہوں۔“ حزہ نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔ ”آرام کر گا، ذہن فریش ہو جائے گا تو ٹھیک ہو جاؤں گا۔“

”تم یہیں رہو آج ہمارے پاس، وہاں اپنے فلیٹ میں کہاں اکیلے پڑے رہو گے۔“ اس اپنائیت سے کہا۔

”تمہارے گھر میں اتنے لوگ ہیں یار، تمہاری سسرال والے ہیں، یہ مناسب نہیں لگتا، میں ہو جاؤں گا اور اب تو یہیں ہوں ملاقات ہوئی رہے گی، تم فکر مت کرو۔“ حزہ نے رساں سے کہا۔



”مجھے آپ پر پورا بھروسہ تھا، میرا خیال تھا کہ آپ کو اس بات کا خیال رہے گا کہ میرے دوسرے جس ماحول میں پل بڑھ رہے ہیں ویسا ہی ماحول آپ حمزہ کو بھی دیں گی تاکہ ان کی شخصیتوں میں کوئی تضاد آئے مگر آپ نے تو اسے پورے کا پورا ہی کشمیری محلے کے کچر کے رنگ میں رنگ دیا۔“

مہرین کو اندازہ ہی نہیں ہو رہا تھا کہ وہ بی اماں کو کتنی تکلیف دے رہی تھیں۔

”پھر ایسا کرو کہ لے جاؤ اسے۔“ بی اماں نے دکھ سے کہا۔ ”نہیں جاتا تو زبردستی لے جاؤ، یہ تو زیادتی کی بات ہے کہ بچے کو اس کی ماں کی پسند کے مخالف تربیت دی جائے۔“

”مجھے یہیں رہنا ہے، میں بھی اسلام آباد نہیں جاؤں گا۔“ حمزہ نے سخت اور دُشست لہجے میں کہا۔

”اس نے یہیں رہنا ہے۔“ اس نے ایک ہی رٹ لگائی، وہ بی اماں کے پلو کے ساتھ لگ گیا۔

”اس عمر میں اسے یہاں سے لے جانا اس کی سائیکس خراب کرنے کے مترادف ہے، بہتر ہے کہ یہیں چھوڑ دیا جائے، بی اماں کی تربیت میں کوئی خرابی نہیں ہے، ہاں ماحول کا فرق ضرور ہو سکتا ہے مگر یاد رکھنا چاہیے کہ آپ خود بھی اسی ماحول میں رہتی تھیں اور یہیں آپ نے پرورش پائی ہے، بی اماں کے ہاں ہی آپ کی تربیت ہوئی ہے۔ یہ بھی قدرت کا فیصلہ ہے کہ حمزہ کو یہاں رہنا تھا اور بہتر ہے کہ اب وہ یہاں رہے۔“ حمزہ کے ابا نے سارے حالات کو بھانپ لینے کے بعد بہت سکون کے ساتھ اپنی بیوی کو سمجھایا تھا۔

”ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، آپ کا ہے کو میری حمایت کریں گے۔“ مہرین نے سر جھٹک کر کہا۔ ”آپ کو تو ابھی انہی گلی محلوں کی زندگی پسند ہے۔“

بحث جہاں بھی ختم ہوئی اس کا نتیجہ یہ ہی نکلا کہ حمزہ، بی اماں کے پاس ہی رہا، یہ بات نکلیں کے ڈھیروں خوشی کا باعث تھی، اس کا حمزہ کے ساتھ بچپن کا ساتھ تھا۔ وہ اکٹھے کھیلے، اکٹھے پڑھتے تھے۔ ان کی ایک جیسی تھی، ان کی دلچسپیاں ایک جیسی تھیں، حمزہ عمر میں اس سے کچھ ہی ماہ بڑا تھا، اسی لیے ان دونوں کی بات میں اتنی گاڑھی جھنپتی تھی۔

نکلیں کو اپنی دادی کا گھر بہت پسند تھا، قدیم طرز تعمیر پر بناوا دکشادہ کمروں اور اونچی چھتوں والا گھر ان دنوں بھی بہت اچھا لگتا تھا جب طرز تعمیر نے نئی کروٹ لے لی تھی اور لوگ اسی کے مطابق جدید گھر بنا رہے تھے۔ بی اماں کے گھر کے صحن میں ایک طرف بنے نیچے سے شیڈ کے نیچے ایک بڑا سا حمام ہر وقت موجود رہتا تھا۔ جس کے کوضائع نہ کرنے کی تلقین بی اماں ہر وقت کرتی رہتی تھیں مگر نکلیں اور حمزہ کو جب بھی موقع ملتا وہ اس کی ٹوٹی نیچے پلاسٹک کا ٹب رکھ کر اس میں کاغذی کشتیاں بنا کر چلاتے رہتے تھے۔ کبھی جو بی اماں کی نظر پڑ جاتی تو خود ڈانٹ پڑتی مگر یہ مشغلہ اتنا پسندیدہ تھا کہ وہ دونوں ڈانٹ کھانے اور یہ سمجھنے کے باوجود کہ پانی ضائع کرنا بے حد یاد آتا تھا۔ اس کا اپنا گھر بی اماں کے گھر کے بالکل ساتھ تھا لیکن اس کے ابا نے اس میں کئی ترامیم کر کے قدرے جدید شکل دے رکھی تھی پھر بھی نکلیں کا دل اپنے گھر سے زیادہ بی اماں کے گھر ہی لگتا تھا۔

دوپہر کے وقت محلے کے بچے اسکول کا ہوم ورک کرنے اور سپارہ پڑھنے کے لیے بی اماں کے گھر ہوتے تھے اور یہ وقت حمزہ اور نکلیں کے لیے بڑا دلچسپ ہوتا تھا۔ جب دونوں ہائی کلاسز میں پہنچ گئے تو بی اماں ان پر اعتماد بڑھ گیا وہ ان بچوں کی رہنمائی کے لیے ان دونوں کو ان کے پاس بٹھا دیتیں۔ نکلیں کو بچپن سے استانی بننے کا بہت شوق تھا اور یہ شوق پورا کرنے کا اس سے بہتر موقع کیا ہو سکتا تھا۔ وہ ان بچوں پر



جانی، کسی چھوٹے موٹے ڈنڈے سے کام لیتی اور استانی بن جانے کا ٹھیک مزہ لیتی۔ حمزہ اس کی سنجیدہ شکل اور حرکتیں دیکھ کر ہنستا اور وہ اس سے لڑتی کہ وہ بچوں پر اس کا رعب ختم کر رہا ہوتا تھا۔ مگن سوچنے بیٹھتی تو ایسی ہی ہزاروں باتیں اسے یاد آتیں جن سے اس کی دانستگی تھی مگر جو بات اسے ہر بات سے زیادہ عزیز تھی وہ حمزہ کے ساتھ گہری بیانی ہم آہنگی تھی۔ وہ اپنے دل کی بات ایک دوسرے سے کیے بغیر نہ نہیں کہتے تھے۔ ایک دوسرے کی خوشی اور دکھ کو بغیر پوچھے، بتائے چہرے سے دیکھ کر ہی بھانپ لیتے تھے۔ حمزہ کے بارے میں مگن کا خیال تھا کہ وہ خاصا introvert تھا مگر اپنے دل کی بات وہ مگن سے ضرور کرتا تھا۔

”تمہیں کبھی افسوس ہوتا ہے کہ تم اپنے اماں ابا کے پاس رہنے کے بجائے یہاں رہتے ہو؟“ ایک بار مگن نے سنجیدگی کے ساتھ اس سے پوچھا تھا۔

”شاید کبھی کبھی میں اس بات کو محسوس کرتا ہوں۔“ وہ صاف گوئی سے کام لیتا۔ ”مگر جو زندگی یہاں ہے اس سے محروم رہنا بھی بد قسمتی ہوتی۔“

”وہ کیسے؟“ مگن کو اس جواب پر حیرت ہوتی۔

”بی اماں کی شخصیت میں بڑا فحش ہے مگن۔“ اس روز وہ بات کرنے کے موڈ میں تھا اس لیے اس نے اسے تفصیل سے بتایا تھا۔ ”اے لوگ بہت کم رہ گئے ہیں۔ تم نے دیکھا وہ ماموں کے اتنے قریب رہتے ہوئے بھی اس عمر میں اکیلی راتی ہیں۔ پھر ایک اکیلے بندے کے لیے بہت بڑا ہے۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں میرا ان کا ساتھ نہ ہوتا جب بھی وہ یہاں اکیلی ہی رہ رہتی ہوتیں۔ تمہیں پتا ہے وہ یہاں اکیلے رہنے کو کیوں ترجیح دیتی ہیں۔“

”کیوں؟“ مگن نے دلچسپی سے سنتے ہوئے پوچھا۔

”کیونکہ اس گھر کے در و دیوار میں ان کا مزاج رچ بس گیا ہے۔ اس گھر کے ماحول میں ایک مخصوص ٹھہراؤ اور شکل ہے جو بی اماں کی ذات کا حصہ ہے۔ میں نے یہ ماحول نہیں اور نہیں دیکھا۔ ان کی شخصیت کا صبر، حوصلہ اور تحمل اس گھر کی فضا پر چھایا رہتا ہے۔ وہ خوش رہتی ہیں، تنگ نہیں پڑتیں، غصے میں نہیں آتیں، تم نے دیکھا اس گھر کے کونے، کونے میں خوشی کا اور شکرگزاری کا احساس ہکتا ہے۔“ مگن کو محسوس ہوا اس کا کہا ایک ایک حرف سچ تھا۔ اسے یہ ساری کیفیات محسوس ہونے لگیں۔

”یہ سب بہت rare ہے۔ میں نے اپنی کسی خالہ کے کسی ماموں کے اور اماں کے مزاج میں یہ چیز نہیں دیکھی، یہ ممکن نہیں کہ بی اماں نے ان کے ذہنوں میں ڈالی نہ ہو مگر وہ نئے ماحول کو نئے انداز کو اڈاپٹ کر گئے ہیں۔“

”تمہیں ہمیشہ یہاں تو نہیں رہنا حمزہ۔“ مگن کو خیال آیا۔ ”اب سے کچھ دیر بعد جب پریکٹیکل لائف میں قدم رکھو گے تو ممکن ہے اس وقت یہ جگہ تمہیں چھوڑنی پڑے، تم بھی نئے ماحول کو نئے انداز کو اڈاپٹ کر جاؤ گے اور یہاں بے جگہ محسوس کرو گے۔“

”مجھے نہیں لگتا کہ ایسا ہو۔“ حمزہ نے سر ہلایا۔ ”میں یہاں بی اماں کے ساتھ تنہا رہا ہوں، اس گھر کا ماحول میرے مزاج میں بھی رچ بس گیا ہے، میں یہاں سے کہیں اور جا کر تو بے جگہ محسوس کر سکتا ہوں یہاں نہیں، تمہیں پتا ہے مگن! بی اماں نے زندگی کے وہ سنہرے اصول میرے مزاج کا حصہ بنا دیے ہیں جو ہم رسالوں، کتابوں کے اقوال و زریں والے صفحات پر پڑھتے اور بھول جاتے ہیں۔ مجھے خود بھی پتا نہیں چلا کہ ایسا کیسے ہوا مگر یہ سب انہوں نے بھی لاشعوری طور پر کیا۔ روایات اور اخلاق کے اصولوں سے پیارا آج کی دنیا کے اصول



”کیسی ہو؟“ دوسری جانب سے پوچھا گیا۔ ”میں نے بہت بے صبری سے تمہارا نمبر لیا آپریٹر سے یار آئی سوچ مجس یو!“ وہ بے تکلفی سے کہہ رہا تھا۔

”ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ تمہیں یہاں سے گئے عرصہ ہو گیا تم اس دوران ملک سے باہر رہے پھر تم مجھے کب کہاں اور کیسے پس کرتے ہو، میرا خیال ہے کہ میرا تو نام بھی تمہیں اس روز یاد آیا ہو گا جس روز میں نے کال کی تھی۔“

”میں بھول گیا ہوتا تو اس روز بھی یاد نہ آتا۔“ دوسری جانب سے سنجیدگی سے کہا گیا۔ ”تم میری واحد ایسی برائی یاد ہو جسے میں کبھی بھلا نہیں سکا۔ تم کیسی ہو لینہ، کیا کر رہی ہو، آنٹی کیسی ہیں، ایبٹ آباد کیسا ہے، وہ سرسبز ہے، وہ راتے شملہ، سرین، برن ہال، بی ایم اے روڈ، عجمی مسجد اور ہرنو کیسے ہیں، اس شہر کی فضا میں اور ہوا میں کیسی ہیں؟ میں اس سب کو بہت مس کرتا ہوں۔ میں بہت دنیا گھوما ہوں مگر اس شہر کی فضا کی خوشبو اور اس شہر کے رنگوں جیسے رنگ میں نے کہیں اور نہیں دیکھے، نہ محسوس کیے، لینہ تم سوچ نہیں سکتیں کہ اس روز تمہاری کال نے مجھے کتنا خوش کیا مجھے لگا میں اس لائیو شو میں آیا ہی اس لیے تھا کہ اس کے ذریعے تمہارے ساتھ میرا رابطہ ممکن ہوتا تھا۔“

”ارے یہ تو ویسے کا ویسا ہی ہے۔ اتنا ہی بے تکلف، اتنا ہی سادہ۔“ علیینہ نے لحوں میں اندازہ لگایا۔

”اور کتنے مزے سے تم مجھے گدھا کہہ رہی تھیں اس روز۔ ارے، کیا یہ کام گدھوں کے کرنے کا ہے، تم کسی ہوٹل یا ریسٹورنٹ میں کھانا کھانے جاتی ہو تو کیا گدھوں کا پکا یا کھانا کھاتی ہو۔“ پھر اچانک جیسے اسے لڑنا یاد آ گیا۔

”اچھا مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم خانسا ماں ہونے پر فخر کیا کرو گے، مالی گیری، ہیرا گیری، ڈرائیوری اور خاکروبی کے اعلیٰ کورسز کرنے کب تشریف لے جا رہے ہو میریون ملک؟“ علیینہ نے سنجیدگی سے کہا۔

نہیں رہے مگر میں نے محسوس کیا کہ جہاں یہ نہ ہوں وہاں مجھے تکلیف ہوتی ہے۔ میں اپنی اماں کے پاس اسی سے تو رہ نہیں سکا۔ وہاں مجھے یہ دونوں چیزیں نظر نہیں آتیں۔“

”تم قد امت پسند بن گئے ہو۔“ علیینہ نے اسے تنگ کیا۔

”یہ قد امت پسندی نہیں ہے لیکن انسان کی زندگی کے کچھ اصول ایسے بھی ہونے چاہیں جن کی وجہ سے وہ اس ماحول کا حصہ نظر آئے جس میں وہ رہتا ہے۔ ورنہ تو بندہ اوپر اوپر اسالگتا ہے۔“ یہ ایک منفرد بات تھی مگر علیینہ نے بہت بعد میں یہ جانا کہ اسی منفرد بات کی وجہ سے حمزہ باقی لوگوں سے مختلف نظر آتا تھا۔ اس کے اپنے خاندان کے لوگ کھاتے پیتے اور جدید طرز زندگی کے شیدائی تھے اور بی اماں کے گھر کے ماحول کا مذاق اڑاتے تھے مگر حمزہ کسی قسم کے کامپلیکس کا شکار نہیں تھا۔ وہ ان سب میں اسی اعتماد سے اٹھتا بیٹھتا تھا جو اس کی شخصیت کا خاصہ تھا وہاں اس کی اور ان کی شخصیات میں زمین آسمان کا فرق نظر آتا تھا۔

”مہرین کے گھر میں حمزہ اب رہ ہی نہیں سکتا۔“ علیینہ کی امی کبھی کبھار خیال ظاہر کرتیں۔ ”بڑی مشکل بات ہے۔“

جب بی اماں کا انتقال ہوا اس وقت حمزہ لاہور میں پڑھ رہا تھا۔ وہ ویک اینڈ پر باقاعدگی سے گھر آتا تھا، علیینہ شادی ہو چکی تھی، بی اماں کی موت ان سب کے لیے بہت بڑا صدمہ تھی مگر حمزہ کے لیے ایک بڑا جھٹکا ثابت ہوئی تھی۔ وہ بی اماں کے سائے سے محروم ہو گیا تھا اور دوسری طرف اس کی اماں اب اس سلسلے میں کوئی دلیل سننے کو تیار نہ تھیں کہ وہ ان کے پاس جا کر نہیں رہے گا۔ علیینہ بخوبی سمجھ سکتی تھی کہ حمزہ کی زندگی میں وہ وقت سب سے کڑا تھا مگر اس وقت تک وہ میچور اور کمپوز ڈھوپکا تھا کہ اس نے کسی پس و پیش کے بغیر اپنی اماں کے ساتھ جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کے بعد اگرچہ وہ اس سے رابطے میں رہا مگر ملاقات کا موقع کم ہی آتا۔ اب کچھ عرصے سے جب حمزہ کو اس فرم میں جاب مل گئی اور اس کا پہلا ٹرانسفر لاہور ہو گیا تو علیینہ سے ملاقات کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔

علیینہ اب اس کو دیکھتی تھی تو اسے محسوس ہوتا تھا کہ حمزہ کی شخصیت اور مزاج میں کافی تبدیلیاں آچکی تھیں۔ یہ ایک فطری سی بات تھی مگر اس کا وہ مخصوص ٹھہراؤ اور چل اب بھی اس کے مزاج سے جھلکتا تھا۔ جس نے اسے باقیوں سے منفرد بنا رکھا تھا اور جس کی وجہ سے وہ اپنے باقی گھروالوں سے اتنا مختلف لگتا تھا کہ اکثر لوگ حیرت سے مہرین سے پوچھتے تھے کہ کیا یہ واقعی ان کا بیٹا ہے۔

☆☆☆

”تم علیینہ ہو؟“ علیینہ کو اپنے سیل فون پر ایک اجنبی آواز سنائی دی، یہ کون تھا جو اتنی بے تکلفی سے اس سے بات کر رہا تھا۔

”آپ کون ہیں؟“ اس نے بے اختیار پوچھا۔

”میں وہی ہوں جس کو کچھ دن پہلے لائیو شو میں آپ کو س رہی تھیں۔“ دوسری جانب سے آواز آئی۔

”ارے۔۔۔۔۔۔“ علیینہ کے دل نے ایک دھڑکن بس کر دی۔ ”فہد!“ وہ اس روز لائیو شو میں اپنی آواز سنائی نہ دے جانے پر بہت مایوس تھی۔

”آئی ایم سوری! اس روز میں نے دانستہ تمہاری کال رکوا دی، جو تم کہہ رہی تھیں وہ آن ائر چلا جاتا۔ مسئلہ ہو جاتا۔“

”ہاں شاید۔“ علیینہ کو اس کی بات فوراً سمجھ میں آ گئی۔

**مئی 2013ء..... موسم**

**گرمیوں کی تصویر کشی**

فرمانبرداری کا تقاضا ہے

**ماہنامہ سسٹم**

**مزید**

میرزا محمد بیگ کے حالات

آپ کے خطوط اور محفل شہر و سخن

**گر قبول افتد**

ایجادات کی افادیت، ضرورت اور اذیت کے مابین عجیب و غریب واقعات کو ختم دینی ایک پرفکر داستان۔ **محی الدین نواب** کا شاہکار

**جرا غرقہ**

داراشکوہ..... ایک دگر دار..... فتح اور شکست کے شیب و فراز، رشتوں کی آرائش پشیل تاریخی صفحات۔ **ڈاکٹر ساجد امجدی** کا دل

**معصومہ**

پسندیدہ قلم کار اسماء قادری کی سسٹم کے لیے ایک نایاب تحریر

**مسافر**

کہیں پہاڑوں کی سختی، کہیں کھیتوں کی ہریالی..... بدلتے موسم کی روداد۔ **ناصر ملک** کے خیالات کی روانی

**کشمکش**

پیش روں کی کشمکش

کشمکش و کشمکش

کشمکش و کشمکش

**کشمکش**

کشمکش و کشمکش

کشمکش و کشمکش

کشمکش و کشمکش



تھی اس سے اس کی جذباتی وابستگی تھی اور اسے ان سے کوئی اختلاف نہیں تھا، ہاں اسے پڑھنے اور اچھا پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ اس نے گولمنڈی کا کالج سے ایف اے کیا تھا اور اب اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ فائن آرٹس میں بی۔اے کرے۔ اس کا دل پنجاب یونیورسٹی سے زیادہ نیشنل کالج آف آرٹس میں داخلہ لینے کو چاہتا تھا مگر اسے معلوم تھا کہ اس کے بھائی اس پر نہیں مانیں گے۔ اگر وہ وہاں کے ماحول کے بارے میں کچھ نہ بھی جانتے ہوئے تو بھی وہاں کے اخراجات کے بارے میں جان کر ہی منع کر دیں گے۔ جبکہ خود اس کا یہ خواب تھا کہ وہ وہاں پڑھے۔ اس کے پاس پنجاب یونیورسٹی ہی ایک ایسی چوکنج تھی جس کے لیے بھائیوں سے اصرار کیا جاسکتا تھا۔ ایسے موقع پر جب اپنے دل کی کوئی بات کہنا ہوتی اسے اپنے ابا بہت یاد آتے۔ جو اس کے ساتھ شوق بھی تھے اور اس کی بات ماننے کو ہر دم تیار بھی رہتے تھے لیکن جن کے سائے سے وہ بہت جلد محروم بھی ہو گئی تھی۔ اسے خیال آتا کہ وہ زندہ ہوتے تو نہ صرف پڑھنے کا بلکہ این سی اے میں پڑھنے کا اس کا خواب بھی ضرور پورا ہوتا۔ اس سے دونوں بڑے بھائی جن کی وہ اعلیٰ کو بہن تھی وہ بھی اس کے ساتھ بہت پیار کرتے تھے مگر بہت سی باتیں ایسی تھیں جن پر وہ اس کا نقطہ نظر سمجھ نہ پاتے تھے، ابا کی وفات کے بعد ان دونوں کو وہی اپنی پڑھائی چھوڑ کر ابا کی کپڑے کی بڑی دکان سنبھالنا پڑی تھی۔ ابا کی دکان دادا کے زمانے سے بہت چلتی تھی اور واقف لوگ امرتسر کے ان شیریں شیخ برادران پر اعتماد بھی ان کے باپ دادا کی دیانتداری کی وجہ سے ہی کرتے تھے۔ بھائیوں کی طبیعت میں ایمانداری اور حلم ابا کی وجہ سے آیا تھا، دونوں محنتی اور حوصلے والے تھے، کاروبار پہلے سے بھی بہتر ہو گیا تھا اور اب تو چھوٹا بھائی اسی دکان کی ایک برانچ انارکلی میں بھی کھولنے کا ارادہ کر رہا تھا۔ بیش کو ابا کے بعد انہوں نے کسی طرح کی کمی نہیں ہونے دی تھی اور بہت لاڈ پیار سے رکھا تھا مگر اس کی جن باتوں کو وہ سمجھ نہیں پاتے تھے ان کے سلسلے میں وہ بے بس تھے۔

”میرا تو خیال ہے بیش جینا تو سیدھا سیدھا جانی اے کر لے اپنے اس گولمنڈی والے کالج سے ہی، اس رات جب کھانے کے دوران بیش نے براہ راست بھائیوں سے بات کی تو بڑے بھائی نے رمان سے سمجھانے کی کوشش کی۔

”تو اور کیا یہی تو میں اسے سمجھاتی ہوں، ہم نے تجھے اگلے گھر بھیج دینا، ہم نے کون سا تجھ سے نوکریاں کروائی ہیں۔“ اماں نے بیٹے کا موقف سن کر بیش کی طرف ایسی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا جیسے کہہ رہی ہوں اور لے مزہ خود بات کرنے کا۔

”پر بھائی ان،“ بیش نے اپنے مخصوص انداز میں کہنا چاہا۔

”برو والی کوئی بات رہ ہی نہیں گئی۔“ اماں جھٹ سے بولیں۔ ”بھائی نے کہہ تو دیا ہے کہ کیا کرنا ہے، چل تمہرا شوق ہے تو دو جمعائیں اور پڑھ لے ورنہ ہمارے گھر تو لوگ ابھی سے رشتہ پوچھنے آتے ہیں اللہ کے فضل سے کوئی کمی نہیں ہے۔“

”اماں آپ تو جب کرو۔“ چھوٹے بھائی نے الجھ کر کہا۔ ”تم بتاؤ بیش صاف، صاف کیا دل چاہتا ہے تمہارا؟“ بیش کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا، یہ ہی وقت تھا کہہ دینے کا یہ وقت نکل جانے کے بعد واپس آنے والا نہیں تھا۔

”میرا دل چاہتا ہے میں فائن آرٹس پڑھوں، ایف اے میں میری ٹیچرزمیرے کام کی بہت تعریف کرتی تھیں، وہ بھی کہتی تھیں کہ اگر میں پروفیشنل ایجوکیشن حاصل کر لوں تو بہت اچھا ہو جائے گا۔“ اس نے دانستہ

”ہوں۔“ وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ ”آئیڈیا برا نہیں۔ اگر ایسے کورسز منعقد ہوئے تو کرنے پر جاسکتا ہے۔“ پھر وہ دونوں بے اختیار ہنس دیے۔ اب وہ ایک دوسرے سے اتنے سالوں میں گزر چکا والے حالات کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ ایک دوسرے کو اپنے بارے میں بتا رہے تھے۔ ”ارے، یوں لگتا ہے کہ برسوں کے بعد کسی اپنے سے ملاقات ہوئی ہو۔“ اس رات علیحدہ نہ رہنے لپٹے بیٹے سوچا۔ ”اور بات بھی یوں کہ جیسے درمیان کا وقت آیا ہی نہ ہو، سچ ہے نہ اس لائیو شو میں آیا ہی لیے تھا کہ اس کی میری بات ہوئی تھی۔“ اس روز وہ بہت دنوں بعد دل سے خوش تھی بہت خوش۔

☆☆☆

”تیری ضد بھی تو انوکھی ہے بیش۔“ صالحہ نے کچن میں بیٹھے کھانا کھاتے ہوئے بیش کو مخاطب کیا۔ ”رشید اور جمید کو میں کیا سمجھاؤں اور تو کیا سمجھائے کہ تو نے اس کالج میں داخلہ لیتا ہے جس میں لڑکے اور لڑکیاں اکٹھے پڑھتے ہیں اور تو نے وہاں جو پڑھائی کرنی ہے اس کو کرنے کے بعد تیرے ہاتھ کھاروں والا ہنر آجائے گا مٹی کے برتن بنانے لگ جائے گی۔ وہ تجھ سے کیا یہ سوال نہ کریں گے کہ کھاروں کی طرح برتن ہی بنانے کیجئے؟ تو پڑھائی پر اتنا زچہ کرنے کے بجائے اپنے نائنگے چلی جا پورو، وہاں بہتر ہے ہوتے ہیں کھار اور کھاروں۔ برتن، بہتر پیسہ کماتے ہیں وہ ادھر ادھر برتن بیچ کر ملکہ پوسے پاکستان میں۔“ صالحہ نے اپنے تئیں بہت اچھی دیکھ پیش کی تھی۔ جس کو سننے کے بعد بیش کو اپنے دماغ سے پڑھنے کا کیزا بالکل ہی نکال دینا چاہیے تھا۔ بیش گھنٹوں منہ دھرے بڑی دلچسپی سے اماں کو سوچی روٹی پر کر لیے پیاز کے رشتے سے کھاتے دیکھ رہی تھی۔

”اس کام میں اور اس پڑھائی میں بڑا فرق ہے اماں۔“ اس نے اپنی دلچسپی اور خوبیت کو جھٹک کر کہا۔ ”کھاروں کا پیشہ اور مہارت تعلیم کا ایک شعبہ بن گیا ہے۔ اس کا باقاعدہ تعلیم انسان کو برتن سازی کے فن کا بے بنادیتی ہے اور آپ کو اندازہ نہیں کہ آج کل اس کی کتنی اہمیت ہے اور اس کے ذریعے کتنی شہرت اور کتنا پیسہ کمایا جاسکتا ہے۔“

”لے شہرت کو ہم نے آگ لگانی ہے۔“ صالحہ نے سادگی سے کہا اور لٹی کے گلاس کو ایک سانس میں کر کے ہونٹوں کو دوپٹے سے پونچھا۔ ”ہاں پیسے کی بات کر، پیسہ تو لڑکیاں خوب کماتی ہیں، شہینہ کو دیکھا ہے جس ہونٹ میں کھانا دیتی ہے لوگوں کو، وہاں سے پیسہ بھی ملتا اور بچا بچایا ڈھیر کھانا بھی، وہ ہونٹ والے اگلے گرم کر کے تھوڑی دیتے ہیں پچھلے دن کا کھانا، وہ رات کو سب بانٹ دیتے ہیں اپنے کام کرنے والوں کے درمیان پر شہینہ نے تو کچھ خاص پڑھائی نہیں کی، پھر بھی کماتی ہے خوب، تو جو کہہ رہی ہے اس پر تو پیسہ ہی نہیں لگتا ہے، پہلے اتنا پیسہ لگاؤ پھر کاؤ، اس وقت تک ہم تجھے یہاں تھوڑی ہی بیٹھا چھوڑیں گے، اس وقت تک تو اپنے اگلے گھر چل پڑی ہوگی، اگلوں کو فائدہ پہنچانے، پیسہ ہم لگائیں فائدہ اگلے اٹھائیں، یہ بھی کوئی بات ہوئی۔“ صالحہ کے لہجے میں قطعیت تھی وہ ہرگز بیش کا ساتھ دینے والی نہیں تھیں۔

”میں بھائیوں سے خود ہی بات کر لوں گی اماں، مجھے یقین ہے وہ میری بات نالیں گے نہیں۔“ اس نے صالحہ کے کھانا ختم کرنے کے بعد برتن سیٹے ہوئے کہا۔ اسے افسوس ہو رہا تھا وہ اتنی دیر اماں کے پہلا وقت نہ رہی، خود ہی بھائیوں سے بات کر لیتی آریا پاور فور آہی پتا چل جاتا۔

اس کے رشتے داروں کا خیال تھا کہ اپنے حالات اور ماحول سے اس کا مزاج میل نہیں کھاتا تھا۔ وہ کب اور ہی دنیا میں رہتی رہتی تھی مگر خود وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ ایسا نہیں تھا۔ وہ جن حالات اور ماحول میں پلی بڑھی



جتی دوپہر دھیرے دھیرے شام میں ڈھل رہی تھی۔ دھوپ دیواروں سے اوپر چھتوں کی طرف جانے لگی تھی مگر پیش کا اثر کم نہیں ہو رہا تھا۔ فضا میں ہوا کا احساس ذرا برابر بھی نہیں تھا، چرند پرند سب کی سائے میں چھپے بیٹھے تھے اور ماحول پر عجیب افسردہ سی خاموشی چھائی تھی۔ بینش نے کتنی دیر تک چھت کے پلٹے پر دل کو گھورتے رہنے کے بعد اکتا کر وہاں سے نظریں ہٹائیں اور اپنے بستر کے ساتھ والی کھڑکی سے جتن ہٹا کر باہر گلی میں جھانکا۔ گلی بھی سنسان تھی، گلی میں ہر دم کھیلنے والے بچے بھی شاید اس گرمی کی حدت کو برداشت نہ کرتے ہوئے گھروں کو بھاگ گئے تھے۔ دور گلی کے آخری سرے پر قالوں کی چھابوئی کی گھر کی سڑکیوں پر رکے ایک شخص اکتایا ہوا کھڑا نظر آیا جو چہرے پر آئے پسینے کو بار بار شانے پر رکھے پیلے کپڑے سے پونچھ رہا تھا۔

”کتنی محنت طلب کمائی ہوگی اس شخص کی۔“ اسے خیال آیا۔ ”صبح کسی باغ سے فالے توڑتا ہوگا اور پھر دن بھر گلی، گلی پھر کرائیں بیچتا ہوگا۔ باغ والے کو پیسے دینے کے بعد اس کے پاس کیا بیچتا ہوگا؟“ اسے خیال آیا۔ ”ارے، یہ شخص تو آئیڈیل ہے۔“ اس نے سوچا۔ ”جس دور میں کمائی کرنے کے لیے اتنے شارٹ کٹس دستیاب ہوں اس دور میں اتنی محنت اور مشقت کی کمائی کرنے والا آئیڈیل ہی تو قرار دیا جانا چاہیے۔“ یہ بات اس نے دانیال سے سنی تھی اس بات کے یاد آتے ہی بینش کا دھیان باقی سب باتوں سے ہٹ کر دانیال کی طرف چلا گیا۔ وہ پنجاب یونیورسٹی کے فائن آرٹس ڈپارٹمنٹ میں بی ایف اے سینکڈ ایئر کا طالب علم تھا اور ایک انتہائی قابل طالب علم سمجھا جاتا تھا۔ اس کی شخصیت اور فن اسے واقعی دوسروں سے ممتاز نظر آنے میں مدد دیتے تھے۔ بینش نے اسے یونیورسٹی میں اپنے پہلے ہفتے کے دوران ہی نوٹ کر لیا تھا، اس کی وہ پہلی مکمل بات جو اس نے سنی تھی اس کا خیال تھا کہ اسے عمر بھر نہیں بھولے گی۔

”تم بناؤ تمہاری ترجیح کیا ہوگی؟“ وہ اپنے کسی دوست سے پوچھ رہا تھا۔ ”تمہارے قریب ہی ایک سپر اسٹور ہے جہاں ہر چیز مل جاتی ہے آکس کریم سمیت اور تمہیں سامنے سے آکس کریم کی ریڈ بھی بیچنا پسینے میں شرابور گرمی کا ستایا ہوا شخص آتا نظر آئے، کھائی تو تمہیں آکس کریم ہی ہے بناؤ کس سے لوگے سپر اسٹور والے سے یا اس آدمی سے؟“

”آکس کریم کی کوالٹی پر منحصر ہے۔“ اس کے دوست نے بے پروائی سے جواب دیا۔ ”اگر تم اس ریڈ بھی والے کی مدد کے خیال سے کہہ رہے ہو تو اسے چند پیسے دیے دوں گا۔“

”اس کی عزت نفس کی پروا نہیں کرو گے؟“ دانیال کی بات نے بینش کو باقاعدہ اس کی طرف دیکھنے پر مجبور کر دیا تھا۔

”ان لوگوں کی بھی کوئی عزت نفس ہوتی ہے؟“ اس کے دوست نے ہنس کر جواب دیا تھا۔ ”اس روز اس شخص کو دیکھا تھا جو اس روڈ سائڈ ہوٹل کے قریب موجود تھا جہاں سے ہم نے کھانا کھایا تھا، ہمارے کھانا کھانے کے بعد وہ سب پلیٹوں میں سے بچا ہوا جمع کر کے وہیں ہمارے سامنے کھانے لگ گیا تھا ایک سائڈ پر بیٹھ کر، ان لوگوں کی میرے بھائی کوئی عزت نفس نہیں ہوتی....“ وہ ہنس رہا تھا۔

”انہی لوگوں کی تو عزت نفس ہوتی ہے منصور۔“ بینش نے دیکھا دانیال کے چہرے پر کرب تھا۔ ”یار اس عزت نفس کی پروا ہم لوگوں نے نہ کر کر کے اس کو مار ہی دیا ہے مگر یقیناً جانو انہی لوگوں کے پاس تو عزت نفس ہوتی ہے۔“

انگریزی کے الفاظ بولے اسے معلوم تھا کہ ان کا اثر کیا ہونے والا تھا۔

”یہ تو بڑے فخر کی بات ہے۔“ چھوٹے بھائی نے دانتوں میں خلال کرتے ہوئے بڑے بھائی کی طرز دیکھا۔ ”سب بچوں کو تو نیچر مشورے نہیں ناں دیتیں۔“

”پھر؟“ بڑے بھائی نے چھوٹے کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”ہم تو پڑھنے کا شوق پورا نہ کر سکے۔ حالانکہ میں بھی اپنے نیچر کا بوا پسندیدہ طالب علم تھا مگر قسمت!“ چھوٹے بھائی نے افسردہ لہجے میں کہا۔ ”پر اب تو کوئی مسئلہ نہیں ہے، بینش اگر پڑھ سکتی ہے اسے شوق بھی ہے تو پڑھنا چاہیے، ساری دنیا پڑھ رہی ہے اب تو، جتنا پڑھ لے اتنا ہی اچھا ہے۔ زندگی کا کوئی تیار طریقہ تو آئے گا۔“

”ہا..... ہائے۔“ اماں اس کا پالٹ پر حیران ہوئیں۔ ”پروہ تو کہتی ہے پڑھ کر میں نے برتن بنانے میں مٹی کے کپھاروں کی طرح۔“

”یہ تو اور بھی اچھا ہے، صرف پڑھائی نہیں ہر بھی سیکھ لے گی۔“ چھوٹا بھائی کچھ زیادہ ہی دیا لو ہو رہا تھا۔ ”کہاں سے لینے ہیں داخلہ فارم بینش، مجھے بتا دے میں منگوا دوں گا۔“ اس نے فیصلہ کرتے ہوئے کہا، بڑا بھائی کچھ نہیں بولا، یوں یہ طے ہو گیا کہ بینش نے آئندہ آنے والے وقت میں کیا کرنا تھا۔

☆☆☆

وہ کمرافاست سے سجایا گیا تھا، اس میں ہر طرح کی سہولت میسر تھی، کلر اسکیم اور فرنیچر بے حد دلکش تھا مگر اس کا دھیان ان میں سے کسی چیز پر بھی نہیں تھا۔ وہ جس کو صرف دیکھنے کی خاطر یہاں آیا تھا وہ جسم اس کے سامنے موجود تھی۔ اس کا دھیان اس کے خوب صورت لباس اور بناؤ سنگار پر بھی نہیں تھا۔ وہ تو صرف اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظریں صرف اس کے چہرے پر اٹکی تھیں۔ اس کا چہرہ جو اس کے دل کا آئینہ تھا اور پکار پکار کر بتاتا تھا کہ اس کا دل کتنا خوب صورت، معصوم اور سادہ تھا۔ اس کے چہرے کی دلکشی اس کے لیے ایک اضافی چیز تھی، اصل میں اس کا دل تھا جس نے اسے اپنے سامنے جھکا دیا تھا۔ ”ارے کیا یہ دل یہاں آنے والے ہر شخص کو نظر آتا ہے؟“ وہ پوچھنا چاہتا تھا مگر یہ بات اسے کبھی نہیں پوچھنا تھی۔ اس سوال کے ساتھ ہی اس کی حقیقت بھی سامنے آ جاتی تھی جس سے نظریں چار کرنا بھی مشکل تھا اور نظر بچانا بھی مشکل۔ یہاں اس شخص اس خیرہ کر دینے والی خوب صورتی کو دیکھنے کے لیے آنے والا وہ اکیلا نہیں تھا۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں کوئی بھی چہرہ سکوں کے عوض من پسند چہرہ دیکھنے اور من پسند جسم سے ناتا جوڑنے کے لیے آ سکتا تھا۔

”آف!“ اس کے حلق میں زہر سا بھر گیا جسے اس نے ٹھنڈے مشروب کے ایک گھونٹ کے ساتھ حلق سے اتار دیا۔ اس حقیقت سے نظر بچانے کے لیے ایک بار پھر اس وجود پر بھرپور نظر ڈالنے لگا۔ اس کا چہرہ، اس کا جسم وہ اوپر سے دیکھتے، دیکھتے پیچھے آئے لگا۔ اس کے ہاتھ بے حد خوب صورت تھے پھر اس کی نظر اس کے بازو میں پہنچے خوب صورت جڑاؤنگن پر اٹک گئی۔

”تمہیں معلوم ہے میں یہاں کیوں آیا ہوں، تم جانتی ہو کہ میں نے اس ایک رات کی بھاری قیمت کیوں ادا کی ہے؟“ اس نے بھاری لہجے میں اسے مخاطب کیا تھا۔

\*\*\*



ہوں۔  
 عینش کے لیے یہ ایک غیر متوقع سی بات تھی۔ یہ ٹھیک تھا کہ وہ ایک سیدھی سادی لڑکی تھی اور اس ماحول میں  
 ہر ایک مرتبہ تو بری طرح گھبرا گئی تھی مگر آئندہ یوں اس سے دوستی کے لیے ہاتھ بڑھانے کی اس کا خیال اسے  
 نہیں آیا تھا مگر اسے ایک سہارا چاہیے تھا ایک دلاسا، اسے یہاں سروائیو کرنے کے لیے ایسے ہی ساتھ کی  
 ضرورت تھی سو اس نے بلا تامل دل سے آئندہ کی دوستی کو قبول کر لیا تھا اور وہ آئندہ بھی جو اسے نئی نئی چیزوں سے  
 روشناس کروا رہی تھی۔ عینش نے ایف اے میں فائن آرٹس نہیں پڑھا تھا، وہ سائنس کی اسٹوڈنٹ تھی مگر کالج کے  
 فنکشنز پر پوزر اور بیک گراؤنڈز بنانے میں اس کا بڑا شہرہ تھا۔ جب ہی میڈیکل کے لیے اچھے نمبر نہ آنے پر  
 اس کی ایک بچہ نے اسے فائن آرٹس پڑھنے کا مشورہ دیا تھا۔ فائن آرٹس سے اس کے ذہن میں جس چیز کا تصور  
 آتا تھا اس میں مٹی کے برتن بنانے کا فن سب سے نمایاں تھا۔ وہ ٹی وی پر اس سے متعلق کئی پروگرام دیکھ چکی تھی  
 اور اس کے لیے فائن آرٹس پڑھنے کے خیال میں سب سے زیادہ خوشی کا مقام ہی یہ تھا کہ وہ مٹی کے برتن بنانا  
 سیکھ لے لی مگر شروع، شروع میں اسے یہ کورس لائن مشکل اور پڑھائی کا شیڈول سخت لگا تھا۔ اس کی انگریزی  
 بہت اچھی نہیں تھی اس کے لیے یہ سب سے بڑی جھینپ تھی، اس کے ڈپارٹمنٹ میں اکثر لوگ بڑی روانی سے  
 انگریزی بولتے تھے۔ وہ ان کی بات سمجھ جاتی مگر.... وہ انہیں انگریزی میں جواب نہیں دے پاتی تھی۔

”یہ کونسی شرمندگی والی بات نہیں۔“ اس سلسلے میں بھی آئندہ نے اس کو تسلی دی۔ ”تم پورے اعتماد کے  
 ساتھ اردو میں جواب دیا کرو، بے شک تم اپنی انگریزی بہتر کرنے کی کوشش کر سکتی ہو مگر اردو پر شرمندہ ہونے کا  
 کبھی نہ سوچنا یہ سب سے بڑی جہالت ہوگی۔“ اور عینش نے دیکھا تھا کہ اس کے اعتماد کے ساتھ اردو بولنے پر  
 کوئی بھی اس کی طرف استہزاء نظروں سے نہیں دیکھتا تھا ہاں اگر یہی بات وہ جھینپ کر کرتی تو یقیناً بہت سی  
 نظروں میں استہزاء ہوتا۔ لیکچرز کو سمجھنے اور عملی کام کو کرنے میں بھی آئندہ اس کا پورا پورا ساتھ دیتی تھی۔ عینش کے  
 لیے آئندہ وہ فرشتہ ثابت ہوئی تھی جو خاص طور سے کسی کام پر مامور کر دیا جاتا ہے۔ بعض اوقات وہ سوچتی تھی کہ  
 شاید وہ اس نئی دنیا میں کبھی قدم نہ جما پاتی اگر آئندہ وہاں موجود نہ ہوتی۔ وہ اس ڈپارٹمنٹ میں موجود رنگ  
 برنگ لوگوں کو دیکھ کر بہت گھبرا گئی تھی مگر آئندہ اور دانیال کی شخصیتوں میں اسے وہ رنگ بھی نظر آیا تھا جسے اس نے  
 بلا تامل انسانیت کا رنگ دے دیا تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جن کے لیے طبقاتی فرق، رنگ، زبان، ماحول کوئی بھی چیز  
 ممتی نہیں رکھتی تھی۔ وہ لوگوں کو انسان سمجھتے تھے اور انسانوں کی طرح ہی تعلق قائم رکھتے تھے۔ آئندہ کے بعد جس  
 شخص کو دیکھتے رہنے اور سنتے رہنے کی خواہش عینش کے دل میں ابھرتی تھی وہ دانیال رضا تھا اگرچہ خود دانیال  
 رضائے شاید بہت دیر تک اس عام اور سادہ سی لڑکی کے ڈپارٹمنٹ میں موجود ہونے کا نوٹس بھی نہیں لیا تھا۔

☆☆☆

”تمہیں معلوم ہے کہ میں یہاں کیوں آیا؟“ مہر زاد نے اپنا سوال دہرایا تھا۔ اس سوال کے دہرائے  
 جانے پر زنگار جیسے گہرے خیال سے نکلتی تھی۔ اس نے اپنے بھاری بچوٹے اٹھا کر اس کی جانب سوالیہ نظروں  
 سے دیکھا تھا۔

”یہ آنکھیں یقیناً دنیا کی خوبصورت ترین آنکھیں ہیں۔“ مہر زاد کو خیال آیا۔ ”کیا یہ لڑکی میرے لیے  
 زندگی کی سب سے بڑی خوشی ہے؟“ اس نے لمحے بھر کو سوچا۔ ”اوہ کیا یہ بات میں بہت جلد میں سوچنے لگا۔“  
 اس نے خود سے سوال کیا اور پھر سوچنے کا سلسلہ موقوف کر کے دوبارہ سے زنگار کی جانب متوجہ ہوا۔

”ایک بات تو بتاؤ۔“ منصور نے اس سے پوچھا۔ ”تمہیں اتنا احساس ہے ایسے لوگوں کا تو اس روز تم  
 اس شخص کو کھانا کیوں نہیں کھلا دیا؟“

”اسی خوف سے کہ اس کی عزت نفس میرے یوں کھانا کھلانے پر مجروح نہ ہو جائے، وہ جس طرح کو  
 کھانا کھاتا تھا۔۔۔۔۔ نظروں میں آنے پر شرمندہ نہ ہو جائے، مجھے اس بات سے ہمیشہ بہت ڈر لگتا ہے یار۔“ وہ  
 رہا تھا۔ ”تمہیں فٹ ہاتھ پر بیٹھا وزن کی مشین رکھے لوگوں کا وزن بتانے والا وہ شخص یاد ہے جسے ہم نے  
 پیسے دینے کی کوشش کی تھی بغیر وزن کیے، کتنا لڑا تھا وہ شخص ہم سے، کسے حقارت سے اس نے ہمارے  
 ہماری طرف پھینک دیے تھے۔ میں اس روز سے ہی ان لوگوں کی عزت نفس مجروح ہو جانے کے خیال سے  
 ہوا ہوں۔“

”سب ڈرامے ہیں یار، ان لوگوں کی کوئی عزت نفس نہیں ہوتی۔ پیسہ دکھا کر ان سے کوئی کام بھی  
 کوئی فرق نہیں پڑتا ان کو۔“ اس کے دوست نے کہا تو وہ لمبی بحث میں پڑ گئے۔

دانیال کا تعلق کسی امیر اور اونچے گھرانے سے تھا۔ یہ بات عینش کو ڈپارٹمنٹ میں اس کی پہلی دور  
 آئندہ نے بتائی تھی جو دانیال کو ذاتی طور پر بھی جانتی تھی۔ اس روز اس کی اپنے دوست کے ساتھ اس بحث کو  
 کے بعد عینش کو لگا جیسے اسے کہیں بہت اندھیرے میں انسانیت کی روشنی نظر آگئی ہو۔ ڈپارٹمنٹ میں پہلے  
 کے دوران وہ خاصی گھبراہٹ ہوئی سی رہی تھی۔ یہاں کا ماحول، یہاں کے رنگ ڈھنگ پورا کچھ ہی مختلف  
 گوالمنڈی کا کالج سے یہاں تک سفر طے کر لینا الگ بات، یہاں آکر خود کو ایڈجسٹ کرنا دوسری بات تھی۔  
 ہفتے میں عینش کو اپنی جیسی کوئی نظر نہیں آئی، اگلے ہفتے میں اس کی دوستی آئندہ سے ہوئی جو اگرچہ طبقاتی اعتبار  
 اس سے بہت مختلف تھی مگر محبت کرنے والی پُر خلوص لڑکی تھی۔

”تمہیں پتا ہے عینش تم کتنی پیاری لڑکی ہو۔“ اس نے دوستی کے پہلے دن ہی اس سے کہہ دیا تھا۔  
 ”میں پیاری ہوں؟“ عینش کو اپنے خاص اندرون لاہور سے پر قابو پانے میں خاصی دقت ہوتی تھی  
 کے زیر اثر اچھی خاصی بولی جانے والی اردو بھی پنجابی محسوس ہوتی تھی۔

”ہاں تو اور کیا۔“ آئندہ نے بے پروائی سے کہا تھا۔ ”ہم لوگ جس خوب صورتی کو حاصل کرنے کے  
 لاکھ جتن کرتے ہیں، وہ تمہارے پاس ویسے ہی ہے قدرتی اور خالص اور ادھر سے تم ابھی تک ویسے ہی خالص  
 ہو، تمہاری روح خالص ہے ابھی تم پر ماحول کی ناخالصیت کا اثر نہیں ہوا اس لیے تم اتنی پیاری دیکھتی ہو لیکن  
 ڈر ہے یہ ڈپارٹمنٹ تم پر اثر کر کے چھوڑے گا۔“

”ہائے اللہ نہ کرے۔“ عینش کو ڈپارٹمنٹ میں موجود لڑکیوں کی بے ساختگی اور کھلا ڈالامیل جول  
 آگیا، کیا وہ کبھی ایسی ہو سکتی تھی، کیا وہ اپنی بے ساختہ اور بے قابو ہو سکتی تھی کہ ساتھ پڑھنے والے لڑکے  
 یوں گفتگو کرے اور بے تکلف ہو جائے جیسے کسی لڑکی کے ساتھ ہوتی ہے۔

”یہ تم ابھی کہہ رہی ہو ناں عینش۔“ آئندہ نے اپنے شوٹلڈرکٹ سکی بالوں کو ہاتھ سے برابر کرتے ہوئے  
 ”میں نے اپنی آنکھوں سے سیدھی سادی معصوم لڑکیوں کو ماحول کا اثر پکڑتے دیکھا ہے مگر تم فکر مت کرو، تمہارے  
 قسمت اچھی ہے کہیں یہاں ہوں، میں تمہاری روح کی خالصیت کی حفاظت کروں گی۔ مجھے خالص رہیں  
 اچھی لگتی ہیں۔ عینش اس ڈپارٹمنٹ میں میرے جانے والے بہت ہیں۔ کچھ پرانے دوست بھی ہیں  
 فریڈز ہیں مگر میں دوستی صرف تم سے کروں گی کیونکہ تم جیسے لوگوں کے قریب رہنا میں اپنے لیے اعزاز



بیانی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ سے تو ہرگز نہیں، آپ سے میں جھوٹ بول نہیں سکتی اور جب تک آپ سے ملاقات کا سلسلہ رہے گا میں آپ سے جھوٹ نہیں بولوں گی۔“

”کیوں، مجھ میں کیا خاص بات ہے؟“ مہر زاد چونکا۔

”آپ.....“ وہ کہتے کہتے رکی اور بس دی۔ ”آپ کو میں نے بتایا تو ہے آپ مختلف ہیں، آپ عام نہیں ہیں بہت خاص ہیں۔ آپ منفرد ہیں۔“

”اچھا.....“ مہر زاد نے سیدھے ہو کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”تو ابھی ابھی جو تم نے دعویٰ کیا ہے اس پر پورا اترنا چاہیے نہیں۔“

”کون سا دعویٰ؟“ وہ یاد کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

”یہی کہ تم مجھ سے جھوٹ نہیں بولو گی۔“ مہر زاد نے یاد دلایا۔

”بالکل نہیں بولوں گی، یہ تو طے ہے۔“ وہ اسی کامل اعتماد کے ساتھ بولی۔

”پھر یہ بتاؤ کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں؟“ مہر زاد نے ایک مرتبہ پھر پوچھا۔

”بتایا تو ہے کہ مجھے اس کا ٹھیک اندازہ نہیں ہے۔“ زرنگار نے کہا۔

”زرنگار.....“ مہر زاد نے کہا اور توقف کیا۔ ”یہ نام تمہاری شخصیت کے ساتھ موزوں نہیں لگتا، تمہارا یہ نام ہونا بھی نہیں چاہیے، مجھے یقین ہے کہ یہ نام اس ماحول اور اس ماحول کے بنانے والوں کا دیا ہوا ہے۔ کیا تم تمہاری کھوج میں جا سکتے ہیں زرنگار۔ کیا ہم تمہاری تاریخ میں سے تمہارے اصل کو لیکھ کر سکتے ہیں؟“

”تو آپ اس لیے آئے ہیں۔“ زرنگار نے فوراً اندازہ لگایا۔

”حقیقت تو یہ ہے کہ مجھے کسی بھی بات سے فرق نہیں پڑتا، تمہارا پس منظر کیا ہے یا اب تم کس پیش منظر میں موجود ہو۔ مجھے کسی بھی بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ تمہیں پرکھنے اور سمجھنے کے لیے میرے پیمانے مختلف ہیں مگر میں یہ ضرور جانتا ہوں چاہے تم یہاں کیسے؟“ مہر زاد نے ہر سکون لہجے میں کہا۔

”جاننے کی خواہش۔“ زرنگار ہولے سے ہنسی۔ اس کے لہجے میں طنز تھا، استہزاء یا شاید پھر کچھ بھی نہیں تھا۔ ”خواہش بھی ہے اور فرق بھی نہیں پڑتا۔“

”ہاں خواہش بھی ہے اور فرق بھی نہیں پڑتا۔“ مہر زاد نے اس کے لہجے اور ہنسی سے متاثر ہوئے بغیر کہا۔ ”تمہارا یہاں ہونا ایک بھیاں تک حقیقت ہے مگر مجھے اس بھیاں تک حقیقت کا سامنا کرنے سے بھی خوف نہیں آتا۔ جاننے کی خواہش اس لیے ہے کہ وہ چہرے دیکھنا چاہتا ہوں جنہوں نے ایک خوش رنگ پھول کو نیکل کے جنگل میں لاسجایا ہے۔ یاد رکھنا کیکر کا جنگل ہو یا خوش رنگ، خوش نمایاں، پھول پھول ہی رہتا ہے نہ اس کا نام کوئی بدل سکتا ہے نہ اس کی خوب صورتی چھین سکتا ہے، یہ ہر جگہ نمایاں نظر آتا ہے۔“

”یہ خوش کن باتیں دل کو بھایا کرتی ہوں گی کبھی عمر اب دل ہر حقیقت سے آگاہ ہے نہ کچھڑ میں کھلنے والے پھول والی بات بھاتی ہے نہ کیکر کے جنگل میں سجے پھول کی بات اچھی لگتی ہے، کون ہے جو کچھڑ اور کیکر کے جنگل میں سجے پھول تک رسائی چاہتا ہے۔ کون ہے جو کچھڑ میں لٹ پٹ ہونا یا کیکر میں لٹھ کر خود کو زخمی کرنا چاہے گا۔ کسان کی باتیں کتابوں میں جیسے حروف کو پڑھتے ہوئے ہی اچھی لگتی ہیں، عملی زندگی بہت مختلف ہے، کچھڑ میں آگے اور کیکر میں لٹھ پھول کو دیکھ کر تعریف تو ہر کوئی کر سکتا ہے اس کی خوب صورتی سے آنکھوں کی پیاس بھی بجھائی جا سکتی ہے مگر ان تک رسائی کوئی بھی نہیں چاہتا، کون چاہے گا ایسا؟“ اس نے سوالیہ نظروں سے

”تمہیں معلوم ہے کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں؟“ اس نے تیسری بار یہ سوال کیا تھا۔

”میں یقین سے نہیں کہہ سکتی۔“ زرنگار نے اپنا بھاری دوپٹا درست کرتے ہوئے کہا۔ ”مگر اتنا مجھے ضرور

معلوم ہے کہ جس خاطر اکثر لوگ یہاں آتے ہیں، یہ راستے اور یہ جگہ جن خیالات کو ذہن میں جنم دے کر لوگوں کو اپنی طرف کھینچتی ہے آپ ان خیالات سے بالاتر ہیں۔ آپ کوئی معمولی اور عام شخص نہیں ہیں۔ نہ ہی آپ کی سوچ اتنی عامیانہ ہو سکتی ہے۔ معمولی اور عام شخص سے میری مراد دولت، جائیداد اور حیثیت ہرگز نہیں کیونکہ یہاں آنے کا تصور صرف وہی کر سکتے ہیں جو صاحب دولت، صاحب جائیداد اور صاحب حیثیت ہوتے ہیں۔ آئے دال کے چکر میں اچھے شخص کا یہاں کیا کام مگر آپ معمولی اور عام شخص اس لیے نہیں ہیں کہ آپ کا ذہن اور آپ کی سوچ بہت بلند، بہت غیر معمولی اور بہت خاص ہے۔ اس کا اندازہ مجھے ان چند ملاقاتوں میں جو آپ تک ہوئیں، آپ کی فون کا لڑا اور آپ کے پیغامات سے ہو چکا ہے۔“

”اسی لیے تم نے ایک رات میرے نام کر دینے میں تامل نہیں کیا۔“ مہر زاد کے چہرے پر مسکراہٹ ابھری۔

”یقیناً.....!“ زرنگار کے لہجے میں اعتماد تھا۔

”اور اگر تمہارا یہ یقین غلط ثابت ہو جائے اور میں بھی تمہارے جسم اور تمہارے حسن کا خریدار بن کر رات گزاروں تو.....؟“ مہر زاد اس کے چہرے کے تاثرات کو غور سے دیکھ رہا تھا۔

”ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔“ نہ اس کے چہرے کے تاثرات بدلنے لہجے کا اعتماد ڈگر گیا تھا۔

”کیوں تمہیں اس بات کا یقین ہے اس قدر؟“

”میری عمر زیادہ نہ کبھی مگر چہروں، لہجوں اور آنکھوں میں جھانکنے والے خیالات کو سمجھنے میں اتنا وقت گزارا ہے میں نے کہ اس سلسلے میں میرا اندازہ غلط ثابت ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ لمحے جو میں نے یہ تجربہ حاصل کرتے گزارے ان کا شمار کیا جائے تو میری کل عمر سے ان کی کتنی شاید بڑھ جائے۔ آپ کا کیا خیال ہے جولوگ یہاں اس مارکیٹ میں پہنچ گئی وہ خود اپنی مرضی سے ان راستوں پر چل کر آئی ہوگی۔ اس کے راستے میں کانٹے اور نکرے ہوں گے اس کے زخم زخم پاؤں سوچ، فہم، ادراک، شعور اور تجربے کی دھول سے پاک ہوں گے۔“

اس نے کہتے کہتے مہر زاد کی طرف دیکھا۔ وہ تجویز سے اس کی بات سن رہا تھا۔

”نہیں خانزادہ صاحب، حقیقتیں خیالات کے برعکس ہوتی ہیں۔“ وہ مسکرا کر بولی تھی۔ ”تجربہ بات اور مشاہدات کا ایک لمبا سلسلہ ہے میرے ساتھ اور یہاں موجود ہر لڑکی کے ساتھ۔ ہمیں لہجے اور تاثرات، سوچ اور خیالات پڑھ لینے میں لچہ بھی نہیں لگتا۔ اسی لیے میں یقین کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ یہاں آپ کی آمد کا مقصد عام اور معمولی نہیں ہے۔ آپ کے ارادے وہ ہرگز نہیں جن کو لے کر دوسرے تمام مرد یہاں آتے ہیں۔“

”تم بہت بائیو ہومیرے متعلق..... حیرت ہے۔“ مہر زاد نے دلچسپی سے اس کی بات سننے کے بعد کہا۔

”ہونا بھی چاہیے، آپ ہیں ہی ایسے، آپ کی شخصیت کا عنوان ہی مختلف ہے۔“ زرنگار کے لہجے سے

اعتماد اور یقین نے مہر زاد کو مسکراتے پر مجبور کر دیا۔

”تم دیکھنے میں بہت مصحوم لگتی ہو، تمہارا ہر انداز تمہاری کم عمری اور مصحومیت کا عکاس ہے، میرا تو تجربہ مشاہدہ بہت کمزور ہے۔ کوئی بہت تجربہ کار انسان بھی دھوکا کھا جائے اور بھی یقین نہ کرے کہ تم جو بہت تجربہ کار اور مشاہدے کا دعویٰ کر رہی ہو وہ درست ہے۔“ اس نے کہا۔

”نہ کرے.....!“ وہ بے پروائی سے بولی تھی۔ ”پروا کسے ہے مگر جو حقیقت ہے وہ حقیقت ہے۔ مجھے غلط



مہر زادی کی طرف دیکھا۔

”میں.....“ وہ بے اختیار بولا اور پھر ہنس دیا۔ ”سچ بتاؤں، مجھے یہ دعویٰ کرتے ہوئے عجیب سا لگ رہا ہے، زندگی دعوؤں کے ساتھ نہیں مل کے ساتھ جتنی ہے مگر یہ حقیقت ہے کہ میرے جیسے شخص کی اس جگہ پر آمد مقصد صرف اس پھول کی خوش نمائی سے آنکھوں کی پیاس بجھانا نہیں ہے۔ مجھے اس پھول تک رسائی مقصود ہے جب ہی تو بار بار یہ سوال کر رہا ہوں کہ کیا تم جانتی ہو میں یہاں کیوں آیا ہوں؟“

”کہانیاں کہنے اور کہانیاں سننے۔“ زرنگار نے اپنے دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی میں پڑی قیمتی انگوٹھی کو گھماتے ہوئے کہا۔

”حقیقت سننے.....“ مہر زاد نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”حقیقت سنانے کا وقت بعد میں آئے گا اور تم وعدہ کرتا ہوں، وہ میں تمہیں ضرور سناؤں گا۔“

”یہ حقیقت الف لیلہ کی کہانیوں کی طرح طویل بھی ہو سکتی ہے لیکن میں شہر زاد نہیں ہوں۔“ زرنگار نے جملے میں مہر زاد کو چونکا دیا۔

”میں بھی بادشاہ وقت نہیں ہوں۔“ وہ سنبھلتے ہوئے بولا۔ ”لیکن اگر تم مجھے سناؤ تو یقیناً جانو میں اسے اپنی عزت افزائی سمجھوں گا۔“

”آپ نے ایک رات کی قیمت ادا کر رکھی ہے، یہ رات بہت قیمتی ہے مگر کم ہے۔“ زرنگار نے معنی خیز انداز میں کہا۔

”میں ایسی ایک ہزار راتوں کی قیمت ادا کرنے پر تیار ہوں اگر تم مجھے حقیقت سنانے پر تیار ہو جاؤ، ایک ہزار راتوں کی قیمت ادا کر دینے سے اگر تمہاری زندگی میں رات کی غلامی سے آزادی کی صورت حال پیدا ہو جائے تو مجھے اور کیا چاہیے۔“ زرنگار نے محسوس کیا مہر زاد خان کا لہجہ بوجھل ہو رہا تھا، زندگی کی ایک خوب صورت حقیقت اس کے اختیار میں تھی مگر وہ اجتناب برت رہا تھا۔ وہ ایسی باتیں کر رہا تھا جو یہاں آنے والے کوئی بھی دوسرا شخص نہیں کر سکتا تھا۔ اس کا اندازہ بلکہ یقیناً سو فیصد درست تھا۔ مہر زاد خان دوسروں سے مختلف اور منفرد تھا..... زرنگار کو اپنے اندازے کی صداقت پر یقین کامل ہونے لگا تھا۔

☆☆☆

زونی حسین کی زندگی کے انداز میں انتہا سے زیادہ یکسانیت تھی، وہ ایک سی روٹین پر لگی بندھی زندگی گزارنے کی عادی تھی۔ اس کا دن صبح سات بجے شروع ہوتا تھا، وہ ایک چھوٹے سے فلیٹ میں رہتی تھی جس کی صفائی ستھرائی وہ خود کرتی تھی۔ صبح وہ اپنے لیے ناشتا، اپنے ساتھ لے جانے کے لیے کچھ اسٹیکس جو وہ دوپہر میں کھانے کے وقفے کے دوران کھاتی تھی اور رات کا کھانا سب اکٹھا ہی بناتی تھی۔ اس کے چھوٹے سے کمرے میں دو برز کا ایک چولہا تھا جس پر وہ ناشتا اور رات کا کھانا تیار کرتی، اسٹیکس کے لیے وہ بجلی کے جدید آلات استعمال کرتی تھی، چھوٹے سے فلیٹ کی صفائی میں اسے زیادہ وقت نہیں لگتا تھا۔ سب کاموں سے فارغ ہو کر وہ ٹھیک آٹھ بجے اپنے کمرے کے دروازے پر پہنچ جاتی جہاں اس کے دو اساز ادارے کی بس اسے لینے کے لیے ٹھیک آٹھ بج کر پانچ منٹ پر پہنچ جاتی تھی۔ وہ سارا دن ادارے کی لیبارٹری میں گزارتی تھی۔ اس کا تعلق ریسرچ کے شعبے سے تھا۔ لیبارٹری کے اندر کا مخصوص ماحول اور بو اس کے دماغ میں رچ بس گئی تھی۔ لیبارٹری کے اس شعبے سے منسلک رہنا اس ملک میں اس کی رہائش کے دن بڑھانے کا سب سے اہم ذریعہ تھا۔ اس لیے وہ بھی

## شام شہریازاں

اس ماحول اور اس بو سے تنگ نہیں پڑی تھی۔ اس کے کام کے اوقات کار طویل تھے وہ شام پانچ بجے فارغ ہوتی تھی اور ادارے کی بس پر بیٹھتے بیٹھتے تقریباً چھ بج جاتے تھے۔ شہر بھر میں اس وقت برقی ٹمقے جگمگا رہے ہوتے جب زونی حسین واپس گھر پہنچتی تھی، اس وقت تک اس کا دماغ اور جسم تھک چکے ہوتے تھے مگر اس کا تعلق شدید محنت کی عادی قوم سے تھا اس لیے یہ تھکن اسے بہت زیادہ محسوس نہیں ہوتی تھی۔ گھر واپس آنے کے بعد وہ زیادہ تر تنہا رہتی تھی۔ اس کا میل ملاپ کم ہی لوگوں سے تھا جس علاقے میں وہ رہتی تھی وہ لوئر مل کلاس لوگوں کا علاقہ تھا اس کے اوپر نیچے دائیں بائیں فلیٹس میں ایسی گھریلو خواتین رہتی تھیں جو زونی کے بارے میں شدید تحفظات رکھتی تھیں اور اس کے بارے میں طرح طرح کی باتیں بناتی تھیں۔

”یہ لوگ سناپ، مینڈک اور چھپکلی تک کھا لیتے ہیں، یہ لڑکی بھی یقیناً ایسی ہی چیزیں کھاتی ہے جب ہی اس کے کچن سے عجیب و غریب قسم کی بو آتی ہے۔“ زونی کو معلوم تھا کہ یہ بات تو اس کے بارے میں شدید دے کی جاتی تھی۔

”کا کرا کوچ اور چوہے بھی لپکاتی ہے۔ میرے بچوں نے خود دیکھا ہے کچن کی کھڑکی میں سے جھانک کر۔“ مسز امتیاز تو یہ بات بہت وثوق سے کہتی تھیں۔

”جانے کوئی دین مذہب بھی ہے اس کا کہ نہیں، سنا ہے ان چینٹیوں کا کوئی دین مذہب نہیں ہوتا، یہ کسی خدا کو نہیں مانتے تو یہ استغفار۔ اس بلڈنگ میں ضرور ایک فلیٹ اس چینٹی لڑکی کو دینا تھا ان لوگوں سے سارا ماحول خراب ہو سکتا ہے۔“ بوڑھی مسز ستار کہا کرتی تھیں۔

ایک اکیلی زونی حسین پورا ماحول کیسے خراب کر سکتی تھی، کبھی کوئی نہیں بتاتا تھا۔ وہ بھی ان حالات میں جب وہ صبح کی گئی شام گئے گھر لوٹتی تھی اور اپنے کام سے کام رکھتی تھی۔ زونی کو ان باتوں سے تکلیف ہوتی تھی، اسے اپنے بارے میں چو گونیاں کیے جانے پر نفوس بھی ہوتا تھا مگر وہ اس معاشرے کی عمومی سوچ اور گفتگو سے بہت اچھی طرح واقف ہو چکی تھی۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ چو گونیاں کرنا فارغ البال عورت کی فطرت تھی، خواہ وہ دنیا کے کسی بھی کونے میں رہتی ہوں، اس لیے وہ ان خواتین کی باتیں بہت زیادہ محسوس نہیں کرتی تھی البتہ جس بات پر اسے سب سے زیادہ دکھ ہوتا تھا وہ یہ بات کیے جانا تھا کہ وہ لا دین تھی، اگرچہ وہ خود بھی بہت اچھی طرح نہیں جانتی تھی کہ وہ مذہبی لحاظ سے کس جگہ کھڑی تھی مگر اسے اپنی ماں اور باپ دونوں کے مذہب سے پیار تھا۔ اس کی ماں خالص چینٹی عورت تھی اور بد مذہب کو ماننے والی بھی اگرچہ اس کے نانا نانی تاؤ ازم کے پیروکار تھے اور اس کا باپ مسلمان تھا اگرچہ اس کے باپ نے تمام عمر چین میں گزاری مگر وہ بھی خود زونی کی طرح مخلوط النسل تھے۔ زونی کے دادا چینٹی النسل تھے اور دادی پاکستانی مسلم۔ زونی کے دادا بھی مسلمان تھے، زونی اس بارے میں زیادہ نہیں جانتی تھی کہ اس کے دادا اور دادی کی شادی کا محرک کیا تھا مگر اسے ان دونوں سے شدید پیار تھا اور اپنی دادی سے محبت کی وجہ سے ہی اس نے فارمیسی پڑھنے کے لیے پاکستان کا انتخاب کیا تھا۔ وہ خود بھی نہیں جانتی تھی کہ ڈگری کے حصول تک کا دورانیہ پاکستان میں گزرتے، گزارتے اسے کس طرح اس ملک اور یہاں کے لوگوں سے اتنا پیار ہو گیا تھا کہ ڈگری کے حصول کے بعد اس کا واپس جانے کو ایک فیصد بھی دل نہیں مانتا تھا۔ یہ بہت مشکل وقت تھا۔ اس کے اسٹوڈنٹ ویزے کی مدت ختم ہو رہی تھی اور اسے واپس جانا تھا جبکہ وہ کسی صورت بھی خود کو واپسی پر آمادہ نہیں پاتی تھی۔ اس کی اسی خواہش کو دیکھتے ہوئے اس کے ایک استاد نے اسے ریسرچ سے منسلک ہو جانے کا مشورہ دیا۔ ریسرچ سے وابستگی کے حصول کے لیے اسے کئی ایک دو اساز کمپنیوں کے پیچھے خوار ہونا پڑا تھا اور اس کے مطلوبہ کاغذات ملنے تک اس کے ویزے کی مدت



بڑھائے جانے کے باوجود ختم ہو چکی تھی مگر اسے خوشی تھی کہ ریسرچ سے منسلک ہو جانے کی وجہ سے اس ویزے پر ریسرچ کے اختتام تک قیام کا اجازت نامہ مثبت ہو چکا تھا۔ زوئی کو یہاں رہنے سے بہت سکون تھا۔ وہ ان فضاؤں اور ہواؤں سے مانوس ہو چکی تھی۔ وہ اس زمین کی محبت میں اتنی بری طرح گرفتار تھی اسے یہاں کے لوگوں کے رویے اور اور مزاج سے بھی اُنس ہونے لگا تھا۔ یہاں رہتے ہوئے اسے اس وطن یاد بہت کم ستاتی تھی جہاں اس نے زندگی کے اٹھارہ سال گزارے تھے۔ وہ یہیں بس جانے کے خواب دیکھتی تھی اور اس کی اس خواہش پر اس کے دوست اور ساتھ کام کرنے والے حیران ہوتے تھے۔

”یہاں کے لوگ اِدھر سے باہر فرسٹ ورلڈ کے کسی ملک میں جانے کو بے چین رہتے ہیں زوئی عجیب لڑکی ہو جس کو اپنا اتنا اچھا، صاف ستھرا، پرسکون ملک یاد نہیں آتا اور تم یہاں رہ جانا چاہتی ہو۔“ ان سے اکثر کہتے تھے۔

زوئی کو خود بھی سمجھ نہیں آتا تھا کہ ایسا کیوں تھا، کبھی کبھی اسے خیال آتا کہ بچپن سے لے کر اس وقت تک کی زندگی جب وہ یہاں آئی تھی کی جامد خاموشی اور مشین جیسی رفتار نے اس کا دل اچاٹ کر ڈالا تھا۔ بھی اسے خیال آتا کہ اس کی ماں کی شخصیت میں جو گہما گہما، لمساری، محبت اور رچاؤ تھا اس کے اُسرا کو کھوجنے کے لیے وہ یہاں آئی اور پھر یہاں ہی رہ گئی یا پھر شاید اس ملک کی ثقافت کی رنگارنگ اور نئی جہتوں نے اس کے پاؤں باندھ لیے تھے۔ جو بھی تھا ٹھیک سے سمجھ میں نہ آنے کے باوجود ایک حقیقت یہ تھی کہ زوئی حسین جسم، شکل، صورت، تاریخ اور ثقافت بالکل مختلف تھی پاکستانی ماحول کے عشق میں گرفتار ہو چکی تھی۔

☆☆☆

”اگر تم سمجھتی ہو کہ مجھے بی اماں کی کبھی ہر بات کا لحاظ ہے اور میں اسے پورا کرنے کی کوشش اب بھی کر رہی ہوں جبکہ وہ اس دنیا میں موجود نہیں ہیں تو سمجھ لو کہ اس لڑکی میرال کا تعلق بھی اسی بات سے ہے۔“ حمزہ نے کہا۔

”کھاتے ہوئے نکلیں ان کی بات کا جواب بہت اچانک دیتا تھا جو وہ اس سے پچھلے کئی دن سے پوچھ رہی تھی۔

”اس لڑکی میرال کا تعلق بی اماں سے؟“ نکلیں کو پانی پیتے پیتے اچھو لگ گیا۔

”ہاں بالکل بی اماں سے۔“ حمزہ نے آخری نوالہ کھانے کے بعد پلیٹ پر بے کھسکاتے ہوئے جواب دیا۔

”وہ کیسے؟“ نکلیں مارے تجسس کے کھانا کھانا بھول گئی۔

”تمہیں یقیناً نہیں مگر ماموں اور ممانی کو ضرور یاد ہوگا کہ بی اماں کی ایک دوست ایبٹ آباد میں رہتی تھیں وہ ان کی دوریاری کی عزیمت بھی تھیں مگر دوستی کا رشتہ عزیز داری سے زیادہ قریبی تھا، دونوں ایک دوسرے خطوط بھی لکھا کرتی تھیں۔ دو مرتبہ وہ خاتون ہمارے ہاں سیالکوٹ آئی بھی تھیں اور کئی مرتبہ بی اماں گری جیٹوں میں ان کے پاس جاتی تھیں۔ چند ایک بار مجھے بھی اتفاق ہوا ان کے ساتھ جانے کا۔“

”پھر.....؟“ نکلیں ایک سانس میں ہی ساری کہانی جان لینا چاہتی تھی۔

”پھر یہ کہ مجھے ان دونوں کا آپس کا پیار بہت اچھی طرح یاد تھا، ان خاتون کے گھر کا ماحول اور لوگ بھی میرے ذہن میں تھے۔ وہ بہت خوب صورت خاتون تھیں ان کے شُخ کو عمر کی گرہیں نے چار چاند لگا دیے تھے۔ وہ ہمیشہ یاد رہ جانے والی شخصیتوں میں سے ایک تھیں جو رواداری اور مروت بی اماں کی شخصیت کا خاصہ تھی وہ ان کی شخصیت کا بھی حصہ تھی۔ میں ان سے خاصا متاثر تھا۔ بی اماں کے برعکس ان کے ساتھ خاصی بڑی ٹریجنڈ ہو چکی تھیں، ان کے شوہر کا انتقال ہو ہی چکا تھا مگر ایک فضائی حادثے میں ان کا بیٹا اور بہو بھی ان

”بی اماں کی وفات کے بعد مجھے ان کی دوست کے بارے میں تقریباً بھول ہی گیا بلکہ اس سے بھی پہلے ان کی زندگی میں بھی وہ آخری دفعہ جب سیالکوٹ آئیں، میرا خیال ہے کہ میں فرسٹ ایئر میں پڑھتا تھا، جنہیں بھی شاید یاد ہوں وہ خاتون جو پانچ کو نزلانی تھیں اور سفید مٹی کا آٹا اور کھٹا ترین انار دانہ اور ریڈ بلڈ مالٹے خان پور کے۔“ حمزہ نے یاد دلایا۔

”اصل میں، میں کوشش تو بہت کر رہی ہوں کہ مجھے ایسی کوئی شخصیت یاد آجائے لیکن ابھی تک مجھے بالکل یاد نہیں آ رہا کہ وہ کون تھیں۔“ نکلیں نے سادگی سے جواب دیا۔

”ہاں.....“ حمزہ نے سر ہلا کر کہا۔ ”اچھا، شاید تمہیں اس لیے یاد نہ آ رہی ہوں کہ اس آخری آمد پر وہ صرف ایک رات ہی ٹھہری تھیں اور پھر بی اماں کی بیماری کے دوران اور ان کی وفات پر بھی ان کا کوئی اتنا پتا نہیں آیا بلکہ شاید کسی نے ان کو اطلاع ہی نہیں دی۔“

”کون دیتا؟“ نکلیں نے کہا۔ ”ابو کو بی دینی چاہیے تھی یا پھر تمہیں لیکن کبھی کبھار ملنے والے ایسے مواقع پر اکثر ذہن سے نکل جاتے ہیں۔“

”اور پھر میں تو بی اماں کے بعد بہت سی باتوں سے غافل ہو گیا۔“ حمزہ کے لہجے میں دکھ سا اثر آیا۔ ”یاد رہا تو صرف اتنا کہ بی اماں نہیں رہیں۔“

”پھر ان دوست کا خیال کیسے آیا تمہیں؟“ نکلیں کو تجسس کا دورہ دوبارہ سے بڑ گیا۔

”ایبٹ آباد جانے کے اتفاق سے۔“ حمزہ نے ٹھکن سے بھاری ہوتا سر ڈانگ چیر کر پشت سے لگاتے ہوئے کہا۔ ”ایبٹ آباد پہنچتے ہی میرے دماغ میں بی اماں کے ساتھ وہاں تک کا سفر اور ان کی دوست کے ہاں قیام روشن ہو گیا۔ مجھے اس شہر کی فضا میں کسی مخصوص خوشبو سے بہت کچھ یاد آنے لگا۔ تمہیں پتا ہے نکلیں کہ ہر شہر کی اپنی ایک الگ خوشبو ہوتی ہے، اپنی ایک الگ فضا۔“ وہ بات کرتے کرتے کسی اور موضوع کی طرف چلا گیا۔

”ہوں.....“ نکلیں نے بے دھیانی سے سنتے ہوئے یونہی سر ہلا دیا۔

”اور وہ خوشبو اور فضا ہمارے ذہنوں میں محفوظ ہو جاتی ہے، خواہ کتنے سالوں بعد ہی کیوں نہ اس شہر میں واپس جاؤ وہ فضا اور خوشبو ذہن کے کسی خانے سے نکل کر فٹ سے حواس میں بس جاتی ہے اور پھر بہت کچھ یاد آنے لگتا ہے۔“

”ہاں تم ٹھیک کہتے ہو۔“ نکلیں کو اب خیال آیا کہ اس کا اپنا تجربہ بھی ایسا ہی کہتا تھا۔

”خیر.....“ حمزہ کو اپنی ادھوری چھوٹی بات یاد آ گئی۔ ”خیر..... میں تمہیں سنا رہا تھا کہ جب میں ایبٹ آباد



ہوئی۔ اس کا کچھ اتنا پتا نہیں معلوم تھا وہاں کے لوگوں کو۔“ حمزہ کی آوازیات کرتے کرتے بھاری ہو گئی۔  
”اوہ میرے خیر!.....“ ٹکین کو جیسے سخت شاک لگا۔

”پتا نہیں کیوں ٹکین مگر یہ صورت حال جان کر میں ایک عجیب سے دکھ، عجیب سی پریشانی میں مبتلا ہو گیا۔  
مجھے ایسا لگا جیسے یہ سب میرے کسی بہت ہی اپنے کے ساتھ ہوا ہو۔ مجھے یاد آیا کہ رابعہ بانو بی بی اماں سے کہا  
کرتی تھیں کہ ان کا اور ان کی پوتی کا خدا کے بعد ایک دوسرے کے علاوہ کوئی نہیں یا پھر بی بی اماں ان سے  
ملا کرتی تھیں عزیز، رشتے دار اپنی اپنی زندگیوں میں مست اور دوست احباب بہت ہی کم..... پھر تم سوچو کہ اس  
جاہل قیامت جیسی صورت حال میں کون تھا جو اس لڑکی کے سر پر موجود تھا۔ تم ذرا اندازہ لگانے کی کوشش کرو  
کہ اس لڑکی پر کیسی قیامت ٹوٹی ہوگی۔ اس قیامت خیز منظر کو دیکھنا۔ اس کا شکار ہونا، دنیا میں اپنا واحد رشتہ کھو  
دینا اور پھر اجنبی مددگاروں کے درمیان زخمی حالت میں موجود ہونا بی بی اماں کا شکار ہونا، دنیا میں اپنا واحد رشتہ کھو  
مشکل ہے پھر نہ جانے اس کے ساتھ کیا ناگہانی ہوئی کہ وہ وہاں سے غائب ہو گئی۔“ حمزہ کہتے کہتے چپ ہو گیا۔  
اس کے چہرے پر کرب تھا۔

”تم سوچ نہیں سکتیں کہ بالاکوٹ میں قیام کے دوران مجھے اس زلزلے کے دوران اور بعد کی کیسی کیسی  
کہانیاں سننے کو ملیں۔ سننے اور دیکھنے میں بہت فرق ہے۔ کیا کیا ہوا اور کس کس کے ساتھ ہوا بتانا مشکل ہے۔  
میں نے سب سنا مگر اس سننے کے دوران جس بات پر میرا دل اور میرا دماغ انک کر رہا تھا وہ میرا دل کا وہاں سے  
غائب ہونا تھا۔ میں نے وہاں ہر اس شخص سے ملاقات کی جو میرا دل اور رابعہ بانو کو تھوڑا بہت جانتا تھا۔ ان  
میں ایک خاتون ایسی بھی تھیں جنہوں نے بتایا کہ گزشتہ سال انہوں نے میرا دل کی شکل کی ایک لڑکی کو مسلم ٹاؤن  
کے ایک گھر میں دیکھا تھا، ان کے بقول وہ گھر ان کی بہن کی کسی دوست کی ماں کا تھا، وہ وہاں کسی کی عیادت  
کرتے لگی تھیں۔ میرا دل پہچان لیے جانے پر اس منظر سے غائب ہو گئی، ان خاتون کے دریافت کرنے پر گھر  
والوں نے بتایا کہ وہ ان کی بیٹی کی دوست تھی۔ یہ وہی گھر ہے جس کا پتا میں نے اشعر بھائی کو دیا تھا۔ مجھے اس  
خبر نے اس شاک میں مبتلا کر دیا۔ جس سے لکنا مشکل تھا مگر میں اتنی جلدی اس کے بارے میں معلوم کر لینا  
چاہتا تھا کہ خود یہاں آنے کا انتظار بھی نہیں کر سکا اور اشعر بھائی کو فون پر ہی کہہ دیا۔ میں پوری سنجیدگی سے یہ  
بات کہہ رہا ہوں ٹکین کہ مجھے اس لڑکی کو ہر حال میں تلاش کرنا ہے۔ شاید اس تباہ کن واقعے کے نتائج نے ایسی  
نئی کہانیاں کو جنم دیا ہو۔ میں یقیناً ہر ایک کی کھوج میں نہیں جاسکتے مگر یہ معاملہ کچھ اور ہے۔ مجھے ایسا لگتا  
ہے جیسے بی بی اماں کے حوالے سے یہ ہمارا فرض بنتا ہے کہ اس لڑکی کی کھوج لگائیں۔ خدا نہ کرے کہ وہ وہاں سے جو  
یہ ساری بات سن کر کسی بھی ذی عقل کے ذہن میں آسکتے ہیں ان میں سے کوئی ایک بھی اس کے سلسلے میں  
درست ثابت ہو..... مگر اس کا پتا لگانا بہت ضروری ہے۔ وہ ایک انتہائی شریف اور باعزت فیملی کی بیٹی ہے اور  
وہ خود بھی یقیناً بہت مہذب اور ڈینٹ لڑکی ہے۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ میرا ایبٹ آباد جانا اور اس کے متعلق  
دریافت کرنا اور اس واقعے کی خبر تک پہنچنا اسی لیے ہوا کہ اس لڑکی جس کی تلاش اور حالات سے کسی ایک شخص کو  
بھی دلچسپی نہیں تھی کے لیے کوئی تو ہو جو پریشان ہو، شاید ہماری تلاش اس کے کسی کام آجائے۔“

”حمزہ ایک بات پوچھوں؟“ ٹکین نے اس کے جذبات کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔  
”ایسی کوئی بات نہیں ہے ٹکین۔“ وہ جیسے بن سنے ہی سمجھ گیا۔ ”میرا اس لڑکی سے کوئی ایسا قلبی تعلق نہیں  
ہے۔ میں تو ان لوگوں کو بالکل ہی بھلا چکا تھا اور بھولا ہی رہتا اگر ایبٹ آباد نہ جاتا۔ مجھے تو شاید ڈھنگ سے

پہنچا تو مجھے بہت کچھ یاد آنے لگا۔ رابعہ آنٹی کا گھر، اس کا نقشہ، وہ علاقہ، ان کی باتیں، سب سے بڑھ کر  
بی اماں۔“ حمزہ نے سیدھے ہوتے ہوئے کہا۔  
”پھر تم ان سے ملنے چلے گئے۔“ ٹکین نے متوقع بات کہی۔

”ہاں، میں جانا چاہتا تھا مگر ان کا ایڈریس بھول گیا تھا، دراصل وہ شہر اتنا بدل گیا ہے کہ سارے راج  
اور علاقے گم ہو گئے اور میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کدھر جاؤں جو وہ مل جائیں مگر نہیں صاحب وہ تو علاقہ  
جیسے کہیں گم ہو گیا تھا۔ جب میں ڈھونڈ، ڈھونڈ کر مایوس ہو گیا تو یونہی گھومتے گھماتے ایک دیکھے دیکھے  
علاقے میں ایک گھر سے پتا کرنے پر ان کا سراغ مل ہی گیا۔“

”وہ تو بہت خوش ہوئی ہوں گی تمہیں دیکھ کر۔“ ٹکین اس سراغ مل جانے والی بات سن کر خوش ہو گئی۔  
”نہیں، وہ وہاں نہیں تھیں۔“ حمزہ نے پیچی آواز میں کہا۔  
”ارے.....“ ٹکین نے غور سے اسے دیکھا۔ ”وہ کہیں اور شفقت ہو گئیں کیا؟“  
”ہاں.....“ حمزہ نے مختصر جواب دیا۔

”کہاں.....؟“  
”اس دنیا سے عالم بالا میں۔“ حمزہ نے ایک اور مختصر جواب دیا۔  
”ارے.....“ ٹکین کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ”تمہارا مطلب ہے کہ.....“  
”ہاں.....“ حمزہ نے سر ہلایا۔

”اوہ..... بہت افسوس ہوا۔“ ٹکین نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا اور کچھ دیر تک کمرے میں خاموشی چھا گئی۔  
”یہ ایک متوقع سی بات ہونی چاہیے تھی۔ بی اماں جاسکتی ہیں تو وہ بھی تو تقریباً ان کی ہم عمر ہی ہوں گی۔  
ٹکین نے خاموشی کو توڑنے کے لیے کہا۔

”مجھے علم ہوا کہ وہ وفات سے کچھ عرصہ قبل ایبٹ آباد سے بالاکوٹ شفٹ کر گئی تھیں۔ میں نے ان کے  
بارے میں بتانے والی لڑکی سے ان کی پوتی کے بارے میں پوچھا تو اس نے لاعلمی کا اظہار کر دیا۔“  
”اچھا.....“ ٹکین نے اچھا کولمبا کرتے ہوئے کہا۔ ”تو تم اس لیے بالاکوٹ گئے تھے۔ ان لوگوں نے  
بارے میں معلوم کرنے بلکہ پوتی کے بارے میں معلوم کرنے۔“

”معلوم کرنے نہیں بلکہ اس سے تعزیت کرنے اور یہ بتانے کے میں بی اماں کا پوتا ہوں اور اگر بی اماں  
زندہ ہوتیں تو وہ بھی ضرور اس کے پاس افسوس کرنے کے لیے اور اسے یہ بتانے کے لیے کہ عزیز رشتے دار  
نام پر وہ اس کے لیے موجود ہیں، پہنچتیں۔“ حمزہ نے ہنسی کی۔

”اوہ ہاں.....“ ٹکین نے اس کی بات سمجھتے ہوئے کہا۔ ”یہ تم نے اچھا کیا..... بہت اچھا کیا۔ بی اماں  
ہوتیں تو ضرور ایسا ہی کرتیں۔“

”میں وہاں ایسا ہی کرنے کے لیے گیا تھا مگر میں وہاں پہنچا تو وہ مجھے وہاں نہیں ملی۔“ حمزہ نے بتایا۔  
”ارے..... وہ کہاں گئی؟“ ٹکین نے چونکتے ہوئے کہا۔

”اس کے ارد گرد رہنے والے لوگوں نے بتایا کہ رابعہ بانو کا انتقال اس تباہ کن زلزلے کے نتیجے میں  
جس نے اس پورے علاقے کو موت کی وادی بنا دیا تھا۔ ان کی پوتی میرا دل زلزلہ زدگان کے لیے لگائے  
عارضی امدادی ٹیمپوں میں سے ایک میں زخمی حالت میں موجود تھی لیکن ایک رات وہ اچانک وہاں سے



اس لڑکی کی شکل بھی یاد نہیں مگر اس کا یوں بے آسرا ہونا مجھ سے برداشت نہیں ہو رہا۔ ایسا تو ہم کسی بھی آئینہ لیے محسوس کر سکتے ہیں ناں اور اگر تم اس علاقے میں جا کر ابھی اتنا عرصہ گزرنے کے بعد بھی ان لوگوں کی حالات دیکھو تو یقیناً سوچو گی کہ ان میں سے جتنے لوگوں کی مدد کر سکتی ہو ضرور کرو۔۔۔۔۔ پھر یہ تو ایک ایسی لڑکی جو بی اماں کے تعلق کے حوالے سے ہمیں عزیز ہونی چاہیے۔

”تم ٹھیک کہتے ہو حمزہ۔“ لیکن نے آہستہ آواز میں کہا اور برتن سمیٹنے لگی۔ اس کے دل پر اچانک ہی ایک عجیب سی اداسی چھا گئی تھی۔ میرا نام اس لڑکی پر سے گزرنے والے حالات کا اثر بھی تھا اور زلزلے کا ہونے والے بانی لوگوں کا دکھ بھی نئے سرے سے جاگ گیا تھا۔ اسے حمزہ کی انسانیت پسندی کا بھی احساس ہو رہا تھا۔ حمزہ ہو رہی اماں کی تربیت کا پرتو تھا۔ وہ بھی جہاں کسی کو تکلیف میں دیکھتی تھیں، غمزدہ ہو جاتی تھیں اور فوراً مدد کو تیار بھی۔ کئی ایسی خواتین بھی اس نے ان کے پاس مالی طلب کو آتے دیکھی تھیں جن کے چہرے سے خود بی اماں بھی شناسنائیں ہوتی تھیں۔ ادھر ادھر سے ان کی سخاوت اور نیک دلی کی خبریں کر رہی ادھر آج تھیں اور بی اماں چپکے سے ان کی توفیق بھرا مدد کرنے کے بعد کسی کے استفسار کرنے پر تیار تھیں۔

”وسیلہ انسان خود نہیں بننا، اسے خدا وسیلہ بنانا ہے اب اگر خدا بنادے تو کیا ناشکری کر دوں اس مہربانی کی، شکر ہے اس نے کسی کی ضرورت پوری کروانے کے لیے میرا انتخاب کیا، یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ وہ کام کسی اور کو سونپ دیتا اور میں سوئی رہ جاتی۔“

”اوکے۔۔۔۔۔ پھر میں چلتا ہوں، اشعر بھائی تو نہ جانے کب پہنچیں۔“ کچھ دیر بعد تکلیف کے کان میں حمزہ آواز آئی وہ اس کی ساس کو سلام کرنے کے بعد اسے خدا حافظ کہنے آیا تھا۔

”حمزہ۔“ لیکن نے اسے خدا حافظ کہنے سے پہلے کہا تھا۔ ”ہم میرا دل کو ضرور دھوٹیں گے۔ اگر دنیا بھر ہوگی تو ضرور ملے گی۔“

”ہم۔“ حمزہ نے دُہرایا اور مسکرایا۔ ”اچھا، ہاں ضرور۔“ وہ مسکرا رہا تھا جیسے اسے دوسرا ہٹ مل گیا ہو۔ ”اچھا خدا حافظ۔“

”ہاں ٹھیک ہے۔“ لیکن جیسے مطمئن ہو گئی۔

☆☆☆

اسے اس گھر کے کسی بھی کام میں دلچسپی محسوس نہیں ہوتی تھی اور یو ایچ اسے ہر کام میں طاق کر دینا چاہتے تھیں۔ کھانا لگانا، کپڑے سینا، کپڑے دھونا، صفائی ستھرائی، کپڑوں کو استری کرنا، بستر بنانا، یہاں تک کہ چار پائیاں بننا بھی وہ اس کو سکھا چکی تھیں اور وہ اپنے مزاج اور طبیعت کے عین خلاف یہ سب کچھ سیکھ بھی چکی تھیں۔ مگر اس کی زندگی ایک مسلسل جھنجھلاہٹ بن چکی تھی۔ جب بھی وہ تنہا ہوتی اسے اپنی محرومیوں پر کڑھنے اور بچے کا نادر موقع مل جاتا۔ وہ رہ کر اپنے مرے ہوئے ماں باپ کو یاد کرتی جو اگر زندہ ہوتے تو نہ جانے وہ کس ریاست کی شہزادی ہوتی۔

”ہم اکثر زندگی کی حقیقتوں سے فرار حاصل کرنے کے لیے اپنی محرومیوں کی گنتی میں پناہ لینے لگتے ہیں جیسے وہ محرومیاں نہ ہوتیں تو ہماری ٹوپوں میں کئی طرح کے پر لگے ہوتے۔ ایسا کرتے ہوئے ہم یہ نہیں سوچتے کہ یہ بھی ممکن ہے کہ اگر یہ محرومیاں نہ ہوتیں تو ہم کسی اور بہت بڑی مصیبت میں پھنسے ہوتے، دراصل ہمیں کبھی بھی حالت میں خوش رہنا آتا ہی نہیں ہے۔“ اس کی پسندیدہ ترین استاد مسز اعجاز نے اسے ایک بار سمجھایا بھی تھا۔

”اور یہ دیکھو یہ بھی کوئی کام ہے جو یہ مجھ سے کروا رہی ہیں۔“ دھوپ میں سوکھنے کے لیے رکھی سرخ مریچوں کی ڈنڈیاں توڑتے ہوئے اس نے سوچا تھا۔ ”اچھی بھلی بازار میں پیسی ہوئی مریچوں کے پیکٹ مل جاتے ہیں مگر ان کا ہر کام نرالا اور مشقت طلب ہی ہوتا ہے۔“



## تم بن ہے گھر ویران میرا

گھر بھر میں تھی برکتیں تم سے ماں، وہ گھر جو ایک شفیق ماں سے محروم ہو گیا

ہوش سنبھالا تو ایک ایسی شفیق ہستی کو اپنے گرد پایا جس کے رویے نے پیار اور محبت سے آشنا کیا۔ ہستی جو ہمیں ہر بل مضبوطی کا احساس دلاتی تھی ان کے ہونے سے کوئی بھی پریشانی یا غم پاس نہیں پہنچتا تھا۔ ہماری چھوٹی چھوٹی سی خواہشوں اور ہماری ضرورتوں کے حصول میں دن رات ایک کر دیتیں۔ وہ ہمیں میری جان ہستی، میری ماں جس کی چھانٹیں ہمیں غموں کی دھوپ سے بچائے رکھتی تھی، اب وہ ہم میں نہیں۔ وہ ہم سب بہن بھائیوں کی چاہت تھیں۔ اتنی ہی خوش اخلاق، باہمت خاتون صرف اپنے کام سے مطلب رکھتی تھیں۔ ان کا پیار ہی ہم بہن بھائیوں کے لیے مثالی تھا شاید بیان نہ کر سکوں خود تو وہ اس دنیا میں ہی ساری تکلیفیں جھیل گئیں، وہ تکلیفیں دو دھائی مہینے کیسے جھیل گئیں وہ ان کا گرا بڈ سوہ ہوتا ہی ان کا ناسور بن گیا وہ ان کی نظریں جو کبھی نہیں بھول پاؤں گی وہ کچھ نہا بھی چاہتی تھیں تو ان کی آواز نے ان کا ساتھ نہیں دیا ہم پوچھتے بھی کہ کیا تکلیف ہے تو صرف رو دیتی تھیں۔ حسرت بھری نظریں دل دہلا دیتیں۔ جب ہم سے کوئی

”ماہت مرچیں لا کر اچھی طرح دھو کر سکھائی جائیں گی، روزانہ انہیں دھوپ میں بکھیرنا اٹھانا بھی ایک الگ ڈیوٹی بن جاتی ہے اور پھر ان کی ڈیوٹی ان کی یادیں تو ذکر انہیں پھوایا جائے، مکالمے ایک ایسے دور میں جب سہولتیں اور آسائیاں اس قدر میسر ہیں یہ صدیوں پیچھے کی روایت چلا رہی ہیں۔“ وہ اس طرح کے کاموں میں مشغول ہو کر غائب دماغی کی کیفیت کا شکار ہو جاتی تھی۔

”ابھی ہلدی منگو کر اسے بھی ابال کر سکھانا ہے اور پھوانا ہے، سالن کا رنگ خراب ہو جاتا ہے اگر غلط ہو تو۔“ اس کو ایسی سوچ سے چونکا کر ہوش میں لانے والی بھی بواجی ہی ہوتی تھیں۔

”نمک بھی منگوا لیں، وہ بھی دھو کر سکھائیں گے۔“ اس نے جل کر کہا۔

”ہاں بات تو ٹھیک ہے مگر یہ آئیو ڈین والے نمک والی بات دل کو نہ لگتی ہوتی تو ضرور کر لیتی ایسا۔۔۔۔۔“

بے نیازی سے بولیں۔

”دوبندوں کے کھانے میں مسالا پڑتا ہی کتنا ہے مگر اہتمام کس قدر ہے۔“ وہ کڑھ کر سوچتی۔

اور اسی پر بس نہیں وہ اسے سلائی کڑھائی کی ماہر بھی بنانا چاہتی تھیں۔ خود انہوں نے ایک نجی ادارے کے تعاون سے سلائی مرکز بنایا رکھا تھا، جس سے شہر کی کئی خواتین اور بچیاں استفادہ حاصل کر رہی تھیں۔

”میں پڑھائی کروں یا سلائی سیکھوں، میرے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا۔“ ان کی اس فرمائش پر کہ وہ سلائی مرکز سے سلائی سیکھے وہ جھنجھلا کر کہتی تھی۔

”پڑھائی کے وقت پر پڑھائی کرو اور سلائی کے وقت پر سلائی۔ جب چھٹیاں ہوں ان دنوں میں سلائی کڑھائی سیکھا کرو، ہر سب اچھے ہوتے ہیں، ہاتھ میں ہوں تو کام آتے ہیں۔

چھڑ جاتا ہے تو وہ رات چاہے سردی کی ہو چاہے گرمی کی کوجسم کے آر پار ہو جاتی ہے۔ رب نے یہ کائنات اور اس کا تمام حسن ان ہی رشتوں سے بچا رکھا ہے جب یہ رشتے نہ ہوں تو موسموں کی بے رونقی اور روکھے پن کا احساس زیادہ دلاتی ہے۔ یہ موسم پہلے بھی آتے تھے مگر ہمارے والدین کے سبب یہ بہت خوب صورت ہو جاتے تھے۔ آج یہ بد مزہ سی وجہ سے ہیں کہ ان کی یادوں کی جھوک سے لمحے غمگین ہوئے جاتے ہیں اور آنکھیں پُر نم رہتی ہیں۔ وہ منظر کبھی نہ بھولنے والا دھندلا سا گیا ہے، وقت کی چاپ سنانی نہیں دیتی اتنی خاموشی چھائی ہے۔ سات مہینے بیت گئے ماں سے پچھڑے لگتا ہے کہ ابھی دروازہ کھلا گا اور وہ ہنستی مسکراتی سب کو آواز دیتی داخل ہوں گی۔ وہ آخری وقت کافی تکلیف میں ان کا گزرا تھا مگر ہمارے چہرے دیکھتے ہی ان میں حوصلہ پیدا ہو جاتا۔ ہر شخص ہر انسان نے موت کا مزہ چکھنا ہے مگر جب کوئی جان سے زیادہ عزیز ہوتی جدا ہوتی ہے تو درد کا احساس ہمیشہ ہی غم کو ہرا کر دیتا ہے۔ بس اللہ تعالیٰ سے یہی التجا ہے کہ میری ماں کی مغفرت فرما اور ان کی قبر کو جنت کے باغوں میں سے ایک باغ بنادے اور ہم سب سے جو کی اور کوتاہی ان کی زندگی میں رہ گئی وہ دور کرنے کی توفیق عطا فرما، آمین!

مرسلہ: صوفیہ قر، کراچی

”مجھے آپ کی اس تھیوری سے ذرا بھی اتفاق نہیں ہے۔“ وہ کہنا چاہتی تھی مگر کبھی نہیں پائی۔ شدید اختلافات کے باوجود نہ جانے کیوں وہ بواجی کے سامنے بول نہیں پاتی تھی، اپنا تو رعل دکھانے نہیں پاتی تھی۔ ان کی شخصیت کا یہ رعب تھا یا ان کی وہ محبت تھی جو کھلاؤ سونے کا نوالہ اور دیکھو شیر کی نگاہ کے مترادف تھی کے سامنے اس کی زبان گنگ ہو جاتی تھی۔

”اگر تم یہ کام نہ سیکھو گی تو لوگ کہیں گے چراغ تلے اندھیرا والی بات ہے۔ زندگی کا اعتبار کوئی نہیں، آج محل میں بسنے والے لکل گنیا میں رہنے پر مجبور ہو جائیں، بڑے بڑے بادشاہوں پر کڑا وقت آتا رہا ہے، اگر اس بڑے وقت کا تصور ذہن میں ہو تو انسان آپ سے آپ ہی ہر کام سیکھ لیتا ہے، نہ جانے کب کس ہنر کی ضرورت پڑ جائے۔“ وہ رمان سے سمجھاتیں۔

”کبھی اچھی بات نہ سوچے گا میرے بارے میں۔“ وہ کڑھ کر سوچتی۔ ”محل میں تو آج بھی نہیں رہ رہی، آنے والے لکل کے لیے محل نہ سبھی ایک شاندار گھر تو سوچا جا سکتا ہے ناں مگر بواجی۔“ اسے خیال آتا۔ ”ہمیشہ بدترین سوچیں گی میرے لیے، کبھی جو خیر کا کلمہ نکالا ہو میرے لیے انہوں نے اور بے ہنری اور بے سلیقگی کا ہر کڑا انہیں مجھ میں ہی نظر آتا ہے خیر سے حالانکہ کیسی اچھی وہ مس سلیم شیرانی ہیں جو سمجھتی ہیں کہ انگریزی ادب کے بارے میں وسیع معلومات رکھنے والی مجھ ایسی اسٹوڈنٹ انہیں اپنے پورے کیریئر میں نظر نہیں آئی اور مس عظیم کے خیال میں مجھ ایسی ڈیڑا اسکول نے کبھی پیدا نہیں کی۔ میں بواجی کو کیسے سمجھاؤں کہ میرا میدان اور میرا مقام وہ نہیں جو وہ سمجھتی ہیں، میرا مقام اور میرا میدان کچھ اور ہے۔“ وہ اپنے خوابوں کی دنیا میں کھو جاتی۔ جہاں ادب کے بڑے بڑے کردار اس کے منظر ہوتے تھے، وہ ان سے گفتگو کرتی، بحث و مباحثے میں حصہ لیتی



اور خود اپنے آپ کو بھی دنیا کی مشہور ترین ہستیوں میں سے ایک خیال کرتی۔ اس کے بچپن سے ہی اس کا تجربہ ترین مشغلہ تھا، یہ اس کے ساتھ ایک اچھا اتفاق ہوا تھا کہ بواجی نے اسے شہر کے سب سے اچھے اسکول تعلیم دلوائی تھی۔ اسکول کے ماحول اور تربیت نے اس کے اندر موجود پیدائشی اوصاف کو خاطر خواہ جلا بخشی اسے دنیا بھر کی چیزوں کے بارے میں بلا کی معلومات حاصل تھیں۔ اس کا شمار اسکول کی ذہین ترین طالبہ میں ہوتا تھا اور نہ صرف اسکول میں بلکہ گھر میں بھی ان کی رہائشی کالونی کے مکین اس پر رشک کیا کرتے تھے لائق اور محنتی تھی اور ہر گھر میں طاق تھی، ایسی لڑکی بہت سوں کی آئیڈیل قرار دی جاسکتی تھی۔ مگر صرف اسے معلوم تھا کہ وہ ان تمام اوصاف کی مالک ہونے کے باوجود کتنی منفی سوچ کی مالک تھی۔ خود اس نے اپنے آپ کو negative (منفی) اور sadist (یاسیت پسند) کا خطاب دے رکھا تھا۔ اسے خود بھی معلوم تھا کہ اس کے یہ دونوں اوصاف باقی سب خوبیوں پر بھاری تھے اور انہیں ختم کرنے کا ذریعہ بن سکتے تھے۔ وقت وہ خود تری اور خود رچی کا شکار ہو جاتی اس وقت دنیا کی بڑی سے بڑی خوشی بھی اسے اس کیفیت نکالنے میں ناکام ہو سکتی تھی۔ یہ بات اسے بہت بعد میں جا کر معلوم ہوئی تھی کہ ان دونوں خامیوں سے بھی ایک خامی اس کے مزاج کا حصہ تھی بلکہ اس کی شخصیت پر حاوی تھی اور یہ وہ خامی تھی جو آنے والے دنوں میں طور پر اس کی زندگی کا پانسہ پلٹنے والی تھی۔ یہ بھی اسے بہت بعد میں پتا چلا تھا کہ اس خامی کا نام ناشکری تھا۔

☆☆☆

زندگی کے اس دور میں جب ہر نو جوان سائنس اور ٹیکنالوجی کے پیچھے خوار ہو رہا تھا اور فزکس ایڈمنسٹریشن کے میدان یا لینے کے پیچھے پاگل ہوا جا رہا تھا۔ دانیال کو آرٹ میں دلچسپی تھی۔ اس کی ذرا نا بچپن سے ہی بہت اچھی تھی۔ اس کے گھر کے ماحول نے اس کے شوق کو بھادی تھی۔ اس کے ڈیڈ کونٹن مصور میں اچھی خاصی دلچسپی تھی۔ اس کے گھر میں نامور مصوروں کی مشہور پینٹنگز موجود تھیں۔ خود اس کا گھر آرٹ ایک نامور نمونہ محسوس ہوتا تھا، جدید فن تعمیر کا ایک نامور نمونہ، اس کی مٹی کا ذوق بھی بہت اچھا تھا اور یہ وہی تھی جنہوں نے دانیال کے اندر ایک پیدائشی آرٹ کو دریافت کر لیا تھا۔ وہ صرف چھ سال کا تھا جب انہوں بچوں کے ایک آرٹ مقابلے میں اس کی رجسٹریشن کروائی تھی۔ اس نے وہ مقابلہ بہت بڑے مارچن سے جیتا تھا۔ اس کے بعد وہ اسے ہر ایسی جگہ لے جانے لگیں جہاں اس کے فن کو جلا بخشنے جانے کا امکان ہوتا۔ گری چیشیوں میں وہ آرٹ اسکولز کے سرکمپ میں شرکت کرتا اور آرٹ مقابلوں میں حصہ لیتا۔ وہ پیدائشی طور دائیں کے بجائے بائیں ہاتھ پر مضبوط تھا۔ اور جب وہ بائیں ہاتھ سے اپنے سامنے موجود کیوس پر مقابلے کے عنوان سے متعلق تصویر بناتا ہوا لائین کھینچتا تو ایک مکمل مصور معلوم ہوتا۔

”میں تمہیں دنیا کے بڑے آرٹ اداروں میں داخلہ دلواؤں گی۔“ ممی اس کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہتیں وہ خوش ہو جاتا اور آرٹ پڑھنے سے متعلق اس کا ارادہ مضبوط ہو جاتا۔ گریسنٹر کیمبرج کے دوران ان کے ذہن اور سوچ نے اچانک یوٹرن لے لیا۔ اس کی وجہ اس کے بھائی کا فلائنگ کا شوق تھا۔ اس کا بڑا بھائی چارلڈ کا ڈینٹس میں دلچسپی رکھتا تھا اور اس کا ارادہ بیرون ملک جا کر تعلیم حاصل کرنے کا تھا اسے اپنے لیوٹر رزلٹ کا انتظار تھا اور اسی دوران اس نے ایک فلائنگ کلب جو اس نے کر لیا تھا۔ ویک اینڈ پر کبھی گیارہ دانیال کو بھی ساتھ چلنے کی آفر کرتا، اس نے اب تک جو سکھا تھا اسے گھر کے کسی فرد کو دکھانے کا شوق تھا مگر اس میں کسی اور کو فرصت ہی نہیں تھی سو دانیال ایک بار عاصم کا دل رکھنے کو اس کے ساتھ چلا گیا۔ عاصم اپنی تربیت

کے ابتدائی مراحل میں تھا اور اس کا ٹریژر اس پر رشک نہیں لیتا تھا مگر دانیال نے وہاں ان لوگوں کو بھی دیکھا جو تربیت کے آخری مراحل میں تھے یا تربیت حاصل کر چکے تھے۔ وہ زندگی میں کئی بار جہاز کے ذریعے سفر کر چکا تھا، اندرون ملک بھی اور بیرون ملک بھی مگر اس نے کبھی غور نہیں کیا تھا بڑے بڑے پروں والے جس مشینی پر عملے پر بیٹھ کر وہ سمندر پار تک کا سفر کیسے ہوتے گھنٹوں میں کر لیتا تھا اسے اڑانے میں کیا حوصلہ آسکتا تھا۔ اس روز اس نے پہلی بار محسوس کیا تھا کہ اس کام میں کتنا حوصلہ تھا کتنا قہرل تھا۔ وہ پورا دن اس نے فلائنگ کلب میں گزارا تھا اور وہاں موجود لوگوں کی شام تک اس کے بارے میں سختی طو پر ..... یہ رائے تھی کہ عاصم سے بہت پہلے وہ فلائنگ سکھ سکتا تھا اور فلائنگ کلب سے نکلنے سے پہلے وہ اس بات کا قوی ارادہ کر چکا تھا کہ وہ فلائنگ سکھنے کا نہ صرف سکھے گا بلکہ اس کو اپنا کیریئر بھی بنائے گا۔

”کیریئر پلان میں یہ اچانک تبدیلی تمہاری زندگی کا سارا ٹیپو خراب کر سکتی ہے۔“ ممی نے اس کا ارادہ سن کر رائے دی تھی، وہ شاید ایک دم اس کی مخالفت نہیں کرنا چاہتی تھیں۔

”ابھی کیریئر بنانے کا سلسلہ شروع ہی کہاں ہوا ہے؟“ اس نے بے نیازی سے کہا تھا۔ ”آرٹ ایک ایسا ہنر ہے جو پیدائشی موجود ہوتا ہے انسان میں، اسے کوئی ٹھین یا چر انہیں سکھا، اچھا بنانا اور پینٹنگز بنانا میرے ہاتھ کا ہنر ہے، اس میدان میں پیشہ ورانہ تعلیم میرے ہنر کو بہتر بنانے میں مددگار ثابت ہو سکتی ہے مگر اس کے بغیر بھی میں آرٹسٹ تو کہلا ہی سکتا ہوں۔ تاریخ ایسے آرٹسٹوں کے ناموں سے بھری پڑی ہے جنہوں نے پکا سو، مائیکل انجلو، وال گو، ڈاؤنچی، مانے اور پیزارو کی لائف ہسٹریز، تکنیک، کام اور بڑے بڑے کاموں کے بارے میں نہیں پڑھا مگر وہ پھر بھی آرٹسٹ تھے اور ان کے کام کی خوب صورتی کو کوئی جھٹلا نہیں سکتا، یہ وہ میدان ہے جس میں تصویر اتنی اہم نہیں جتنا کہ عملی کام اہم ہے، اس لیے ضروری نہیں کہ اس فیلڈ میں بڑے بڑے فنکار اداروں سے بڑی بڑی ڈگریاں لے کر کام کیا جائے، ان ڈگریوں کے بغیر بھی میرا کام اور میرا ہنر میرا ہی رہے گا۔“ اس نے جواب میں لمبی تقریر جھاڑی تھی۔

”وہ تو ٹھیک ہے مگر یہ میدان بھی ایک ٹھیک ٹھاک کمائی والا پیشہ بن چکا ہے، تم نے دیکھا نہیں اس میں کتنی سی، سی جیتیں نظر آ رہی ہیں۔ پہلے لوگ صرف پینٹرز یا مجسمہ ساز ہوتے تھے اب ہنر کاری بھی فیلڈ آف آرٹ ہے، سنار، کمہار، جولا ہے سب کے کام فیلڈ آف پروفیشنل آرٹ بن چکے ہیں۔ تم اپنے اس پیدائشی فن میں زیادہ نام اور زیادہ پیسہ کماسکتے ہو بہ نسبت اس میدان کے جو تمہارے لیے بالکل نیا ہے اور ایک جذباتی جنون کی شکل میں تمہارے دماغ میں سما گیا ہے۔“ ممی نے اسے سنجیدگی سے سمجھایا تھا۔ شاید ان کی نظروں کے سامنے دنیا بھر کی ان مشہور آرٹ گیلریز کے منظر گھوم رہے تھے جن کی دیواروں پر وہ تصویریں تصور میں اس کا کام بنایا ہو سکتی تھیں۔

”یہ جذباتی جنون نہیں ہے۔“ دانیال نے سنجیدگی سے کہا تھا۔ ”جو کیفیت میرے دل و دماغ پر گزری ہے فلائنگ کلب میں جا کر، وہ جذباتی جنون نہیں ہے۔ بلند یوں پر اڑنے کی خواہش جنون نہیں محسوس ہے۔ اوپر فضا میں وہ کون سا جہان ہے جسے متحر کرنے کی ذمہ داری ہے انسان پر، ہوا کا دوش کیسا ہوتا ہے۔ ہوا کے دوش پر توازن برقرار رکھنے کا عمل کیسا لگتا ہے، آپ یوں سمجھیں کہ میری زندگی کو ایک نیارخ عطا ہو گیا ہے۔ زندگی صرف ایک ہی کام کرنے کے لیے عطا نہیں کی گئی۔ اس کا نکتہ میں کرنے کے لیے بہت سے کام ہیں، انسان کی کامیابی اس بات میں ہے کہ وہ ایک زندگی میں کتنے کام کرتا ہے اور کیسے کرتا ہے۔“



”اوہ آئی ایم سوسری۔“ علیہ کو ان الفاظ کے سننے سے زیادہ تکلیف کبھی کسی بات کے سننے پر نہیں ہوئی تھی۔  
”وہم اب بھی اسی طرح کی تنہائی کا شکار ہو یا رکھ اے دوست بنا لیے ہوئے جو تمہاری تنہائی بانٹ  
سکتے۔“ فہد کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس معصوم اور حالات کی شکار لڑکی کو کس طرح دلا سادے سکتا تھا۔  
”کیا کسی دوست کے پاس اتنا فالتو وقت ہوتا ہے کہ وہ کسی کی تنہائی بانٹنے کے خیال سے اس کے ساتھ لگا  
بیٹھا رہے؟“ علیہ نے لہجے میں طنز تھا یا خود ترسی فہد کی سمجھ میں نہیں آیا مگر اس کا دل دکھی ہو گیا۔

”ہاں ہوتا ہے، بالکل ہوتا ہے۔“ اس نے بے ساختہ کہا۔ ”مثلاً میرے پاس تمہارے لیے بہت وقت  
ہے، تمہاری باتیں سننے کے لیے، تمہاری خوشیاں اور تمہارے دکھ شہزادے کرنے کے لیے اور اپنی باتیں تمہیں سناتے  
کے لیے، میرے پاس بہت وقت ہے یقین کرو۔“

”تم مجھ پر ترس کھا رہے ہو۔“ علیہ کو عجیب سا احساس ہوا۔  
”ہرگز نہیں۔“ وہ فوراً بولا۔ ”ترس کھانے کے لیے یہاں بھی بہت لوگ موجود ہیں، تم سے تعلق دوسرا ہے،  
تمہارے ساتھ تو خود مجھے بھی ایک تعلق قلبی محسوس ہوتا ہے۔ کیا ہم چند سال پرانی دوستی کی مکمل تجدید نہیں کر سکتے؟“  
”ہوں۔“ علیہ نے کچھ دیر تک سوچا۔ ”اما کو یہ بات بالکل پسند نہیں آئے گی۔“

”انہیں بتا کون رہا ہے۔“ فہد نے کہا۔ ”ضروری تو نہیں کہ ہر بات ہر کسی کے ساتھ شہزادے کی جائے۔ مجھے  
معلوم نہیں کہ تم اسے پسند کرو گی یا نہیں اور قبول کرو گی یا نہیں مگر میری پیشکش برقرار رہے گی، تم جب چاہو جس  
وقت چاہو مجھے کال کر سکتی ہو۔ تمہارے لیے میں ہر وقت حاضر ہوں۔“ اس کے لہجے میں خلوص تھا اور اپنے اس  
روئے پر وہ خود بھی حیران ہو رہا تھا۔

”لائو کو لگ شوق کے دوران بھی۔“ علیہ کی آواز میں اچانک ہی مسرت چھلکنے لگی۔  
”وہاں بھی۔“ فہد نے مسکرا کر کہا۔ ”میں کال بلا کر اس کے سن سکتا ہوں، وہاں سے فارغ ہو کر تمہیں کال  
یک کر سکتا ہوں، تم فکر مت کرو تم جہاں بھی جب بھی مجھ سے بات کرنا چاہو گی، میں دستیاب ہوں گا۔“  
علیہ کو محسوس ہوا جیسے اس کی عمر بھر کی تنہائی لمحے بھر میں ختم ہو گئی ہو۔ اسے دوسرا ہٹ کا احساس ہونے لگا۔

”میوزک سنتی ہو آج کل؟“ فہد نے اچانک پوچھا۔  
”ہاں، کبھی کبھار۔“ علیہ نے مختصر جواب دیا۔  
”موسیقی دیکھتی ہو؟“

”بہت کم۔“  
”اسپورٹس دیکھتی ہو، فارمولا ون اور باسکٹ بال، تمہیں علم ہے کیا ہو رہا ہے اسپورٹس کی دنیا میں؟“  
”شاید نہیں۔“

”نیوز چینل تو دیکھتی ہو گی، حالات حاضر پر معلومات کا کیا حال ہے؟“  
”نہ ہونے کے برابر۔“  
”پھر کرتی کیا رہتی ہو؟“

”کچھ نہیں کرتی اور کچھ نہ کرنا بھی آہستہ آہستہ کرتی ہوں۔“  
”اوہو۔“ فہد بے اختیار ہنس دیا۔ ”چلو میں تمہیں چند سی ڈیز بھجواتا ہوں، میوزک اینڈ مودیوز  
بھجوا دوں؟“ اس نے پوچھا۔

”یہ تمہاری عمر کی سوچ ہے اور یہ سوچ ایسی ہی ہونی چاہیے اس لیے میں مخالفت نہیں کروں گی، کچھ عرصے  
بعد ہی تمہیں پتا چل جائے گا کہ زندگی ایک کام کو ڈھنگ سے کرنے کے لیے بھی ناکافی ثابت ہوتی ہے، کچھ عرصے  
سارے کام۔“ ممی نے متاثر ہوئے بغیر کہا۔ ”ٹھیک ہے تم اپنا شوق پورا کر لو، عاصم کر رہا ہے، تم بھی ضرور کرو، فار  
وقت کو استعمال کرنے کا ایک اچھا ذریعہ ہے یہ۔“ ممی نے اس کی بات کو بخیرہ نہیں لیا تھا اور یہ ان کی غلطی تھی۔

☆☆☆

”ارے علیہ تم ابھی تک سوچ بچار ہی میں پڑی رہتی ہو، ارے، ابھی سوچ بچار کی عمر تو گزر گئی اب تمہیں  
پریکٹیکل لائف میں داخل ہو جانا چاہیے۔ کچھ کرو ڈارلنگ زندگی کو ضائع کیوں کر رہی ہو؟“ علیہ کے کانوں  
میں وہ آواز گونج رہی تھی جو آج کل اکثر اس سے مخاطب ہوتی تھی۔

”کیا کروں، میں تمہاری طرح ڈیرنگ (بہادر) نہیں ہوں جو نت نئے تجربے کرتی پھروں۔ میں  
تمہاری طرح شیف کو موسم کا کام کر لوں، آف فہد تم کتنے بہادر ہو، تمہارے دل میں جو آتا ہے کر لیتے ہو  
تمہیں کسی کی کبھی بات کا خوف ہوتا ہے نہ ہی کسی کے مذاق کا۔“ اسے اپنے کبھی بات یاد آئی۔

”ارے تم کون سی صدی میں جی رہی ہو لی بی۔ یہ پروفیشنل ازم کا دور ہے۔ یہ کام پیشہ بن چکا ہے، ہر چیز  
پیسہ یعنی money بن چکا ہے۔ تم نے وہ شہور مقولہ نہیں سنا جو جدید دور کی پیداوار ہے، لوگ کہتے ہیں کہ جہ  
تمہیں ذرا سی فرصت ملے تمہیں چاہیے کہ تم خود کو پیسہ کمانے والی مشین میں تبدیل کر لو۔“ اس نے کہا تھا۔

”ارے یہ ہم سے نہیں ہوتا۔“ علیہ نے بے ساختہ جواب دیا تھا۔ ”پیسہ عملی زندگی کی ایک بڑی حقیر  
ہوتا ہو گا مگر کیونکہ میں ابھی عملی زندگی میں داخل نہیں ہوئی، اس لیے میرے لیے اس کی کوئی اہمیت نہیں۔“  
”تمہارے لیے وقت کی بھی کوئی اہمیت نہیں کیا؟“ دوسری جانب سے پوچھا گیا تھا۔

”وقت بہت اہم چیز ہے۔“ علیہ نے اعتراف کیا۔ ”مگر کیا کریں کہ میرے پاس ہے بہت وافر مقدار  
میں، اس لیے مجھے اس کی بھی کوئی اہمیت محسوس نہیں ہوتی۔“ اسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ یہ ساری باتیں صرف  
اپنے مخاطب کو زچ کرنے کے لیے کر رہی تھی۔

”ارے تمہیں وقت کی اہمیت کا احساس نہیں؟“ دوسری جانب سے حیرت کا شدید اظہار کیا گیا تھا۔  
”مت بتاؤ مجھے یقین نہیں آ رہا۔“

”میرے پاس وقت گزارنے کے لیے کوئی معقول کام نہیں ہے، اس شہر میں مواقع بھی محدود ہیں اور  
مجھے کوئی بھی کام کرنے کی اجازت نہیں دیتیں، پھر میں کیا کروں، میں کچھ کرتی نہیں اس لیے میرے پاس وقت  
بہت ہے اور اسی لیے مجھے وقت کی اہمیت کا احساس نہیں ہوتا بلکہ گزرتے لمحوں کی کتنی سے اکتاہٹ محسوس  
ہے۔“ علیہ نے برملا اعتراف کیا۔

”ڈونٹ ٹیل می علیہ کہ تم ابھی تک اما ما بے بی mama's baby ہی ہو، تم نے اپنا قد کاٹھ نہیں  
ٹکا لا، تم ابھی تک اسی بڑے درخت کے نیچے موجود چھوٹا سایہ ہو جسے اونچا ہونے اور ٹھنڈا پھیلانے کے لیے  
جگہ نہیں ملتی۔“ ایک مرتبہ پھر حیرت کا شدید اظہار کیا گیا۔

”یہ حقیقت ہے فہد۔“ علیہ اعتراف کے موڈ میں تھی۔ ”میری اما ما کو بون سائی پلانٹس  
plants میں بہت دلچسپی ہے، وہ دو دووں کو کاٹ چھانٹ کر چھوٹے پودے بنائے رکھنا پسند کرتی ہیں۔  
بھی ان کا ایک بون سائی پلانٹ ہوں۔“



”تم مجھے بتادو، میں خرید لوں گی۔“

”ٹھیک ہے، ایسے ہی آئی۔“ وہ فوراً مان گیا۔ ”اور میرا کوکنگ شو کیمنٹا میون اور کوکنگ بھی لکھ آرت ہے۔“

”جیسے آنے والے کل میں خاکروبی اور کپڑے دھونا بھی ایک آرٹ بننے والا ہے۔“ علینہ نے مذاقاً کہا۔

”کوئی حرج نہیں اور کوئی پتا نہیں کہ ایسا ہی ہو۔“ وہ سنجیدگی سے بولا۔

”تم سب سرٹیکلس لے لینا ان آرٹس میں، تم یونیک بننے کے شوقین تھے اور تم یونیک بننے کی سڑک پر چڑھنے کے شوق میں کچھ بھی کر سکتے ہو۔“

”جو بھی سمجھ لو، میں تو ایسا ہی ہوں۔“ وہ برامنائے بغیر بولا۔

اور علینہ کو پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ کسی کے برامنانے کے خوف کے بغیر کسی سے مذاق کرنا کیسا لگتا ہے۔

☆☆☆

”ڈیزائننگ کا تعلق صرف ڈیزائننگ سے ہوتا ہے، اس میں کسی دوسرے فیلڈ آف آرٹ کی گنجائش نہیں ہے یہ خود ہی ایک وسیع مضمون ہے۔“ آمنہ نے نیش کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

”چلو اماں کی ایک پریزینٹیشن تو ختم ہوئی کہ میں مٹی کے برتن بنانا سیکھ کر کہا ہوں جیسے کام کرنا شروع کر دوں گی۔“ نیش نے آمنہ کی بات یاد کرتے ہوئے کہا۔ وہ گھر سے آرٹ کی تعلیم حاصل کرنے نکلتی تھی اور

اس کا خیال تھا کہ اسے تصویریں بنانا، پورٹریٹ بنانا، مٹی کے برتن بنانا اور مجسمہ سازی جیسے ہنر سیکھنے کے علاوہ

کتابیں پڑھنا پڑیں گی۔ مگر جب اسے ڈیپارٹمنٹ میں پڑھائے جانے والے مضامین اور ذیلی ڈیپارٹمنٹس کے بارے میں بتایا گیا تو اس کے لیے فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا کہ وہ کیا پڑھے۔

”بی ایف اے پیٹنگ سے بہتر ہے تم ڈیزائننگ میں داخلہ لو۔“ اس کے کالج کی ایک استاد نے اپنے

متن سے اسے صائب مشورہ دیا اور اس نے ڈیزائننگ میں داخلہ لے لیا۔ اب اسے یہ میدان مشکل لگ رہا تھا۔

اگر آمنہ کا ساتھ اسے ملتا تو شاید وہ حوصلہ پار چکی ہوتی۔ آمنہ کی دوستی نے اسے شروع کی بہت سی مشکلات

سے بچا لیا تھا۔ اور جوں جوں وہ کورس کو سمجھنے لگی تھی اس کا پریزیشن حال دل مطمئن ہونے لگا تھا، ذرا سانس لینے کے بعد جس اتفاق نے اسے مزید خوش عطا کی تھی وہ دانیال ابراہیم کا بھی ڈیزائننگ کا طالب علم ہونا تھا۔ اسے

پہلی مرتبہ اپنی ٹیچر کا مشورہ اچھا لگا تھا۔

اس نے گھر میں بیٹھے، پڑھتے ہوئے، کلاس میں لیکچر لیتے ہوئے، راستے میں آتے جاتے کئی بار اپنے

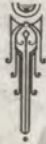
آپ سے یہ سوال کیا تھا کہ دانیال میں اس کی دلچسپی کی وجہ کیا تھی۔ کیا وہ بہت خوش شکل اور امارت تھا؟ اس لیے اس سوال کا جواب

تھا، کیا اس کی شخصیت منفرد تھی؟ اس بات کا جواب یقیناً ”ہاں“ ہوا کرتا تھا۔ پھر وہ اس کھوج میں پڑ جاتی کہ

دانیال ابراہیم میں کیا انفرادیت تھی جو باتوں میں نہیں تھی۔ اس سوال کے کئی جواب اس کے ذہن میں آتے

تھے مگر کوئی جواب بھی بہت زیادہ تسلی بخش نہیں تھا۔ پھر اس نے فیصلہ کیا کہ اس سوال کے جواب کو وہ کچھ عرصہ ملتوی رکھے گی۔ کیونکہ اس سوال کے جواب کے لیے اسے کئی کلوز چاہیے تھے جو اسے مل نہیں پارہے تھے۔ اس نے خود سے یہ سوال کرنا چھوڑ دانیال کی شخصیت کا خاموش جائزہ لیتا شروع کر دیا تھا۔

(جاری ہے)



وہ کھڑکی

سید احمد شیر



”یہ دیکھیں اماں، یہ رہا آپ کا کمرہ۔“ قدیر نے سوٹ پیس رکھتے ہوئے اماں کو پیار سے مخاطب کیا اور کمرے میں ایک گول چکر سا لگا کر گھوم گیا۔ ”ہاں، ہاں بیٹا، تمہارا ہی کمرہ ہے مگر اب تمہیں ”داوی کے ساتھ شہر کرنا پڑے گا۔ سمجھایا تھا ناں آپ



بہوتنی چاہت سے بلاتے بھی رہتے تھے پھر ویرا ملنے ہی وہ امریکا جانے والے جہاز میں بیٹھ گئیں اور گھنٹوں کی مسافت کے بعد اب امریکا کے ایک چھوٹے سے مگر جدید قصبہ ڈین ول جا پہنچیں۔

☆☆☆

بہو بیٹا اور ان کے بچے کمرے سے جا چکے تھے۔ اماں نے خود پہلی بار اس کمرے کا بھرپور جائزہ لیا جہاں اب انہوں نے شاید ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رہنا تھا۔ درمیانے سائز کے کمرے میں دو سنگل بیڈ دیواروں کے ساتھ ساتھ قریب سے لگے ہوئے تھے۔ پوتے کی عمر کے حسب ذوق کی قسم کے پوسٹرز اور تصاویر سے دیواریں مزین تھیں۔ لیکھت اماں کو ایک عجیب سی گھبراہٹ کا احساس ہوا۔

”میں کہاں آگئی ہوں۔“ انہوں نے اپنے آپ سے سوال کیا اور بھاگ کر کمرے کی واحد کھڑکی کا پردہ جلدی سے ہٹانے لگیں۔

”ارے یہ کیا.....؟“ یہ گھر کا کچھوڑا تھا۔ دور دور تک پھیلی ایک خوب صورت سرسبز وادی تھی جس کے آخر میں جنگل شروع ہو جاتا تھا۔ گھر کے ایک طرف آڑوؤں کے درخت تھے جن سے پھل گر کر کر زمین پر ڈھیر ہوتے نظر آرہے تھے۔

”کوئی انہیں کھاتا کیوں نہیں؟“ اماں نے حیرت سے سوچا۔ بڑے سے بیک یارڈ میں لگے پھولوں پر ننھی ننھی شکر خور چڑیاں ہوا میں معلق ہو کر پھولوں سے رس کشید کرتی نظر آرہی تھیں۔

”سبحان اللہ۔“ اماں کے منہ سے خود بہ خود تسبیح جاری ہوگئی۔ ”اللہ نے میرے بیٹے کو کتنے بھاگ لگائے ہیں۔ عالیشان محل نما گھر، دو گاڑیاں، قیمتی ساز و سامان، اچھی بیوی، پیارے پیارے بچے، واقعی انسان کو اور کیا چاہیے۔“ وہ فوراً سجدے میں گر گئیں۔ وضو کر کے دو نفل شکرانے کے ادا کیے اور پھر سے کھڑکی کے نظارے میں کھو گئیں۔ باہر ہوا چلی

مسی مدھار کسی ہیلپر کی ضرورت بڑھتی ہی چلی جا رہی ہے۔

امریکا کی مصروف اور مشینی زندگی میں دونوں میاں بیوی مل کر کھاتے تھے تو گزرا ہوتا تھا مگر آمدنی بھی کم نہ تھی۔ بڑے ہوئے اخراجات کی بنا پر کم ہی بڑنی چلی جا رہی تھی۔ دونوں صبح سویرے ہی جاب پر نکل جاتے اور دن ڈھلے لوٹتے۔ بچوں کو اسکول کے بعد ایک ڈے کینٹر میں جانا پڑتا کیونکہ اکیلے گھر پر بھی نہیں چھوڑا جاسکتا تھا۔ شام کو گھر آ کر کھانا کھانا، برتن دھونا، ویک اینڈ پر لائڈری کرنا، صفائی کرنا کچھ کم کام نہیں تھے۔ کبھی بھارا گر بچوں کو گھر پر رکھنا ہوتا تو بے بی سہر کو بھی اچھے خاصے میسے دینے پڑ جاتے تھے۔ بڑی مشکل ہوتی جا رہی تھی۔

”آخر اماں اب یہاں آ کیوں نہیں جاتیں؟“ کیا مسئلہ ہے ان کا.....؟ وہاں اب ان کا رکھنا ہی کیا ہے۔ ابھی رہے نہیں تو کیا خالی مکان کی دیواروں کو چھاننا ہے؟ ایک روز شہناز غصے سے جھنجھلائی لگی۔ ”کم از کم یہاں آ کر ہمارا ہاتھ تو بٹاسکتی ہیں۔ ہم اکیلے ہی چھتے رہتے ہیں اور پھر انہیں ماہانہ خرچ بھی تو بھیجنا پڑتا ہے۔ ہمارے بھی اب بچے ہیں، اخراجات ہیں انہیں خود ہی خیال کرنا چاہیے۔ آپ سے جدائی کا رونا بھی روتی رہتی ہیں۔ یہاں آ گئیں تو آپ یعنی۔۔۔ ان کا اکلوتا بیٹا ان کی آنکھوں کے سامنے ہوگا۔“ قدرے سن کر خاموشی سے سر جھکا لیا۔ واقعی اس کی ماں کی ضد بہت بے جا اور غیر معقول تھی۔

اب انہیں امریکا آ ہی جانا چاہیے تھا۔ اماں نے یہ بات بھی مان کے نہ دی مگر وہ تو برا ہو سیلاب کا کہہ کر ہی زندگی کی بچی بھی خوشیاں بھی اپنے ساتھ بھا کر لے گیا۔ نہ گھر رہا اور نہ ہی زمینوں کی کاشت سے آنے والی آمدنی۔ وہ سوچ میں پڑ گئیں۔ غیر لوگوں کے بچے میں کیسوں، سڑکوں پر رہنے سے تو بہتر تھا کہ وہ اپنے بیٹے کے ہی پاس چلی جائیں۔ بیٹا اور

بیوی کے ساتھ کمرے سے باہر چلا گیا۔ ”کتنی خوش اور پرسکون لگ رہی تھیں! ہے ناں!“ شہناز نے بچن ٹیبل پر بیٹھے اپنے کے سامنے کافی کالک رکھتے ہوئے کہا۔ ”ہاں، بھی، خوش کیوں نہ ہوں..... آخر اکلوتے بیٹے کے گھر آئی ہیں۔ یہاں ہماری سبیل زندگی دیکھ کر دعائیں ہی تو دے رہی ہوں گی۔“ قدرے فخر یہ انداز میں اپنے گھر کے اندر حصے پر ایک طائرانہ نظر ڈالی۔ اس کے جدید انداز میں تیسرہ طبقہ میں نصب سرمئی اسٹیل کی ایلپسٹر کتنی پروقار دکھائی دے رہی تھی بڑے سے وسیع کاؤنٹر پر دھرے خوب صورت دار فروٹ کی بڑی سی پلٹسٹری سے روشنیاں رہی تھیں۔ کتنا پرفیکٹ اور صاف ستھرا تھا اس کا گھر..... خوب صورت بچن، پُر آسائش باغداد اور اچھی بیوی، پیارے پیارے صحت مند بچے۔ ان کو اور کیا چاہیے ہوتا ہے۔ ایک ماں کی کتنی سواہ وہ بھی پوری ہوگئی۔

اماں تو گاؤں کبھی نہ چھوڑیں مگر برا ہوا سیلاب کا کہ جس میں ان کا گھر تو کیا پورے گاؤں ہی بہہ گیا۔ وہ اکیلی ہی رہتی تھیں۔ اب اس کا پہلے گزر گئے تھے مگر گاؤں میں رہنے والے ان کے رشتے داروں، ملنے جلنے والوں، دوست، احباب وچہ سے انہیں کبھی تنہائی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ شہناز نے کئی بار اماں کو امریکا آنے کی دعوت دی وہ ہر بار ٹال جاتیں۔

”میں نہیں خوش ہوں۔ میری مٹی یہیں کی ہے۔ وہ مجھے کہیں جانے نہ دے گی۔“ اماں ہر بار یہی کہتی تھیں۔

قدر اور شہناز مایوس ہو کر خاموش ہو جاتے۔ کیونکہ اب انہیں اماں کی یاد سے زیادہ اس جھگڑنے ستانا شروع کر دیا تھا کہ ان کی گھر بلو زندگی

کو۔“ انم کی ماں شہناز نے آگے بڑھ کر اپنے بیٹے کے سر پر پیار سے ہاتھ رکھ دیا اور اپنی ساس کا بستر ٹھیک کرنے لگی۔ ”یہ بچے بھی وقت بے وقت کسی بات کر دیتے ہیں۔“ اس نے منہ ہی منہ میں کہا۔ ”ارے، تم لوگوں نے دادی کو سلام تو کیا نہیں، چلو چلو۔“ قدرے اپنی بیٹی علیزبے کے سر پر چپت لگاتے ہوئے کہا۔

”سلام گرینڈ ما۔“ علیزبے آہستہ سے بولی۔ انم نے بھی ایسا ہی کیا اور پھر ماں کے پیچھے جا چھا۔ دادی نے انگریزی لب و لہجہ میں کیے گئے اپنے پوتا، پوتی کے سلام کو بڑے پیار سے قبول کیا اور دونوں کو پیار سے پکڑ کر اپنے سینے سے لگا لیا۔ ”تو تو بیٹا، یہ کوئی سلام نہیں ہے پورا اسلام علیکم کہیے۔۔۔۔ آپ کو پتا ہے ناں کہ ہم لوگ مسلمان ہیں اور ہم پورا اسلام کرتے ہیں۔“ قدرے ہلکی پھلکی سی سرزنش کی تو بچوں نے قدرے بلند آواز میں اسلام علیکم کہا اور پھر کمرے سے باہر بھاگ گئے۔

”اماں جی، آپ کو یہاں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ اب آپ امریکا میں ہیں۔ دنیا کے بہترین ملک میں۔ یہاں کسی بات کی کوئی تنگی نہیں ہے۔ پاکستان کی طرح نہیں کہ بندے کو ہر وقت مصیبتیں ہی پڑی رہیں۔ سچی بات ہے آپ خوش قسمت ہیں کہ آپ کا اتنی آسانی سے ویزا لگ گیا اور آپ یہاں ہمارے پاس آ گئیں۔ ویسے بھی اب آپ وہاں کیسے رہ سکتی تھیں۔“ قدرے پرجوش لہجے میں بولا۔

”ہم تو بڑے خوش ہیں۔ ہماری اماں جی کے آنے سے ہمارے گھر میں بھی برکتیں پھیلیں گی۔“ شہناز نے بھی ساس کو مخاطب کر کے لگاؤ سے کہا۔ قدرے تاہد میں سر ہلا دیا۔

”اچھا چلیں اماں، آپ آرام کر لیں تھک گئی ہوں گی۔ لہجی فلائٹ تھی۔ شام کو چائے پر باتیں ہوں گی۔“ قدرے ماں کو آرام سے بیڈ پر لٹا دیا اور خود



## انفرادی دلکشی اور شخصیت کے نکھار کیلئے



### BREAST DEVELOPING CREAM

ڈولفین بریسٹ ڈویلپنگ کرم میں شامل قدرتی اجزاء نسوانی اہماری کیلئے تہات آرمود ہیں۔ اس کا صرف پندرہ دن کا استعمال کمزور پیشہ کو طاقت فراہم کر کے ان میں جتنی اور جرات میں نمایاں اضافہ کرتا ہے انفرادی دلکشی اور شخصیت کے نکھار کیلئے جتنی ضرورت ہے بے ضرر خواہ مخواہ اور دوشیزاؤں کیلئے یکساں مفید



Rs. 350

تمام ہومیو پیتھ اور یونانی اسٹورز پر دستیاب

**STOKIST**  
Khuwaja Store Saddar Karachi. Tel: 35212257  
Sindh Medical Saddar Karachi. Tel: 35670816  
Ibraheem Sun Mall. Tel: 34502764  
Shabir Brothers Aram Bag. Tel: 32215111  
Usman Bhai Khachi Gali Tel: 32435877  
Central Homoeo Nazimabad. Tel: 36617488  
Abid Homoeo Gulshan Tel: 34821193  
Taha Traders water pump. Tel: 36338065  
Kiran Medical u.p. Tel: 36909909  
German Al noor. Tel: 36366372  
Mohammad Homoeo Maleer. Tel: 34506620  
Irfan Qndri Landi. Tel: 35813919  
Adnan Medical Korangi. Tel: 35049056  
Bismillah Homoeo New Saeedabad. Tel: 32810777  
Murad Homoeo Stadium Road. Tel: 34933664  
Al Habib Zenat Market. Tel: 32720328  
Bilal Homoeo Kherpur. 0301-3436572  
Hassan Medical Larkana. 4043813  
Al-Shahab Homoeo Mervur Khas. 0300-3314450  
Rahool Medical Nawabshah. 2720258  
Noman Homoeo Hyderabad. 2720258  
Maria Dawakhana Hyderabad. 2751798  
Multan Homoeo Multan. 4513805  
Al-Shifa Homoeo Bahawalpur. 2877259  
Tahir Homoeo Rahemyarkhan. 5877170  
Sadaat Traders Quetta. 2830919  
Star Shop Suk. 23553  
Kent Homoeo Lahore. 6317276.

تعمیم کار سادی ٹریڈر فون : 0313-2603241

”دیکھیں نہ ذرا باہر نکل کر تازہ ہوا کھالوں۔“  
”بھئی سی چھل قدمی کروں تو طبیعت ذرا سی بٹاش ہو جائے گی۔“ اماں کے جی میں آئی تو انہوں نے بیرون میں چھل ڈالی اور بیڑھیاں اتر کر نیچے والے حصے میں بیٹھ گئیں۔ ابھی گھروالے سو رہے تھے کسی کو بچا مناسب نہ تھا۔ اس لیے انہوں نے کوشش کر کے گھر کے مین دروازے کا لاک گھمایا اور باہر جانے کے لیے اسے کھول لیا۔

”یہ کیا؟“ دروازے کے کھلتے ہی یوں لگا جیسے کائنات میں صور پھونکا جا رہا ہو۔ چاروں طرف ایک شور مچا ہوا تھا۔ کانوں میں سوراخ کر دینے والی تیز آواز لگتی تھی جیسے کوئی ایبونیٹس قریب المرگ مریض کو لمبے پچھکاڑی ہوئی سڑکوں کے بیچ راستہ بناتی جا رہی ہو یا آگ بجھانے والا انجن گھر میں کھس آیا ہو۔ مردے قبروں سے نکل کر۔۔۔ سڑت روڑے جا رہے ہوں اور قیامت کا اعلان جاری کیا جا چکا ہو۔ اماں کے دیکھتے ہی دیکھتے گھر کے سامنے پولیس کی گاڑیاں ہارن بجاتی جمع ہونا شروع ہو گئیں۔ شور شرابے سے بہو، بیٹا بھی جاگ گئے، وہ بھی رات کے ہی کپڑوں میں اٹھ بیٹھ سیدھے قدموں بھاگتے ہوئے گھر سے باہر آ کر کھڑے ہو گئے۔

”اوہو، اماں جی یہ کیا، کیا آپ نے؟“  
شہناز غصے کو دباتے ہوئے بولی۔  
”کیوں... کیا کیا ہے میں نے؟“ اماں کچھ کچھ نہ سکیں۔

”آپ گھر سے باہر نکل آئی ہیں۔ آپ کو کھانا نہیں چاہیے تھا۔“ وہ بولی۔ اماں سوچ میں پڑ گئیں۔

”یہاں کیا گھر سے باہر قدم نکالنا اتنا بڑا جرم ہے۔ مجھے کیا خبر تھی۔“ وہ حیران ہو کر بیٹے کی طرف دیکھنے لگیں جو پولیس والوں سے گفتگو میں مصروف تھا۔ چند ہی لمحوں میں پولیس والے بیٹے سے ہاتھ ملا

آئی۔ ساری رات کروٹیں بدلتی رہیں حالانکہ بہت آرام دہ تھا۔ پوتا ساتھ والے بیڈ پر سکون سو رہا تھا۔ انہیں اس پر بہت سائیڈ آ یا مگر بیڈ پر اسے جگانا نہیں چاہتی تھیں۔ چاروں طرف خاموشی گھر میں بیٹے، بہو کے قریب ہی ہونے کی کن احساس تھا مگر نیند نے تو گویا نہ آنے کی کھارھی تھی۔

صبح کے پانچ بجے ہوں گے کہ اماں بستر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ وضو کر کے نماز پڑھی۔ ان پوتے نے جتنی جلدانی پر کسمسا کر اوں اوں گھبرا کر جھٹ سے جتنی بند کر دی اور دھیرے دھیرے کھڑکی کا پردہ اٹھا کر باہر جھانکا۔ ایسا لگا جیسے سے پردہ ہٹا کر وہ کوئی خوب صورت کھیل دیکھ رہے ہوں۔ ملگجے اندھیرے سے ایک نئی فوٹیج ہوئی صبح جنم لیتی دکھائی دے رہی تھی۔ چہرے چمک رہے تھیں، نظارے بہک رہے تھے، دھیرے دھیرے کورنش بجاتا پیچھے پیچھے کھٹک تھا۔ اماں کو سورہ رحمان کا خیال آ گیا شاید ایسی خوب صورت وادیوں کے لیے اتاری گئی تھی پیاری سورت مگر پھر یکدم اماں پر اداسی پاد شدت سے حملہ آور ہو گئی۔

”یہ نظارہ خوب صورت سہی مگر میرے گاؤں سبزہ زاروں کا بھلا کہاں مقابلہ کر سکتا ہے۔“  
پر لگے پچیل کی گہری چھاؤں تلے بیٹھ کر جو یہ کہیے کیسے نئے اور دلہوز ہیریں سنایا کرتا ہے۔ کھیلے، پھٹے ہوئے کپڑوں میں لمبوس بنے جو بڑوں میں بھینسوں کے ہمراہ نہاتے کنول کے پھولوں طرح بکھلے نظر آتے ہیں اور یہ امریکا کا خوب صورت ویرانیوں کا مارا ہوا سبزہ زار جہاں نہ بندہ نہ بندے کی ذات۔ کتنا ویران، اجاڑ اور اداس ہے خاموشی کا شور ہے اور جنگل میں ناچتا کوئی نہ ہے۔“ اماں کو سوچوں نے گھیر لیا۔

رہی تھی۔ درخت مستی سے جھوم رہے تھے۔ ہوا میں گرد نام کو بھی نہ تھی۔ دور ایک پہاڑی پر سے جھرتا بہتا نظر آ رہا تھا جس پر اڑتے چند آبی پرندے اپنی رنگ برنگی چونچیں کھولے بار بار نیچے اوپر ہوتے نظر آ رہے تھے۔

”سبحان اللہ۔“ اماں پھر کہہ اٹھیں۔ کھڑکی سے باہر کا منظر انہیں بہت پسند آیا تھا۔ چند گھنٹے لیٹ کر تھکن اتار لینے کے بعد اماں بیڈروم سے نچے اتر کر بچن میں چلی آئیں جہاں ساری کیلی موجود تھی۔ چائے پر خوب کپ شپ ہوئی۔ قدیر نے بھولے بسرے رشتے داروں کے قصے سنے، سیلاب کی تباہ کاریوں پر افسوس کا اظہار کیا اور شہناز نے اماں کو بچن کا بھرپور دورہ کروا کر اس کا مکمل جغرافیہ سمجھایا۔ پیٹرنی میں رکھی گروسری کے خشک آٹمز دکھائے اور یہ بھی بتایا کہ کون سی مٹین کو کیسے چلانا ہے اور کیسے بند کرنا ہے۔ مائیکرو ویو اوون، ڈسپینسریل چولھے، ڈش واش۔۔۔۔۔۔ کس کس قسم کی مٹینیں تھیں اور تو اور کوڑا ڈالنے والا ڈبا بھی بن دبانے سے کھلا اور بند ہوتا تھا۔

”بھلا یہ سب مجھے کیسے آئے گا؟“ اماں کچھ گھبرا سی گئیں۔

”ارے اماں جی، آپ فکر نہ کریں۔ چند ہی دن میں آپ کو سب کچھ آ جائے گا۔ اتنا مشکل کچھ نہیں ہے اماں۔۔۔۔۔۔ یہ امریکا ہے امریکا۔ یہاں تو آسانیاں ہی آسانیاں ہیں۔“ قدیر نے ماں کی ابھن سمجھ کر مسکرا کر ان کی حوصلہ افزائی کرنے کی کوشش کی۔ اماں نے یونہی سر ہلادیا۔ وہ اپنے بچوں کو پریشان نہیں کرنا چاہتی تھیں نہ ہی یہ احساس دلانا چاہتی تھیں کہ وہ شاید کم عقل یا جاہل ہیں لہذا چپکی ہو رہیں۔

ایک تو جگہ کی تبدیلی پھر امریکا اور پاکستان کے وقت کا فرق۔ اماں رات کو لیٹیں تو پھر نیند ہی نہ



سے سراسر کودیکھا۔

”اماں جی، یہاں تو یہ سب کرتا ہی پڑا  
آپ سیکھ لیں گی تو اچھا ہوگا۔“

”نہیں نہیں، اس کی کوئی ضرورت نہیں  
گھر میں ہی رہوں گی۔“ اماں بھی اپنی بات  
رہیں۔ شہناز خاموش رہی۔ مصلحت اسی میں  
جلدی کام پر جانا تھا۔ شہناز، اماں کو  
دینے لگی۔ اس نے بتایا کہ کیسے منجھد گوشت  
سے نکال کر نارمل ٹمپر پچر پر لانا ہے۔ روٹی

لیے آٹا کہاں رکھا ہوتا ہے، چھری کس دروازے  
گی۔ کچن کاؤنٹر کو کس طرح صاف کرتا ہے۔  
فورا اور بائیں اسپرے سے کاغذ کے ٹاول سے  
ہے، گیلانا سفینچ نہیں مارنا کیونکہ اس طرح جراثیم  
طور پر خاتمہ نہیں ہوتا۔ چوھوں کے تاب کو اچھی  
چیک کر کے کھانا ہے جلنے کے بعد بجھنے تک ایک  
بتی جلتی رہے گی۔ ایسے میں چوھے پر کوئی چیز  
رکھنا۔ ایگزاسٹ فین ضرور چلانا ہے وغیرہ وغیرہ  
اماں نے حسب ہدایات پھونک پھونک  
کچن میں کھانا بنانے کی کوشش کی۔ کئی مشینوں  
بنوں کی انہیں سمجھ نہیں آرہی تھی مگر وہ اندازے  
کام کرتی گئیں اور کھانا پکا ہی لیا۔ شام کو بہت  
آئے تو انہوں نے ناک سکواڑ کر فضا میں کچھ  
شروع کر دیا۔

”اماں لگتا ہے آپ ایگزاسٹ فین چلانا  
گئی تھیں، ہے ناں؟“ شہناز نے مسکرا کر پوچھا۔  
اماں کو کوئی جواب نہ سوجھا۔ شہناز لپک کر  
اور فوراً خوشبو دار رنلین موم بتیاں سلگانا  
کردیں۔ چاروں طرف مدھری مہک پھیلنے  
قدیر نے بھی سارے گھر کی کھڑکیاں کھولنا  
کردیں۔ برفانی ہوا کے جھونکوں سے اماں کو  
چھوٹنے لگی۔ اماں کی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کیا  
ہے۔ ان سے کیا خطا ہوگئی ہے۔

کر رخصت ہو گئے اور چاروں طرف خاموشی  
چھا گئی۔ قدیر اماں کی طرف بڑھا، لمبے بھر کور کا اور  
پھر کہنے لگا۔

”اماں جی، دراصل رات کو ہم نے الارم  
سٹم لگایا ہوتا ہے۔ صبح گھر سے باہر جاتے ہوئے  
اسے ڈی کوڈ کرنا ہوتا ہے۔ اگر نہ کریں تو یہ الارم  
پولیس اسٹیشن میں بج اٹھتا ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ  
ہمارے گھر کوئی چور آ گیا ہے۔ اسی لیے وہ فوراً  
دوڑے آتے ہیں۔“

”دوبار غلطی سے بجنے کے بعد پولیس والے  
فائن لگا دیتے ہیں کہ آپ نے خواہ مخواہ پھیرا لگوا دیا۔“  
شہناز نے اماں کی معلومات میں اضافہ کیا۔

”میں نے پولیس والوں سے معذرت کر لی  
ہے اور بتایا ہے کہ آپ ابھی یہاں نئی نئی آئی ہیں اور  
آپ کو اس سٹم کا علم نہیں ہے۔ اب ایسا نہیں  
ہوگا۔“ قدیر نے اندر جانے کا اشارہ کرتے ہوئے  
اماں کو تقریباً دو گھنٹہ لگا کر کہا۔ اماں سر جھکائے خاموشی  
سے اندر کوچل دیں۔

انہیں شدید احساس جرم ہونے لگا۔ انہوں نے  
آتے ہی کتنی بڑی غلطی کر دی تھی۔ بیٹے کے گھر کو  
ڈسٹرب کر دیا تھا۔ پوتا، پوتی بھی انگش میں وادی  
کے بارے میں کچھ کہتے جارہے تھے۔ اماں کو سمجھ نہ  
آنے کے باوجود سمجھ آرہی تھی کہ اُن کے بارے میں  
کیا بات ہو رہی ہے۔ بھلا گھر سے باہر قدم رکھنے  
کے اتنے بڑے نتائج ہو سکتے ہیں انہیں کیا پتا تھا۔

”اماں آپ گھبرائیں نہیں۔ ہم آپ کو  
سکھا دیں گے کہ الارم کیسے ڈی کوڈ کر کے بند کرنا ہے  
پھر آپ آرام سے صبح کی سیر کو چلی جایا کریں گی۔“  
قدیر نے کچھ دیر بعد نرمی سے کہا۔

”نہیں نہیں، مجھے نہیں سیکھنا کچھ بھی۔ میں گھر  
سے باہر قدم رکھوں گی ہی نہیں۔ تم فکر نہ کرو۔“ اماں  
گھبرا کر بولیں۔ شہناز نے پھرائے ہوئے چہرے



بہو جب شام کو تھکے ہارے گھر آتے تو گرم گرم کھانا اور پھلکے ان کا انتظار کر رہے ہوتے۔ مٹی بھر محبت کی اجرت کے عوض انہیں سب کچھ اتنے اچھے طریقے سے ملنے لگا تھا۔ شہناز اور قدیر کو اتنی آسانیاں پا کر زندگی میں کچھ اور مزہ آنے لگا تھا۔ اپنے بچوں کی خوشی دیکھ کر اماں کو بھی کارآمد ہونے کا احساس ہونے لگتا اور وہ بھاگ بھاگ کر کھانا پروٹے لگتیں۔

”دادی رات کو خراٹے بہت لیتی ہیں، میں ڈر جاتا ہوں۔“ ایک بار ان کے ننھے پوتے نے کھانے کی میز پر انکشاف کر کے اماں کو تو پانی پانی کر دیا۔ اسی لمحے اماں نے سوچ لیا کہ وہ بچے کے کمرے میں نہیں لاؤنج کے صوفے پر سویا کریں گی۔ قدیر اور شہناز بھی اماں کے اس فیصلے پر کچھ نہ بولے تو اماں نے سمجھ لیا کہ یہی صحیح فیصلہ تھا اور انہیں اسی پر کاربند رہنا چاہیے۔

”اماں اگر آپ دن میں کبھی بور ہو جائیں یا تنہائی محسوس کریں تو یہ ریڈیو لگا لیا کریں۔ دیکھیں ایف ایم چار سو بیس گیارہ بجے ایک اسلامی پروگرام ہوتا ہے۔ آپ سنیں گی تو آپ کا دل بہلا رہے گا۔“ ایک روز شہناز نے ان پر مہربانی کی اور انہیں ریڈیو پروگرام کے بارے میں بتا دیا۔

”سن راتر ریڈیو یہاں کی گیوفنی میں بہت پاپولر ہے۔ ہم لوگوں کے پاس تو سننے کا ٹائم ہی نہیں ہوتا۔ چلیں آپ ہی سن لیا کریں۔“ اماں نے انٹین کا نمبر نوٹ کر لیا اور اگلے روز گھر خالی پاتے ہی ریڈیو کا ڈائل گھما دیا۔ ابھی گیارہ نہیں دس ہی بجے تھے مگر اماں کو خیال نہیں رہا اور بے چینی سے سوئی کو ادھر ادھر گھمانے لگیں۔

”گڈ مارننگ سننے والو۔ یہ ہے سن راتر ریڈیو کا انڈین پروگرام اور میں ہوں آپ کا ہوسٹ، سنیل شرما۔ آپ اپنی پسند کے گانے سنیں گے اور ہمیں فون بھی کریں۔ یہ ہے ہمارا نمبر۔“ اماں دھیان سے

”اماں... آئندہ سے ذرا احتیاط کیجیے گا۔ کھانا بکاتے وقت کھڑکیاں کھول لیں اور ایگزاسٹ فنن ضرور چلا لیں۔ دراصل ایسا نہ کریں تو سارے گھر میں بسن، بیاز اور اورک کی بو پھیل جاتی ہے پھر بہت برا لگتا ہے۔“ قدیر افریقہ میں چھڑکتا ہوا قریب آ کر سپاٹ انداز میں بولا۔ اماں چونک گئیں۔

”ہیں..... مسالے کی خوشبو اتنی بری چیز ہوتی ہے۔ مجھے بھی پہلے کیوں نہ پتا چلا۔ شاید یہاں ایسا ہی سوچتے ہیں۔“ وہ سوچوں میں ڈوب گئیں۔ یہی کہیں باتوں کا انہیں پتا چل رہا تھا جن کا انہیں کچھ پتا ہی نہ تھا۔ عجب دنیا میں چلی آئی تھیں وہ۔

”اور ہاں اماں جی، صبح جلدی میں کچھ باتیں تو میں بتانا بھول گئی تھی۔ یہ جو کچن رسک میں لگا ہوا ایک ڈھکا ہوا سوراخ ہے ناں۔ اس میں غلطی سے بھی بھی ہاتھ نہ ڈال لیے گا۔ یہ کوڑے کو پیں دینے والا گارجن ڈس پوزل ہے۔ اسے اس بٹن سے آن اور آف کرنا ہے اور اگر کبھی کوئی چیچ اس میں گر گیا تو اس کی موٹر نوٹ بھی سکتی ہے۔ گرم ہنڈیا کو کچن کاؤنٹر پر بغیر کسی میٹ کے نہیں رکھنا کیونکہ کاؤنٹر جل بھی سکتا ہے۔ فرش پر موم پھیرتے وقت کبھی بیچ والا پانی نہیں استعمال کرنا کیونکہ وڈورک کارنگ وروپ خراب بھی ہو سکتا ہے۔“

اماں دن بھر کچن کی دنیا میں جی لگاتیں اور پھر فراغت ملنے پر کھڑکی کے منظر سے ملاقات کرنے چلی جاتیں۔ جنت کے نظارے انہیں بہت بھلے محسوس ہوتے اور وہ ان کے سحر میں کھوئی رہتیں۔ انہوں نے ایک دو بار دیکھا کہ جنگل کے کچھ آوارہ برن اور ہرنیاں بھی سبزہ زار سے اپنا حق لینے کو چلے آتے ہیں تو اماں انہیں دیکھ کر سرشار ہوتی رہتیں۔ کتنی خوب صورتی تھی اس منظر میں مگر ساتھ ہی ویرانی کا احساس ہوتا۔

چند ہفتوں میں اماں کافی کچھ سیکھ گئیں۔ بیٹا،



سرگزشت

شماره مئی 2013ء  
کی جھلکیاں

عقل کل

ماضی بعید کی ایک اہم شخصیت کا زندگی نامہ

غازی

اس پاکستانی جانباز کا قصہ جس نے عالمی شہرت حاصل کی

فكار

ایک پاکستانی مصور کا کمال اس نے فن کا لوہا اک عالم سے منوایا

## گوئی محبت

وہ گونگا تھا مگر محبت کی خاطر اس نے بہت بڑی قربانی دی

اسی کے علاوہ

لہو کی گردش تیز کر دینے والی طویل کہانی سرب، فلمی دنیا کی کہی ان کہی باتیں فلمی الف لیلہ مگر اس بار الگ انداز ہیں، ترکی کی دلچسپ سفر کہانی اور بھی بہت کچھ

بس ایک بار پڑھنے کی دیر ہے آپ خود  
سرگزشت کے گرویدہ ہو جائیں گے

آج ہی نزدیکی بک اسٹال پر اپنا شمارہ مختص کرالیں

، خاص شماره ..... هر شماره، خاص شماره ..... هر شماره، خاص شماره

ماہنامہ پاکیزہ 149 مئی 2013

کسے اور ہی دنیا میں چلی گئیں۔

”گلد... گلد... ویری گلد چوائس، مس  
لیجے سنیں۔“ سنیل شرما چپکنے لگا۔ گانا

شروع ہو گیا اور اماں چوہدری صاحب کے خیالوں میں کھینچیں۔ چوہدری نیاز ان کے بچپن کے ساتھی ان کے چچا زاد تھے۔ وہ دونوں اکٹھے ہی پلے بڑھے، کھیل کودے تھے پھر بڑے ہوتے ہی ان کی شادی کر دی گئی۔ نیاز اکثر ہی یہ گانا سنا کر چھیڑا کرتے تھے تو وہ کتنا شرمایا کرتی تھیں۔ اماں بے

انتظار مسکرانے لگیں اور مسکراتے مسکراتے چپکے سے ستر سے ستر سال کی ہو گئیں۔ کتنا اچھا لگ رہا تھا یہ سب۔ آج تیری مدت کے بعد انہوں نے اسے بیٹے،

ہو، پوتے، پونی کے علاوہ کسی اور سے پاست کی کسی  
ان کی زبان تو باتیں کرنے کو ہی ترس گئی تھی۔ آج  
ایک عرصے بعد کسی نے ان کا نام لیا تھا۔ انہیں اماں  
کے علاوہ کسی اور نام سے پکارا تھا۔ ان کے مرحوم دلبر  
شوہر کی مادیلا دلی تھی۔ اماں ہوا میں اڑنے لگی تھیں۔

گاتا ختم ہوتے ہی ریڈیو پروگرام ختم ہو گیا تو  
اماں کھڑکی کا پردہ سرکا کر حسب معمول سبزہ زار کے  
نظارے سے دل بہلانے کو کرسی ڈال کر بیٹھ گئیں اور  
ماحول کی خوب صورتیوں کو اپنے اندر جذب کرنے

تھیں۔ اچانک انہیں لگا جیسے روز کے معمول کے  
ماحول سے آج کچھ مختلف سامنظر ہے۔ ابھی وہ سوچ  
تھی رہی تھیں کیا.....؟ کہ ان کی نظر ایک انسانی وجود  
پر پڑی جو ساتھ والے مدتوں سے ویران پڑے گھر  
میں سے باہر آ رہا تھا۔

”اے یہ کیا؟ آج یہاں کوئی انسان نظر آ رہا ہے؟ کیا کوئی رہنے لگا ہے اس گھر میں؟“ اماں نے

سفید قام امریکن تھا جو آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ڈاڑھیوں سے گزر کر سر پرش کنارے لگے ڈاک کے ڈبے کی طرف جاتا دکھائی دے رہا تھا۔

میں بیچ تھا مے کھڑکی کے سامنے کرسی ڈال لیتیں  
سبزہ زار کا منظر دیکھ کر دل بہلایا کرتیں۔ اب  
ان کی دنیا اور یہی ان کے معاملات تھے۔

ایک روز انہیں ریڈیو والا سیل شرافہ خانہ کے لیے لائیکو کاٹر لے رہا تھا۔ اماں کے جی جانے کیا آئی ڈرتے ڈرتے نمبر نوٹ کیا۔ آنکھوں پر چھائی اور کال کر دی۔ اتفاق کی بات کہ کال مل گئی تھی اور سیل شرافہ خانہ سے چیت کرنا شروع کر دی۔

”جی میڈم، کال ملانے کا شکریہ۔ بتائیے  
ساگائیاں سنیں گی۔ اچھا سب سے پہلے آپ اپنا نام  
لوکیشن تو بتائیے؟“ جنیل شرماشوخی سے بولا۔

”نام.....“ اماں کو ایک جھکسا سا لگا۔ ان کا  
کیا تھا؟ وہ تو جیسے بھول ہی گئی تھیں۔ انہیں ام  
آئے ہوئے مہینوں ہو گئے تھے مگر کسی نے انہیں  
کے اصلی نام سے نہ پکارا تھا۔ بچے گریڈ ماکتے

”ماسی زبیدہ..... ماسی زبیدہ۔“ یکدم ان کے کانوں میں ان کے ہمسائے مید و کمہار کی بیٹی آواز گونجی۔

”اوہ تو میرا نام زبیدہ ہے۔“ اماں نے اپنی جلدی سے اپنے منہ سے اپنا نام اُگلا جیسے اگر جلدی کی تو وہ نام کہیں گم ہو جائے گا اور وہ اپنا تختہ ڈھونڈتی پھریں گی۔

”تو مس زبیدہ، بتائیں کون سا گانا آپ  
فرمائش پر لگاؤں؟“ سنیل شرماباٹ کو آگے بڑھ کر  
ہوئے بولا۔

”میری فرمائش۔“ اماں تھوک نکلتے ہوئے  
 واپس۔ آج تک ان کی فرمائش یا خواہش تو کسی  
 نے پوچھی ہی نہیں تھی۔ ”وہ والا گانا گادیں بچپن  
 سے سن رہی تھیں۔“

سننے لگیں۔ سنیل شرمانے کسی کی فرمائش پر ایک بہت ہی پرانا گانا گادیا تھا۔

اماں کی رگ رگ میں عجیب سی خوشی اور اداسی سننا نہیں پیدا کرنے لگی۔ یکدم اماں کے کلیجے میں اک ٹیس سی آگئی۔ انہیں یاد آیا۔ ان کے ابا جی تقسیم سے پہلے کسی انگریز سے ایک ریڈیو خرید لائے تھے جو بہت سال ان کے گھر میں رہا تھا۔ اماں اپنے بچپن اور جوانی میں گانوں کی بہت شوقین ہوا کرتی تھیں۔ یہ گانا بھی انہی دنوں کی یادگار تھا۔ پانچ بیعتیں بڑھی اماں کے لیے وہ زمانہ کتنا جادوئی زمانہ تھا۔ آگاہی کے نئے نئے در کھلتے جا رہے تھے۔ وہ اس عہد گزشتہ کو بھی بھلا نہیں سکتی تھیں۔ کیا واقعی میں نے بھی ایسا کوئی زمانہ گزارا بھی ہے؟ اس نئے زمانہ و مکان کے تانے بانے میں ابھی ہوئی اماں کو وہ سب ایک دھندلے خواب کی طرح محسوس ہو رہا تھا۔ انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ کبھی اس دور کے علاوہ بھی کسی دور سے گزری ہیں۔

اٹھیں پروگرام کے بعد اسلامی پروگرام شروع ہوا تو اماں نے اپنے دین کی پیاری پیاری باتیں سنیں۔ اس کے علاوہ مولوی صاحب نے عورتوں کے لیے پردے کے احکامات، وضو، نماز کے فضائل، جھوٹ بولنے پر عذاب الہی کے بارے میں خوب تفصیل سے گفتگو کی جس سے اماں کو اپنے اعمال بہت سیاہ لگنے لگے اور انہوں نے سچے دل سے خدا سے معافی مانگنے کو مصلیٰ نکال کر بچھا لیا۔ اتنا روح پرور پروگرام سن کر اماں کی روح سرشار ہو گئی۔

اب اماں نے اپنا معمول بتالیا تھا۔ صبح کچن میں کام کرتے وقت ریڈیو سنیں۔ کھانا پکاتیں، برتن دھوئیں، صفائی کرتیں تو جان ماری کا اتنا احساس نہ ہوتا۔ پہلے انڈین اور پھر اسلامی پروگرام باقاعدگی سے سنیں تو لگتا بالآخر اب ان کی عاقبت سنو رہی جائے گی۔ دوپہر کو وہ نمازِ ظہر سے فارغ ہو کر ہاتھ

ماہنامہ پاکیزہ 148 مئی 2013ء



”ارے، اسے کیا ہوا ہے؟ لگتا ہے کچھ ہو رہا ہے۔“ اماں کے دیکھتے ہی دیکھتے وہ زمین پر گر کے لوٹنے لگا۔ ڈاک اس کے ہاتھ سے نیچے جا گری۔ اماں بے چین ہو گئیں۔

”بھائی صاحب، بھائی صاحب۔ جیلو..... جیلو۔“ اماں نے کھڑکی کھول کر پوری طاقت سے آواز دی۔ بوڑھے نے ایک نظر اوپر کی طرف دیکھا اور آنکھیں بند کر لیں۔

”اللہ اسے تو کچھ ہو رہا ہے۔ کہیں دل کا دورہ.....“ اماں سوچ کر پریشان ہو گئیں۔ ایک دم اماں کے اندر جیسے بجلی سی بھڑکی۔ وہ یوں اپنی کرسی سے اچھلیں جیسے سولہ سال کی نوجوان لڑکی ہوں اور چھلانگیں مارنی سیزھیاں اترنے لگیں۔ جلدی سے مین دروازہ ان لاک کیا اور تقریباً بھاگتی ہوئی اس اجنبی ہمسائے کی طرف چلے گئیں جس کا انہیں نام تک نہیں معلوم تھا۔ ایسے میں الارم کی پرشور تیز آواز ان کے لیے بالکل بے معنی ہو چکی تھی۔ بوڑھے کے قریب پہنچ کر انہیں سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کریں اور کچھ نہ سوچا تو اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر ملنا شروع کر دیا۔ گاؤں میں اسی طرح بے ہوشوں کی ہتھیلیاں گھس کر انہیں ہوش میں لایا جاتا تھا۔ اماں کو خود ہوش تب آیا جب انہیں تیز تیز آواز کے بارن والی پولیس گاڑیاں اپنے گھر کی جانب آتی سنائی اور دکھائی دیں۔ انہیں ایک دم احساس ہوا کہ وہ کیا کر رہی ہیں، چونک کر خواب سے جاگیں اور اگلے قدموں اپنے گھر میں گھس کر سانس برابر کرنے لگیں۔ پولیس والوں نے کئی بار گھنٹیاں بجائیں مگر اماں نے دروازہ ہی نہ کھولا۔ وہ اپنی رپورٹ لکھتے لکھتے گھر کے ارد گرد چکر لگا کر دیکھنے لگے کہ کہیں کوئی گڑبڑ تو نہیں کہ اچانک ان کی نظر زمین پر گرے ہوئے بوڑھے پر پڑ گئی۔ انہوں نے فوراً فون کر کے ایس۔پولیس منگوائی اور بوڑھے کو اسٹریچر پر ڈال کر غائب

آسمان تارے۔ ”کیا شہزادی کبھی اس جزیرے کی قید سے رہا ہو سکتی؟ مگر اب میں رہا ہو کر جاؤں گی بھی کہاں؟ کھڑکی کا سیلاب میں بہہ گیا ہے۔ اب تو وہاں نئی آبادکاریاں شروع ہو چکی ہوں کی اور پھر یہ تو میرے اپنے من موہنے بیٹے کا گھر ہے۔ اب تو میرا نہیں رہنا بنتا ہے۔“ وہ خود ہی اپنے آپ سے سوال کر کے جواب دے دیتیں اور پھر اپنی معمول کی زندگی میں مصروف ہو جاتیں۔

اب کبھی بھار اماں اور بوڑھے کے درمیان کھڑکی سے ہی جیلو ہائے، یس اور نو کے الفاظ کا تبادلہ ہو جاتا تو اماں کو اچھا لگتا کہ انہوں نے کسی ذی روح سے کم از کم بات تو کی ہے۔ ان کا وجود ہے، وہ ختم نہیں ہوئیں۔ اماں کو ایک آس رہنے لگی تھی وہ ایک بجے کا انتظار کرتی رہتیں۔ سارے دن کی تنہائی میں یہی وہ چند لمحے تھے جب وہ کسی سے ہم کلام ہوتی تھیں پھر اماں کا جی چاہا وہ اس بوڑھے شخص سے بہت ساری باتیں کریں۔ اس سے پوچھیں وہ اکیلا کیوں رہتا ہے۔ اس کے بال بچے کہاں ہیں، وہ کیا کرتا ہے مگر نہ اماں کو ہی اتنی انگریزی آتی تھی اور نہ اس بوڑھے کو اماں کی زبان کا پتا تھا لہذا بات آگے نہ بڑھی۔ کھڑکی کا منظر تبدیل نہ ہو سکا۔ کئی بار اماں کا جی چاہا وہ نیچے اتر جائیں اور اس سے بالمشافہ گفتگو کریں مگر پھر اماں کو یاد آ جاتا کہ جننا جزیروں میں شہزادیاں قید ہوتی ہیں ان کے کھلونے قفل کھولنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ قدم باہر رکھیں تو خطروں کی گھنٹیاں بج اٹھتی ہیں لہذا اماں بس اوپر ہی کھڑکی میں کھڑی مسکرا کر جیلو، ہائے کہہ لینے پر ہی اکتفا کر لیتیں۔

ایک روز ایک عجیب بات ہوئی۔ اماں حسب معمول ایک بجے کھڑکی میں بیٹھی ہمسائے سے جیلو کرنے کے بعد اسے ڈاک نکالتا دیکھ رہی تھیں کہ انہیں لگا جیسے بوڑھا یکدم زمین پر جھکتا ہی چلا گیا۔

کرتیں۔ بس کھڑکی میں بیٹھی باہر کوکتی رہتیں۔ کوہی اپنا دوست کچھ لپٹیں کہ دوست کی ضرورت ایک کو محسوس ہوتی ہے۔

ایک روز نہ جانے کیا ہوا، بوڑھے امریکہ کی نظر سامنے والے گھر کی ایک کھڑکی میں کھڑے ہوئے پر پڑ گئی۔ وہ روایتی دوستانہ امریکی انداز مسکرایا اور ہاتھ ہلا کر زور سے ہائے کہا۔ اماں جیسے کسی پتھو نے ہی کاٹ لیا۔ تڑپ کر کھڑکی پر دے سے علیحدہ ہو گئیں۔ ایسا لگا جیسے اس نے گی کوئی چوری پکڑ لی ہو۔

”ہیں..... کیا میں نا عزم کو چھپ چھپ کر رہی تھی۔ تو بے اللہ مجھے معاف کرنا مگر میں ایسی تو ہوں۔“ وہ بڑبڑائیں۔ انہیں خواہ مخواہ ہی اصرار جرم ہونے لگا۔

موسم آہستہ آہستہ گرم ہو رہا تھا۔ ایک روز نے کھڑکی کو ان لاک کر کے چابی میں سے باہر پڑنے کی کوشش کی تو تازہ ہوا کے فرحت بخش جھونکوں ان کا منہ چوم لیا۔ انہیں بہت اچھا لگا۔ دن پورے ایک بجے تھے۔ بوڑھا اپنے معمول مطابق باہر نکلا اور کوڑا پھیٹ کر ڈاک اٹھنی لگا۔ یکا یک اس کی نظر پھر کھڑکی میں کھڑے ہوئے پر پڑ گئی۔ اس نے پھر سے مسکرا کر ہائے پھر امریکی دستور کے مطابق بولا۔

”اُس اے بیوٹی فل ڈے۔“ اماں بولا گئیں جیسے اس نے موسم کی نہیں ان کے حسن تعریف کردی ہو مگر اب کی بار وہ پیچھے ہٹ کر نہیں بلکہ وہیں کھڑی رہیں اور جواباً اسے بھی ہلا دیا۔ بوڑھا ہاتھ ہلا کر دوبارہ اپنے گھر اندر چلا گیا۔ اماں سوچ میں پڑ گئیں انہیں لگا کہ غیر آباد، ویران جزیرے میں قید ایک تنہا شہزادی جس کے آس پاس کوئی آباد مگر، کوئی زندہ ہستی نہ ہے۔ چاروں طرف گہرا سمندر ہے اور اوپر

”اچھا تو یہ کوئی ہمسایہ ہے مگر یہ پہلے کبھی کیوں نہیں دکھائی دیا شاید نی ہی آیا ہو۔“ اماں سوچنے لگیں۔ ایک لمحے کو تو اماں کو لگا جیسے ان کے منظر میں اس نئے شخص نے شامل ہو کر دخل اندازی کی ہے مگر اماں کو دھیرے دھیرے اس کردار میں دلچسپی پیدا ہونے لگی۔ روزانہ دن کے پورے ایک بجے وہ بوڑھا ڈولتے قدموں سے گھر کے باہر آتا، کوڑے کا ایک بڑا سا بیگ کوڑے دان میں پھینکتا اور پھر ڈاک چیک کر کے واپس گھر کے اندر داخل ہو جاتا۔ اماں کو اسے دیکھتے ہفتے اور پھر مہینے بیت گئے۔ سردی ہو یا گرمی اس شخص کی روٹیں میں بھی کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ اماں نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے بارے میں سوچتی رہتیں۔

”ہائے بے چارہ اکیلا رہتا ہے۔ اس کے گھر والے پتا نہیں کہاں ہیں۔ یہ یہاں کیوں پڑا ہوا ہے۔“ اماں نے یہ بھی دیکھا کہ کھانا ڈلیور کرنے والی ایک گاڑی meals on wheels کے نام سے آتی اور اسے دو وقت کھانا پہنچا کر جاتی ہے پھر ایسا سوچتیں آخر میں بھی تو گاؤں میں اکیلی ہی رہتی تھی مگر وہاں تو کوئی دوست، کوئی رشتہ دار، نوکر چاکر، سودے پھیری والا کوئی نہ کوئی تو ہوتا ہی تھا۔ یہاں تو میل ہا میل کوئی دور تک نظر نہیں آتا۔ اس ویرانے میں یہ اکیلا سارا دن کیا کرتا ہوگا۔ یہ وہ جگہ ہے جس کے بارے میں ہم کہتے تھے چاچے راوی نہ کوئی آوی نہ کوئی جاوی۔ کیسے لوگ ہیں یہاں کے۔ کیسا غیر سادیس ہے۔ اماں بہت باتیں دل میں رکھتیں مگر کسی سے کہہ نہ پاتیں۔

ان کے بیٹا، بہوشام کو تھکے ہارے آتے تو انہیں بس اماں کے ہاتھ کا پکا ہوا لذیذ تازہ کھانا کھانے میں ہی دلچسپی ہوتی۔ ان کے اپنے ہی سو بکھیرے تھے۔ بھی بچوں کی اسکول ایکنی ویٹر، بھی کوئی فنکار یا پارٹی وغیرہ۔ اماں ان سے کیا باتیں



ہسپتال بھجوا دیا۔

اماں یہ سب اندر سے چھپ کر دیکھتی رہیں۔  
یہ سوچ کر خوش ہو گئیں کہ کم از کم بوڑھے کو طبی امداد تو مل جائے گی۔

”آج آپ باہر گئی تھیں؟“ شام کو گھر لوٹنے پر قدیر نے اماں سے پوچھا۔

”نہیں تو“ اماں کارنگ فق ہو گیا اور وہ صاف جھوٹ بول گئیں۔

”اچھا، حیرت ہے پولیس والوں کا فون آیا تھا کہ یہ سیکنڈ ٹائم ہے جب آپ کی طرف سے ہمیں false alarm ملا ہے۔ کئی بات ہے غلطی سے آپ کا ہاتھ کہیں دروازے پر نہیں لگ گیا؟“

قدیر نے کھانا پلیٹ میں ڈالتے ہوئے پوچھا۔

”ارے، ارے دیکھیے یہ نیوز..... یہ کیا دکھا رہے ہیں۔“ شہناز نے اپنے شوہر کی توجہ دینی کی طرف دلاتے ہوئے کہا۔

”یہ تو ہماری اسٹریٹ ہے۔ اوہو..... یہ تو ہمارے ساتھ والے گھر میں ہی رہتا تھا ناں!“ قدیر نے نیوز رپورٹ دیکھتے ہوئے کہا۔

”کیا ہوا ڈیڈ؟“ ننھے انم نے باپ سے سوال کیا۔

”بے چارہ ہمارا امیر تھا ناں جاسن۔ وہ جو پچھلے عرصے پہلے ہی یہاں شفٹ ہوا تھا۔ آج ہارٹ ایک سے مر گیا۔ شکر ہے پولیس یہاں آئی ہوئی تھی وہ اسے اٹھا کر لے گئی ورنہ تو بے چارہ پتا نہیں کب تک یونہی زمین پر مڑ رہتا۔“ قدیر نے تفصیلات بتائیں۔ اماں کے حلق میں نوالہ پھنسنے لگا۔

”بھائی صاحب۔“ ان کے دل سے ایک چیخ نکلی جسے انہوں نے اپنے اندر ہی دبایا پھر یک دم انہیں ایک عجیب سی خوشی کا سا احساس ہوا۔ بوڑھا جاسن اس تنہائی کی قید سے بالآخر چھوٹ گیا تھا۔ کتنا اچھا ہوا تھا۔ ان کا جی چاہا وہ سنیل شرما کے کسی ریڈیو

پروگرام میں کسی چیخل گانے کی دھن پر اٹھ کر سبے ساختہ ناچنے لگیں۔ گھر کی ساری کھڑکیاں دروازے مکمل طور پر کھول دیں تاکہ تازہ ہوا اندر آجائے اور انہیں نہال کر دے۔

”ان بے چارے بوڑھے امریکنوں کا تو یہی انجام ہوتا ہے۔ اکیلے پڑے، گل سڑ کر مر جاتے ہیں۔ ہماری طرح نہیں کہ ہم تو اپنے پیارے بزرگوں کو سینے سے لگا کر رکھتے ہیں، ہر ماں

اماں؟“ قدیر نے اپنی ماں کی طرف پیار بھری نظروں سے دیکھ کر نیا لقمہ لیا۔ آج مٹن پلاؤ بہت زبردست تھا۔ اماں نے پھینکی سی مسکراہٹ سے اس کی طرف دیکھا۔

”بے چارہ بابا، نہ جانے کہاں تھے اس کے گھر والے۔“ شہناز بولی۔ ”ارے ہاں قدیر، وہ میں نے آپ کو بتایا نہیں قریشی صاحب کہہ رہے تھے انہوں نے اپنے ابوآئی کو پاکستان سے بلایا ہے۔ کہتے تھے گھر میں بچوں کے لیے آسانی رہتی ہے۔ اب تو بہت سے انڈین پاکستانی لوگ ایسا ہی کر رہے ہیں۔“

”اچھا مگر قریشی صاحب تو کہہ رہے تھے میرا گھر بہت چھوٹا ہے۔ ان کے والدین رہیں گے کہاں؟“

”مسز قریشی کہہ رہی تھیں اتنا بڑا کیراج خالی پڑا ہے۔ انہیں وہیں سیٹ کر دیں گے۔“ شہناز نے سلا د میں سے کھیر اٹھا کر منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔

”دیے ایک بات ہے قدیر مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا.... بابا جاسن کو لے جانے کے لیے پولیس ہماری گلی میں آئی ہی کیوں جبکہ ہمارا الارم بھی نہیں بجا تھا؟“ شہناز نے کچھ سمجھ میں نہ آنے والے انداز میں کہا اور عجیب عجیب نظروں سے ساس کی طرف دیکھنے لگی۔

۲۷  
واہ

توقیر عاشر



”بھائی صاحب کا فون آیا تھا۔ اس مہینے کی 25 کو ان کی فلائٹ ہے۔ پوچھ رہے تھے کہ کیا مشورہ کیا؟“ نازیہ نے طاہر کی جانب چائے کا کپ بڑھاتے ہوئے کہا۔

”بھئی بات یہ ہے کہ اتنی بڑی آفر قبول کرتے ہوئے مجھے شرم آتی ہے۔“ طاہر نے جواب دیا۔

”اسا کرتے ہیں شام کو ان کی طرف چلتے ہیں، اونٹ کسی کروٹ پیٹھ ہی جائے گا۔“ نازیہ نے



## خوفناک

ایک فقیر نے راستے میں ایک خاتون کو روک کر کہا۔ ”خدا کے لیے آپ مجھے صرف سو روپے دے دیں ورنہ مجھے ایسا خوفناک کام کرنا پڑے گا جس کے خیال سے ہی میری روح کانپ اٹھتی ہے۔“

خاتون نے خوف زدہ ہو کر کہا۔

”میں سو تو کیا دو سو روپے تمہیں دے رہی ہوں مگر پلین میرا پرست مت چھینا۔“

فقیر نے بے پروائی سے کہا۔ ”میں

حرام کی کمائی نہیں کھاتا۔ میں تو محنت مزدوری

جیسے خوفناک کام کی بات کر رہا ہوں۔“

مرسلہ: نور افشاں، شکار پور

میں ملنے چلا آیا۔ دوستوں سے تو آدمی پریشانی بیان کرتا ہی ہے۔ طاہر نے بھی مکان کی فروخت میں غیر معمولی رکاوٹ کا ذکر کیا۔ اس نے پہلے تو مذاق بنایا کہ اس میں جن رہتے ہیں جو بکنے نہیں دیتے لیکن پھر سنجیدگی سے ایک ایسے صاحب کا ذکر کیا جو لوگوں کے مسائل اپنی غیر معمولی دانائی سے حل کرتے ہیں لیکن صرف مشورے کی حد تک۔ ان کے مشورے ایسے صائب ہوتے ہیں کہ اس پر عمل کر کے بہت سے لوگ اپنے مسائل سے نجات پا چکے ہیں اور وہ خود کوئی لوگوں کو ان کے پاس لے جا چکا ہے وہ ایک اسکالر ہیں اور اخبارات میں مضامین وغیرہ لکھتے ہیں۔

”تم کہتے ہو تو چلا جاؤں گا۔“ طاہر نے بے دلی سے کہا اور وہاں جانے کے لیے رضامندی ظاہر کر دی۔

☆☆☆

سرور نے رحمانی صاحب سے وقت لے لیا۔ پوش علاقے کی خوب صورت کٹھنی کے باادب

اسکول، کالج جائے گی اب وہاں کا ماحول پہلے جیسا نہیں رہا، اپنا گھر فروخت کر کے اسی علاقے میں پلاٹ لے کر ڈال لو۔ آہستہ آہستہ تعمیر کرتے رہنا۔ بچوں کی بہتری اسی میں ہے۔“

اس منصوبے میں کوئی جھول نہ تھا۔ پیشکش میں چنے چلوس نے طاہر کو قائل کر ہی لیا۔ جمال بھائی خیر و عافیت کے ساتھ اپنی فیملی کو لے کر کینڈا چلے گئے اب ان دونوں کو اپنا سامان شفٹ کرنا تھا۔ وہ بھی مرحلہ وار اور پورا ہوا۔ جب سامان منتقل کیا جا رہا تھا تو طاہر کو وہ دن بھی یاد آئے جب فرح کے بھائی علی محمد کی بے بعد اس کے جینز کا سامان لے جا رہے تھے اور بدلے میں ایک سناٹا اور وحشت چھوڑ کر جا رہے تھے مگر اب میں اور تب میں کتنا فرق تھا۔ سب کام منصوبے کے مطابق انجام پاتے جا رہے تھے۔ امید تھی کہ مکان بھی جلد فروخت ہو جائے گا مگر..... یہ تو جوئے شیر لانے کے مترادف ثابت ہوا۔

طاہر نے قریبی اسٹیٹ ایجنٹ کو ساری معلومات لکھوا دیں۔ دونوں میاں بیوی آئے دن یہاں کا چکر لگاتے کہ خالی گھر میں کوئی کس کر ہی نہ بیٹھ جائے۔ چونکہ ار بھی نہیں رکھتے کہ آج کل اس کا بھی کچھ بھروسہ نہیں کوئی غیر قانونی کام ہی نہ شروع کر دے۔ اخبارات میں اشتہارات دیے۔ ہر حربہ آزمایا گیا۔ ایسا نہ تھا کہ گاہک نہ ملتا ہو۔ گاہک بہت آتے، پسند بھی کرتے معاملہ بیعانے کے لین دین تک پہنچ جاتا مگر پھر کوئی ایسا انوکھا مسئلہ آٹھ آ جاتا کہ گاہک پچھلی کی طرح ہاتھ سے نکل جاتا۔ آفس سے وقت بے وقت اس کام سے اٹھ کر آنے میں وہاں کا بھی حرج ہو رہا تھا۔ اس ذہنی کوفت سے طاہر اب بڑبڑا ہوا چلا تھا۔ اچانک جانکادوں کی قیتیں گرنا شروع ہو گئیں۔ طاہر نے کم قیمت پر بھی اپنے دل کو

آبادہ کر لیا لیکن بات نہ بنی۔ ایسے میں ایک دن اس کا دوست سرور آفس

یہ طاہر تھا جس کے دکھ سے سب ہی واقف تھے جمال بھائی کو تو اس سے بڑی ہمدردی محسوس ہوتی تھی۔ کزنز اور خاندان کے دیگر افراد کسی غرض یا لاچارگی میں جمال بھائی کے آگے پیچھے پھرتے مگر طاہر کی برابری اور وقار کے ساتھ ملتا۔ جمال بھائی نے ان میں طاہر کے بارے میں مشورہ کیا تو سب ہی نے پسند کیا۔ فکر نازیہ کی تھی کہ کہیں وہ انکار نہ کر دے لیکن شائستہ (جمال بھائی کی بیوی) نے نازیہ سے اس طور پر بات کی کہ وہ بھی راضی ہو گئی اور نازیہ کے دم سے طاہر کا گھر پھر سے آباد ہو گیا۔

چند سال میں نازیہ کو بھی اللہ نے بیٹے اور بیٹی سے نواز دیا اور یوں طاہر کی زندگی پھر سے خوشگوار گئی مگر اب کچھ عرصے سے نازیہ اس رہائش سے مطمئن نہیں تھی۔ اب یہاں کی مقامی آبادی میں غریب طبقے کے افراد کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی، قریبی میدان میں قائم ہونے والے کسی وین کے آخری اسٹاپ پر پھر آٹو ورکشاپس کی ڈھیروں دکانیں مستقبل کا عجیب نقشہ پیش کر رہی تھیں۔ جمال بھائی کی آخری نازیہ کو بڑا سکون محسوس ہو رہا تھا۔ وہ مکان جو نازیہ کے والدین کا گھر تھا۔ جمال بھائی نے اسے فروخت ہونے سے بچانے رکھا تھا جبکہ اپنے بہن اور بھائی شریعت کے مطابق ان کا حصہ دے چکے تھے۔ وراثت کی تقسیم کا بھی کوئی مسئلہ نہ تھا اور گرانے کی انہیں کوئی حاجت بھی نہ تھی لہذا وہ چاہتے تھے کہ ان اس گھر میں رہائش اختیار کر لے۔

☆☆☆

”طاہر میاں! ہمارے اوپر مہربانی کرو ہمارے گھر میں رہو جو تنخواہ چوکیدار کو دیں گے تمہیں ہی دے دیا کریں گے۔“ شائستہ نے جمال بھائی میں کہا اور سب ہی ہنس پڑے۔ اب جمال بھائی بات آگے بڑھائی۔

”تمہارا اسد کل انہی گلیوں میں کھیلے گا۔ یہ

برتن بیٹھے ہوئے کہا۔ حسب وعدہ شام میں وہ جمال بھائی کے پاس بیٹھے تھے۔

مسئلہ یہ تھا کہ نازیہ کے بڑے بھائی جمال کو بہت اچھی جاب کینڈا میں مل گئی تھی اور وہ اپنے اکلوتے بیٹے کی بہتر تعلیم اور مستقبل کے لیے وہاں شفٹ ہونا چاہتے تھے اور چاہتے تھے کہ اپنی چھوٹی بہن نازیہ کو جسے انہوں نے باپ بن کر پالا تھا اپنے گھر میں رہائش کے لیے آمادہ کر لیں۔

جمال بھائی ابھی برس برس روزگار ہوئے ہی تھے کہ ان کے والد دنیا سے رخصت ہو گئے۔ ماں اور چھوٹے بھائی اور بہن کی ذمے داری ایسی محبت سے نبھائی کہ ماں دعائیں دیتے نہ ٹھکتیں۔ یہ دعائیں انہیں معاشی کیا ہر طرح سے خوب مستحکم کرتی چلی گئیں۔ پہلے چھوٹے بھائی کو گھر بار کا کیا بعد میں ماں کے اصرار پر اچھے خاندان کی لڑکی سے شادی بھی ہو گئی مگر بیٹی نازیہ کی خوشی دیکھنے سے پہلے ہی ماں بھی دنیا چھوڑ گئیں۔ اب بھائیوں کو اس ذمے داری کا ہر آن احساس تھا۔ بھائیوں کی مستحکم معاشی حالت کے پیش نظر بہت سے رشتے آتے لیکن ان کی لالچ ان کی گفتگو سے نیچتی اور دونوں بھائی انہیں چلتا کرتے۔

ایسے میں ان کی نظر خاندان کے ہی ایک جوان پر پڑی جو عمر، تعلیم اور روزگار سب ہی میں نازیہ کا ہم پلہ تھا۔ اس کی والدہ دنیا میں نہ تھیں اور والد صاحب کا خیال تھا کہ بھائیوں میں محبت قائم رکھنی ہے تو اپنی، اپنی رہائش الگ ہونی چاہیے۔ اگرچہ وہ والد صاحب کے ساتھ ہی کاروبار میں شامل تھا۔ آمدنی اتنی مقبول تھی کہ درمیانی درجے کی آبادی میں دن یونٹ بنگلا بنالیا تھا۔ والد صاحب نے اس کے سہرے کے پھول کھلائے جو جلد ہی مرجھا گئے۔ میکے کا شدید اصرار اور کچھ خود فرح کی امریکا سیٹ ہونے کی خواہش اتنی بڑھی کہ وہ چند ماہ ہی ساتھ رہ سکی اور پھر ہمیشہ کے لیے اپنے والدین کے پاس چلی گئی۔



ہے۔ اب میں تم سے نظر نہیں ملا سکتا۔“ طاہر نے کہا اور سر تھام کر بیٹھ گیا۔

اس کا خیال تھا کہ نازیہ یہ سن کر بھڑک اٹھے گی مگر وہاں خاموشی تھی۔ نازیہ کے لیے بھی یہ ایک بڑا شاک تھا مگر وہ کچھ دیر کی ذہنی تکفیش کے بعد ایک نتیجے پر پہنچ چکی تھی۔

”میرے بھائی نے آپ کی شرافت کی بنیاد پر آپ کو میرا سا بھی بنایا تھا اس مکان کی بنیاد پر نہیں۔ اللہ مہربان ہے کہ اس نے ہمیں بے گھری کے عذاب سے بچاتے ہوئے پہلے ہی ایک ٹھکانا فراہم کر دیا۔ آپ وعدہ پورا کریں، اللہ بہتری کرے گا۔“ وہ سنجیدگی سے بولی۔

طاہر کے دل سے منوں بوجھ اتر گیا۔ زبان نے تو ساتھ نہ دیا لیکن نازیہ کی ہتھیلی پر گرنے والے دو آنسو سب کچھ کہہ گئے۔

دوسرے دن طاہر اور سرور، فیروز صاحب کے پاس بیٹھے فرح کا حیران کن فیصلہ سن رہے تھے۔ اس نے پیغام دیا تھا کہ آج کل پاکستان کے جو حالات ہیں ان میں کوئی جانکاد بنانا بہت ہی مشکل ہے۔ یہاں میرے شوہر اور بچے ہیں۔ میرا پاکستان آنے کا کوئی ارادہ نہیں۔ طاہر کے بھی بچے ہیں۔ میں یہ مکان طاہر کے بچوں کو گفٹ کرنی ہوں۔ طاہر ان کے سر پرست کی حیثیت سے جس طرح چاہیں اسے استعمال کر سکتے ہیں۔ فرح کی اعلیٰ ظرفی کے اس مظاہرے نے طاہر کے لیے بندگی میں راستہ بنا دیا تھا۔ کسی مشکل میں انسان کا گرفتار ہونا دراصل اللہ کی طرف سے ایک سنگٹل ہوتا ہے کہ اپنے باہمی معاملات درست کر لیے جائیں اس لیے اپنے دل کی بیڑی چارج رکھے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ زندگی کی بھاگ دوڑ میں کوئی خاص سنگٹل آپ سے مٹس ہو جائے اور خدا کے حضور پہنچنے کے بعد تلافی کی کوئی صورت بھی نہ رہے۔



”رحمانی صاحب نے کہا۔ سرور منہ پھاڑے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ معاملہ واضح ہو جانے کے بعد دونوں مصافحہ کر کے اچھے ہوئے۔ گاڑی میں بیٹھ کر دونوں باتیں کرنے لگے۔

”پارا میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ مکان اسے دے دوں تو میں خالی ہاتھ رہ جاؤں گا اور اتنی بڑی دنیا میں فرح کو کہاں ڈھونڈوں؟“ طاہر نے پریشانی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

سرور نے تو اپنے دوست کی مدد کی ٹھان ہی لی تھی۔ اس نے کہا۔ ”نیت ثابت رکھ میرے بھائی۔ دنیا گول و بیچ بن چکی ہے۔ فرح کو ڈھونڈ ہی لیں گے۔ ایسا کر جنہوں نے تمہارا رشتہ لگایا تھا ان سے رابطہ کرو، شاید وہ کچھ بتا سکیں۔ ایسا کرو تم ٹائم لے لو میں خود تمہارے ساتھ چلوں گا۔“

اس ساری جدوجہد میں فیروز صاحب رابطے کا ذریعہ بنے۔ انہوں نے فرح سے امریکا بات کی۔ فرح کے لیے بھی یہ خبر ایک دھماکے سے کم نہ تھی کہ بیٹھے بٹھائے مکان مل رہا تھا جسے وہ اپنا بھی سمجھ ہی نہیں کتنی تھی پھر بھی اس نے سوچنے کے لیے ایک دن مانگا۔

آج جب طاہر گھر پہنچا تو مٹے ہوئے چہرے پر بارہنہ رہے تھے۔ نازیہ جو کئی دن سے محسوس کر رہی تھی آج رہ نہ سکی۔

”یہ سرور بھائی آپ کو روزانہ کہاں لے جاتے ہیں۔ آخر کیا پریشانی ہے؟“ اب طاہر کی ہمت جواب دے گئی اس نے الف سے ی تک ساری صورت حال سامنے رکھ دی۔

”نازیہ جس چیز پر میرا حق نہیں رہا تھا وہ تمہیں دے بیٹھا۔“ رحمانی صاحب کے جو الفاظ اس کے دل پر لگے تھے وہ زبان پر آ گئے۔ ”زبان سے نکلے الفاظ ہوں یا کاغذ کی تحریریں سب پر پہلا گواہ خدا ہوتا

خیال بھی نہ تھا کہ ایسا ہو جائے گا۔ میں نے سادہ سے کاغذ پر لکھ کر دے دیا تھا کوئی باقی دستاویز تو نہیں بنائی تھی۔ اب تو وہ کاغذ بھی کاغذات میں ادھر ادھر ہو گیا۔“ اُٹھے اُٹھے لپکے بولا۔

”پھر حالات بدل گئے۔ تنہی آ جانے سے اسے راستے الگ ہو گئے اور وہ کوئی مطالبہ کیے بغیر گئیں پھر آپ کی شادی ان خاتون سے ہوئی آپ نے یہ مکان انہیں بھی گفٹ کر دیا۔ ایسا ہی تھا نا؟“ رحمانی صاحب نے آگے کا نقشہ کھینچا۔ ”جی ہاں۔“ طاہر نے ٹرے ٹرے سے اس میں کہا۔ مسئلے کا یہ رخ اور زاویہ ایک برس میں ہونے کے ناتے طاہر پر خوب عیاں ہو رہا تھا۔ رحمانی صاحب نے ایک لمبی ہول کی اور کچھ دیر بعد گویا ہوئے۔

”میرا خیال ہے، آپ بہت کچھ سمجھ چکے ہیں۔ مکان کا فروخت نہ ہونا اس بات کی علامت ہے کہ چیز آپ کی ملکیت نہیں۔ ہر وعدے کا پہلا گواہ اللہ تعالیٰ ہوتا ہے۔ چاہے وہ زبانی ہو یا کاغذات پر آپ کی موجودہ بیگم تو اس صورت حال سے لاعلم ہیں اور اسے فروخت کرنے پر آمادہ ہیں اگر آپ کی سابقہ بیگم یہ مکان آپ کو واپس کر دیتی ہیں اور اس میں کوئی دھچکی ظاہر نہیں کرتی تب ہی آپ وعدے کی طرف سے آزاد ہو سکیں گے اور یہ فروخت ہو سکے گا۔“

”اب میں کیا کروں؟“ طاہر نے بڑی چارگی سے پوچھا۔

”ہے تو یہ بڑے دل گروے کا کام لیکن آپ خود دیکھ رہے ہیں کہ ہزار کوشش کے باوجود آپ اسے فروخت نہیں کر پا رہے ہیں۔ اب اللہ تعالیٰ آپ کو وعدے کی پاسداری کا نوش دے رہا ہے۔ آپ خوش نصیب ہیں کہ آپ کو یہ نوش مل رہا ہے ورنہ تو یہاں لوگ بڑے بڑے کام دکھا کر ہونے زندگی گزار جاتے ہیں اور کوئی نوش موصول نہیں

چوکیدار نے انہیں ایک کمرے میں لا بٹھایا۔ چند ہی منٹ بعد درمیانی عمر کے ایک صاحب داخل ہوئے۔ بارش چہرے پر گول توٹی بڑی بھلی معلوم ہو رہی تھی۔ ابتدائی تعارف اور مسئلے کی نوعیت جاننے کے بعد انہوں نے طاہر سے کہا۔

”میں آپ سے بہت سے سوالات کروں گا جیسے ڈاکٹر اپنے مریض سے کرتا ہے۔ آپ ابھن تو محسوس نہیں کریں گے؟“ طاہر کا جواب تو انہیں میں ہی تھا پھر انہوں نے عمر، تعلیم، روزگار، خاندانی پس منظر سب ہی کچھ پوچھ ڈالا پھر شادی کے بارے میں پوچھا۔

”یہ میری دوسری وائف ہیں۔“ طاہر نے بتایا۔ رحمانی صاحب نے سابقہ بیوی کے بارے میں پوچھا کہ وہ اب کہاں ہیں۔ طاہر نے وضاحت کر دی۔

”اب یہ تو مجھے علم نہیں دراصل وہ شادی کے چند ماہ بعد ہی خلع لے کر چلی گئی تھی وہ اپنے والدین کے پاس امریکا سیٹ ہونا چاہتی تھی اور میں اس پوزیشن میں نہیں تھا۔

”کیا آپ موجودہ شادی سے مطمئن ہیں؟“ انہوں نے پوچھا۔

”جی ہاں، بالکل۔“ طاہر نے جواب دیا۔ اب انہوں نے مکان کے سلسلے کے سوالات شروع کیے۔ طاہر نے تمام معلومات دے دیں کہ کاغذات بھی مکمل ہیں۔ کوئی ہاؤس بلڈنگ کالون (قرضہ) بھی نہیں ہے اور وہ اس میں 8 سال رہ چکا ہے۔

”کیا آپ نے یہ مکان کسی کو گفٹ کیا ہے؟“ انہوں نے ایک اور سوال کیا۔

”جی ہاں، میں نے اپنی وائف کو دیا ہے۔“ طاہر نے فوراً کہا۔

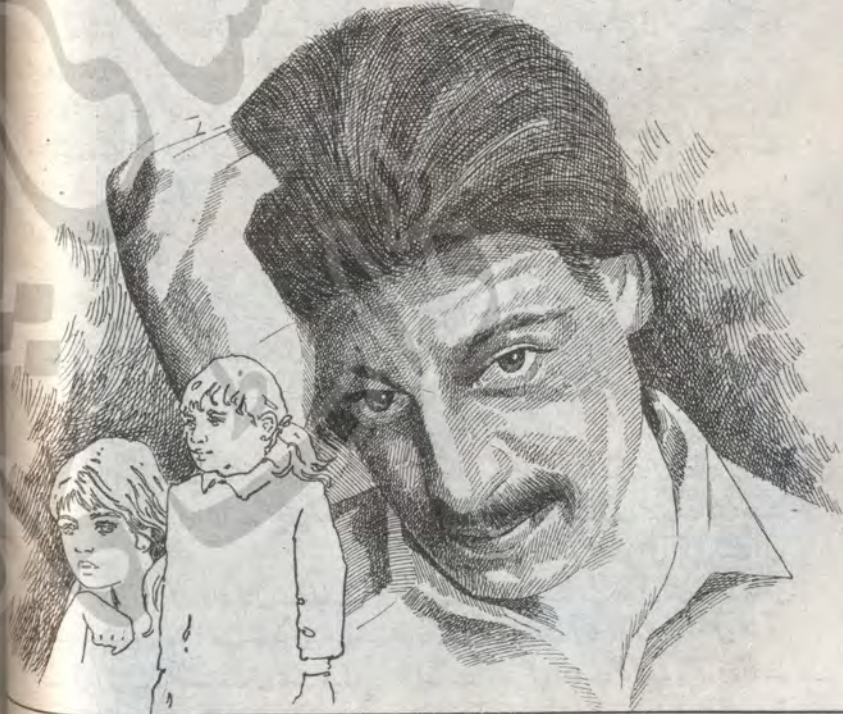
”کون سی وائف کو پہلی یا دوسری؟“ اس سوال پر طاہر شپٹا گیا۔ فوری طور پر کچھ جواب سمجھ میں نہ آیا۔..... کیونکہ اسے بہت کچھ یاد آ گیا تھا۔

”وہ جی میری پہلی شادی تھی، جذباتی سا دور تھا



# آگہی کا ایک جیل

سارہ رضا



بے حد ہز بونگ، شور شرابے اور آپادھانی کے بعد اب خامشی گہرے سناٹے میں تبدیل ہو گئی تھی۔ جو اسے اچانک بری طرح محسوس ہونے لگی، چودہ انچ کے ٹی وی سے نکلتی ہلکی آواز بھی تاثر کو توڑنے میں ناکام رہی تھی، سامنے بیٹھا لیاقت حسین استر شدہ کپڑے، پال جمائے، جوتے چمکانے پس منٹ میں نکلنے والا ہی تھا۔ وہ رات کے سامنے ساتھ پر اٹھا کھاتے ہوئے چائے کے گھونٹ بھی



ماں کو ہمیشہ ذرا ذرا سی بات پر جھکتے دیکھا تھا، غربت بھی سر ڈھکتے تو پیر بننے کے مصداق ہر چیز بس ناپ تول کر اور اس پر یا شگری کا تڑکا اور تو تراخ کی بہار وہ بہت حساس بھی اس شور سے ڈر جاتی۔ دسترخوان پر روٹی کم ہو جاتی تو ہاتھ پیچھے کر لیتی کہ اگر اماں سے اور مائی کو تو وہ دوبارہ تولا جلائے اور مزید روٹی مانگنے پر آگ بگولہ ہو جائے گی۔ وہ خالی پیٹ سو جاتی، پانی پی لیتی۔ اس طرح گھونٹ گھونٹ صبر کر لینے کی عادی ہو گئی بس شور نہ ہو، ہنگامہ نہ ہو بس خامشی اور سکون۔

اس وقت اسے خود پر بے حد رشک آیا جب لیاقت حسین کا رشتہ اس کے لیے آگیا۔ فقط ایک لیاقت اور ایک اس کی اماں بس دو کمروں کا گھر جس میں آئل پیٹ کیا ہوا تھا کریم کلر..... کھڑے ہو کر روٹی پکانے کا چولہا اور برتن دھونے کی جگہ اس کی امی نے نہ جانے کون سے زمانوں کا اکٹھا کیا ہوا اچھا برا سامان اس کے ہمراہ کر دیا۔ وہ دہلی پتلی، اکیس برس کی صاف رنگت والی خوش شکل لڑکی تھی اور پھر اپنے خوابوں کی تعبیر کو پالنے کا نشہ اسے بے حد خوب صورت مستقبل دکھا رہا تھا۔ لیاقت حسین مسکورا سا اسے دیکھتا چلا گیا۔

وہ بیوہ ماں کا اکلوتا بیٹا..... عزیز رشتے دار بس خوشی غمی کے حصے دار تھے۔ غمی..... جب ابا کا انتقال ہوا تو وہ بہت چھوٹا تھا اور خوشی بس اس کی اپنی شادی..... باقی نئے زمانے کے نئے پیسے والے رشتوں کو تھیم اور کلر کی کرنے والے بیوہ ماں کے بیٹے سے دلچسپی بھی کیا ہو سکتی تھی سوا سکول، کالج اور گھر کے بعد اب فقط گھر اور دفتر کے دائرے میں گھومنے والے لیاقت حسین کے لیے یہ نیا رخ بڑا ہی دلچسپ تھا۔ گھر میں مسلسل رہنے کے لیے ایک فرد آگیا تھا۔ کھن کھن اور چھن کی آوازیں تھیں۔ عورت کے لیے شادی حقیقتاً دوسرے جنم کے مانند ہوتی ہے، ہر شے

”ہائے“ اس نے جان بوجھ کر اب کی بار آواز پیدا کی کافی دل دوزی۔ لیاقت حسین چونک گیا تھا، متوجہ ہو گیا تھا۔ عذرا کی آنکھوں میں چمک سی تھی وہ ایک قدم اور آگے بڑھ آئی۔

”ہائے“ وہ ایک بل کو رکھا تھا۔ عذرا کا وجود بھی کان بن گیا۔ اگلے بل وہ بالکل بے تاثر چہرے کے ساتھ بایک پر سوار ہو چکا تھا۔ عذرا دروازہ بند کر کے وہیں زمین پر پھسکڑا مار کر بیٹھ گئی۔

”آئے ہائے..... ہائے“ اب اس کے جسم اور دل سے جھج جھج کی آہیں نکل رہی تھیں وہ ہر چیز سے بے نیاز اب جھولی کے گولے پر ہاتھ رکھے مسک رہی تھی۔

☆☆☆

چودہ سال پہلے جب وہ بیاہ کر اس گھر میں آئی تو کتنا تھا جیسے وہ ہواؤں میں اڑ رہی ہو۔ صبح عید، رات شب برات، دوپہر سحر انگیز۔ وہ سوتے جاگتے خوابوں میں خود کو پانی، یہ خیال تو ہمیشہ سے تھا کہ شادی ہوگی تو زندگی بدل جائے گی..... تکلیفوں اور پریشانیوں سے دور۔ اس نے کبھی محلوں کی رانی بننے کے خواب نہیں بنے تھے بس ایک گھر اچھا سا۔

”میں اپنے شوہر سے بہت محبت کروں گی جب میں اتنی محبت، توجہ اور سلوک دوں گی تو وہ میرے گرد پروانے کی طرح گھوما ہی کریں گے اور اگر اس سسر ہوئے تو انہیں ماں باپ سے بھی زیادہ عزت دوں گی۔ امی ابا کی تو حکم عدولی کر جاتی ہوں، سارے گھر کے کام کروں گی۔ دیوڑ، مندوں سے بہت پیار، عزت سے پیش آؤں گی پھر جب میں اتنی محبت کروں گی تو وہ سب بھی مجھ سے محبت کریں گے۔ بے جا غم نہیں کروں گی۔ سب کا کہا مانوں گی بس مجھے سکون اور عزت سے زندگی گزارنی ہے، بس اللہ رزق کے لیے ہاتھ تنک مت رکھنا۔“ اس نے اپنی

حسین کی ہی سافٹی اور جھانپوں سے بھرا چہرہ، انہر دھنی بے رنگ آنکھیں..... ساری رات کروڑوں بدلنے کے باعث بال برتن دھونے کے تاریکی میں پھیلے تھے۔ دیے، اجڑے نکلے سے اس نے غیر ارادی طور پر انہیں ہاتھ سے سنوارا..... اور یہ لیاقت حسین میری طرف دیکھتا کیوں نہیں وہ پھر اس سوال پریشان ہوئی جو شاید سالوں بعد اسے یاد آیا تھا۔

چوں چوں چڑ چڑ..... چوں..... امر دودھ پیڑ سے چڑیوں کا غول اڑ گیا خاموشی میں آواز غماز ہوئی دونوں کی نظریں ایک ساتھ انہیں لیاقت کے چہرے پر نرمی کے تاثرات آگئے اب وہ کھڑا ہو کر جب چپک کر رہا تھا۔

”میں ایسا کیا کروں کہ یہ.....“ وہ پیشانی مسلنے لگی۔ وہ اونچی چوٹی پر بیٹھی تھی۔

”ارے چو لھا بند کیوں کیا؟“ اس کی بڑبڑاہٹ اونچی تھی وہ حتی الامکان تیزی دکھاتے ہوئے کھڑی ہونے لگی۔

”آہ..... آف..... ہائے“ ایک ہاتھ دیوار پر اور دوسرا گھٹنے پر رکھ کر وہ کھڑی ہوئی اگلے قدم باورچی خانے کا دروازہ تھا لیکن عذرا کے پہنچنے سے پہلے ہی اس نے چو لھا بند کر دیا۔ اب شاید وہ کچھ کے عذرا نے اچھبے سے خیال آرائی کی مگر وہ باہر کی جانب بڑھنے لگا تھا۔ وہ اسے پکارنے، متوجہ کرنے کی کوئی جملہ کہنا چاہتی تھی مگر بہت ہی نہیں ہوئی۔ وہ کھڑی ہوئی تو ایک آواز اور نکلی اب اس طرح اٹھا بیٹا کہاں جاتا تھا مگر بس یہ اچانک اٹھنے والی خواہش، یہ اماں کی غیر موجودگی تھی، پانچویں بیٹوں کا اسکول چلے جاتا یا..... وہ سمجھ نہیں سکی وہ دروازے تک آگئی، زمانے ہوئے اس نے یہ دل رونا چھوڑ دی تھی۔ کوئی جملہ، کوئی بات یا..... یا.....

”بہنزی والے سے بات کر لی ہے، وہ آجائے گا اگر کوئی کی بیٹی ہوگی تو کہہ دینا۔“

رہا تھا اور سارا دھیان خبروں کی طرف تھا۔ نیوز اسکر بھی بول رہی تھی اور چار چار پٹیاں بھی نیچے چل رہی تھیں۔ اس نے دلچسپی سے اسکرین کو دیکھنا چاہا مگر اکتا گئی، یہ سناٹا بار بار اس کا دھیان کھینچ لیتا تھا اور ایسی خاموشی اور تپانج شاید بارہ تیرہ برس بعد ان کی زندگی میں آہی گئی تھی..... اس کے ہونٹوں پر پڑا مردہ سی غیر محسوس مسکراہٹ بل بھر کر کرن بنی۔

یہ ساتھ ہی تو اماں کا تخت تھا جس پر بیٹھی وہ سارا دن خبریں سنتی، سارے گھر پر نگاہ رکھتیں۔ برآمدے میں دروازہ..... اس کی عین سیدھ میں دو کمرے، عقب میں باورچی خانہ، دائیں جانب کھلا صحن اور سامنے کونے میں بیٹھک..... عذرا کو ان کی نظریں بگ باس کا کیمرہ لگتیں، ہر عمل پر ان کی نگاہ ہوتی، کچھ چھپتا ہی نہیں، نہ ہنسا، نہ رونا اور بھلا میں آخری بار کب ملتی تھی؟ اس نے سوچ کے پر پھیلائے پھر نام ہو کر سمیٹ لیے اور آخری بار کب روٹی تھی..... آہ یہ پکلیں تو اب بھی ٹھیک ٹھیک لگتی ہیں۔

”پانی دو۔“

”آں ہاں۔“ وہ لہک کر پانی بوتل میں سے گلاس میں اٹھیلنے لگی، گڑگڑکی آواز سے اسے ابھن سی ہوئی اس نے تھوڑا آگے ہو کر گلاس ذرا سی آواز پیدا کر کے رکھا نہ جانے کیوں بل بھر میں ایک خواہش پیدا ہو گئی کہ وہ لیاقت حسین کو اپنی طرف متوجہ کرے اور وہ کون سا طریقہ ہو سکتا ہے کہ یہ شخص اسے اب ایک نگاہ غلط انداز میں ہی دیکھے صرف کن انکھیوں ہی سے وہ ایسے کس تھہیار سے لیس ہو کر لیاقت حسین چونک پڑے اور.....

”عذرا کیا ہو گیا تجھے؟“ وہ اپنے خیالوں سے چونک پڑی اور خود کو سرزش کی نہ جانے سوچیں کہاں کہاں لے گئیں۔ اب جو حال پر نظر ڈالی تو بس ایک ٹھنڈی بے بس سانس ہی لے پانی۔ گہرے نیلے کاشن کے پلین سوٹ پر کسی اور رنگ کا دوپٹا، جوتی لیاقت



ارے جس چیز کی کمی ہوگی اسی کا دل کرے گا۔ اللہ کا نظام ہے۔“

”اچھا، اچھا۔“ ڈاکٹر کے ہاں سے ٹیکے بھی لگ گئے۔ اماں نے اسے ساتھ لگا کر گرتے بھی سی لیے چھوٹے ٹوپے۔ ہٹا لاسٹک کے چنن والے پاجامے، دلائیاں، تھلائیاں، چادریں، کرتوں پر تارشی بھی کی۔

”بالت بھر کے گرتے پھر دو انچ لمبے پھر چار انچ لمبے ارے یہی اندازہ ہے ہمارا تم بھی دھیان رکھو۔“ کروٹیاں کے جوتے اور سارے کام مکمل ہوئے تو گرتوں کی جگہ پھول دار فراروں کی ضرورت پڑ گئی۔ عذرا کی ہنسی چھوٹ گئی۔

”پہلے بچے کی دفعہ دونوں طرح کے کپڑے بناتے ہیں۔ اب اتنی پیاری سی بیٹی اور یہ گجروں والا کرتہ۔“ نرس کُرتے میں ادھر ادھر ڈھونڈتی پچی کو لہرا کر بولی۔

”ہاں واقعی۔“ عقل رکھتا، دھیان دیا ہوتا تو سارے گھر میں یہ جو قدم قدم چھن چھن ہوتی ہے موند کر لیتی مگر وہی سراسر بے پروا بندہ، عذرانے کبھی خیال ہی نہیں کیا۔ اماں مطلع کرتی جاتیں یہاں تعریف کرنی ہے وہ رٹوٹوٹے کی طرح۔“ جی جی۔“ یہاں ذرا جھاڑ ہو جائے۔“ ہاں بالکل۔“ اماں نے بتا دیا تھا۔

”دہن دوجی سے ہے جو فرمائش کرے پوری کرنی ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ پھر ایک دن بھاگا بھاگا آیا۔

”وہ عذرا پچی مٹی ملتی ہے؟“ وہ پوکھلا نظر دوں میں گھن اور حیرت بھرے اماں کا عندیہ لینے آڈیکا۔

”ارے تو جالا کروے، منہ کیا دیکھ رہا ہے۔“

”اماں مٹی..... آخ.....“

”ارے مٹی میں بھی بہت سے دھامن ہوتے ہیں، بتا رہی ہوں تیرے وہی مانگے جو بچہ چاہے۔“ بولی۔

وہ ماں، بیوی کو خوش اور مگن دیکھ کر پروا مٹا لگتا ورنہ ارد گرد کے قصے سن کر دل ہی دل میں ضرور تھا۔ ساس بہو کی روایتی چپقلش ایک طرف زلفوں کا جال دوسری جانب دودھ کی دھاریں یہاں راوی چھن لکھتا تھا تو ٹھیک ہے ٹھیک ہی ہوگا دراصل لیاقت وہ بندہ تھا جس کی ہر ضرورت اماں نے بنا کے پوری کر دی۔ کپڑے کہنے سے پہلے گئے۔ نئے جوتے کب پہننے ہیں، گھر میں قلعی ہوگی۔ اب سردی کے کپڑے، اب شنبین کا زار ہے۔ اب بخنی چلے گی جو اماں نے کہا تھا ہے۔ اماں کو اس کے لیے جس چیز کی ضرورت ہوئی اس کی خواہش اور کہنے سے پہلے وہ خود آئیں سو جب اماں کو لگا کہ اب بیٹے کو بیوی ضرورت ہے تو بیوی حاضر۔

”اس کی اماں اسے بہت اچھے سے سمجھتی ہیں۔“ وہ خوب خوش ہو ہو کر کہتا پھرتا اور اکثر ماؤں کے اکلوتے بچے دنیا کو پھر ماں کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، ان کے لیے اپنی ماں سے بڑھ کر کون سے کپڑے سوچے سے آگے کچھ ہوتا ہی نہیں ہے اور دھن میں مگن عذرانے کبھی اس پہلو کو سوچا بھی نہیں۔ وہ اچھی لگتی تو تعریف کر دیتا۔ اماں کے کہنے سے چوڑیاں چڑھوانے بازار لے جاتا۔ تعریفی نگاہوں سے بھی دیکھ لیتا اور کبھی یہ بھی ہوتا۔

”اے لیاقت بچے ذرا دیکھ تو دہن اس رنگ میں کیسی بچ رہی ہے؟“ وہ پھر غور کرتا۔

”ہاں واقعی۔“

”اور یہ سبز رنگ بالکل ایسا جوڑا تمہارے لیاقت بار جب لاہور گئے تو لائے مگر انہیں پہنے دیکھنا نصیب کہاں ہوا بس تم آنے والے تھے پھر وہ چلے گئے دہن کے کپڑوں میں پہلا رنگ میں نے یہی لیا۔“

پازیب دیکھتے ہو، ادھ کلوزن کی ہن آئے جس سے پیر میں جاںیں سجادیں۔“ تب لیاقت دیکھتا۔

بدل جاتی ہے۔ گھر، رشتے، لوگ، محلہ، جذبے، خیال، لباس، زپور، بستر اور تکلیف تک سب..... اور عذرانے اس تبدیلی کو بہت آرام سے اپنے اندر اتار لیا تھا۔ مرد کے بستر پر شخص ایک ٹیکے کا اضافہ ہوتا ہے اور عورت کے لیے مانو خابوں کی اربانوں کی نئی راہ گزری بن جاتی ہے۔ وہ ہر روز اس پر سر رکھے کتنے بہت سے خواب اور اربان بن ڈالتی ہے..... اور عذرا تو یوں بھی بے حد محمل مزاج، قناعت پسند لڑکی تھی۔ تھوڑی تھوڑی سی خوشیاں بھی اسے انبار لگتیں۔

یہ سب اچھا بھی تو کتنا لگتا تھا۔ اماں ہر روز اسے صبح شام بناؤ سنکا رے رہنے کی تلقین کرتیں۔ پور پور سجانے کو کہتیں اور وہ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں کے مصداق احکام بحالائی اور جب خدا کی طرف سے اس پر خصوصی نظر کرم ہوگی تو سچ سچ وہ ہواؤں میں اُڑنے لگی۔ پیر پہلے ہی کب زمین سے لگ رہے تھے اب تو اپنا وجود اور بھی ہلکا پھلکا تیرا لگتا۔ وہ اماں کی تمام باتیں بلا چوں، چراں مانتی جاتی۔ دودھ میں زعفران گھول کر پیتی، کچاناریل چبائے جاتی، خربوزہ کلکلو کے حساب سے بناؤ کار، ڈکار جاتی۔ اماں کی خوشیوں کا تو بیان ہی کیا۔ جوانی کی بیوی سننے اور اکلوتے بیٹے کی پرورش کے بعد اب گھر میں ایک اور اضافہ ہونے کو تھا وہ بیٹھے بیٹھے گانے گاتیں، کہانیاں بٹیتیں۔ سردائیں بائیں ہلا کر اپنی گن گن آواز میں کچھ نہ کچھ میں آنے والے قصے گنگنائی ریتیں وہ الجا جاتی۔ ماں کے پیٹ میں بچہ کن کن حالوں سے گزرتا ہے اسے اتنی باریق دیتیں کہ اب کوئی بھی عمل اسے حیران نہ کرتا۔ ہونے والی ہر بات سے اماں اسے پہلے ہی آگاہ کر چکی تھیں۔ ڈاکٹر کے چکر بھی لگ گئے اور اسپتال میں نام بھی لکھوا دیا گیا۔ اس کی اپنی امی اس پر رشک کرتیں کہ خود انہوں نے سارے بچے چھوٹے سے کمرے میں چار پائی کی آڑ لے کر پیدا کر دیے تھے۔ دوسری جانب لیاقت حسین.....!

**پیر نے نوائے حسنہ کارزار**

**پلوٹم پریسٹ ڈولپنگ ایڈوٹائیٹنگ گریج (ہرمل)**

چھوٹی ریسٹ میں اضافہ کر کے ریسٹ کی شوقنا مکمل کرتی ہے

ریسٹ کی نئی کوڈور کے کتنی لانی ہے۔ ریسٹ کو سٹوڈ اور خوبصورت بناتی ہے۔

Rs.250/=

**چہرے کے فاضل بالوں کو ہمیشہ کیلئے ختم کرتی ہے۔**

**گلیسی**

تجربہ جزی بوٹیوں کے ایڈوٹ اور عرقیات سے تیار کردہ۔ بدشادہ و مضمون مباحہ سون کو بھی صاف کر کے نکال کر کرتی ہے۔

051-5502903-5533528

042-7666264

Cell: 0333-5203553, Website: www.devapk.com



وہ بے حد خوف زدہ اور ناامید تھی۔

”ارے اسے اٹھرا ہے مجھے خود خواب میں بشارت ہوئی۔ کیا دیکھتی ہوں کہ یہ اسی تخت پر بیٹھی ہوں پوتا لیے..... ماتھے پر کالا ٹیکا اور سیدھی ٹوپی پہنے آئے ہائے میرے تو پازوؤں میں دم نہیں اسے گود میں بھرنے کو“ وہ آتی جاتی سانس پر اسے کوئے لگیں۔ عذرا کہہ نہ پانی کیسی بشارت۔ وہ تو ایک شائبہ سا تھا محض خیال اور خود اسے خیال آتا۔

”یا اللہ اگر لڑکا تھا تو کم از کم میں دیکھ تو لیتی.....“ اور کبھی سوچتی۔ ”اچھا ہوا پتا ہی نہ چلا۔ جو لڑکی ہوتی تو اماں تو مجھے کھائی جاتیں۔“ زندگی اب گول گھومتا پھیرا ہی گئی تھی۔ صبح سے دوپہر کرو اور دوپہر سے شام۔ ایک عجیب ناامیدی، مایوسی، سرد مہری نے سارے گھر کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ چوٹی بار وہ بے حد کمزور تھی اور بیٹی بھی بے حد لاغر پیدا ہوئی یہ کالی پتلی، پتلے پتلے ہاتھ پیر بس بڑی بڑی حیران آنکھیں۔

”ارے یہ تو لڑکیاں جتنے کی مشین ساتھ لائی ہے۔ ہائے میرا نصیب۔“ اماں دو ہتھ سینے پر مارتیں۔ عذرا منہ چھپا کر رونے کے بجائے بے گنگ وہل روئی۔ تین بیٹیاں اپنی زیادہ نہیں تھیں جتنا کہ اس پر دباؤ تھا۔ ذہنی، جسمانی، جذباتی، نفسیاتی، اخلاقی اور معاشرتی..... وہ پھوٹ پھوٹ کر روئی اور پھر ایک نئے عزم سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ نمازوں میں اور باقاعدگی آگئی۔ اس نے مولوی صاحب کے تین چار تعویذ بھی گلے، بازو اور کمر سے باندھ لیے۔ کسی نے بتایا کہ صبح تہجد کے وقت سورۃ بقرہ پڑھو پھر پانی پر پھونک مار کر دعا مانگو پتا بات کیے نماز پڑھو اور سوجاؤ اس نے عمل کیا۔ گیارہ جمعراتوں تک سورۃ یٰسین پڑھی۔ منت بھی مان لی۔ اماں بھی اس بار پہلی بار کی طرح سرگرم تھیں ان کے اپنے وظیفے اور تعویذ تھے۔ وہ خود بھی بے حد امید بلکہ پریقین تھی۔ لیاقت

وہ سہا ہی اچھا ہولیاقت ہم ان دو بیٹیوں پر گزارہ کر لیں۔ انہی کی اچھی تعلیم و تربیت، گھر شادی وغیرہ.....“ اس نے شوہر سے زیادہ خود کو سنبھالتا جاہا۔

”نہیں، ایک بیٹا تو ضرور ہونا چاہیے۔“ وہ قطعیت سے بولا۔ اس کی زبان ٹھنک رہی تھی۔ ”ہونا تو چاہیے مگر کیا گارنٹی ہے کہ بیٹا ضرور ہوگا اور بیٹے کے چکر میں بچوں کی لائن نہ لگا دیں۔ میرے خیال میں ہمیں کچھ منصوبہ.....“ اس نے ہمت نہ ہاری وہ لیٹے سے اٹھ بیٹھا۔

”تم تو دو رہی گھر آگئی ہو، میری اولاد ہے میں پاؤں کا تھپیں تو گھر سے نکل کر کمانے کو نہیں کہہ رہا اور یہ بنیاں تمہیں کون بڑھاتا ہے؟ اماں نے سن لیا مال تو..... اور یہ فیصلہ مجھے کرنا ہے کہ میرے کتنے بچے ہوں گے، ہمارے خاندان کی نسل چلتی ہے، تم سے نہیں ہوتا یہ کام تو صاف بات بتاؤ۔“ وہ بالکل ہتھے سے اکھڑ گیا۔

”میرا یہ مطلب نہیں تھا دراصل.....“ وہ منمنائی۔ ”خدا سے دعا کرو، نماز تم عید، رمضان پڑھتی ہو۔ بس اماں کے وظیفے ہی ہیں۔“ وہ طعنے دینے پر آگیا کڑوا ہونے لگا خود کا حال یاد نہ کیا، سحری میں نیند کا بوجھ، مغرب میں کھائے کا بوجھ اور بیٹا تو بس صرف ایک اسی کی دعا سے ہونا تھا۔

”چلو ٹھیک ہے۔“ وہ ذرا باقاعدہ ہو گئی۔ اب خدا سے مانگنے لگی۔

”اے، ہاں ناں، اماں نے اور سب نے بھی کہا تھا سارے چلن لڑکوں والے ہیں پھر یہ لڑکی.....“

☆ ☆ ☆

اور اگلی مرتبہ پہلے وہ اماں کے کہنے سننے کرتی رہی تھی اب اس کے اپنے دل میں بھی خواب تھی۔ لیاقت بھی مکمل پریقین تھا وہ بھی چھوٹے کمرے لیے اسپتال پہنچ گئی اور واپس بھی بنی بیٹی لیے آگئی۔ اس دن گھر پر گہرا سناٹا تھا لیاقت، اماں کا چہرہ دیکھ دیکھ ویسے ہی تاثرات کر لیتا۔ تھوڑا غصہ، افسوس، ناامیدی، بے بسی پھر دوبارہ غصہ۔ وہ چھوٹے منہ سے بڑبڑاتی رہی۔ ادھر ادھر گھومتی پھرتی تھیں اور خود عذرا..... وہ عجیب سی کیفیت کا شکار تھی۔ جن میں سب سے حادہ شرمندگی کی کیفیت تھی۔ اسے بے حد شرم آ رہی تھی۔ سب کو مایوسی سے دوچار کرنے پر اسے اپنا آپ گھر وار لگ رہا تھا۔ وہ ان سے نظریں ملانے سے قاصر تھی۔ منہ پر ہاتھ رکھے وہ کمرے کے بل لٹ رہی۔ دادی اماں نے بچی کو بھی سنبھالا اور گھر بھی دیکھا۔ لیاقت دو سال کی اس کو لیے ادھر ادھر پھرتا رہا۔ بارہ چند روز بعد اس نے انجکشن لگوانے کے روز خود ہی بچی کو ادھر لے کر دیا اور پھر یہ لڑکی نظام ہے کہ آنے والا بچہ اپنی جگہ بنا کر انگوٹھی میں ٹکینے کی طرح فٹ ہو جاتا ہے۔ سو زندگی معمول آگئی۔ اماں اب اکثر آہ بھرتیں، لیاقت وہی کون کے بتل کی طرح آنکھوں پر بیٹی باندھے گول گول گھومتا رہتا۔ پھر دن پردن گزرتے دنوں بچپن نے اپنی موہنی صورتوں، دل ربا باتوں، چنچل اداؤں اور مصدومیت سے بیٹیوں کو گرویدہ کر لیا۔ زندگی گئی ہو گئی مگر بس وہ ایک شاخ نہال دل..... جب ذرا دھیان آتا وہ ہاتھ روک کر ساکت ہو جاتا ارد گرد ایک بار پھر آگے..... وہ زبان دانتوں سے داب لیتی۔

”ارے ہمارے ہاں تو پہلا لڑکا ہی ہوا ہے بھلے تم کتنی کروالو۔“ اماں کی آواز میں ایسنا زیادہ تھا۔ ”ارے اماں یہ کوئی رقم و رواج کا حساب نہیں ہے۔ اللہ کا حکم..... بچہ یا بچی بس تیسری جنس نہ ہو۔ اتنے بچے پیدا کروادیے ہیں میں نے اب تو کتنے بیٹیوں بھی تو کچھ یاد نہیں مگر خدا سے دعا ہے بس تیسری جنس میرے ہاتھوں نہ ہو تم ناخوش ہو کیا؟“ ڈاکٹر نے ناگواری سے اماں کے حیران چہرے کو دیکھا۔

”نن، جی..... بس وہ.....“ اماں سے بات نہ بن سکی۔ عذرا وارڈ میں شفٹ ہوئی تو لیاقت حسین آگیا بے حد اشتیاق سے بچی کو دیکھا۔ دودھ ملے زعفران اور کچے ناریل نے اثر دکھایا ہی تھا اس کے چہرے میں شائبہ تلاش کرنا مشکل تھا تاہم گہری بھوئیں عذرا کی طرح تھیں۔ اس نے بے اختیار اپنے ہونٹ اس کی پیشانی پر رکھ دیے تب ہی اماں کے منے چہرے پر نگاہ پڑی۔

”کک..... کیا ہوا اماں؟“

”کچھ نہیں۔“ وہ بسوری بیٹھی تھیں۔

”خیریت تو ہے ناں؟“ وہ اُن تک چلا گیا۔

”ارے ہاں، خیریت ہی ہے۔“

”پھر اتنی اداس کیوں لگ رہی ہیں اور یہ اپنی پوتی دیکھی آپ نے۔ ارے ہاں اماں آپ نے تو کہا تھا پوتا ہوگا پھر یہ.....؟“ اسے جیسے یاد آیا اور خدا کا شکر ہوش و حواس قائم تھے ورنہ انداز یوں تھا کہ زمین پر گر کر کہتا یہ کیا ہے پھر؟

”وہی تو۔“ اماں نے تیزی سے ماتھے پر چھیلی ماری۔ ”پتا نہیں کہاں سے حالانکہ میرا اندازہ کبھی غلط نہیں ہوا، یہ تو پہلا پاؤں سیدھا ہی اٹھاتی تھی اور ساری نشانیاں بھی بیٹے والی تھیں۔“ وہ بے حد تاسف سے کہہ رہی تھیں۔ لیاقت کی لیاقت بھی دھری رہ گئی۔ اس نے بچی کو ہتھیلی سے عذرا کے پہلو میں ڈال دیا۔ اب کے عذرا بھی چوکی۔







چہرے اور بے تاثر آنکھوں سے نظریں چرائے اپنے دائرے میں گھومتی رہتی تھیں۔ باپ کا شبیہ انداز حال چال کبھی بکھار کی مسکراہٹ..... نہ غصہ نہ پیار کا والہانہ بین..... وہ کبھی باپ کے کندھوں کو گھوڑا بنائے نہیں چڑھیں۔ نہ کبھی ماں کی گود میں چھپ کر لاؤ جٹائے بس ابا، بس اماں نہ دادی کی گرم خوشبودار آغوش کا ذائقہ کچھا ہاں گرم کڑوی آگ برساتی نگاہیں ہمہ وقت نگران رہتی تھیں۔ وہ ان رویوں کو کچھ بھی نا سنجھی کے عالم میں جیتی جاتی تھیں۔

☆☆☆

اماں کے سگے تایا زاد بھائی حیدر آباد میں انتقال کر گئے اور بیوہ بھانج سگی پھوپھی زاد بھی تھی سوا ماں روئی بیٹی جنازے پر پہنچیں۔ لیاقت حسین جنازے کے بعد واپس آگئے اور اماں دوسوں کے بعد آنے کا کہہ گئیں، چودہ سالہ شادی شدہ زندگی میں ایسا طویل تہاوت پہلی بار آیا تھا مگر اب خواہش کے تھی۔ وہ خود سے سب سے بے پروا اپنے دائرے میں گھومتی، کھاتی، پیتی، سوتی جاگتی اور بس وقت گزاری، نہ روانہ دعا اللہ سے ناراضی تو بہت پرانی بات ہو گئی تھی۔ اب کی بار کسی اسپتال کا منہ بھی نہ دیکھا۔

”جب مرنے لگوں گی اور ٹائم پڑ جائے گا تو جہاں مرضی جی چاہے لیتے پھریں۔“ اس نے بڑی جیسی سے سوچا تھا۔ زندگی گزار دی ایک فضول سی طلب کے پیچھے! اس نے خود کو ڈپٹا۔ ”جیسے مسلسل امتحان کسی اور طرف دھیان دیتی تو کچھ نہ کچھ کر ہی جاتی..... اب سوائے تاسف کے کیا ملتا پتا نہیں نتیجہ کیا ہوگا اور یہ آئے دن لوگوں کے بچے گرتے ہیں یہاں نہ کچھ کھاتے ہیں نہ پیتے ہیں اور بچہ ہاتھ میں۔“ وہ اذیت کی انتہا پر پہنچ کر ناشکری پر اتر آئی۔ ”وکیل صاحب کی بہو کے چار بار حمل ضائع ہو گئے ادھر ایسا بھی کچھ نہیں اور شاید اماں ٹھیک کہتی ہیں مجھے اٹھرا ہی ہوگا۔“ مایوسی کے اندھیرے میں انسان کو یوں بھی ہر

چمکتی چیز روشنی کی کرن لگتی ہے۔ صحیح غلط اور غلط تو بات یہ ہوئی عذرا بی بی کہ سو ہاتھ سرے پر گانٹھ اب کی بار بھی تم لڑکی ہی بنو گی۔“ نے خود کلامی کی اور اپنے پھیلے پیٹ پر ہاتھ رکھ کر ”بہ معمول سے کچھ زیادہ بڑا اور بے ڈول لگتا ہے“ بھی بالکل خاموش اور ساکت ہوتا ہے اور کبھی ہے کوئی لڑ رہا ہے۔“ اس کے محسوسات سے ہو چکے تھے مگر پھر بھی کبھی بکھار وہ چونک پڑتی اور بھی ہر بار یہ تجربہ نئے رنگ دکھاتا ہی ہے مگر اس دھپکی مٹی چھوڑ دی تھی۔ اسے سب سے زیادہ لاچار اور رنج سے آتی وہ کیا سوچتی ہوں گی اور..... اور اور لیاقت حسین کاش وہ پوچھ سکتی کہ وہ کیا سوچتا ”اور شاید لیاقت حسین نہیں سمجھی میرے سوالوں کو جواب دینے پڑی جائیں“ وہ ایک بار پھر ہائے وائے کرتی، بچپن سے پھیلائے کام سمیٹ رہی تھی۔ چھوٹے چھوٹے وہ ڈولنے ہاتھوں گھٹنوں میں مکمل کر رہی تھی۔ اب یہ کمر کا درد تو جیسے مستقل ہو گیا ہے۔ ہر روز ایسی لہر آتی ہے کہ ابھی کہہ تھی وہ بڑبڑاتی اور کپکپ کوئی پر ڈال دیے۔

”اور پتا نہیں اماں کب آئیں گی۔ ان موجودگی بھی مشکل ہوتی ہے اور غیر موجودگی بھی مشکل۔ کم از کم اس خوف ناک سناٹے سے تو بچنا ہے ناں۔“ وہ بہت مدھم آواز میں خود سے ہم کلام ہو کر ”سوچ رہی تھی اب ڈاکٹر کو دکھائی لوں کبھار تو ایسا درد آتا ہے کہ میں جھپتی ہوں کہ بس پورا ہو گیا۔“ اس نے رات لیاقت حسین کو بتایا۔ ”ہوں۔“ اس کی نظریں ہنوز اسکرین پر تھیں۔ عذرا کی ہمت جواب دے گئی۔ ”میں آپ سے کچھ کہہ رہی ہوں۔“ ”ہاں، ہاں سن رہا ہوں۔ اماں آج آئیں گی۔“ جانا۔“ وہ اس کی طرف دیکھ کر بغیر بولا۔

”اماں کے آنے میں تو ابھی چار پانچ روز ہیں اگر آپ چلے تو.....“ ”ہیں.....؟“ لیاقت نے اس کی طرف دیکھ کر ”میرا مطلب ہے کہ میں پہلے بھی گیا ہوں جو اب..... تم اماں کے ساتھ ہی جانا یا پھر پڑوں کے ساتھ نکل جاؤ۔“ ”بچ پڑوں کا نہیں ہے اور نہ اماں کا۔“ وہ جھنجھکی۔ ”کیا مطلب اس فالتو بات کا؟ جو عورتیں پڑنوں اور ساسوں کے ساتھ ہوتی ہیں وہ کسی اور نے بچ لے کر جاتی ہیں، دماغ ٹھیک ہے؟“ عذرا کا دل بھگ گیا نہ لکڑ اور مگر بے رخی بھرے یہ جملے۔ ”میں آپ کے ساتھ جانا چاہتی ہوں لیاقت۔“ وہ سر جھٹک کر مدھم آواز میں بولی۔ ”کیوں، اس بار کیا خاص بات ہے؟“ اب انداز میں روشنی تھی۔ عذرا کی پلکیں بھی بھگ گئیں۔ ”خاص بات.....“ وہ سوچ میں پڑ گئی۔ ”خاص بات تو کوئی نہیں مگر بس..... یونہی خواہ خواہ۔“ وہ چپ کر گئی بچپن کے کمرے سے ہلکی ہلکی آوازیں آرہی تھیں ان کے درمیان پھر خیریں حاصل ہو گئیں۔

”آپ کو اندازہ ہے لیاقت کہ میں ہر بار کس تکلیف دہ مرحلے سے گزرتی ہوں۔“ وہ اچانک بول پڑی بلا ارادہ۔ ”کیسی سانس روک دینی والی اذیت کتنی ہوں اور آف بھی نہیں کرتی۔ نہ کوئی تسلی ملے ہے نہ دل آسا آپ نے بھی سوچا بھی ہے عورت کے لیے یہ کیا مشکل ترین وقت ہوتا ہے۔“ ”ساری دنیا کی عورتیں اسی عمل سے گزرتی ہیں۔ تم انوکھی تو نہیں..... اور یہ کون سا تمہارا پہلا بچہ ہے بالکل نو عمر لڑکیوں والا رویہ اپنا رہی ہو اور مجھے صبر کیا رہی ہو خدا کا نظام ہے جو اس کی مرضی..... پھر آ رہا ہے۔ دنیا میں ہر روز ہر منٹ پر ایک

پھر آ رہا ہے۔ تم کوئی واحد ہو..... ہونہ۔... درد سہتی

ہوں۔“ وہ سچ سچ حیران ہوا پھر دانت چبا چبا کر بولنے لگا۔ ”یہ کوئی چار پانچ بچھانے کا کام نہیں یا کوئی اور بھاری کام کہ تم سے نہیں ہو رہا تو میں کر دوں گا۔ ارے تمہارا کام ہے تم ہی نے کرنا ہے یہ نئی داستان کون سی کہہ رہی ہو۔“ وہ اچھبے سے اور غصے سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ”میں تو بس یونہی۔“ وہ پھر کھو گئی۔ ”ہونہ۔“ وہ ریموٹ ٹیلی پر پھینک کر پاؤں میں چپل ڈالنے لگا۔ عذرا نے ڈیڈ پائی آنکھوں سے اسے نکلنے دیکھا اور بہ مشکل دراز ہو گئی۔

☆☆☆

اور لیاقت حسین کیا سوچتا تھا اس نے کبھی کسی پر ظاہر ہی نہیں کیا بلکہ شاید وہ خود بھی اپنے بارے میں، دل کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ اگر اس سے کوئی پوچھتا۔

”کیا تم اپنی پانچ بیٹیوں سے نفرت کرتے ہو؟“ تو وہ بہت زور زور سے نفی میں سر ہلاتا۔ ”نہیں، وہ اپنی بیٹیوں سے قطعاً نفرت نہیں کرتا۔“ ”کیا تم ان سے محبت کرتے ہو؟“

”آں..... ہاں.....“ وہ یقیناً انک جاتا وہ اس کا جواب نہیں دے سکتا تھا۔ اسے معلوم ہی نہیں تھا، اسے کیوں مورد الزام ٹھہرائیں اس نے بھی جاننے کی کوشش ہی نہیں کی اور ضرورت ہی کیا تھی۔ بس وہ آگئیں وہ نامرد نہیں تھا کبھی جب ضمیر کی عدالت میں پیشی ہوتی تو وہ یہ ضرور سوچ لیتا کہ شکر ہے خدا نے اسے صاحبِ اولاد تو کیا ورنہ زندگی کا کیا مقصد ہوتا اور اسے یہ حدیث بھی یاد تھی۔ دو بیٹیوں کی اچھی تربیت اور بیاہ کے بعد وہ جنت کا حقدار ہو چکا تھا مگر بس.....!

وہ اپنے ہم عمر محلے داروں کو اپنے بیٹوں کے ساتھ دیکھ کر راستہ بدل لیتا ظاہر کرتا کہ اسے کوئی



متوجہ ہو گیا۔ آج اس کی چھٹی تھی اور اسے سکون سے ریوٹ سے بدل بدل کر چینل دیکھنے کا اپنا مزہ تھا۔ ٹی وی کی آواز مناسب تھی اور وہ بے حد دلچسپی سے متوجہ تھا پھر بھی کبھی کبھار کوئی آہ کان میں پڑ جاتی تو دھیان بٹ جاتا، ہل بھر کو آواز بھی بلند بھی ہوتی تھی اور جب وہ پوری دلچسپی سے بریکنگ نیوز دیکھ رہا تھا تب یکبارگی اسے لگا کہ عذرا چیچی ہو اس نے کان جھٹکے مگر آواز واضح اور بلند تھی اور اب متواتر چیخیں تھیں۔ اتنی دل خراش، اتنی کان میں سوراخ کرتی کہ وہ چھلانگ لگا کر کمرے میں داخل ہوا۔

”کک..... کیا ہوا؟“ وہ ڈپٹ کر بولا مگر پھر فوراً مدھم پڑ گیا، وہ چارپائی پر گول گیندنی باقاعدہ چیخ رہی تھی۔ ”ہائے اماں مرگئی۔ اماں ہائے، میں نہیں بچوں گی لیاقت حسین..... بلاو کسی کو بلاؤ ارے صغرا! اماں کو آواز دے لو..... جاؤ لیاقت حسین میں مرگئی ہائے، ہائے اللہ ارے مولا۔“ وہ اس کی چارپائی تک بڑھا اسے کندھوں سے پکڑنا چاہا۔

”پچھے ہٹ جاؤ۔ میں گئی لیاقت ہائے میری بچیاں۔ ہٹ جاؤ، یاد دیا ہائے اللہ۔“ وہ مرغ بیکل کی طرح ٹپ رہی تھی۔ لیاقت حسین اب متوجہ ہو گیا تھا۔ ”جی جی۔“

”تم جاؤ اماں صغرا کو بلاؤ، میں نے نہیں بچنا۔“ اس نے دونوں ہاتھوں سے اسے دھکیل دیا نہ جانے دل و دماغ کا کیا فیصلہ تھا مگر باج مگر ذبح ہوتے بکرے کی طرح چیخیں وہ اٹنے قدموں باہر نکلا۔

”میں بس ابھی آیا اماں صغرا کو لے کر، عذرا دومنٹ۔“ وہ حواس باختہ بھاگا لگی کے کونے والے گھر میں پل بھر میں پہنچا، سرعت سے پیغام دیا ایمر جیسی چہرے سے عیاں تھی۔

”اماں نہار ہی ہیں، دومنٹ میں آتی ہیں۔“ اُن کی بہو نے بتایا۔

”وہ..... عذرا کی طبیعت بہت خراب ہے۔ وہ

”تو کیا وہ ڈاکٹر غلط کہہ رہی ہے، تم تو فارغ یعنی خواب کیا میں سارا دن جھک ماروں گا، چھٹی صبح کروادی ابھی اماں کو لینے بھی جانا تھا بلا وجہ کا شروع والا۔“ وہ مسلسل غرار ہا تھا۔ عذرا منمنائی پیچھے تھی پھر گھر آکر واقعی درد غائب ہو گیا۔ اس نے ہانڈی بھی چڑھائی اور گھر بھی سمیٹ کر نہائی اور لیاقت سارا دن اسے تیوری چڑھائے گھورتا رہا۔ رات بھر ہلکی ہلکی کراہیں تھیں۔ لیاقت کو کبھی لگا وہ مکر کر رہی ہے پھر وہ گہری نیند سو گئی۔ اذانوں کے وقت وہ پھر اٹھ کر بیٹھی ہائے وائے کر رہی تھی۔ لیاقت نے ٹیکے پر سر رکھا اور اندھا سو گیا۔

”اب جب ڈاکٹر نے کہہ دیا کہ بڑا وقت پڑا ہے تو برداشت کرو۔“ چونکہ وہ خود بھی ساری رات بے آرام رہا تھا صبح ساڑھے سات بجے جب بچیاں خدا حافظ کہہ رہی تھیں تب آنکھ کھلی ورنہ ساڑھے چھ بجے اٹھنا روٹین تھا۔ عذرا گڈی چڑھا کر واپس بیٹی توڑتے حال نظر آ رہی تھی۔

”چائے لاؤں آپ کے لیے؟“ اس کے بال کیے جوڑے کی شکل میں لپٹے تھے وہ صبح بھر نہائی تھی۔ ”ہوں۔“ وہ ہنکارا بھر کر غسل خانے کی جانب بڑھ گیا۔ وہاں بھی اسے وقتا فوقتا ہائے، آف کی صدا آئی آتی رہیں پھر جب وہ چائے کی چسکیاں بھرتا خبریں سن رہا تھا اسے دفعتاً لگا کہ وہ سرتا پالپینے میں نہار ہی ہے اور اس کے ماتھے پر اور اوپری ہونٹ پر پسینے کے قطرے سے تین اور رنگ..... رنگ زرد، سفید یا بلدی۔

”تمہاری طبیعت ٹھیک ہے؟“

”ہاں، بس وہ درد..... کل کی طرح پھر درد اٹھ رہا ہے۔“ عذرا نے کسی مجرم کی طرح سر جھکا لیا۔

”جاؤ کمرے میں لیٹ جاؤ۔ پتکھا چلاو، لائٹ ابھی ہے سو جاؤ تم کام بعد میں دیکھ لینا۔“ یہ اس کی طرف سے انتہائی خیال اور نرمی کی۔ عذرا بدقت تھی اور اندر بڑھ گئی وہ پھر سے خبروں کی طرف

رہے ہیں۔ اس نے انہیں ساتھ لے کر کھانا چھوڑ دیا اور اب..... اب تو سوال ہی کیا۔ اس اماں کی طرح نہ تو چیخ، نہ جیج کراہے جذبات تھے اور نہ ہی عذرا کی طرح اندر ہی اندر گھلا بس ایک ساکت نظر ایک بے حسی، ایک گول دائرے سے گھومتا وہ کیا سوچتا ہے وہ خود بھی نہیں جانتا تھا۔

☆☆☆

اماں کے آنے میں تین روز باقی تھے اور پندرہ تین دن سے وہ شدید تکلیف میں مبتلا تھی۔ درد برداشت کرتی رہی کہ درد آتا اور چلا جاتا۔ کل بے ضد کر کے وہ کسی نہ کسی طرح لیاقت حسین کے کمر ڈاکٹر کے پاس گئی، وہ گلی محلے میں کلینک کھولے تھے اور موہا بل کان سے لگائے گھٹنا جیج میں مگن تھی اس نے جلدی جلدی اسے نبھایا اور ساتھ جھنجھکی جھاڑا بھی۔

”ابھی بہت وقت پڑا ہے۔ تمہارا کون سا پرچہ ہے بلاو تم درد، درد چلا رہی ہو اور اب تک رجسٹریشن بھی نہیں کروائی۔ ہم ایسے کیس نہیں لے کر سر پیر معلوم نہ ہو، کل آکر سارے میٹ کرواؤ۔“ کچھ سمجھ بھی آئے ایک الٹرا ساؤنڈ بھی..... اور کوئی کروایا ہو تو وہ بھی لانا، اب جاؤ۔“ عذرا یہ مشکل درد برداشت کرتے کھڑی ہو گئی۔ ڈاکٹر نے دوبارہ فوراً کان سے لگایا اور مشغول ہو گئی۔ اس کی ہمت جواب دے گئی۔ لیاقت کی کڑی نگاہیں، وہ بے حد اکتانیا اس کے آگے چل رہا تھا۔

”میرا تو کوئی الٹرا ساؤنڈ نہیں ہوا، کل کروالوں پھر؟“ اس نے بات گھمانے کو یونہی کہا۔ ”جو مرضی کرواؤ۔ یہ تمہارا مسئلہ ہے، میرا مت خراب کرو بلا وجہ مجھے کے دن کی چھٹی کروادی اب کوئی تم تنہی پہنچی تھوڑی ہو جسے کسی چیز کی خبر نہیں۔“ ”میں بہت تکلیف میں ہوں، لیاقت جیج کیسے بتاؤں آپ کو..... آہ۔“

فرق نہیں پڑتا۔ ”آئی ڈونٹ کیئر، مجھے تو پتا ہی نہیں، سب اچھا ہے، میں مطمئن ہوں.....“ کا عنوان ہمہ وقت چہرے کے مضمون پر لگا دیتا مگر اندر سے وہ کن اکھیوں سے دیکھا کرتا عید اور مجھے کی نمازوں میں ساتھ لگے بہت چھوٹے چھوٹے لڑکوں کو اور پندرہ سولہ سال کے لڑکوں کو دیکھ کر اسے اپنی کم مائیگی کا شدید احساس ہوتا۔ اگر ان بانجھوں میں سے کوئی ایک بھی بیٹا ہوتی تو میں بھی انگلی پکڑ کر اسے ساتھ لاتا۔ وہ آفس میں فرصت کے لحاظ میں میرے بچوں والے ٹاپک میں کبھی حصہ نہیں لیتا تھا۔ اس نے بھی کسی بچی کے کسی خوب صورت جملے کو کسی پیاری ادا کو ذکر محفل نہیں بنایا تھا۔ وہ کیسی ہیں، اسما بہت بھدار ہے، وہ ذمے دار ہے، حساس ہے۔ ارفع کی لکھائی بہت خوب صورت ہے۔ یوں جیسے ورق پر مومنی پھسلے ہوں۔ بشری نقیٹیں بہت خوب صورتی اور عقیدت سے پڑھتی ہے۔ کزئی اور رضیہ اس کے بیٹا کے اس کے سامنے جوتے رکھتی ہیں، اٹھاتی ہیں۔ وہ کئی باندھ کر اسے دیکھا کرتی ہیں۔ رضیہ اکثر اس کے سینے پر آکر آوندھی لیٹ جاتی اور منٹوں میں سو جاتی ہے، وہ اس کے گال چومتی ہے۔ اس کی انگلیاں ہونٹوں میں بھر لیتی ہے۔ اسے ابو سے خوشبو آتی ہے۔ وہ بڑی ہو کر ابو بننا چاہتی ہے۔ موقع ملے تو اس کے بے حد دزنی پشوری جوتے پیروں میں اُس کر دھم دھم چلنے کی کوشش کرتی ہے اور اس نے باقی چاروں بہنوں کی بہ نسبت اسے پہلے ابو پکارا اور..... اور اس نے بھی ان سب اور ان جیسی بہت سی باتوں پر غور نہیں کیا۔ وہ سب بچے ہیں اور بچے تو ایسے کرتے ہی ہیں، اس میں ایسا کیا اور اس میں کیا مزہ؟ عید، شبِ برات وہ اگر کبھی بچوں کو لے کر نکلتا، اسما، ارفع اور بشری تو اسے تب بھی لگتا لوگ اسے ترحم آمیز نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں۔ اس کی جانب اشارے کر رہے ہیں۔ اسے بے چارہ سمجھ



چین رہی ہے، وہ مر رہی ہے۔“

”بھائی لیاقت بس اماں پڑے بدل لیں، میں نے پیغام دیا ہے بس دومنٹ اللہ خیر کرے گا، آپ چلیں۔“ اس نے ہلکا ہلکا کر مزید جلدی کی تاکید کی اور کھر کی طرف سر پٹ دوڑا اس کے لیے عذرا کی ایسی چیخیں بے حد حیران کن اور..... اور اذیت کا باعث بن رہی تھیں۔ اس نے تو اسے کبھی بلند آواز میں بولنے نہیں سنا تھا ایسا کیا ہو گیا اس کے ساتھ کہ وہ..... ماتھے سے پسینہ پونچھتے اور تقریباً بھاگتے ہوئے بھی اسے حیرت تھی۔ جب اس نے اندر قدم رکھا تو ایک بار پھر خاموشی تھی وہ چونک گیا تو کیا عذرا پھر ڈھکوسلا کر رہی تھی اسے بار بار یہ خیال آیا تھا ان دس دنوں میں کہ عذرا اماں کی غیر موجودگی کا فائدہ اٹھا کر اسے الوداعی کی کوشش کر رہی ہے وگرنہ وہ پہلے تو کبھی ایسے نہیں تھی، اسے عود کر غصہ آیا وہ جارحانہ انداز لیے اندر آیا تو ٹھٹھک کر رک گیا۔ اسے لگا ساری کائنات بھی رک گئی تھی، اس نے دانت پر دانت سختی سے جمادیے۔ اس کی ہتھیلیاں ترتیر ہو گئیں اور شاید آنکھیں خوف و دہشت اور حیرانی سے جیسے حلقوں سے باہر آگئیں۔ سامنے کا منظر دنیا کا سب سے پرانا اور حقیقی منظر تھا۔ سب کے تصورات میں تھا مگر لیاقت حسین نے ایسا نظارہ پہلی بار دیکھا تھا عذرا کا لان کا دو پٹا سارا کا سارا اس کے منہ کے اندر تھا۔ اس کا چہرہ خطرناک حد تک بگڑ گیا تھا۔ گردن کی رگیں، آنکھوں کی تکلیف، چہرے کے سارے عضلات..... اسے لگا وہ غش کھا کر گر پڑے گا۔ اس نے دروازے کو اتنی سختی سے تھاما کہ ہاتھ کی رگیں پھول گئیں۔ دانت اتنی سختی سے بچھنے کہ جبڑے ایک دوسرے میں شاید دھنس گئے۔ یہ اس کی زندگی کا ناقابل فراموش، ناقابل بیان اور ناقابل یقین منظر تھا۔ اس نے آگے بڑھنا چاہا مگر اس کے قدم جیسے جکڑ گئے۔

”اور اگر میں آگے بڑھ بھی جاؤں تو میں کرسکتا ہوں۔ میں عذرا کی کیسے مدد کرسکتا ہوں۔ تو ہمیشہ ہی مجھے احساس کروانا چاہتی تھی، بتاتی تھی میں نے کبھی سنا ہی نہیں۔ میں نے سوچا ہی نہیں کہ دراصل ایک انسان سے دوسرا جیتا انسان حاصل کرنا ہوتا کیا ہے۔“ اس کاٹن ہوتا ذہن سوچوں کے ساتھ ڈول رہا تھا۔ دفعتاً عذرا اپنی پوری جان سے مل گئی اس کا سر چارپائی کے پائے سے جا لگا، سمیر یزیم ٹوٹ گیا۔ وہ جنت بھر کر وہاں تک گیا۔ اس کی آنکھیں بھر بھر آ رہی تھیں۔ پیٹ میں مروڑ سے اٹھ رہے تھے اور رُواں کھڑا تھا۔

”عذرا..... عذرا میں کیا کروں عذرا؟“ اس ہوش میں آ گیا۔ اس کی آواز نہیں نکل پاری تھی۔ اس نے عذرا کا چہرہ تھامنا چاہا، وہ جو پیچھے کی طرف گرنے کو تھی دواوازہ بج رہا تھا شاید اماں صغراں آگئی تھیں وہ آگے کیسے بڑھتا۔ زور زور سے ہاتھ پاؤں مارنا گھڑی بنا بالشت بھر سے کچھ زیادہ وجود ٹپ ٹپ کر اپنی آمد کا اعلان کر رہا تھا۔ عذرا نے اپنی لان کی چڑھتیں کے دامن سے بچے کا منہ اور ناک صاف کیے بچہ یکدم گلا پھاڑ پھاڑ کر رونے لگا۔ لیاقت حسین کی آنکھیں دھندلا رہی تھیں۔ وہ شاید بھگ چکی تھیں اس کے ہونٹ کپکپا رہے تھے۔

”لیاقت بیٹا کھول..... دروازہ کھول۔“

”اماں صغراں.....“ وہ بے ڈگ بھرتا سر عت دوازے تک گیا۔ پیچھے عذرا ایک بار پھر چیخ رہی تھی۔

”وہ..... وہ بچہ.....“ لیاقت حسین کے منہ سے کچھ نہ نکلا۔

”ارے تو کاہے رو رہا ہے؟“ وہ حیرانی سے پوچھ رہی تھیں اور ”عذرا.....“ وہ اندر لگیں۔

”ہائے میں مر گئی۔“ ان کی دلدوز چیخ..... وہ جہاں کا تھاں رہ گیا۔ ”ارے چولے پر پانی رکھ۔“ پھر ان کی بوکلائی آوازیں تھیں اور سر پٹ دوڑنا

لیاقت حسین۔

”ارے بڑواں ہوئے ہیں، میں کس کس کو سنبالوں۔“ ان کے ہاتھ پیر پھول رہے تھے۔

”ارے لیاقت چھوڑ سب کچھ..... ٹھیکسی پکڑ کس بڑے اسپتال چل ورنہ کچھ نہیں بچے گا۔ ارے ادھر تو ذرا آؤ۔“ وہ خود بھی ہڑ بڑا ہٹ کا شکار تھیں اور اسے بھی نچائے دے رہی تھیں۔

”ارے میری بیٹی آنکھیں کھول۔ یہ..... یہ بے ہوش ہو گئی۔“ لیاقت کمرے میں آ گیا۔ عذرا بے دم گردن ڈھلکائے انتہائی بری حالت میں پڑی تھی۔ وہ گہرا اٹھا اس نے آستین آنکھوں پر رگڑ لی نمی کی چادر جو تن رہی تھی۔ اس نے بہ مشکل خود کو سہارا دیا اور پلنگ پر پڑے بچوں کی طرف لپکا وہ جو آتے ہی چیخ کر اپنے آنے کا اعلان کر رہا تھا اور دوسرا جو بے سندھ، بے حس و حرکت مردہ حالت میں پڑا تھا۔ اس نے چیختے کو اٹھالیا اور چارپائی کی چادر پھینچ کر اسے چمپا کر بازو دیں گھسیڈ لیا۔ اس نے پاس پڑے تو لیے میں بے حس و حرکت وجود بھر لیا۔

”کیا یہ مر چکا ہے.....؟“ میرا بچہ اس نے بل بھر کو سانس لے کر تو لیا کھولا۔ نہ رنگ، نہ روپ بس مردہ وجود اس کی آنکھیں جھرجھر بننے لگیں۔ اسی گہری دھند میں اس نے دیکھا۔

”آہ..... میری بیٹی، میری بیٹی آنکھیں کھول۔“ اس نے دوسرے بازو کو سینے سے لگا لیا۔ اس کے حلق میں آنسوؤں کے گولے تھے۔ بھی سی بیٹی بے حس و حرکت، چادر والے بچے نے ہلچل مچا رکھی تھی۔ اس نے چادر آرام سے فرش پر رکھ دی۔ تیز تیز چلتی آنکھوں نے چادر کھول دی۔ اماں صغراں کی تیز چیخ نکلی۔

”ارے اللہ لیاقت دیکھ دیکھ..... ارے یہ تو لڑکا ہے۔“ اس نے ایک بار پھر آستین آنکھوں پر رگڑ لی۔ ذرا منظر واضح ہوا تو چیخا، وہ آچکا تھا جس کے انتظار میں انہوں نے کسی چیز کو شکر کے انداز میں نہیں دیکھا

## اک دعا

دعا میرے پاکستان کے لیے خوشحالی کی آس لیے

سب خوش رہیں آباد رہیں دل ان کے ہمیشہ شاد رہیں

کریں عزت سے گزر یہاں ہر پل ہو قائم امن یہاں

ہوں پوری سب کی ضرورتیں لوٹ آئیں سب کی مسکراہٹیں

حکمران ہو ایماندار یہاں ہو قوم ڈٹے دار یہاں

جو قابل ہو اسے پزیرائی ملے ہر بے گناہ کو رہائی ملے

دل بھرے ہوں محبت کے ساتھ نہ ہو سلوک نفرت کے ساتھ

رہے قائم ہر دم پاکستان ہے اختتام اس دعا کے ساتھ

مرسلہ: رفعت غفار، کوئٹہ



لگا کہ اللہ اس کے سامنے کھڑا ہے۔ لیاقت بس ایک نظر ادھر بھی..... اس کی چالیس سال کی زندگی اور وہ چالیس منٹ اور لیاقت حسین تجھے شکر کرنا چاہیے کہ خدا نے تجھے بے خبری سے بچالیا۔ وہ ساری رات اسپتال کے لان میں ہاتھ پیچھے باندھے ٹہل ٹہل کر نہ جانے کیا، کیا سوچ رہا تھا۔

”اگر عذرا مجھ سے لگائیں نہیں ملنا چاہتی تو وہ حق بجانب ہے۔ میں نے اسے دیا ہی کیا۔ کام تو یہ اسی کا تھا اور اسی کو کرنا تھا مگر وہ میرا اخلاقی سہارا، وہ دل دہی کے جملے، وہ بس ایک بار اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر جو اسے اپنے ساتھ کی یقین دہانی کروا دیتا تو زندگی کتنی آسان ہو جاتی اور میں کیسے لگاؤں ملاؤں اپنی بیٹیوں سے اور شاید میں اب بھی کسی عورت سے لگاؤ نہیں ملا سکتا اور عذرا اگر میں ایک مندر بناتا تو عورت کو وہاں بیٹھا کر میں شاید سر جھکا کر بقیہ زندگی گزار لیتا۔ خدا کے تمام فیصلے درست ہوتے ہیں۔ اس نے مرد بنایا، اسے اولیت دی پھر اسی کی پہلی سے عورت پیدا کی۔ مرد گھمنڈی ہو گیا اسے ہر شے حقیر نظر آنے لگی پھر شاید خدا نے ترازو کے پلڑے میں دونوں کو ڈالا ہوگا تو مرد کا وزن زیادہ تھا اور اللہ بڑا ہی انصاف پسند ہے۔ تو ازن اسی سے شروع ہو کر اسی پر ختم ہوتا ہے۔ اس نے دوسرے ہی پل کم وزن عورت کی گود میں بچہ دیا، لہجے کا کھیل تھا ترازو کے دونوں پلڑے برابر ہو گئے پھر آگے جا کر اس نے ماں کے پیروں تلے جنت رکھ دی۔ پل صراط بعد میں پار کرنا پہلے اس منزل سے تو نکلنا اور..... اور میری ماں نے بھی مجھے ایسے ہی جنتا تھا۔ اسی تکلیف دہ عمل کے ساتھ اور پھر یہ بن کر پالا ہوسا میں نے تو بس سن لیا تھا کہ میری ماں نے بڑی مشقتوں سے مجھے پالا اور سننے اور سمجھنے میں کتنا فرق ہوتا ہے۔ حق الیقین، عین الیقین اور میں سارے مراحل سے گزر گیا۔ نہ جانے کیا بات ہے آج چار دن ہو گئے ہیں بس وہ منظر

خبر اس میں سے چائے نکال کر اسے دی۔ لیاقت نے جواب نہیں دیا، کپ ہوئوں سے لگالیا۔

”اور اگر اسے کچھ ہو گیا تو کیا وہ خود کو معاف کر سکتا ہے؟“

”میں تو خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتی ہوں کہ میرا پوتا ٹھیک ٹھاک میری گود میں ہے۔ ارے! اگر جو یہ ہوتا اس شے کے ڈبے میں تو..... اللہ توبہ!“

اماں نے جھجھکی سی لی اور ہاتھوں سے ناک کان گھونچا۔ لیاقت نے نگاہ اٹھا کر دیکھا عذرا کے چہرے کے تاثرات بھی یہی کہہ رہے تھے۔ اسے اماں پر غصہ آیا اور عذرا کا یہ رویہ بالکل درست لگا۔ کیا واقعی اگر ایسا ہوتا تو صورت حال بالکل الگ ہی ہوتی۔ وہ سوچ سکتا تھا کہ یوں نہ ہوتا تو کیا ہوتا اور عذرا نے اسے ایک بار بھی مخاطب نہیں کیا تھا۔ وہ میدان مار چکی تھی اب اسے کسی کی پروا نہیں تھی۔ اس کی زندگی میں وہ مرد آچکا تھا جس کے بعد اب اسے کوئی اور خواہش نہ تھی۔ لیاقت حسین کی سالوں پر محیط بے اعتنائی، بے حسی ان چالیس منٹوں میں ختم ہو چکی تھی۔ اسے خبر نہ تھی وہ خود سے شرمندہ تھا، معاشرے سے اور عذرا سے اور ہر عورت سے، ہر ماں سے شاید اب وہ کبھی نگاہ ملانے کے قابل نہیں تھا۔ اس نے دیکھ لیا تھا انسان کتنا حقیر ہے، وہ پانی کے ایک ملبے سے وجود پاتا ہے اور پھر کس طرح زمین پر گر کے ایڑیاں گرگڑاتا ہے اور وہ کتنا بے بس ہوتا ہے اور جب وہ کھڑا ہونے کے قابل ہوتا ہے تو خود کو کیا شے سمجھنے لگتا ہے اور کتنا گھمنڈ کرتا ہے۔ اس نے رٹے رٹائے قصے کی طرح سن لیا تھا کہ عورت کے لیے اپنی جان سے جا کر نئی زندگی لانی ہے اس نے کبھی یہ نہیں سوچا تھا کہ جان سے جانا ہوتا کیا ہے اور اگر کافر ہو تو اللہ اللہ پکارتا جنگلوں میں نکل جائے، سب دین ہو تو اللہ والا ہو جائے فقط اس ایک منظر کو دیکھ کر دونوں کو پھر دینے والا ایک ایسا پل جب اسے

چپکائے دونوں ہتھیلیاں شے سے جوڑے ذرا ایڑیاں اٹھا کر لیاقت حسین ڈھائی گھنٹے سے اندر پڑے ایک انیکو بیٹر میں رکھی اپنی بیٹی کو پیچھے پکڑنے سے تکتا جا رہا تھا۔ شینوں کے سہارے سانس لینے کے بعد مختصر وجود، پیلے رنگ کی بے دم بچی لیاقت باندھے اسے دیکھتا تھا، بنا پلکیں جھپکے اس کے بے دم ہونے سے سینے کا زیروم وہ دم انگلیوں پر چپے گن رہا تھا۔ ایک دو تین نہ جانے کیوں تھوڑی تھوڑی دیر بعد آنکھیں بھگ جاتی تھیں جنہیں وہ ہتھیلیوں سے پکڑنے سے رگڑ لیتا اور وہ ان تین دنوں سے کیا سوچ رہا تھا اسے پتہ ہی نہیں چلتا تھا بس خالی الذہن۔

”ارے مٹراب کب تک کھڑے رہیں گے۔ بچی ریکور کر رہی ہے، اچھی پروگریس ہے۔ آپ اپنی مسز کے پاس جائیں۔“ سسر نے اسے بہت اعتدال سے یقین دہانی کروائی تو وہ نہ چاہتے ہوئے وہاں سے ہٹ گیا۔ اندر کمرے میں عذرا چوڑے کی پٹی پی رہی تھی۔ وہ بے حد کمزور تھی اور بے حد خون کی کمی تھی، اس کے اندر داخل ہونے پر اس نے کن آنکھیں سے عذرا کے چہرے کو دیکھا جہاں بے نیازی کی نفار تھا۔ وہ کندھے جھکا کے صوفے پر ٹپک گیا۔

”ارے لیاقت دیکھ تو کیسا شہزادہ بنایا ہے میں نے اسے۔“ اماں بچو اس کے سامنے لے آئیں۔

”جی اماں۔“ اس نے بسم اللہ کہہ کر بچے کے ماتھے پر بوسہ دیا۔

”تو اتنا ٹھنڈا حال کیوں ہے اور کہاں تھا اتنی دیر؟“ اماں کو دھیان آئی گئی۔

”ہاں انہیں کیا ہوا ہے؟ ادا اس چہرہ، پریشان آنکھیں، بچے بچے انداز۔“ عذرا بھی چونکی۔

”وہاں چھوٹی گڑیا کے پاس..... اسے ہی دیکھ رہا تھا۔“ وہ مدھم آواز میں بولا۔

”ارے اسے کیا ہوتا ہے ڈاکٹر دیکھ تو رہے ہیں، تیرے کھڑے ہونے سے کیا ہوگا۔“ اماں نے

تھا۔ لیاقت بے یقینی سے آنکھیں پھاڑے دیکھنے لگا۔

”اور..... یہ تیری گود میں کیا ہے؟“ اماں صغراں نے مسرت آمیز لہجے میں اشتیاق سے تیزی دیکھائی۔

”بیٹی۔“ لیاقت حسین کی آواز کپکپائی آنکھیں پھر بہنے لگیں۔

”بیٹی..... خالہ..... میری بیٹی۔“ اس نے دونوں ہاتھوں سے بچی کو پیچھے لیا۔

”مم..... مم..... مگر یہ تو روٹی ہی نہیں۔“ خالہ کو لگا وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے۔

☆☆☆

اماں واپس آچکی تھیں۔ عذرا اسپتال کے پرائیویٹ روم میں ڈرپ لگی بے حد کمزور، احساس نفار سے لبریز لگاؤں لیے داوی کو پوتے کے لاؤ کرتا دیکھ رہی تھی۔ وہ دیکھنے میں پچی ہلدی، بڈیوں کا ڈھانچا دھکتی تھی۔ اندر کو دھکی آنکھیں مگر ان میں موجود وہ چمک کیا ہی کسی سونے چاندی میں ہوگی۔ اسپتال میں ٹھہرے کھٹک لگے نہ جانے کہاں کہاں سے لوگ اُمنڈے پڑ رہے تھے۔ مبارک باد دینے کو۔ نہ جانے کون کون مٹھائیوں کے ٹوکے، مبارک بادیاں، اماں نے اپنے سونے کے بالے اتار کر اللہ کے نام دے دیے۔ پانچوں بچیاں سرشار، خوش، حیران تھیں سے بھائی کو تک رہی تھیں جس نے تیرہ سال پہلے کے بنے کپڑے پہنے تھے۔ اماں کے لیے، عذرا کے لیے جیسے دینا نے نیا جنم لیا تھا۔ عذرا جیت گئی تھی۔ اس کے کانوں نے یہ رس بھرا جملہ نہ لیا تھا کہ اس کے ہاں بیٹا پیدا ہوا ہے۔ وہ ایک فخر سے ایک شعوری بے نیازی کا مظاہرہ کرتی اس بار بچ بچ ساس سے مکر کر کے نازا شور ہی تھی اور اماں خوش تھیں، وہ عذرا کے ہاتھ کہنے پر بازو تک لپکتی تھیں۔ سارے سارے سگے، سارے شکوے، سب ملال ختم ہو گئے۔ اب دنیا میں اور مانگنے کو کیا رہ گیا تھا سب تو مل گیا ناں..... اور اس سب ہنگامے سے ذرا دور اگلے وارڈ میں شے کی دیوار سے ناک



## ماں کی دعا

اسمطیور

مجھے تقریباً دس منٹ ہو چکے تھے نازہ کا انتظار کرتے ہوئے..... اس نے کہا تھا کہ وہ سیدھی اپنے دفتر سے یہیں اسپتال آجائے گی اور اب تو اس کا آفس ٹائم ختم ہوئے پون گھنٹا ہو چکا تھا اور جہاں تک میرا اندازہ تھا اسے تقریباً پندرہ منٹ پہلے تک یہاں پہنچ جانا چاہیے تھا کیونکہ اسپتال اس کے دفتر سے محض بیس منٹ کی ڈرائیو کے فاصلے پر تھا خیر..... انتظار تو کرنا ہی تھا۔ میں پچھلے کئی دنوں سے اپنی پھوپھی ساس



گئے۔ وہ عذرا کا خیال رکھ رہا تھا۔ عذرا بدگمان بن کر خوش تھی اور وہ اس کی بدگمانی ضرور دور کر لیاقت حسین نے فیصلہ کیا۔ وہ اسے بتائے گا کہ اس نے کیا دیکھا، کیا محسوس کیا۔ وہ اس کے لیے سارے محسوسات بتائے گا۔ وہ اسے اس بدگمانی جیسے نہیں دے گا۔

بے خبری سے جب ہوشمندی کی دنیا میں رکھا تو معلوم ہوا کہ وہ کتنا بڑا شکر انسان تھا۔ شاید کبھی غلطیوں کا اعتراف نہ کرتا مگر یہ بھی شاید حاکم تھا کہ اس کے دل پر لگا قفل اس نے کھول دیا تھا۔ وہ عذرا کو بتائے گا کہ وہ کتنی بیکار زندگی گزارا تھا، جانور کی طرح، صبح سے شام بہت عرصہ تک دوسرے سے دور بدگمان رہ کر گزار لیا۔ اب وہ دوسرے سے بات کریں گے۔ دل کی بات، دکھوں، تکلیفوں کی بات۔ وہ اسے باقی ماندہ زندگی بدگمان کے بھنور میں پھنس کر ضائع کرنے نہیں دے گا۔ اسے ضرور بتائے گا کہ اس ایک پل نے اس کی زندگی بدل دی۔ حرف حرف، زیر زبر پیش کے ساتھ۔ وہ کھلے آگن میں بچی کو کبیل میں لپیٹ لیا۔ کر اسے سنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ عذرا اندر کے ساتھ جو خواب بھی اس نے چاند کی نکھری روشنی میں کبیل کو کھولا وہ پوری آنکھیں کھولے ایک نیک کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ لیاقت حسین کی پلکیں جھپکیں گئیں۔ اس نے اسے ہانپوں میں بھینچ لیا۔

کہتے ہیں مرد کی زندگی میں فلاں عورت آنے سے بدلاؤ آگیا۔ وہ سرتاپا بدل گیا۔ چالیس سال بعد لیاقت حسین کی زندگی میں وہ لڑکی آئی جس نے اسے اندر سے، باہر سے، روح سے، دل سے، نظر سے، دماغ سے بدل کر رکھ دیا تھا۔ ناشکروں کی قطار سے نکل کر شرگزاروں کی قطار میں آکر اہوا تھا۔

آنکھوں کے آگے سے ہٹا ہی نہیں۔ اس نے چار راتوں کی بے خواب آنکھوں کو گرزا۔ اگلے دن عقیقہ کا ارادہ تھا مگر وہ چھوٹی کے... انکو بڑے باہر آنے سے پہلے کچھ نہیں کرنا چاہتا تھا اور ڈاکٹر کہہ رہی تھی اسے آج ڈسچارج مل جائے گا۔ وہ گھر آکر عقیقہ کے بکرے رسی سے باندھتے ہوئے ایک بار پھر حیران تھا۔ عورت اپنے ہی معاملے میں اتنی بے پروا اور سنگدل کیوں بن جاتی ہے۔ اماں نے اسے لڑکے کے حساب سے دو بکرے لانے کو کہا تھا اور بچی کا عقیقہ.....؟ عورت خود ہی خود پر اتنا ظلم کیوں اور کیسے کر لیتی ہے؟

☆☆☆

بڑا ہی خوشیوں بھرا وقت تھا گلی میں خوب بڑا شامیانہ لگا تھا۔ دیکھیں جیس مبارک بادیں، ہنسی خوشی..... اماں اپنی خوشیوں میں اتنی مست تھیں کہ ارد گرد سے بیگانہ عذرا ہی کو خیال آیا۔ لیاقت کی ساری توجہ اس چھوٹی بچی کی طرف تھی۔ وہ اصرار کر رہا تھا کہ وہ اسے بھی دودھ دے جبکہ عذرا کا ایسا کوئی ارادہ نہیں لگ رہا تھا وہ دبا کر دودھ اور بھٹی پی رہی تھی کہ دودھ اترے مگر دماغ میں واضح خیال تھا بیٹے کے لیے..... عورت خود ہی عورت کی دشمن کیسے بن گئی..... شاید معاشرہ، لوگ، رویے، ترجیحات اور..... اور.....! پھر اسے خود ہی خیال آیا۔ ”بیٹا مل گیا ہے اسی لیے.....“ اس نے ڈھیروں ڈھیر فروٹ، گوشت اور دودھ کے ڈبوں کو دیکھا اس کی آنکھوں میں استہزاکارنگ آگیا۔ لیاقت حسین نے دیکھ لیا وہ سر جھٹک کر بچی کے لیے لائے گئے چھوٹے چھوٹے فراک شاپر سے نکال رہا تھا اور یہ خوشی اسے زندگی میں پہلی بار ملی تھی۔ ورنہ اس گھر کی پہلی پانچ پیدا ہونے والی بچیوں نے ہر بار دو دو ماہ تک ناں اور دادی کی طرف سے سلے گئے گرتے ہی پہنے تھے۔ یہ پہلی بچی تھی جس کے لیے بے بی سوٹ خریدے



دل درو چھین پورے کارڈور میں گونج رہی تھیں۔ بے اختیار میری اور نازہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اپنی سسکیوں کی آوازیں ہمیں صاف سنائی دینے لگیں۔ ہم دونوں ہمت کر کے ریسپشن کے قریب جا کھڑے ہوئے کہ ذرا درواغلی دروازے پر بھیڑ چھٹے تو ہم کیسے بھی باہر نکلنے کی کریں۔

چند لمحے غائب دماغی سے دروازے کی طرف دیکھتے رہنے کے بعد میں نے اپنا رخ بائیں جانب کر لیا۔ وہاں دیوار کے ساتھ ایک اسٹریچر لگا تھا جسے رش کی وجہ سے ابھی اندر نہیں لے جایا جاسکا تھا۔ اس وجود کے چہرے کو کپڑے سے ڈھک دیا گیا تھا مگر میں یہ اندازہ نہیں کر پائی تھی کہ آیا وہ لاش ہے یا پھر کوئی زخمی۔

اگر لاش تھی تو جس چادر سے اسے ڈھکا گیا تھا وہ اتنی اجلی کیسے تھی.....؟ مردے کے زخموں سے رستا خون اس میں جذب ہو جانا چاہیے تھا..... اور اگر کوئی زخمی تھا تب بھی اس وجود میں مخصوص تڑپ یا کسمپاش مفقود تھی اور پھر وہی اجلی چادر.....

حیرت تھی کہ آخر زخموں سے رستا خون چادر پر نشان کیوں نہیں چھوڑ رہا تھا اور زخمی تھا تو فوری طبی امداد کے لیے اسے اندر لے جایا جانا بے ضروری تھا۔

میں ایک عجب سے تجسس اور بے کلی کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس انجان، بے کس وجود کی طرف بڑھ گئی۔ اسٹریچر کے پاس پہنچ کر میں نے پلٹ کر نازہ کو دیکھا جو بائیں فون پر یقیناً ہم دونوں کے گھروں میں دیر ہو جانے کی اطلاع دے رہی تھی۔ چند سیکنڈز سوچتی نظروں سے اسے دیکھنے کے بعد میں نے رخ موڑ لیا اور احتیاط سے ہاتھ بڑھا کر اس اسٹریچر پر لیٹے وجود کے چہرے کی طرف سے چادر پکڑ کر ہٹا دی۔

”اف..... میرے خدا!“ کس کا لخت جگر تھا یہ..... اتنا معصوم اور اتنا من موہنا سا چہ میری نظروں کے سامنے تھا۔ بچے کی عمر دس سال کے لگ بھگ

تھیں۔ قدر خوفناک حادثہ تھا۔ کتنی ماؤں کی گودیں اجڑ چکی تھیں اور کتنی ماؤں کی فریادیں اپنے بچوں کی زندگیاں مانتی، فضا میں پھری گئی تھیں۔

میرے لیے یہ ساری صورت حال بہت ہولناک اور غیر متوقع تھی۔ میرے اعصاب جواب دیتے جا رہے تھے۔ میں نزدیکی بیٹھ کر اپنے ہاتھ دھرا ہی رہی تھی جب میرے کندھے پر کسی نے ہاتھ دھرا تھا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو نازہ کا افسردہ اور چٹخا ہوا چہرہ میرے سامنے تھا۔

”ٹریفک میں پھنس گئی تھی۔“ مجھے تو نازہ کی آواز بھی پھنسی پھنسی سی لگی۔ ”اس حادثے کی وجہ سے روڈ بلاک تھا۔ بڑی مشکل سے گاڑی وہیں سائڈ پر لگا کر خود پیدل ہی اسپتال پہنچی ہوں اور باہر جو نظارہ دیکھتی اندر آئی ہوں، یقیناً جانو قدموں پر کھڑے رہنا دشوار ہے۔“ مجھے لگا نازہ ابھی روڈے کی، میں نے ڈھارس کی خاطر اسے خود سے لگایا اور وہ جج میں رو دی۔

”بہت بچے مرے ہیں آمنہ!“ وہ پھر مجھ سے مخاطب تھی۔ ”بہت بڑا حادثہ ہوا ہے۔ بچوں کی واپسی ہو رہی تھی کسی ٹرپ سے، اور روڈ ٹنگ یا اور اسپید کی وجہ سے شاید حادثہ ہوا ہے۔ جو بھی ہے بہت سے خاندانوں کا بہت بھاری نقصان ہو گیا۔ کیسے برداشت کریں گی وہ مائیں جو ابھی یہاں پہنچی بھی نہیں، جو گھروں سے اس امید پر نکلی ہوں گی کہ شاید ان کا بچہ زخمی ہو جانے والوں میں سے ہو شاید.....“

نازہ کی بات کسی ماں کے بین نے کافی تھی۔ ہم سے محض چند لمحوں کے فاصلے پر کھڑی ایک ماں اپنے بچے کے مرنے کا سن کر سینہ پیٹ رہی تھی۔ وہ قابو میں ہی نہیں آ رہی تھی۔ اسے زور سے تھامنے اور جکڑنے والے مرد جو یقیناً اس کے رشتے دار تھے..... پوری کوشش میں تھے کہ کسی طرح اسے یہاں سے لے جایا جائے مگر وہ بے حال ہو کر فرش پر بیٹھ چکی تھی اور اس کی

کوفت میں بدلتا جا رہا تھا کہ ایک دم مجھے آس پاس گزرنے والے آثار محسوس ہوئے۔ پہلے پہل تو مجھے تو کیا آیا کہ یہ ہڑ بولنگ کا بے کی مچی ہے مگر پھر اُدھر بھاگتی دوڑتی نرسز میں سے ایک کو پکڑ کر میں جلدی سے پوچھا تھا کہ اسپتال میں ایک دم زخمی کا ہے کو نظر آنے لگی ہے.....؟ ابھی اس نے قدم اٹھاتے مجھے بے حد جگت میں جواب دیا تھا۔ ”ایمر جنسی ہے۔ ایک اسکول بس کا ایک بچہ ہوا ہے۔ بہت سے زخمی بچے لائے جا رہے ہیں۔ بے شمار ڈیڈ باڈ بھی ہیں۔ کم و بیش 100 بچے سوار تھے۔“

میں۔ اور لوڈ ٹنگ کی وجہ سے بس موڑ کاٹنے میں الٹ گئی۔ باقی اس سے زیادہ ابھی کچھ معلوم نہیں یہ کہتے ہوئے وہ تیزی سے کارڈور میں سے گزرتی گئی۔ میں سخت پریشان ہو گئی تھی۔ نازہ نہ کہہ سکتی تھی۔ نرسز اور وارڈ بوائز کے حواس بے چہرے اور ڈاکٹرز کی اسیجھ اس کو پتہ تھا کہ پریشانی عالم میں جو نرسز اور دیگر اسٹاف کو جاری ہدایات ماحول اس قدر سراسیمہ ہو گیا تھا کہ میرا لٹی

کہ دفع کروں نازہ کو اور گھر کی راہ لوں..... چند لمحوں میں، میں اپنی سوچ پر عمل کرنے ہی والی تھی کہ اسپتال کے داخلی دروازے سے وارڈ بوائز در قطار اسٹریچرز تھاے تقریباً بھاگتے ہوئے داخل ہو رہے تھے۔ میرے کان میں سے آتی آواز کی آوازیں بھی سن رہے تھے۔ یقیناً زخمی اور مرے والے کچھ بچوں کے لواحقین پہنچ چکے تھے اور ان کے بین کرنے کی آوازیں تھیں..... میرے دل پر وحشت گھر کرنے لگی تھی۔ بے ارادہ ہی میں چند قدم اٹھاتی داخلی دروازے کے قریب چلی آئی۔

”یا اللہ.....“ پھول سے بچے میری نظروں کے سامنے تھے۔ میرا دل کانپ کے رہ گیا تھا۔ روتے، روتے اور تڑپتے بچے! بے جان، مردہ..... روح بچے۔

کی عیادت کے لیے وقت نکالنے کی کوشش کر رہی تھی جنہیں شدید نوعیت کا ہارٹ ایک ہوا تھا۔ ان کی حالت اب گوکہ خطرے سے باہر تھی مگر فی الحال ڈاکٹرز نے انہیں انڈر آریزرویشن رکھا ہوا تھا۔ یہ شہر کا مینگا ترین پرائیویٹ اسپتال تھا جہاں وہ زیر علاج تھیں۔ نازہ نہ صرف میری فرسٹ کزن بلکہ میری بیٹ فریڈ بھی تھی اور میری پھوپھی ساس اس کی رشتے میں خالہ ساس لگتی تھیں، یوں ہم دونوں کا سسرال بھی ایک طرح سے مشترک تھا اور سسرال کے پیشتر سلسلے ہم دونوں مشترک ہی بھگتاتی تھیں۔

نازہ دو بچوں کی ماں تھی اور ایک ورکنگ وومن بھی..... ایسا ہی کچھ سلسلہ میرا بھی تھا۔ میں بھی ایک انگلش میڈیم اسکول میں ایس ایم کے فرائض انجام دے رہی تھی..... تین بچوں کا ساتھ اور گھر داری کی سوزنے داریاں..... ایسے میں خاندانی معاملات نمٹانا کبھی کبھار بہت مشکل لگتا ہے۔ آج بہت سے ضروری کاموں سے کئی کتر اکریں نے اور نازہ نے ”مشترکہ“ طور پر فیصلہ کیا تھا کہ میں اسکول سے اور نازہ اپنے دفتر سے سیدھی اسپتال چلی آئے اور ہم ان کی عیادت کریں پر حیرت کی بات تھی کہ نازہ کا ابھی تک کچھ پتا نہیں تھا۔ حالانکہ ورکنگ وومن ہونے کے ناتے ہم دونوں وقت کی پابند اور شیڈول کے مطابق عمل کرنے والی عورتیں تھیں۔

ہو سکتا ہے بہت سے لوگ سوچتے ہوں کہ کام کرنے والی خواتین بد سلیقہ اور بد نظمی کا شکار ہوتی ہیں مگر ہم ان دس فیصد عورتوں میں سے ہیں جو گھر اور باہر یکساں بہتر طور پر منبج کرنا جانتی ہیں..... نہ ہمارے انداز و اطوار بد سلیقہ ہیں اور نہ ہمارے گھروں میں بد نظمی ہے۔ حالانکہ ہم دونوں کو بچوں کے ساتھ ساتھ بیمار ساس سر سے بھی واسطہ ہے۔ جن کی ہر قسم کی ذمہ داری اور فرائض ہم بخوبی نبھاتی آ رہی ہیں۔

میں انہی سوچوں میں گم تھی اور اب میرا انتظار



## اقوال حضرت علی کرم اللہ وجہہ

☆ علم وہ شجر ہے جودل میں اگتا ہے، دماغ میں پلتا ہے اور زبان سے پھل دیتا ہے۔

☆ کمزور کا یہی زور چلتا ہے کہ وہ پیٹھ پیچھے برائی کرے۔

☆ اپنے بھائی کو مخلصانہ نصیحت کرو خواہ اسے اچھی لگے یا بری۔

مرسلہ: فائزہ شاہ، پشاور

گیا۔ اماں صبر تو آئے آتے ہی آئے گاناں۔ پر مجھے افسوس رہے گا کہ میرا بچہ جانے سے پہلے آپ سے مل نہیں سکا۔ کاش آپ حج اس کے اسکول نکلنے سے پہلے پہنچ جاتیں۔“ اس کے آنسوؤں نے ایک دفعہ پھر اس کی بات اپک لی تھی۔ چند لمحے کا توقف بھی بارگزر رہا تھا۔ میرا دل کر رہا تھا کہ اس بچے کی چھوٹی سی زندگی کے بارے میں بہت کچھ جان لوں۔

”اماں! آج میرے قصح کی سالگرہ تھی، میرا بچہ پورے گیارہ برس کا ہو گیا ہے آج۔ میں نے ہمیشہ کی طرح آج بھی کیک بیک کرنا تھا مگر آج پہلی دفعہ اماں میرا کیک جل گیا۔ میں نے سوچا شاید چھوٹے بچوں کی مصروفیات اور گھر کے دیگر کاموں کی وجہ سے ایسا ہوا مگر اماں دوبارہ بتاتے ہوئے پورا پیالہ اچانک جھٹک کھا کر الٹ گیا۔ میں حیران کھڑی فرش پر اُلٹے پڑے پیالے کو دیکھتی رہ گئی مگر پھر سر جھٹک کر سوچا کہ جانے دوں! کچھ اور بتالوں گی۔ شام کے لیے قصح کے کپڑے استری کرنے لگی تو شرٹ جل گئی۔ چھوٹے ہادی نے قصح کا فیورٹ ٹیڈی بیئر بھاڑ کر لیر و لیر کر دیا۔ حالانکہ اس نے کبھی بڑے بھائی کے کسی کھلونے کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ میں تفتی دیر قصح کے پھٹے ہوئے ٹیڈی میں سے نکلے روئی کے

میری جانب اٹھی تھیں جبکہ میں اس کے بالکل کھڑی ان دو عورتوں کو دیکھ رہی تھی جو مکمل ہونے کی حالت میں بچے کو دیکھنے جا رہی تھیں۔ دیکھتے ہی جان گئی تھی کہ ان دونوں عورتوں میں سے ایک جس کی عمر بچہ مشکل 30، 32 سال کی ہوگی اس بچے کی ماں تھی۔ بچے نے ہو ہو ماماں کی طرح جرائی تھی جبکہ دوسری خاتون لگ بھگ پچاس سال کی ہوں گی، ہوسکتا ہے نانی یا دادی ہوں۔

میں نے نازہ کا ہاتھ تھاما اور دو قدم پیچھے ہٹ کر ان دونوں خواتین کے لیے جگہ بنائی۔ بچے کی ہار لڑکھڑاتے قدموں سے اس کے قریب ہوئی اور ہولے سے اس کی آنکھوں پر اپنا سر پڑتا ہوا دھڑکا۔ جو نہ جانے سردی کی شدت سے ٹیلا پڑا تھا یا اپنے دل کے ٹکڑے کو مردہ دیکھ کر اچانک اس کی رگوں میں دوڑتا خون جم گیا تھا۔ ایک ساتھ ہی اس کی خوب صورت آنکھوں سے گرے اور بچے کے بالوں میں جذب ہو گئے۔ اس نے دھیرے سے جھک کر بچہ کا ہاتھ چوما، پھر آنکھیں، پھر ناک، دونوں گال۔ اور بس یہاں اس کا صبر جواب دے گیا۔ وہ اچانک پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ چہرہ اتنا سرخ ہوا کہ لگتا تھا جلد پھٹ جائے گی لیکن آفرین تھی اس ماں پر کہ اس نے اپنی چیخوں کا گلا، منہ پر چادر کا پلورہ کر گھونٹ دیا تھا۔ اور ایسا کرنے سے اس کا جسم جھٹکے کھا رہا تھا۔ اس کے ساتھ آئی دوسری خاتون جو خود ہی طرح رہی تھیں آگے بڑھیں اور اسے تھام کر سینے سے لگا لیا۔ میں اور نازہ ان کے کچھ نہ لگتے ہوئے بھی ان کے دکھ کا حصہ بن گئے تھے۔ ہم دونوں ہی آنسو بہانے میں ان کا بھرپور ساتھ دے رہے تھے۔

اس عورت نے اپنا چہرہ چادر سے صاف کیا اور پھر بچے کا ہاتھ نرمی سے تھام کر احتیاط سے اس کا جسم ٹٹولنے لگی۔ اس کے بازو، گردن، سینہ، پیٹ ٹانگیں۔ غرض تمام اعضا اس نے جانچ لیے تھے۔

”آمنہ! اس بچے کے ہونٹوں کو غور سے دیکھو۔۔۔۔۔ یوں جیسے ”ماما“ پکارتے، پکارتے سارکت ہو گئے ہوں۔۔۔۔۔ ہے ناں۔۔۔۔۔؟“ اس کی سوالیہ نظریں

”اور دیکھیں اماں! آپ کو بلانے والا خود چلا

تھی۔ گورا رنگ اور روشن پیشانی، چھوٹا سا دہانہ اور چھوٹی سی کھڑی ناک گردن پر چاند گرہن کا چھوٹا سا سیاہ نشان تھا۔ خوب صورت میز کٹ والے ہلکے براؤن بال بکھر کر ماتھے پر پھیلے تھے۔ ایک کے بعد ایک آنسو بے اختیار میری آنکھوں سے بہتا چلا گیا۔ کاش! یہ بچہ زندہ ہوتا۔۔۔۔۔ میرے دل میں شدت سے خواہش جاگی۔ اس کے رخ ہونے گال پر دھیرے میرے ہاتھ نے اس کے جسم کے بے جان ہونے کی تصدیق کر دی تھی اور مجھے اپنی ٹانگیں بے جان ہوتی محسوس ہو رہی تھیں۔ کیسا ہنسا کھیلتا بچہ میری نظروں کے سامنے مردہ پڑا تھا۔ اس کی ماں کیسے جھیلے گی؟ وہ تو کچھ دیر میں اپنے جگر کے ٹکڑے کی سلامتی کی دعائیں مانگتی بیٹھنے والی ہوگی۔

”یا اللہ! اس کی ماں کو صبر دینا۔“ میرا زواں زواں دعا گو تھا۔ میری نظریں اس کے چہرے سے ہٹتی نہیں تھیں۔ اس کی بائیں آنکھ ہلکی سی کھلی تھی اور نیم وا خوب صورت ہونٹوں کے کنارے سفید پڑ چکے تھے۔ میں نے برقی آنکھوں سے اس کے جسم کو ٹکا۔ حیرت سی حیرت تھی! اس کا جسم کسی بھی قسم کی چوٹ سے پاک تھا۔ کوئی زخم یا کوئی خراش تک نہیں دکھ رہی تھی۔ اسی لیے خون بھی نہیں رس رہا تھا، بھی اس کے جسم پر پڑی چادر بے داغ تھی۔

”تو پھر یہ معصوم مرا کیسے؟“ یقیناً کوئی اندرونی چوٹ تھی جو اس کی جان لے گئی تھی۔۔۔۔۔ میں انہی سوالوں، جوابوں میں آنسو بہاتی اس کے سر ہانے کھڑی تھی جب نازہ میرے قریب آ کھڑی ہوئی۔ میں نے منہ پھیر کر اسے دیکھا تو وہ بھی یک ٹک اس بچے کو ہنسی سکیاں لے رہی تھی۔ میرے کانوں میں اس کی آواز پڑی۔

ماہنامہ پاکیزہ 180 مئی 2013





## احسان تیرا

نوشین ناز اختر

”اللہ جی..... ہائے میری کمر.....“ منہ نے  
 اپنی کمر پکڑ کر بے اختیار کہا۔  
 ”ارے بھو ابھی تو یہ شروعات ہے ابھی تو  
 آگے آگے دیکھو ہوتا ہے کیا۔“ ماریہ نے پیلا جوڑا  
 اور سیلے پھولوں کا زیور پہنے ہوئی منہ کو ڈرایا۔ جو  
 ابھی ابھی رسم کے بعد کمرے میں لائی گئی تھی۔  
 ”کیا مطلب.....؟“ منہ شروع ہی سے بے حد  
 بزدل اور سادہ سی تھی۔ اس نے ڈر کر پوچھا۔

کا پھول سا جسم زخمی ہوا۔ کس درد کے سمندر سے کمر  
 کر اس نے موت کو گلے لگایا۔ جب اسے پہلی خراش  
 آئی ہوگی تو کیسے اس نے ماما کہہ کر مجھے پکارا ہوگا اور  
 کہیں نہ پایا ہوگا۔ ان تمام اذیتوں کے دکھ سے مجھے  
 نجات میں رہنا میرے رب۔ میرے لیے اپنی اولاد  
 کھودینا ہی بڑا صدمہ ہے تو مجھے اس کو کتنا پشیمان  
 سے محفوظ رکھ۔ مجھے اس دکھ سے بچالے..... اور اللہ  
 کا کروڑ ہا شکر ہے اماں! میرا بچہ ایسے ہی موت کی گود  
 میں گیا ہے جیسے میری گود میں سو رہا ہو..... دیکھیں  
 الحمد للہ کوئی خراش نہیں، کوئی زخم نہیں یہاں تک کہ  
 رنگت میں بھی فرق نہیں..... میں اپنے رب کا کیسے  
 شکر ادا کروں اماں! اللہ نے میرے بچے کو اور مجھے  
 دونوں کو تکلیف سے بچا لیا۔ میرا بچہ سکون سے م  
 گیا..... بے حد سکون سے۔“

یہ کہتے ساتھ ہی اس بچے کی ماں اور دادی ایک  
 دوسرے کے گلے لگ گئیں اور پھوٹ پھوٹ کر رو دیں  
 جبکہ مجھے اور نازہ کو جیسے سکتے سا ہو گیا تھا۔ کیسا عجیب  
 روپ تھا یہ ماں کا۔ کیا کوئی ماں اس طرح بھی سوچتی  
 ہے..... بیٹے کے چھن جانے سے زیادہ صدمہ اس  
 بات کا ہوتا جو وہ دشمنوں سے چور مر جاتا..... کیسا انمول  
 روپ تھا یہ ماں کا۔ بلکہ ماں کا ہر روپ ہی انمول ہے۔  
 کوئی قیمت نہیں ماں کے جذبات و احساسات کی۔  
 ماں اچھی، بری کچھ نہیں، صرف ماں ہے۔

وہ رب جو ستر ماؤں سے بڑھ کر پیار کرنے  
 والا ہے کتنا مہربان ہے اپنی مخلوق پر..... ماریہ کی کیا انتہا  
 پر امید کی ابتدا فرما دیتا ہے اور ہمیں اپنے رب کو کیا  
 لوٹانا ہوتا ہے..... صرف اچھے اعمال..... میں نے  
 آنکھیں موند کر اپنے رب سے معافی اور پناہ مانگی اور  
 اس ماں کے لیے دھیر سا حوصلہ اور صبر....

پھر دھیرے سے نازہ کا ہاتھ تھاما اور اسپتال  
 سے باہر نکلنے کے لیے داخلی دروازے کا رخ کر لیا۔

گو لے تھاے سن سی بیٹھی رہی..... پتا نہیں کیوں؟ پر  
 اماں مجھے ہول سے اٹھنے لگے تھے۔ میرے دل میں  
 وسوسے چکرانے لگے تھے۔ آپ جانتی ہیں ناں.....  
 میں وہی نہیں ہوں، بر میں وہم کرنے لگی تھی۔

مجھے نامعلوم سی گھبراہٹ نے اپنی پیٹ میں  
 لے لیا تھا۔ دل چاہنے لگا کہ بس کیسے بھی ہوج گھر  
 آجائے۔ میری نظریں اس کو صحیح سلامت دیکھ لیں۔  
 کچھ نہ سوچا تو رونے لگی۔ آپ کے گھر آجانے سے  
 میرے دل کو کچھ قرار آیا تھا اماں..... لیکن اندر کی بے  
 چینی قائم تھی اور..... اور پھر خبر آگئی اماں، بس  
 ایکسٹنٹ کی خبر..... ایک بھیانک حادثے کی  
 خبر..... اور میری متانے میرے سینے میں گر لاتے  
 ہوئے بین ڈالنے شروع کر دیے۔ میرے پیٹ میں  
 پڑتی گر ہیں شدت سے مجھے احساس دلانے لگیں کہ  
 میری گودا بڑ گئی ہے۔ میرا صبح نام کا موتی میرے  
 خاندان کی مالا سے ٹوٹ کر پھر گیا ہے۔ میں نے  
 بہت رولیا اماں..... میں نے اسی وقت جائے نماز  
 بچھا کر جی بھر کر رولیا اور اس وقت اماں میں نے  
 سجدے میں جا کر اپنے رب سے بس ایک دعا مانگی  
 کہ، ہاں اماں بس ایک ہی دعا..... ”اے میرے  
 مولا! میں تیری رضا میں راضی۔ تیری چیز تھی تو نے  
 واپس لے لی۔ پر یا اللہ! تو نے مجھے اس بچے کی ماں  
 بنایا۔ میرے دل میں اس کے لیے ممتا کا جذبہ کوٹ  
 کوٹ کر بھرا تو اس جذبے اور احساس کے صدمے  
 جو تجھ میں اپنے بندوں کے لیے ستر ماؤں سے زیادہ  
 ہے، مجھے اپنے صبح کا رخ شدہ وجود نہ دکھانا۔ میں  
 اس کی موت کا دکھ تیرے عطا کیے صبر سے سہہ جاؤں  
 گی مگر صرف موت کا میرے مولا..... تکلیف وہ  
 موت کا نہیں..... مجھے ساری عمر کی تکلیف سے بچا  
 لے میرے بالک جو مجھے اس احساس سے ہوتی  
 رہے گی کہ میرا صبح مرتے وقت کس کرب اور اذیت  
 سے گزرنا۔ اسے کہاں کہاں زخم آئے، کہاں سے اس



”ٹھیک ہے پھر یہی لے لیں۔“ منزہ نے پرسکون ہو کر کہا۔

جبکہ ماریہ کا موڈ جانے کیوں اتنا خراب ہو گیا تھا۔ وہ جو ہمیشہ بانو بازار کی چاٹ کی بے حد شوقین تھی اس نے کچھ بھی نہیں کھایا اور بے حد خاموش، خاموشی واپس آ گئی۔

☆☆☆

”منزہ کی امی تمہارے لیے مہندی کا ٹنگن لائی ہیں۔“ امی خوشی سے تمنتاے ہوئے چہرے کے ساتھ اندر داخل ہوئیں۔ وہ جو ماریہ کی خوفناک باتیں سن کر اور کچھ ٹنگن سے مڑھا ہوا ہو کر بستر پر لیٹی ہوئی تھی امی کی آواز سن کر اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”یہ دیکھو منزہ بیٹی.....“ امی نے بہت خوب صورت جڑاؤ ٹنگن اس کے سامنے کیے۔ ”یہ ان کے خاندانی ٹنگن ہیں جو صرف بڑی بہو کو دیے جاتے ہیں۔ خوش قسمتی سے تم ان کی بڑی بہو ہو۔“ امی جانے کیوں اتنی خوش تھیں حالانکہ ان کے خود کے پاس بھی تو طرح، طرح کے خوب صورت زیور تھے۔

”امی ان میں کیا خاص بات ہے، کیا بہت مہنگے ہیں؟“ منزہ ان کی خوشی کی وجہ جاننا چاہتی تھی۔

”بیٹا بے شک یہ مہنگے بھی ہیں لیکن یہ ان کے خاندان کا اعزاز ہے جو بڑی بہو کو عوار و رتبے کی صورت میں دیا جاتا ہے۔“ امی کو شروع سے ہی بڑے پن کا پروٹوکول ملا تھا شاید اسی وجہ سے وہ اپنی بیٹی کے لیے بھی ایسا ہی کچھ چاہتی تھیں۔

”اوہ.....!“ منزہ نے لمبی سانس بھری اسے یہ سب کچھ ابھی بالکل سر سے گزر رہا تھا۔

”میری بیٹی دو روز بعد اپنے گھر چلی جائے گی۔“ امی نے ایک دم اسے اپنے سینے سے لگالیا۔ منزہ کو پہلی بار شادی اچھی لگی۔ اس کی ریزرو سی امی نے اسے پہلی بار اتنی بے تکلفی سے پیار کیا تھا۔ منزہ کو کچھ وہم سا ہوا کہ امی کی آنکھوں میں آنسو

گندی رنگ ماریہ کی سفید رنگت کے آگے گہرا سا نولا لگنے لگا۔

”منزہ اب پسند بھی کرلو۔“ امی نے اسے لگا۔ وہ ان دونوں کی کھسر پھسر سے بالکل انجان حال کے ساتھ بیٹھی اس کی ساس کے لیے سوٹ دیکھ رہی تھی۔

”امی گھر چلیں، مجھے نہیں کچھ پسند آ رہا۔“ منزہ نے بدول ہو کر کہا اسے اور بخ کلر کا ایک لہنگا بے حد پسند آیا تھا جس میں مسٹر ڈیسیجنر تھے اور ان patches پر مختلف پتھروں کی سجاوٹ تھی اور اس کا ڈیزائن بھی تو مہارانی اسٹائل تھا۔

”آف کتنا پیارا ہے ناں!“ اسے پہلی نظر دیکھتے ہی منزہ نے ماریہ کے کان میں سرگوشی کی تھی۔

”پاکل ہو گئی ہو لڑکی، شادی میں دن ہی کتنے رہ گئے ہیں اور تم ابھی تک غیر سنجیدہ ہو۔“ امی کسی کا لانا لیں کرتی تھیں وہ تو بس موقع مل کا لحاظ کیے بغیر اسے ڈانٹ کر ہر جگہ مشنہ کر دیتی تھیں۔

”مجھے نہیں کچھ اچھا لگ رہا ہے آپ کو جو اچھا لگے وہ لے لیں۔“ منزہ نے ماں کے خوف سے ساری پسند حسب معمول ان پر چھوڑ دی۔ اس کا دل چاہتا تھا تو تھا ذرا سی گرج پر سہم کر تنکے کی طرح ہلنے لگتا تھا۔ امی ہمیشہ سے ہی بہت سخت تھیں جبکہ ابو کی وہ لاڈلی تھی۔

”ٹھیک ہے..... پھر یہ سبز، کاہی اور مسٹرڈ بہت اچھے ہیں، یہ لے لو۔“ امی نے سب سے مہنگا اور نقص کا مالا ایک لہنگا اس کے آگے کیا۔

”امی یہ مجھ پر سوٹ کرے گا؟“ اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

”ارے میری چاندی بیٹی تو اس میں بری لگے گی۔“ خالہ نے کہا۔ منزہ نے مڑ کر امی کو دیکھا ان کے چہرے پر بھی ایسی مسکراہٹ تھی جو خالہ کی بات کی تائید کر رہی تھی۔

انیس، سال عمر ہی کیا ہوتی ہے۔ اسے تو ڈھنگ سے چائے تک بنانی نہیں آتی تھی۔ اس کی امی نے پرانے خیالات کی خاتون تھیں خود ان کی سولہویں برس ہو چکی تھی۔ منزہ کی تو ان کے خیال میں بہت مناسب اور اچھی عمر تھی پھر رشتہ بے حد اچھا ورنہ ابوا نکار ہی کر دیتے۔ حمزہ ڈاکٹر تھا۔ مہنگی بھائیوں میں سب سے بڑا۔..... ابوکوان کا خاندان خاص طور پر حمزہ کی عادات بہت پسند آتی تھیں جبکہ کو حمزہ بھائی کی ڈشنگ پر سنبالٹی پسند آتی تھی۔

”بجو قسم سے میرو کس ہیں ان کے زبردست باڈی ہے۔“ سلمان کو آج کل باڈی بلڈنگ کا شوق جو ہو رہا تھا اس نے اپنے ڈولہ دکھاتے ہوئے کہا۔

”لاحول ولا قوۃ..... تم یہ کس قسم کی باتیں کرتے رہتے ہو۔“ فاروق ان سب میں نہ صرف تھا بلکہ بے حد عجیب بھی رہتا تھا۔ مختصر امی، ابوکوان اور اچھا اور مناسب لگا کر کسی نے انکار بھی نہیں کیا۔

”امی میرا بی اے.....؟“ منزہ کو سب سے زیادہ اپنی تعلیم ادھوری رہ جانے کا دکھ تھا۔

”محترمہ اب تو سیدھا سیدھا بی اے (بی اے) ہو گا۔“ ماریہ نے منہ بنا کر کہا۔ ان سب میں ماریہ اس کی شادی سے نہایت ناخوش تھی۔

”شاید..... وہ میرے جانے پر اپ بھٹ ہے۔“ منزہ نے خود ہی سوچا تھا۔

”یہ اور بخ کلر کا لہنگا تمہاری گندی رنگت کو مالا سانولا کر جائے گا۔“ جانے ماریہ کو کیا ہو گیا تھا وہ کام میں کیڑے نکال رہی تھی۔ منزہ نے گہرا کرنا چھوڑ دیا۔

”پھر کون سالوں.....؟“ منزہ نے ماریہ سے پوچھا۔

”کوئی بھی لے لو تمہاری رنگت ایسی ہے تقریباً ہر شوخ رنگ میں تمہیں مسئلہ ہو گا۔“ ماریہ نے بے حد بے دردی سے کہا۔ منزہ کو ایک دم اپنا کھانا

”ارے میری جان، پہلے مایوں پھر مہندی پھر بارات، اس کے بعد ولیہ ان سارے دنوں میں تم کو جیل کے قیدی کی طرح باندھ کر بٹھا دیا جائے گا پھر..... پھر اس کے بعد تمہیں عمر قید سنا دی جائے گی۔“ ماریہ نے اسے مزید ڈرایا۔

”ماریہ میری شادی ہو رہی ہے، مجھے کوئی کالے پانی تھوڑی بھیجا جا رہا ہے۔“ منزہ نے بہم کر مزید کہا۔

☆☆☆

منزہ کی کوئی بہن نہیں تھی۔ ماریہ جو اس کی خالہ زاد تھی وہ ہی اس کی بہن اور دوست تھی۔ منزہ ہر چھوٹے بڑے فیصلے کے لیے ماریہ کی جانب دیکھتی تھی۔ اگر امی ہی اس کی سہیلی بن کر اس کے دل کا حال پوچھ لیا کرتیں تو آج وہ ماریہ پر اس قدر انھار نہ کرتی۔

”میری جان شادی کالے کیا..... ہر طرح کے لال، پیلے پانی کا نام ہے۔ جہاں شوہر آپ کے وجود کو اپنی جاگیر سمجھ کر دن رات جو مرضی سلوک کرے کوئی اسے کچھ نہیں کہہ سکتا اور جناب..... جہاں سسرال والے لڑکی کو نوکرائی بنا کر چین کا کام لیتے ہیں۔“ ماریہ نے شادی کے بعد والی زندگی کا وہشت ناک نقشہ کھینچا۔

”ماریہ اگر شادی اتنی بری ہے تو امی، ابو میری شادی کیوں کر رہے ہیں؟ میں تین بھائیوں کی اکلوتی بہن ہوں، ان کی اکلوتی بیٹی ہوں، مجھ سے تو ابو ہمیشہ بہت پیار کرتے آئے ہیں پھر وہ مجھے کیوں ایسی جگہ بھیج رہے ہیں؟“ منزہ کا معصوم سا چہرہ بے حد خوفزدہ نظر آ رہا تھا۔

”بس یہی اس دنیا کی رسم ہے، لڑکی کو بیاہ دو چاہے وہ جگہ ٹھیک ہو یا نہیں ہو۔“ ماریہ نے ماتھے پر ہل ڈال کر کہا۔ وہ معصوم ہونے کے ساتھ ساتھ بے حد کم عمر بھی تھی اٹھارہ کی بھی پوری نہیں تھی اور اٹھارہ



”مومن!“ حمزہ کا پیار بھرا خمار آلود لہجہ منزہ کو اندر تک پگھلا گیا تھا۔

”جی.....“ اس نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں کھول کر پوچھا۔

”میں آپ کو مومن کہوں گا..... میری دہن کسی چاند سے کم ہے کیا.....“ اس نے کہتے ہوئے گول تکیہ ہاتھ بڑھا کر کھینچا اور ٹیک لگا کر ڈاٹر چھائیٹ کیا۔

”جی..... جی؟“ منزہ کی بوکھلاہٹ اب بھی کم نہیں ہوئی تھی۔

”آپ کو جی کے علاوہ کچھ اور بولنا آتا ہے۔“ حمزہ نے اسے پیار سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”جی..... جی۔“ منزہ کے منہ سے ایک بار پھر جی نکلا تھا۔

اس بار حمزہ کا قہقہہ بہت بلند تھا اور منزہ کے لبوں پر ہلکی سی مسکان۔

دونوں کی زندگی کی پہلی harmony تھی۔ دونوں ایک ہی بات پر ہنسے تھے۔ پارٹنرشپ کی پہلی مشترکہ ہنسی کی پہلی بنیاد..... جسے انہوں نے اپنے سر دکھ میں شیر کرنا تھا۔

☆☆☆

”بجو یہ جو آپ کے میاں ہیں۔“ سلمان نے کچھ عجیب انداز سے منزہ کو مخاطب کیا تھا۔

”کیا ہوا.....؟“ منزہ نے کچھ حیرت سے بھائی سے پوچھا۔ حمزہ تو سلمان کو بہت پسند تھا پھر.....!

”ان کے گرد بہت لڑکیاں گھومتی ہیں، جسٹ لگ ایٹ ہم..... سارے خاندان کی جل پریاں صاحب کو گھیرے ہوئے ہیں۔“ سلمان نے دور کھڑے حمزہ کو دیکھا جو سب سے ہنس کر بات کر رہا تھا۔

”he is very jolly, just nothing“ منزہ نے سلمان کو تسلی دی۔

”جی..... جی..... مجھ سے کچھ کہا.....؟“

”جی..... جی آپ سے ہی تو ساری عمر مجھے کہنا سنا ہے۔ آخر کو آپ میری بیٹر ہاف ہیں۔“ حمزہ نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام کر بہت نرمی سے کہا تھا۔ گھبراہٹ، شرمناہٹ جانے کیسے عود کر آئی تھی کہ منزہ سے سانس لینی دو بھر ہو گئی۔

”آپ پلیز ایزی ہو جائیں۔“ وہ اب بھی اس کا ہاتھ تھامے اسے تنکے جا رہا تھا۔

کھلاؤ اور اسے کچھ دیر آرام کرواؤ، بے چاری جانے کتنی دیر سے بیٹھی ہے۔ حمزہ کو تو ابھی اندر آنے میں دیر لگے گی۔ اس کے دوست اور کزن اسے گھیرے بیٹھے ہیں۔“

جی جلدی جلدی کہتی باہر نکل گئیں۔ بے شک یہ سارا حکم نامہ اس کی خاطر تھا لیکن انہوں نے ایک لمبے کو بھی رک کر منزہ سے اس کا حال نہیں پوچھا تھا بلکہ اس پر نگاہ بھی نہیں ڈالی تھی۔ وہ جو ان کے آنے پر ایک دم الارٹ ہو کر بیٹھ گئی تھی ان کے جانے پر گہری سانس بھر کر رہ گئی۔

اس کی نظر ایک دم بول باجی پر پڑی کچھ ایسی سکھ بھری سانس انہوں نے بھی بھری تھی شاید۔

”ممی کو ہر کام وقت پر کرنے اور کروانے کی عادت ہے۔“ بول باجی جانے اسے تسلی دے رہی تھیں کہ اطلاع..... منزہ ٹھیک سے جان نہیں پاتی تھی۔ لیکن اس کے اندر ساس کا خوف ابھی سے نیچے گائے لگا تھا اور اس سب کے پیچھے ماریہ کا مسلسل سسرال کا نقشہ کھینچنا گویا ایس این ونڈر لینڈ والا حساب تھا۔

حمزہ شروع سے ہی ٹولس کر رہا تھا۔ اپنی نئی ٹوپی دہن کی خوفزدہ حیرت آنکھیں اس سے چھپی ہوئی نہیں تھیں۔ تبھی تو جب وہ کمرے میں آیا تو جس طرح پانی جیتی منزہ کے ہاتھ سے گلاس چھلکا تھا بے اعتبار حمزہ کے دماغ میں بھی ایک جملہ ایس این ونڈر لینڈ ٹوٹا تھا۔

”جی..... جی..... مجھ سے کچھ کہا.....؟“

”جی..... جی آپ سے ہی تو ساری عمر مجھے کہنا سنا ہے۔ آخر کو آپ میری بیٹر ہاف ہیں۔“ حمزہ نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام کر بہت نرمی سے کہا تھا۔ گھبراہٹ، شرمناہٹ جانے کیسے عود کر آئی تھی کہ منزہ سے سانس لینی دو بھر ہو گئی۔

”آپ پلیز ایزی ہو جائیں۔“ وہ اب بھی اس کا ہاتھ تھامے اسے تنکے جا رہا تھا۔

”جی..... جی..... مجھ سے کچھ کہا.....؟“

”جی..... جی آپ سے ہی تو ساری عمر مجھے کہنا سنا ہے۔ آخر کو آپ میری بیٹر ہاف ہیں۔“ حمزہ نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام کر بہت نرمی سے کہا تھا۔ گھبراہٹ، شرمناہٹ جانے کیسے عود کر آئی تھی کہ منزہ سے سانس لینی دو بھر ہو گئی۔

”جی..... جی..... مجھ سے کچھ کہا.....؟“

”جی..... جی آپ سے ہی تو ساری عمر مجھے کہنا سنا ہے۔ آخر کو آپ میری بیٹر ہاف ہیں۔“ حمزہ نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام کر بہت نرمی سے کہا تھا۔ گھبراہٹ، شرمناہٹ جانے کیسے عود کر آئی تھی کہ منزہ سے سانس لینی دو بھر ہو گئی۔

”جی..... جی..... مجھ سے کچھ کہا.....؟“

”جی..... جی آپ سے ہی تو ساری عمر مجھے کہنا سنا ہے۔ آخر کو آپ میری بیٹر ہاف ہیں۔“ حمزہ نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام کر بہت نرمی سے کہا تھا۔ گھبراہٹ، شرمناہٹ جانے کیسے عود کر آئی تھی کہ منزہ سے سانس لینی دو بھر ہو گئی۔

”جی..... جی..... مجھ سے کچھ کہا.....؟“

”جی..... جی آپ سے ہی تو ساری عمر مجھے کہنا سنا ہے۔ آخر کو آپ میری بیٹر ہاف ہیں۔“ حمزہ نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام کر بہت نرمی سے کہا تھا۔ گھبراہٹ، شرمناہٹ جانے کیسے عود کر آئی تھی کہ منزہ سے سانس لینی دو بھر ہو گئی۔

خواہ مخواہ بہت ساری ڈانٹ ایک، ایک بندے الگ پڑی۔ اس کے گرد کتنی چائیں تھیں جن کا وہ بے شک منہ سے نہیں ہوتا تھا لیکن وہ بے حد حد حصار رکھتی تھیں۔

☆☆☆

”تم بالکل دب کر نہ رہنا۔“

”ہاں، سب کے ساتھ اتنا حاصل مل کر نہ رہنا۔“

”سب تمہیں تر نوالہ جان کر کھا جائیں۔“ ماریہ کے وقت تک اپنی سرگوشیاں اس کے کانوں میں اٹھتی رہی تھی۔ جبکہ وہ حمزہ کی موجودگی سے پریشان سہی ہوئی بیٹھی تھی۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد کی سوں، سوں کی آواز پر حمزہ بے چینی سے پہلو رہا تھا۔ جب کتنی ہی دیر اس کے رونے میں وقفہ تو حمزہ نے ایک دم اس کا حنائی ہاتھ تھام لیا۔

”ٹیک اٹ اپزی.....“ حمزہ کی لمبیر آواز اور اس کے گرم، گرم کس پر اس کی پچکیاں اندر گھٹ گئیں۔

”ارے.....“ حمزہ نے شرارت سے اسے دیکھا جو بالکل چپ ہو گئی تھی ورنہ مسلسل آدھے سے وہ رونے سے شغل فرما رہی تھی۔ ایک اس جھونے سے وہ کسی ایسے ریکارڈ کی طرح چپ ہو جس کا اسٹاپ کا بٹن ہاتھ رکھتے ہی دب جاتا ہو۔

منزہ ایک بار پھر اپنے آپ میں سمٹ گئی تھی۔

”بتول یہ کھانا ابھی تک کیوں رکھا ہوا ہے۔“

منزہ نے دہن کو کچھ کھلایا نہیں؟“ اس کی سانس کی ایک دم کمرے کے دروازے پر سنائی دی تھی۔

منزہ کو وہ بالکل اپنی امی کی طرح سخت اصول پرست لگی تھیں۔ ان کی خود کی بنی تھی تاویل دے رہی تھی..... بالکل منزہ کی طرح۔

بھی تو اپنی ماں کے سامنے ہر وقت صفائیاں دے رہی تھی۔

”اچھا ٹھیک ہے، یہ کھانا گرم کرو اور بھائی

بھی تو اپنی ماں کے سامنے ہر وقت صفائیاں دے رہی تھی۔

”اچھا ٹھیک ہے، یہ کھانا گرم کرو اور بھائی

بھی تو اپنی ماں کے سامنے ہر وقت صفائیاں دے رہی تھی۔

بھی چمک رہے ہیں۔

”کیا واقعی، امی کے لیے میں اہم ہوں؟“

اس نے حیرت سے سوچا۔ منزہ کو ہمیشہ ماں سے شکوہ رہا تھا کہ وہ اسے ہر وقت ڈانٹتی رہتی تھیں۔ شاید وہ اتنی بری اور غیر اہم تھی کہ امی کو ہر وقت اس سے شکایت رہتی تھی۔

”اچھا تم آرام کرو۔ میں سیکنہ کے ہاتھ گرم دودھ بھیج رہی ہوں اسے ضرور پی لیتا۔“ امی نے شاید پہلی بار بغیر ڈانٹ کے اسے دودھ پینے کو کہا تھا۔

”واہ شادی سے تو انسان کو باعزت مقام مل جاتا ہے۔“ منزہ نے خوشی سے امی کو جاتے دیکھ کر سوچا تھا۔

بہت دنوں سے علی اور سلمان بھی اس کی ہر بات ماننے لگے تھے۔

”ارے، یہ کیا پلٹ کیسی؟“ منزہ نے حیرت سے پوچھا تھا۔

”آپ ہمیشہ کے لیے ہمیں چھوڑ کر جو جا رہی ہیں۔“ سلمان کا لہجہ بہت ٹوٹا ہوا تھا۔ اس کا منزہ سے ہمیشہ پھڈا رہا تھا اسے کب معلوم تھا کہ وہ بہن کو اتنا چاہتا ہے کہ اس کے جانے کا سن کر اسے بے حد خالی پن کا احساس ہونے لگا تھا۔

”ارے، میں کیا دنیا سے جا رہی ہوں جو تم اس قدر غمگین ہو رہے ہو۔“ منزہ کا خود دل بھرا آیا تھا لیکن اس نے اپنے آنسو کنٹرول کر کے اسے تسلی دی تھی۔

”اللہ نہ کرے بجو!“ سلمان نے سنجیدگی سے کہا۔

”ارے..... تم تو واقعی بہت سیریس ہو گئے ہو۔“ منزہ نے کھوکھلی ہنسی سے کہا۔

”بجو ہمیں جب اتنی اچھی ہوتی ہیں تو پھر انہیں دور کیوں بھیجا جاتا ہے؟“ سلمان واقعی بے حد اپ سیٹ تھا۔

بس منزہ کا ضبط چھوٹ گیا اور وہ اس قدر روئی کہ سب کو سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ سلمان بے چارے کو

بھی تو اپنی ماں کے سامنے ہر وقت صفائیاں دے رہی تھی۔

”اچھا ٹھیک ہے، یہ کھانا گرم کرو اور بھائی

بھی تو اپنی ماں کے سامنے ہر وقت صفائیاں دے رہی تھی۔

”اچھا ٹھیک ہے، یہ کھانا گرم کرو اور بھائی



## سکون

ایک صاحب پریشانی کے عالم میں ایک کمرے میں داخل ہوئے اور وہاں بیٹھے صاحب سے مخاطب ہوئے۔ ”میں ذہنی اور اعصابی سکون کے سلسلے میں آپ سے مشورہ کرنے آیا ہوں۔“

وہ شخص کاغذات سے نظر اٹھاتے ہوئے حیرت سے بولا۔ ”بھلا میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟ میں ڈاکٹر نہیں وکیل ہوں۔“

”مجھے معلوم ہے۔“ آنے والے صاحب گہری سانس لے کر بولے۔ ”میں طلاق کے سلسلے میں مشورہ کرنے کے لیے آپ کے پاس آیا ہوں۔“

مسکراتے ہوئے کہا۔

”میں تو بالکل خلوص سے آپ کی تعریف کر رہی ہوں۔ آپ کی پر سنائی ایسی ہے کہ ہر چیز سوٹ کرتی ہے۔“ ماریہ نے تو حد ہی کر دی۔ حمزہ کے اندر تک ٹھنڈک اتری تھی۔ چائے کے اختتام تک حمزہ، ماریہ سے بے حد بے تکلف ہو چکا تھا۔ جیسے وہ سالوں پرانے دوست ہوں۔

ماریہ کی امی اس سارے دورانیے بالکل خاموش تھیں۔ بیٹی کو اس قدر آزادی دے رہی تھی کہ حمزہ کے ساتھ بے تکلفی پر انہوں نے اعتراض کی رتی بھر ممکن ماتھے پر نہیں آنے دی تھی۔

یہ ملاقات ان کی اگلی مزید ملاقاتوں کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔

☆☆☆

”کہاں کی تیاری ہے؟“ فاروق نے ماریہ کو تیار ہو کر باہر نکلتے دیکھ کر پوچھا تھا۔ وہ لوگ ان کے ساتھ ہی رہتے تھے۔

”آپ سے مطلب.....؟“ ماریہ نے بے حد بدتمیزی سے فاروق کو جواب دیا۔ آج سے پہلے وہ

ان کا کرایہ پریشان ہو گئیں۔

”اوہو! کیا کیا تھا؟ اب تو آپ بالکل نارمل لگ رہی ہیں۔“ حمزہ نے اسے بخور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”کھائی ہی تو کچھ نہیں ہے۔ دو، دودن خالی دودھ یا جوس پرہ لیتی ہے۔ ڈاکٹر نے بھی ابھی کہا کہ بی بی کچھ تو کھاؤ ورنہ گھونٹ پانی بھی پیو گی تو درو اٹھے گا۔“ ماریہ کی امی نے غصے سے کہا تھا۔

”یہ تو ہے ماریہ..... آپ اپنی خوراک پر توجہ دیں ورنہ ایک دن تو بالکل غائب ہو کر رہ جائیں گی۔“ حمزہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

”اب گھر کے ڈاکٹر نے نصیحت کی ہے مانتی تو رہے گی۔ ٹھیک ہے ڈاکٹر صاحب جو حکم آپ کا۔“ ماریہ نے اٹھلا کر کہا۔

”تعلیں، آپ کو چائے پلاؤں۔ ہمارے کیفے کی چائے بہت اچھی ہوتی ہے۔“ حمزہ نے آداب میز بانی نبھاتے ہوئے کہا اور ماریہ نے بلا تکلف فوراً حامی بھر لی تھی۔

”واؤ..... آپ کے پاس تو آئی فون ہے۔“ ماریہ نے حمزہ کے جدید فون کی تعریف کی تھی۔

”آپ کی جو اس بہت اچھی ہے۔ بہت زبردست لگ رہے۔“ ماریہ نے ایک دفعہ پھر تعریف کی تھی۔

”اوہ تھینک یو.....“ حمزہ کو اس کا تعریف کرنا اچھا لگا تھا۔ چائے کے ساتھ حمزہ نے کچھ اسٹیکس بھی آرڈر کیے تھے۔ ماریہ کی امی بہت خاموشی کے ساتھ چائے پیتی رہیں جیسے وہ وہاں موجود ہی نہ ہوں۔

”آپ نے کس قدر ڈفرنٹ کلر کمی نیشن پہنا ہے اور کس قدر سوٹ کر رہا ہے آپ پر۔“ ماریہ نے تعریف کا سلسلہ مزید بڑھایا۔ حمزہ کو بے حد اچھا لگا تھا۔ تعریف ہم جنس سے ہوتی بہت اچھی لگتی ہے۔ یہ تو مخالف جنس سے تعریف تھی۔ جو ہر مرد کو بہت اچھی لگتی ہے۔

”اب آپ مجھے چڑھا رہی ہیں۔“ حمزہ نے

دو۔“ ممی نے منزہ کو آنکھوں ہی آنکھوں میں بھر اشارہ بھی کیا تھا لیکن منزہ کے پلے کچھ نہیں پڑا۔

”چلو حمزہ بیٹا فریش ہو جاؤ تم بھی۔“ ممی نے بہت زیادہ محتاط انداز میں ان دونوں کو کمرے کی جانب روانہ کیا۔

”بیٹا وہ دونوں میاں بیوی کمرے میں ہیں، تمہیں ان کے پیچھے نہیں جانا چاہیے۔“ ماریہ بھی ان کے پیچھے جانے لگی تو ممی نے ذرا سختی سے ماریہ کو روکا تھا۔ ممی کا لہجہ ماریہ کو بہت کچھ جتا گیا تھا وہ بہت برا منہ بنا کر چپکی بیٹھی رہی۔

”بڑی بی تو میری سوچ سے زیادہ تیز اور چالاک نکلیں۔“ ماریہ نے دل ہی دل میں کہا تھا۔

☆☆☆

جب سے ماریہ گھر آئی تھی اسے رہ رہ کر منزہ کا خوش اور مسکان بھرا چہرہ یاد آ رہا تھا۔

اس کے اندر تو جیسے آگ سی لگ گئی تھی۔ حسد کی آگ نظر تو آتی نہیں لیکن یہ اندر سے انسان کی ساری خوب صورتی بھسم کر کے رکھ دیتی ہے۔ ماریہ کے ساتھ بھی تو ایسا ہی تھا۔ وہ منزہ کی ہر اچھی چیز دیکھ کر اسے خوش دیکھ کر ہمیشہ برا محسوس کرتی تھی۔ یہ حسد کا جذبہ بچپن سے پرورش پاتے پاتے اب اس کے ساتھ جوان ہو چکا تھا اور آج منزہ کی خوشی سے بھر پور ازدواجی زندگی ماریہ کو شدید رنج میں مبتلا کر رہی تھی۔

☆☆☆

”ہائے، آپ کیسے ہیں؟“ ماریہ بظاہر اچانک لیکن بے حد پلان سے حمزہ سے ٹکرائی تھی۔

”اوہ آئی ایم گڈ۔“ حمزہ نے بہت کھلی مسکراہٹ سے جواب دیا تھا۔

”آپ یہاں..... خیریت ہے؟“ حمزہ نے

ماریہ کی اسپتال میں موجودگی کی وجہ پوچھی۔

”وہ بس میرے پیٹ میں اچانک اتنا Pain

”بجو پھر بھی ذرا آنکھیں کھول کر۔“ سلمان نے تھوڑی فکر مندی سے کہا تو منزہ کی ہنسی چھوٹ گئی۔

پندرہ سال کا سلمان بڑے بوڑھوں کی طرح نصیحتیں کر رہا تھا۔

”اوئے ہوئے.....! تم کب سے اتنے سنجیدہ ہو گئے؟“ اس نے کچھ حیرت سے پوچھا۔

”بجو..... ہمیں کتنی پیاری ہوتی ہیں ناں! اللہ ہمیشہ انہیں پیار کرنے والے ساتھی دے۔“ سلمان نے ایک دم منزہ کا چہرہ ہاتھوں میں تھام کر کہا۔ بھائی کے اس روپ پر منزہ حیرت زدہ تھی۔

”سلمان.....“ منزہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔

”بجو صرف ایک دن ہوا ہے آپ اس گھر سے گئی ہیں ایسا لگتا ہے پورے گھر کی روشنی ساتھ لے کر چلی گئیں۔ ہر جگہ ایسا ہے کہ جیسے کچھ کی ہو۔“ سلمان جھوٹا تھا اور اسی لیے شاید اتنا expressive بھی تھا ورنہ سب ہی آئے تھے ان سب کے چہروں پر ایک ہی کہانی تھی لیکن بولا کوئی بھی نہیں تھا اور منزہ کی آنکھوں میں جھپکتے موتی لڑیاں پروتے چہرے سے گردن تک آن کرے تھے۔

☆☆☆

”ارے میری سالی آدھے گھر والی آئی ہیں۔“ حمزہ نے ماریہ کوئی وی لاؤنج میں بیٹھے دیکھ کر کہا۔ وہ ابھی، ابھی اسپتال سے لوٹا تھا۔ چھ فٹ سے اونچا نکلتا قد، مسلز سے بھر پور باڈی، گورا چٹانگ وہ کسی قلم کا خوب رو ہیر و لگ رہا تھا۔

”آہ.....“ ماریہ کے دل سے بے اختیار آہ نکلی تھی۔ اس کے سامنے منزہ تو چھوٹی سی لگتی تھی۔

”منزہ.....“ ممی نے کچھ برا مانتے حمزہ اور ماریہ کو دیکھا اور منزہ کو آواز دی۔

”جی ممی.....“ اس نے کچن سے نکلتے ہوئے جواب دیا تھا۔

”حمزہ آگیا ہے، جاؤ اس کے کپڑے نکال



اہمیت دینا، حمزہ کو کمزور کر رہا تھا۔ اب حمزہ کے لیے ایک مرحلہ بن گیا تھا خود کو بچانا..... اور وہ آہستہ آہستہ ماریہ کے قریب ہوتا چلا گیا۔

☆☆☆

فاروق کی کام سے اس شاپنگ مال میں آیا تھا۔ اپنے دوست کے ساتھ ہی وہ مال کے ایک کینے میں آیا تھا۔ یہاں نیم روشنی اور تیز آواز کے میوزک میں جوان لڑکے اور لڑکیاں ایک دوسرے میں گم تھے۔

فاروق، جس ٹیبل پر آکر بیٹھا وہاں سامنے ہی ماریہ اور حمزہ ایک دوسرے میں کھوئے ہوئے تھے۔ فاروق ڈھیرے شکاک میں تھا۔ ماریہ بچپن سے ہی اس سے منسوب تھی۔ دوسری طرف بہنوئی..... اس کی بہن کا گھر اجڑ رہا تھا۔ کچھ ہی دیر میں جب ماریہ اور حمزہ کی بے تکلفیاں بڑھیں تو فاروق کی اذیت میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ بے اختیار ہی ان کی ٹیبل پر جا کھڑا ہوا۔

فاروق پر آیا زلزلہ اب حمزہ اور ماریہ کے چہروں پر بھی نظر آرہا تھا۔ بالآخر وہ گھڑی آہی گئی جب فاروق نے بہن کا گھر بچانے کے لیے حمزہ سے دو ٹوک بات کرنے کی ٹھان لی۔ اس کے استفسار پر بہنوئی نے بھی کوئی گلی لپٹی نہ رکھی اور اس کی معصوم بہن کا قصور بتا دیا۔

”آپ کی بہن میری زندگی اور دل میں وہ خاص مقام نہیں بنائی جو اسے بنانا چاہیے تھا۔“ حمزہ کی بات کو فاروق نے کسی زوردار تھپڑ کی طرح سہا تھا۔

”کیا کمی ہے اس میں.....؟ آپ کی امانت کی امین نہیں؟ بد صورت ہے؟ دھوکے باز ہے؟..... کیا کمی ہے اس میں جو آپ نے اتنا بڑا فیصلہ کر ڈالا۔“ حمزہ کے پاس کسی سوال کا جواب نہیں تھا۔ نہ ہی وہ کسی سوال کو جھٹلانے کی کنڈیشن میں تھا کیونکہ واقعی وہ کسی بھی سوال کا جواب دینے سے قاصر تھا۔

☆☆☆

شاید روٹی بھی تھی۔ اس کی پلکیں بھیگی ہوئی تھیں۔ حمزہ کے دل کو ایک دم کچھ ہوا تھا۔ وہ بہت معصوم تھی اور وہ اس کے ساتھ کیا کر رہا تھا۔ شاید..... وہ اسے دھوکا دے رہا تھا۔ حمزہ نے ہاتھ بڑھا کر اسے ایک دم قریب کر لیا۔ حمزہ نے چکی نیند سے بھری آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں کے گلابی ڈورے حمزہ کو مزید کمزور کر گئے۔

”سوری.....“ حمزہ کی آواز شدت جذبات سے بھاری ہو رہی تھی۔

حمزہ نے اپنا آپ اس کے سینے میں چھپا کر اپنی صاف دلی کا مزید احساس دلایا۔ اگلا بل حمزہ کے لیے بہت بے اختیار تھا۔ اللہ تعالیٰ نے میاں بیوی کے رشتے میں جو خوب صورتی اور آپس کے ساتھ کا سکون دیا ہے وہ نہ ہو تو شاید انسان حیوانوں سے بھی بدتر ہو جاتے۔

صبح بہت خوب صورت تھی۔ حمزہ بہت چمک رہی تھی، اتنی کہ حمزہ خود چونک، چونک کر اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ بے حد خوب صورت لگ رہی تھی۔ ازدواجی خوشحالی کو کسی ہارسنگار کی طرح خوب صورت کر رہی ہے۔ حمزہ کو دلی طور پر شرمندگی ہوئی تھی۔ اس نے دل ہی دل میں عہد کیا تھا کہ وہ ماریہ کی جانب تیزی سے بڑھتے قدم روک لے گا۔

☆☆☆

لیکن ماریہ تو کسی اور ہی موڈ میں تھی جس نے حمزہ کی ہر سوچ پر پانی پھیر دیا تھا وہ جس طرف بھی رخ موڑتا تھا، وہ اسی طرف سے آن کھڑی ہوتی تھی۔ اسے لگا تھا کہ کوئی بندگی ہے جس میں وہ پھنس کر رہ گیا ہے۔ اس کا کمزور نفس تعریف، چالپوسی اور اداؤں سے پھنس کر رہ گیا تھا۔

ماریہ حسین تھی لیکن اتنی حسین نہیں تھی کہ حمزہ کو حیرت کرے۔ لیکن اس کی حد سے زیادہ نچھاور ہونے کی اور اور بات، بات پر حمزہ کی تعریف کرنا اسے بے انتہا

پھنکار رہی تھی۔ اب اسے مجبوراً کسی دوست کے ہاں پہلے ڈراپ ہونا تھا۔ ”مجھے اسی کو یہ سب بتانا پڑے گا۔ ورنہ یہ تو..... تو بے پورے گاؤں دور ہیں۔“ ماریہ مسلسل بڑبڑاتی ہوئی اندر چلی تھی۔ چادر جو اڑ رہی تھی۔ موصوف کا حکم تھا۔

☆☆☆

”آپ آج بہت لیٹ ہو گئے؟“ حمزہ نے ٹی وی آف کرتے ہوئے حمزہ سے پوچھا تھا۔ وہ اس کے انتظار میں ٹی وی آن کر کے بیٹھی تھی۔

”ہوں.....“ اس نے مختصراً جواب دیا تھا اور چیخ کرنے ڈیرنگ روم میں چلا گیا۔

”کھانا لاؤں؟“ حمزہ کو حمزہ کافی دن سے بدلا بدلا سا لگ رہا تھا۔

”نہیں کھا چکا ہوں۔“ اس نے بے حد روکے لہجے میں کہا۔

”مگر میں نہیں کھایا.....“ حمزہ نے دھیمی آواز میں کہا..... ساتھ ہی بے اختیار ہاتھ ملے۔

”حمزہ..... میری ڈیوٹی کچھ مختلف ہے، اکثر دیر ہو جاتی ہے تم ڈنر پر میرا انتظار نہ کیا کرو، اسے ٹائم برکھالیا کرو۔“ حمزہ نے مڑ کر کہا۔ وہ ایک دم بچہ کر رہ گئی۔ وہ اتنی کم عمر تھی کہ اسے اپنے جذبات کا اظہار کرنا اور ان کا احساس دلانا آتا ہی نہیں تھا۔ وہ کہہ

ہی نہیں سکی کہ حمزہ آپ کے علاوہ میرا یہاں اور کون ہے..... ایک آپ سے ہی زندگی کی ہر خوشی بڑی ہے، آپ کا انتظار کرنا، آپ کو سوچنا کتنا خوب صورت ہے۔ اے میں آپ کے انتظار کے بنا کھالینا میری اس خوشی کو چھین لے گا۔

وہ بھوکے پیٹ ہی لیٹ گئی۔ کچھ آنسو اس کے گالوں پر ٹھک کر ٹھوڑی تک آگئے تھے۔

حمزہ نے رات کے جانے کس بل کروٹ لی تو بے اختیار اس کی آنکھ کھل گئی۔ زیرو بلب کی روشنی میں سوئی حمزہ کے چہرے پر بچوں کی مصحوبیت تھی۔

صرف فاروق کو خوش کرنے کا سوچتی تھی اور اس کا رویہ فاروق کے ساتھ ہمیشہ نچھاور ہونے والا ہوتا تھا۔

ایسے میں یوں..... فاروق کے لیے دھچکا ہی تھا۔ اسے ماریہ کے ایسے لہجے کی عادت بالکل نہیں تھی۔

”یہ تم کس لہجے میں بات کر رہی ہو؟“ فاروق نے اسے بے حد غور سے دیکھا تھا جیسے وہاں اس کے نقوش میں کوئی تبدیلی آگئی ہو..... اور یہ سچ ہی تھا کہ اس کے نقوش کی ترتیب بدل گئی تھی۔ وہاں بے حد اجنبیت اور غصہ تھا۔

فاروق بہت انا پسند اور بے حد رکھ رکھاؤ والا انسان تھا۔ اپنی عزت دوسروں سے کروانے سے پہلے خود کی بہت عزت کرتا تھا۔

”آپ..... ہمارے گھر ہماری فیملی کے ساتھ رہتی ہیں، آپ جب تک ہمارے ساتھ رہ رہی ہیں اس گھر کی عزت بھی آپ کے ساتھ منسلک ہے۔ آپ کا ہر، ہر رویہ اس گھر کی نمائندگی کرتا ہے۔ آپ خود کو الگ نہیں کر سکتیں۔ آپ جواب دہ ہیں مجھے اور اس گھر کے تمام بڑوں کو۔“ فاروق نے بے حد سنجیدگی اور بہت تفصیل سے جواب دیا تھا۔

وہ دھاڑتا چنگھاڑتا نہیں تھا بلکہ بے حد لاجک سے بات کرتا تھا۔ اس کے لہجے کی سنجیدگی بڑے بڑوں کو سہا دیتی تھی۔

ایک بل کو ماریہ کی ساری باغی سوچ جانے کہاں بھاگ گئی تھی اور وہ بھی سہم کر رہ گئی تھی جیسے اس کی سوچ فاروق نے پڑھ لی ہو۔

”دراصل میں اپنی فرینڈ کی برتھ ڈے پارٹی میں جا رہی ہوں۔“ ماریہ کے شعلے بھرے لہجے پر پانی پڑ چکا تھا۔

”اوکے..... کوئی چادر اوڑھ لیں، میں آپ کو ڈراپ کر دوں گا۔“ فاروق، ماریہ کا مزید کوئی بہانہ سننے بنا یا ہر نکل چکا تھا۔

”ہونہ..... یہ بڑھا بابا اور مجھے.....“ ماریہ



ہوئی آواز میں کہا۔

نہیں آ رہا تھا۔

☆☆☆

”ضرور یار..... منزہ میری بھی بہن ہے۔ اس کا گھر بچانے کے لیے میں جو کرسکا ضرور کروں گا۔“ احمد نے فوراً اپنے تعاون کا یقین دلایا۔ فاروق کو فوراً کچھ سمجھ نہیں آئی۔ اسے دادی اماں کی بچپن سے پڑھائی ایک فصاحت یاد آگئی۔ ”جب کوئی ایسی مشکل آن پڑے جہاں دل و دماغ کوئی مدد نہ کرے تو حاجت کے نوافل پڑھ کر اللہ سے مدد مانگنی چاہیے۔“ فاروق نے ایسا ہی کیا۔

وہ اپنی بہن کا صرف گھر نہیں بچانا چاہتا تھا وہ تو پھر بھی بس سکا تھا کسی کے ساتھ بھی ساری دنیا میں ہزاروں لڑکیوں کی طلاقیں ہوتی ہیں۔ ان کے گھر ٹوٹتے ہیں اور دوبارہ اللہ کے حکم سے بنتے ہیں۔ وہ اپنی بہن کا دل بچانا چاہتا تھا۔ اپنی معصوم بہن کا انسانوں پر اعتبار بچانا چاہتا تھا۔ اپنے بوڑھے ہوتے ماں، باپ کا سکون بچانا چاہتا تھا۔ اپنے چھوٹے

”یار فاروق میں نے ابھی ابھی تمہارے بیوی اور تمہاری کزن ماریہ کو سراج احمد کے روم سے نکلے دیکھا تھا۔ تمہاری کزن تو تمہاری میگزین بھی ہے ناں؟ میں نے ان کے جانے کے بعد سراج احمد سے پوچھا کہ یہ دونوں کیوں آئے تھے تو پتا چلا کہ اپنے شاخنی کارڈ وغیرہ جمع کروا کر گئے ہیں۔ کل دونوں کورٹ میرج کر رہے ہیں۔“ ایڈووکیٹ احمد جو فاروق کا دوست تھا، آج کل میر سراج احمد کے چیمبر میں بیٹھتا تھا اور جوئیئر وکیل کے طور پر جاب کر رہا تھا۔ اس نے فاروق کو فون کر کے کہا تھا۔

فاروق کے سر پر جیسے دھا کا ہوا تھا۔ وہ خود کو ایک دم بہت بے بس محسوس کر رہا تھا۔

”یارتو ایک فیور کرنا اگر رات تک میں تمہیں کال کروں تو تم فوراً آ جانا۔“ فاروق نے بے حد بھی

میری حمزہ میں دلچسپی سے واقف ہیں۔“ ماریہ غصے سے کہا تھا۔

”میں نے بہت سوچا ہے ماریہ، یہ بہت مشکل ہی نہیں ہے بلکہ ناممکن بھی ہے۔ حمزہ اگر راضی ہو پہلے رشتہ دیتا اب تو بہت مشکل ہے پھر ہم اس میں تو رتے ہیں اور یہاں سے ہی کھاتے ہیں۔“ طرح طرح تو ہم کہیں کے بھی نہیں رہیں گے۔“

”میں حمزہ سے بات کرنی ہوں تب تک اسے خالہ کو روکے رکھیں، سمجھ نہیں آتی فاروق نے مجھے کے ساتھ دیکھا بھی تھا پھر بھی کیسے اس بات کو دوبارہ رشتے کی بات کر رہا ہے۔ بڑا ہی بے غیرت ہے۔“ ماریہ نے ہنستے ہوئے کہا..... اس ہنسی میں اس کا یہ غرور بھی شامل تھا کہ وہ چھوٹے جانے کے شے نہیں تھی۔

☆☆☆

”مجھے پہلے منزہ سے بات کرنی ہوگی۔“ سارا بات سن کر حمزہ نے تنجیدگی سے ماریہ سے کہا تھا۔

”کیسی حماقت کرتے ہیں آپ؟ منزہ کو پتا ہے کہ مطلب ہے کہ یہاں سارے گھر والوں کو فون ہو جائے گی اور ہمارے لیے وہاں کی زمین بھی تنگ ہو جائے گی۔ آپ میرے اور میری ماں کے بے رہنے کا بندوبست کریں۔ ہم وہاں سے نکلنے ہیں اور پھر ہمارا نکاح ہو جائے تو آپ ساری دنیا کو بتا دیں مجھے اعتراض نہیں ہوگا اور نہ ہی کوئی پروا۔“ ماریہ نے بے حد بے نیازی سے کہا تھا۔

”ہوں.....“ جواباً حمزہ کی ہوں بہت فرمند اور پرسوج تھی۔ وہ خود کو کسی ٹکٹے میں پھنسا محسوس کر رہا تھا۔ منزہ کا بے قصور اور معصوم چہرہ اور دوسری جانب ماریہ کی جانب جھکا دل..... اس کے پس پیار کی شدتوں کو آزما لینے کے بعد وہ کہیں اور نہ رہا تھا۔ وہ خود کو دو حصوں میں بٹا محسوس کر رہا تھا۔ لیکن اسے کچھ کرنا تو تھا لیکن کیسے؟ یہ اس کی سمجھ میں

”ماریہ کیا بات ہے آج کل بہت خوش ہو؟“ فاروق ناشتے کی ٹیبل پر اس کے پاس بیٹھ کر ٹوسٹ پر مکھن لگا رہا تھا اور بغور ماریہ کو دیکھ رہا تھا۔

”آں..... ہاں..... شاید۔“ ماریہ جیسے کسی چوری پکڑے جانے پر بوکھلائی تھی۔

”حیرت ہے کہ تم خوش ہو اور تمہیں یقین سے پتا بھی نہیں..... یہ کیسی خوشی ہے۔“ فاروق نے ذہنی بات کی تھی۔

”کیا مطلب ہے؟“ ماریہ نے اپنی ٹیکھی سی ناک چڑھائی تھی۔

”مطلب کی زبان نہیں ہوتی..... مگر مجھے اپنی زبان میں مطلب سمجھانا اچھی طرح آتا ہے۔“ وہ شعلے برساتی نگاہوں سے اسے دیکھتے باہر نکلا تھا۔

☆☆☆

”ٹھیک ہے تم باجی سے بات کرلو، یہ تو گھر والی بات ہے کوئی تکلف تو ہے نہیں۔“ ابو نے امی کی بات سن کر کہا تھا۔

”یہ تو ہے.....“ امی نے پرسوج انداز میں کہا۔ انہیں بھی تسلی تھی کہ یہ تو واقعی گھر والی بات تھی۔ بچپن سے تو ماریہ کو مانگا ہوا تھا۔ انہوں نے ہمیشہ سے ماریہ کو بہو کے روپ میں سوچا تھا لیکن وہ نہیں جانتی تھیں کہ ماریہ کی سوچ کس قدر بدل چکی تھی۔ وہ خود کو کس روپ میں کس جگہ دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

”نہیں، خالہ سے کہیں کہ یہ نہیں ہو سکتا۔“ ماریہ نے ماں کی بات سن کر غصے سے کہا۔

”لیکن میں ان سے کہوں کیا؟“ ماریہ کی امی نے پریشانی سے پوچھا۔

”صاف اور سچ..... اس کا لہجہ کسی حد تک خطرناک تھا۔“

”کیا سچ.....؟“ ماریہ کی ماں نے پوچھا۔

”امی پلیز بچوں والے سوال نہ کریں آپ

## نسخہ سیرپاؤر

ایک خواتین کیلئے بھی مفید ہے جو شوگر کی وجہ سے پریشان ہو رہی ہیں اور خاص کمزوری شوگر، بلڈ پریشر کی وجہ سے پریشان ہو رہی ہیں اور ایک بار اسے ضرور استعمال کریں اور تمام عمر فٹ رہیں

نوٹ نسخہ سیرپاؤر سونے، چاندی یا قوت، زہرہ، حقیق

موتی پاپا بڑا ہوا بیٹا و حاکم ہوا بیٹا قد سے زائد وزن جسم کی فاقہ جو بی بی سے کرنا غرض ہو جائے گی

کورس ایک ماہ صرف 2000 روپے کورس ایک ماہ صرف 1200 روپے

محکم عالم شیرکھل بلکھے شاہ رڈ نزد ڈاڈا الیانی قصو شہر 0345-6397367, 0300-4280816



کھائے گی اور وہ جیتی بازی ہار جائے گی۔ کل صبح وہ اور حمزہ نکاح کرنے والے تھے سب ٹھیک چل رہا تھا۔ بہت پلاننگ کے ساتھ..... لیکن ایک دم جیسے سب گڑبڑ ہو گیا تھا۔ کوئی بہت بڑی غلطی ہو گئی تھی۔ جو یہ سب ایک دم کرنا پڑ رہا تھا لیکن وہ کہاں چوکی تھی یہ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا۔

حمزہ کو اس نے اسپتال، گھر، دوست ہر جگہ ڈھونڈا ایسا لگ رہا تھا کہ وہ اسے ایوانڈ کر رہا تھا لیکن کیوں.....؟ وہ تو اس سے بہت محبت کرتا تھا۔ اس کے بناس کا دم گھٹا لگتا تھا۔

”حمزہ.....“ ماریہ ایک دم رو پڑی تھی۔ ”تم کہاں ہو.....؟“ مجھ سے میری زندگی کا حق چھینا جا رہا ہے۔“ ماریہ نے بے حد بے بسی سے سوچا۔

وہ بہت غلط کرنے جا رہی تھی لیکن اسے اپنا غلط اقدام غلط نہیں لگ رہا تھا بلکہ اپنے ساتھ فاروق کا نکاح زیادتی اور غلط لگ رہا تھا۔

دوسری جانب فاروق کی intentions بہت سچی تھیں۔ اللہ نے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ یہی تو صرف آدھے گھنٹے بعد ماریہ بچل سے وہ ماریہ فاروق ہو چکی تھی۔

فاروق نے جب نکاح نامے پر سائن کیے تو اسے بے اختیار احساس ہوا کہ جیسے اس نے چڑیا کے پر کاٹ دیے ہوں۔ لیکن ساتھ ہی نفرت کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگا تھا کہ وہ ایسی عورت کو کیونکر بیوی کا درجہ دے گا جو کردار کی غازی ہرگز نہ تھی۔

☆☆☆

حمزہ کی امی نے جھوٹ موٹ کا ہارٹ اٹیک کا ڈراما چاکے بیٹے کو روک لیا تھا۔ اسے بہن کی بیٹی دکھانے کے بہانے بلا کر وہ حمزہ کے لیے ایک دیوار بن گئی تھیں۔ بہن نے حمزہ کا سیل فون اس افراتفری میں ہتھکیا..... ماں بھی کہیں اور بھی کہیں درد کی پکار لگا کر بیٹے کو مصروف اور پریشان رکھے رہیں۔ کوئی

”یہ سب کیا کیوں ہے؟ میں نہیں کر رہی فاروق سے نکاح۔“ ماریہ نے چلا کر ماں کو انکار کیا تھا۔ ”تو بتا دو میں کیا کروں؟ تمہیں کہا بھی تھا کہ مزہ سے بات کرو مگر تم نے کوئی قدم نہیں اٹھایا اور یہاں پر میں پھنس کر رہ گئی ہوں۔ کیا کہہ کر انکار کروں۔ تمہارے ساتھ خود بھی سڑک پر آ جاؤں کیا؟“ خالہ نے غصے سے کہا تھا۔

ماریہ نے زچ ہو کر حمزہ کو ایک بار پھر فون ملایا مگر وہ بار بار رکت رہا تھا۔ گھر فون کیا تو مزہ کی چھوٹی منڈ نے ہی ہر بار اٹھایا اور بتایا کہ بھائی باہر نکلے ہیں چائیں کہاں گئے ہیں۔ کسی کو کچھ پتا نہیں تھا۔ مزہ کو فون کیا تو وہ خوردستے میں بھی یہاں آنے کے لیے۔ اس کی آخری بار حمزہ سے صبح بات ہوئی تھی۔ ماریہ کو مزہ پر بے حد غصہ آیا تھا کہ کیسی بیوی ہے جسے اپنے میاں کے کل وقوع کا پتا نہیں تھا۔

”حمزہ..... حمزہ یک اپ و فون۔“ ماریہ بار بار فون کرتی جاتی اور کال گر رہی تھی لیکن کوئی رسپانس نہیں تھا۔

”امی میں خود جا کر پتا کرتی ہوں۔“ ماریہ نے باہر نکلنے کی کوشش کی مگر امی نے زور سے اسے کھنچا۔ ”تمہیں اس وقت گھر سے باہر بھیج کر میں ساری زندگی خاندان والوں کو منہ نہیں دکھا سکتی۔“ ماریہ کی امی نے بے حد سخت لہجے میں کہا۔

”امی مجھے جانے دیں، میری زندگی کا سوال ہے۔“ وہ تپ رہی تھی۔

”ہماری زندگی کا سوال تھا تبھی تو اتنے عرصے سے کیوں کر رہی تھی کہ تمہیں جو چاہیے عملی طور پر مدد دست کرو۔ میں نے بہت ساتھ دیا تمہارا مگر اب اس عمر میں بڑھاپے میں سڑک پر آ جاؤں۔ نہ..... نہ..... میں کسی طور پر یہ رسک نہیں لے سکتی۔“ امی نے صاف جواب دیا تھا۔

ماریہ کو یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ قسمت ایسے پلٹا

میں کروں گی۔“ انہوں نے خلوص دل سے بھری تھی۔

”ٹھیک ہو آئی..... میرے لیے بھی دعا کرو جو کام میں کرنا چاہتا ہوں۔ عافیت کے ساتھ تکمیل تک پہنچ جائے۔“ فاروق نے بے حد دھمکی سے کہا تھا۔

”انشاء اللہ!“ انہوں نے دعائیہ انداز میں کہا۔ ☆☆☆

”یہ سب کیوں فاروق.....؟“ امی اور دونوں بہت حیران تھے۔ فاروق کی ڈیمانڈ اور اسے سن کر وہ حیران تھے۔

”امی یہ احمد آپ کے پاس بیٹھا ہے، پوچھا کہ کمپنی کو ڈاکو میٹس آج ہی چائیں ورنہ میرا کورس کا چانس نہیں ہے۔ احمد کو میں ڈاکو میٹس کر آج ہی اسلام آباد بھیجنا چاہتا ہوں۔“ فاروق نے

ماں باپ سے بے حد اصرار سے کہا تھا۔ جواب امی کو فاروق کی اتنی غلبت کو مجبوراً قبول کرنا پڑا تھا۔

”ٹھیک ہے، ہم نکاح میں ابھی کسی رشتے دار نہیں بلائیں گے ورنہ رشتے دار بہت باتیں بنا دیں گے۔ بعد میں تم لوگوں کی شادی پر اکٹھے ہی بلا دیں گے۔“ امی نے بددلی سے کہا۔

صبح تک اس گھر میں تقریب کی کوئی بات نہیں تھی اب بیٹھے بٹھائے وہ تقریب ارباب کر رہی تھی جس کا ارمان انہیں بڑے عرصے سے تھا۔ ایسے فوراً وہ اپنے ارمان پورے نہیں کر سکتی تھیں۔ اب اس بات کا دکھ تھا۔

”ٹھیک ہے امی، آپ اب خالہ کو بھی سب بتا دیں۔“ آدھے گھنٹے بعد مولوی صاحب آجائے۔

”فاروق نے تو کھلی چادی تھی۔“ ٹھیک ہے۔“ امی، خالہ کے کمرے

جانب بڑھی تھیں۔ ☆☆☆

بھائی کی بے فکری بھری زندگی بچانا چاہتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ گھر اجڑ کر دوبارہ بس جاتے ہیں لیکن اعتبار، سکون، بے فکری اور دل اجڑ کر بسا قسمت سے ہوتا ہے۔ زیادہ تر یہ اجڑ کر بستے نہیں ہیں اور دلوں کو ساری زندگی کا روگ لگ جاتا ہے۔ جیسے ہی فاروق نے نواں ختم کیے گھر کا لینڈ لائن نمبر دوبارہ بچا تھا۔ وہ دعائیں مانگتے مانگتے اٹھا تھا۔ دوسری جانب مزہ کی ساس تھیں ان کے ہاں نواسی کی پیدائش ہوئی تھی اور وہ اپنی سمدھن سے بات کر کے اپنی خوشی شہر کرنا چاہتی تھیں۔ تین نواسوں کے بعد اللہ نے انہیں نواسی دی تھی۔

فاروق کو بس چند سیکنڈ لگے تھے فیصلہ لیتے۔ اسے ایک دم سے اس مسئلے کا حل نظر آیا تھا۔

”آئی، مجھے آپ سے بہت اہم بات کرنی ہے اور بہت جلد..... یہ میری بہن کی زندگی کا مسئلہ ہے۔“

”خیریت ہے بیٹا.....؟“ مزہ سے ابھی میری گھر بات ہوئی تھی۔ وہ تو ٹھیک تھی ایسی کیا بات ہے.....؟“ مزہ کی ساس کا گہرا نا بے حد بچل تھا۔

”آئی پلیز آپ حمزہ یا مزہ سے کوئی بات نہ کریں..... بس مجھے اجازت دیں کہ میں ابھی آکر آپ سے اسپتال میں مل لوں۔“ فاروق کے لہجے میں بے حد منت تھی۔ اس کے لہجے میں کچھ ایسا تھا کہ انہیں ملنے کے لیے حامی بھر رہی ہی پڑی۔

”ٹھیک ہے آ جاؤ۔“ انہوں نے گرین سگنل دے دیا تھا۔

☆☆☆

فاروق اور اس کے دوست کی ساری بات سن کر انہیں شرمندگی اور غصے نے یک وقت گھیرا تھا۔ وہ مزاج کی سخت ضرورتیں لیکن اصولی تھیں کسی کی حق تلفی کرنے کی روادار نہ تھیں۔ انہیں اپنے بیٹے کی اس حرکت پر بہت غصہ آیا۔

”بیٹا تم مجھ سے جو تعاون چاہتے ہو،



تین گھنٹے بعد حمزہ کو اندازہ ہوا کہ اس کی امی کو جان کا خطرہ نہیں ہے بس کوئی ٹینشن تھی لیکن پھر بھی وہ رات بھر اپنی ماں کے ساتھ رہا کیونکہ اس کی ماں اسے ہر بل ساتھ دیکھنا چاہ رہی تھیں۔

حمزہ کو لگا کہ امی کچھ اپنی کیفیت سے گھبرا گئی ہیں۔ اس کا ان کے پاس ٹھہرنا ہی بہتر ہوگا۔ اس سارے دور ایسے میں امی نے اتنا پریشان رکھا کہ اسے اپنے فون کے دور ہونے کا اندازہ بھی نہیں ہوا۔ اس دوران بتول باجی سب میچ اور کال ہٹری ڈیلیٹ کر چکی تھیں۔ یہ سب انہوں نے حمزہ اور منزہ کی بھلائی کے لیے کیا تھا اور وہ اپنے کیے پر بالکل شرمندہ نہ تھیں۔ حمزہ نہیں جانتا تھا کہ اس کی زندگی بدل چکی ہے، کل نکلنے والا سورج اپنے ساتھ اس کے لیے کیا شاگن نیوز لارہا تھا جو اسے واقعی ہلانے کے لیے کافی تھی۔

☆☆☆

”السلام علیکم!“ منزہ کی چپتی آواز پر حمزہ نے آنکھیں کھولی تھیں۔

”وعلیکم.....؟“ حمزہ آدھا سا جواب دیتا آنکھیں ملتا اٹھا تھا۔

”امی اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟“ آپ نے مجھے کیوں نہیں بتایا، مجھے کیوں نہیں بلوایا؟“ منزہ نے ساس کے گلے لگ کر کہا جو بظاہر چہرے پر نقاہت سجائے آرام سے بستر پر لیٹی تھیں۔ رات بھر حمزہ نے ماں کے سر ہانے گزاری تھی۔ اسے امی نے کسی طرف توجہ دینے ہی نہیں دی تھی۔ جب بھی ان کی آنکھ کھلتی تو وہ حمزہ، حمزہ کی پکار لگا دیتی تھیں۔ حمزہ حقیقت میں گھبرا گیا تھا۔ اس کی امی تو بہت بہادر عورت تھیں، انہیں اتنا کمزور پڑتے اس نے بھی نہیں دیکھا تھا۔

”تم ایک آدھ دن کو تو میکے جاتی ہو کیوں تنگ کرتی، میں تو اپنے حمزہ کے پاس تھی۔ میرے لیے

میرے اللہ کے بعد میرا بیٹا کافی ہے۔“ حمزہ.....؟“ امی نے ماں سے بیٹے کو دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

”بالکل امی.....“ اس نے ماں کے چومتے ہوئے کہا اور دروازے پر کھڑے فاروق کے دل نے بے اختیار اس عورت کو سلام کیا تھا جس کی سختی اور اصول پرستی کی وجہ سے سب گھبرائے تھے۔ آج انہوں نے ثابت کر دیا کہ وہ زبان کی سخت ضرورت تھیں لیکن دل کی بے حد اچھی انسان تھیں۔

”آؤ فاروق کیسا رہا تمہارا فنکشن؟“ حمزہ کی امی خبر کا آفیشل بلاسٹ کرنے والی تھیں۔ ”جی آپ کو فون پر تو بتایا تھا کہ یہ میرے کون سے پیپر کی وجہ سے اچانک کرنا پڑا۔ اس لیے کچھ بھی نہیں کیا، آج امی نے آپ سب کو کھانے پر بلایا ہے۔ آپ کی طبیعت ٹھیک ہو تو ہم کھانا آج کر لیتے ہیں ورنہ جب آپ بہتر محسوس کریں تب ہم کر لیں گے۔“ فاروق کی باتیں حمزہ کو بالکل سمجھ نہیں آ رہی تھیں۔

”حمزہ، بھائی کو مبارک باد دو واس کا کل نکاح تھا مجھے فون کر کے بلایا تھا لیکن پھر میری طبیعت اتنی خراب ہو گئی کہ مجھے تو کچھ یاد ہی نہیں رہا۔“ انہوں نے اس طرح بات خود پر لی کہ حمزہ کبھی منزہ سے نہ بلانے کا شکوہ تک نہیں کر سکتا تھا۔

”بے شک آئی امی آپ بہت عظیم ہیں۔“ فاروق نے دل ہی دل میں انہیں سراہا تھا۔

”مبارک ہو، کہاں ہوا آپ کا رشتہ.....؟“ حمزہ نے کچھ شرمندگی سے فاروق کو مبارک باد دی کیونکہ حمزہ کے ساتھ فاروق اپنی مگیت کر دیکھ چکا تھا پھر وہ تقریباً ان کی آپس میں دلچسپی بھی جان چکا تھا۔ ماریہ سے اس کا رشتہ ٹوٹنے کی وجہ وہ دل سے جانتا تھا۔ اس لیے وہ جانتا تھا کہ فاروق بھی اب ماریہ کی اپنی زندگی میں شامل نہیں کرے گا۔ یقیناً اس کا رشتہ کسی اور کے ساتھ ہوا ہوگا۔

”خیر مبارک..... میرا رشتہ تو open secret تھا۔ ماریہ میرے بچپن کی مگیت تھی اب وہ میری منکوحہ ہے۔“ فاروق نے ایک، ایک لفظ پر زور دیا تھا۔

حمزہ کو ایک دم لگا جیسے اس کے سر پر دھکا ہوا تھا لیکن شاید یہ نہیں تھا بلکہ اسے لگا تھا کہ وہ کسی دلدل میں جنس گیا ہو۔

”کیا..... کیا.....؟“ حمزہ تو جیسے اس بات پر الجھن پڑا تھا۔ حمزہ کی امی کو بیٹے کا چہرہ دیکھ کر دکھ ہوا تھا لیکن اندر سے اپنے بیٹے کا گھر بچتا دیکھ کر سکون بھی آ گیا تھا۔

”جی..... اس میں کوئی حیرت کی بات تو نہیں ہے۔“ فاروق نے نہایت کانفیڈنس سے کہا تھا۔ حمزہ کا چہرہ ایک دم تاریک ہو گیا تھا۔

”آئی میں پھر چکر لگاؤں گا۔ آپ کا جو پروگرام ہو، آپ مجھے انفارم کر دیجیے گا۔“ فاروق کے دل میں

نفرت کے گولے اٹھنے لگے تھے۔ جب سے اس نے نکاح کا تاں پر دستخط کیے تھے۔ اس کے دل میں آگ سی لگی تھی۔ ایک عجیب سی نفرت تھی۔ وہ خود نہیں جانتا تھا کہ یہ کیوں ہے۔ اس لیے خود سے ہی گھبرا رہا تھا۔ اسی گھبراہٹ میں وہ ایک دم باہر نکل گیا۔

☆☆☆

”تم!“ فاروق نے بے حد نفرت سے ماریہ کو دیکھا تھا۔ ”یہ تمہارا خوب صورت چہرہ تمہارے بد صورت دل کا ساتھ نہیں دے رہا..... یہ تو تمہارے دل جیسا ہونا چاہیے ناں.....؟“ فاروق کی ٹھنکارتی ہوئی آواز ماریہ کی روح تک کو دہلائی تھی۔

رات کا جانے کون سا پہر تھا جب ماریہ نے ڈکھتے وجود کے ساتھ دیوار کا سہارا لے کر کھڑے ہونے کی کوشش کی تھی لیکن وہ چکرا کر گر گئی۔ اس کی سزا کا فیصلہ کر کے اس کا ناخدا خرائے لے کر بے حد سکون سے سو رہا تھا۔ ماریہ کو اس نرم بستر پر سونے کی

## ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ

مئی کی گرماہیں... جاسوسی کے جاس فراشار کے آئینے

### سرورق کی کہانیاں

● **پہلی کہانی** ناگہان کی بھی وقت لپیٹ میں لے سکتی ہے... ایک آفت کی نذر ہو جانے والے خاندان کا ماجرا مریم کے خان کا انداز بیان

● **دوسری کہانی** جن چوں پر گئے تھیں ہوئے لگے... سلیم فاروقی کی نئی مڑوق

● **واپسی کا سفر** کوئی بھی خوشخبری اندیشوں کو اجالوں میں پھرنے میں ناگاہی دیتی ہے... زمکری کر پتلا چھوٹکا جانے پر تھتھ... احمد اقبال کے کلام کی جولانیاں

● **گرداب** واقعات کے نگاروں میں گرفتار کوارول کا آغاز و انجام اسماعیل قادری کا سلسلہ

● **لنکار** محبت کی نئی نئی شمعوں اور ہفتا کے نور کو شعلے طاہر جاوید مغل کی نئی تحریر

مغرب کے نالے انداز

مغربی دنیا کی تین تین جہازوں کی کھانسی اور صحت کی مڑودن قابل غور شوقیہ کہانیاں



آپ کے تہرے...  
مشق سے محبتیں...  
اور ان کی دلچسپ باتیں... کہانیاں



بھی اس کے ساتھ تھی۔ اسے زندگی کا سکون حاصل کرنے کے لیے بلاشبہ ایک نیک عورت کا ساتھ بھی چاہیے تھا۔

☆☆☆

عجیب سلسلہ جستجو ہے  
جہاں سے ختم ہو رہا ہے  
وہیں پہ ایک اور کچھ شروع ہے  
عجیب سلسلہ جستجو ہے

”اے میرے رب! بے شک میں نے اپنی جان پر ظلم کیا ہے لہذا تو میری مغفرت فرما، چنانچہ اللہ نے اسے بخش دیا، بلاشبہ وہ بہت بخشنے والا نہایت رحم کرنے والا ہے۔“ جوں جوں ماریہ اس دعا کو پڑھتی جاتی تھی اس کے اندر بہت کچھ ٹوٹ رہا تھا۔ مایوسی کا گھٹا ٹوپ اندھیرا۔

”اے میرے رب! بے شک میں نے اپنی جان پر ظلم کیا ہے.....“ ماریہ کی آواز ہنسنے لگی تھی۔  
”لہذا تو میری مغفرت فرما۔“ ماریہ کو دعا مانگتے مانگتے فاروق کے بیٹک سے مارے گئے کوڑے یاد آ گئے اس کا دل پھر ڈگمگا یا کہ کیا واقعی جو مانگ رہی ہے وہ اسے ملے گا بھی کہ نہیں۔

”بے شک وہ بخشنے والا نہایت رحم کرنے والا ہے۔“ دعا کا آخری حصہ ایسا تھا کہ ماریہ کو اپنے جلتے جہمی جسم پر ایک دم ٹھنڈک کا احساس ہوا تھا۔  
”ہاں..... میں یہ کیوں بھول گئی کہ اللہ تو بہت مہربان اور بخشنے والا ہے۔“ ماریہ کے دل و دماغ نے ایک دم سے اسے اندھیرے سے روشنی میں لاکھڑا کیا تھا۔

یہ باترجمہ دعا آمینہ آئنٹی نے اسے لاکر دی تھی۔ وہ سالوں سے نماز نہیں پڑھ رہی تھی۔ اتنے عرصے سے فاروق نے اسے چھٹی کا ٹائٹل دیا تھا، اسے لگتا تھا کہ نماز نیک لوگوں کا کام ہے اور وہ چونکہ بری عورت ہے تو اس کا نماز پر بھی حق نہیں ہے۔  
آج جب وہ آمینہ آئنٹی کے ہمت دلانے پر نماز

دونوں نے اپنی زندگی حقوق العباد ادا کرنے میں وقف کر رکھی تھی۔ ایسے میں جب وہ دیوار پار ماریہ کی چھینٹیں نہیں تو بے حد دکھی ہو جاتی تھیں۔ کئی بار ماریہ سے کہا کہ وہ یہاں کی پولیس کو فون کر دے یا اپنے گھر پاکستان فون کر دے مگر وہ نہیں مانتی تھی۔ ایسے جیسے وہ اپنی اس زندگی کو قبول کر چکی ہو۔

”ماریہ تم کیا جھکتی ہو، تمہارا گناہ اللہ کی رحمت سے بڑا ہے تو پھر تم اللہ سے نہ معافی مانگو نہ ہی اس سے امید رکھو۔“ آمینہ آئنٹی جاتے جاتے اس سے کہہ گئی تھیں درحقیقت وہ اس کے لیے سوچ کا ایک نیا در کھول گئی تھیں۔

☆☆☆

”فاروق صاحب آپ اس بار عید اپنے گھر پاکستان میں کریں گے؟“ فاروق تلہر کی نماز پڑھ کر کچھ روم میں آئی تو..... اس کے دفتر کے ایک ساتھی نے پوچھا تھا۔

”آہ..... ہاں شاید.....“ فاروق ہمیشہ پاکستان جانے کے نام پر بوکھلا جاتا تھا۔ گزشتہ تین سالوں میں وہ خود ایک دو بار چند دن کے لیے پاکستان گیا تھا لیکن اس کے اکیلے پاکستان جانے پر سب کے سوالات سے گھبرا کر وہ جلد ہی واپس آ گیا۔ ایسے میں وہ کسی تہوار کے آنے پر بوکھلا جاتا۔ یہاں پر موجود لوگوں کے سوال..... ادھر پاکستان میں موجود لوگوں کے سوال..... اور اس کے پاس کوئی جواب نہیں ہوتا تھا۔ کیا وہ ماریہ کو سزا دے رہا تھا یا وہ خود قید تہائی کاٹ رہا تھا۔

والدین اور بہن بھائی سے دور وہ کیا کر رہا تھا۔ ماریہ کو سزا دینے کے لیے خود کو سب سے دور کر دیا تھا۔ کیا ماریہ کی سزا اتنی اہم تھی کہ وہ اپنی زندگی کے اتنے اہم دن ضائع کر دے۔ اسے اپنی جوانی کے ضائع ہونے کا بھی ایک دم سے دکھ ہونے لگا تھا۔

آج جب وہ گھر آ رہا تھا تو ایک مختلف سوچ

ہو گئیں۔ ”ماریہ سبک سبک کر رودی۔“

آمینہ آئنٹی نے بے حد دکھ سے ماریہ سے وجود کو دیکھا تھا۔

”اب پیچھے میرا..... دکھ درد پوچھنے والا نہیں۔ میں اکیلی ہوں بالکل اکیلی.....“ وہ طرح طرح رہی تھی۔

”بہن تین سال ہو گئے جبکہ تم نے اپنا گناہ بھی کیا، معافی بھی مانگی پھر تمہارا مجازی خدا تمہیں معاف نہیں کرتا.....؟ ایک گناہ گار تو ہے۔“ اسے اگر تو یہ کر لے تو اس کا رب بھی اسے معاف کر دیتا ہے مگر ہم انسان.....“ وہ چپ ہو گئی تھیں۔

”آئنٹی آپ کو میرے گناہ کا اندازہ ہے؟“ ماریہ نے اپنی طرف سے آمینہ آئنٹی پر کوئی راز منکشف کرنا چاہا۔

”ہاں، پتا ہے تم اپنی کزن کے شوہر کے ساتھ ناجائز تعلق رکھے ہوئے تھیں اور شادی بھی کرنا چاہ رہی تھیں اور وہ کزن تمہارے شوہر کی بہن تھی، یہ ناں.....؟ تین سال سے دیوار پار تمہاری بیچوں اور تمہارے گناہوں کی کہانی میں مسلسل سن رہی ہوں۔“

آمینہ آئنٹی کا اپارٹمنٹ ساتھ ہی تھا۔ وہ دوسرے تھیں مگر ایک سچی مسلمان تھیں ان کے شوہران سے تیرہ سال چھوٹے تھے۔ وہ بہت نرم خور بہت نیک انسان تھے۔ آئنٹی سے ان کی محبت کی شادی ہوئی تھی اور گزشتہ تیس پینتیس سال سے وہ بے حد محبت ازدواجی زندگی بسر کر رہے تھے۔ احمد انکل کی زندگی کے ہر سکھ دکھ میں آمینہ آئنٹی ساتھ کھڑی ہوتیں۔ ان کے دو بیٹے تھے، ایک امریکا میں تھا دوسرا کینیڈا میں۔ ان کو اولاد کی تابعداری، کامیابی اور خوشی حاصل تھی۔ وہ بہت مطمئن تھے، دن کے آدھے میں وہ اپنے اسٹور پر ہوتے آدھا حصہ ان کا مسجید بچوں کو قرآن پاک پڑھانے میں گزرتا دونوں مایاں بیوی کو پیسے اور دولت کی لالچ نہیں تھی۔

اجازت نہیں تھی۔ وہ زمین پر بیٹھی تھی۔ فاروق نے اسے بیٹک سے مارا تھا۔ دینی آنے تک وہ خاموش تھا۔ آج اس کے دفتر کے قریبی لوگوں نے ان کا کھانا کیا اور ان کے گھر کو سجایا تھا۔ وہ بھی فاروق کے ایک دوست کی بیوی کی مدد سے تیار ہوئی تھی۔ بظاہر سب ٹھیک تھا لیکن جیسے ہی قریبی لوگوں اور احباب کی دھند دونوں کے قریب سے چھٹی تو فاروق نے اسے اس کی اصلیت یاد دلادی تھی۔

فاروق اس کا مقام نو باڈی پر لے آیا تھا۔ ماریہ کی زندگی کا بھیا تک اور نہ ختم ہونے والا دور شروع ہو چکا تھا۔

☆☆☆

”سوچتی ہوں کہ خدا اور اس کا انصاف کیسا ہوگا..... جب، جب میں فاروق کی جانب سے اپنے کردہ اور ناکردہ گناہوں کی سزا بھگتی ہوں تو دعا کرتی ہوں کہ میں مر جاؤں پر مجھے مرنے سے بھی ڈر لگتا ہے اگر میرے گناہوں کی سزا اس دنیا میں اتنی کڑی ہے تو اس بارگاہ میں میری سزا کیا ہوگی، وہ سب جہانوں کا خالق و مالک ہے۔“ ماریہ نے بے حد نقاہت سے آمینہ آئنٹی کو بتایا تھا وہ اس کے زخم صاف کر رہی تھیں۔

”تم اپنے گھر والوں کو کیوں نہیں بتاتیں؟ تین سال..... گزشتہ تین سال سے تم روز مار کھاتی آرہی ہو، زخمی ہو کر دونوں بے سدھ پڑی رہتی ہو، تمہارے اپنے تمہیں بیچائیں گے..... تم انہیں بتاؤ تو۔“ آمینہ آئنٹی نے تم آنکھوں سے اسے دیکھ کر کہا تھا۔

”آمینہ آئنٹی.....! میری ماں تو..... میری پہلی فون کال پر ہی مر گئی تھی۔ یہاں آئے مجھے چار ماہ ہو چکے تھے..... جب ایک دن مجھے فاروق کا موبائل مل گیا، میں نے گھر کال کر کے اپنی ماں کو ساری حقیقت سے آگاہ کر دیا۔ مجھے لگا کہ وہ مجھے آزاد کر دے گی لیکن وہ تو اسی رات خود زندگی سے آزاد



## فرسٹ کزن

ایک قصاب، ڈاکٹر کے پاس آیا اور کہنے لگا۔ ”میں آپ کا فرسٹ کزن ہوں۔“  
ڈاکٹر نے حیرانی سے پوچھا۔ ”وہ کیسے؟“

قصاب اطمینان سے بولا۔ ”وہ اس طرح کہ میں بکروں کی کھال کھینچتا ہوں اور آپ انسانوں کی۔“  
مرسلہ: ارم خالد..... اوکاڑہ

”اپنی ماں کو تیار کر لو پھر چلتے ہیں۔“ حمزہ کافی بدل گیا تھا وہ بہت نرسکون از دو ابی زندگی جی رہا تھا۔ جڑواں بچے اس نئی زندگی کی رونق کو مزید بڑھا گئے تھے۔

☆☆☆

جہاز لینڈ کر چکا تھا۔ فاروق نے مڑ کر اپنے ساتھ بیٹھے بٹ کو دیکھا وہ ایک دم چونکا تھا۔  
”ماریہ! خطرناک حد تک پیلی پڑ چکی تھی۔“  
”ماریہ!.....“ فاروق نے گھبراہٹ سے اسے پکارا وہ ایک دم آگے کو گری تھی۔ فاروق نے بے اختیار اسے اپنے بازوؤں میں سنبھال لیا تھا۔  
”مالک ہے آسمانوں اور زمین کا اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، اس کا رب ہے نہایت غالب، بہت معاف کرنے والا۔“

ماریہ نے بے آواز بلند سورہ ص کی آیت پڑھی تھی۔ اس بل اس کی آنکھیں بند تھیں۔ فاروق نے حیرت سے اسے دیکھا، اس نے ایک دم آنکھیں کھول دی تھیں اب وہ فاروق کو دیکھ رہی تھی۔  
”آسمانوں اور زمین کا اور جو کچھ ان کے درمیان ہے۔“ ماریہ کی سانسیں اکڑی تھیں اس

کے کپے پر فاروق سے چار ہزار مرتبہ تو معافی ضرور مانگی ہوئی اور اب وہ اپنے رب کے سامنے سجدہ ریز رہتی یا اپنی ہتھیلیاں رب کی بارگاہ میں پھیلانے رکھتی۔ آج بھی جب علیہ کہ فاروق کے ساتھ اس قدر بے تکلف ہوتے دیکھا تو اس کے دل سے ایک آنکلی تھی۔

”فاروق تم نے مجھے چار سال تک اذیت میں مبتلا رکھا کوئی لمحہ ایسا نہ گیا جب تم نے میری بھول، میری غلطی، میرے گناہ کا احساس نہ دلایا ہو مگر مجھے اس بات کا دکھ نہیں۔ دکھ تو اس بات کا ہے کہ تم مجھے جس گمراہی کی سزا دے رہے تھے اسی راہ پر تم بھی چل نکلے ہو، جو سزا اور شرمندگی میں کاٹ رہی ہوں میری تو دعا ہے کہ میرا دشمن بھی اس مرحلے سے نہ گزرے۔“ دو آنسو اس کی آنکھوں سے نکل کر اس کی پھٹی ہتھیلیوں میں جذب ہو گئے۔ اس کی آنکھیں رو رو کر بے رونق سی ہو گئی تھیں۔

☆☆☆

”تم ایک پستے سے زیادہ وہاں نہیں رہو گے اور اس مصیبت کو وہاں ہی چھوڑ آنا سمجھے۔“ علیہ انہیں اڑ پورٹ چھوڑنے آئی تھی مگر یہ آواز بلند فاروق کو نصیحتیں کر رہی تھی۔ ماریہ جہاز میں اس کے ساتھ ایسے بیٹھی جیسے کوئی انجان اور اجنبی بیٹھا ہو۔ اس کا دھیان کہاں تھا وہ نہیں جانتا تھا۔ سارے رستے فاروق اسے دھکاتا آتا تھا۔ اس نے ایک بار بھی اس سے کچھ نہیں کہا تھا۔ وہ کیا سوچتی رہی تھی وہ فانی طور پر کہاں رہتی تھی۔ فاروق کے لیے وہ ایک لر سے بند دروازہ بن کر رہ گئی تھی۔

☆☆☆

حمزہ نے جانناز لیٹ کر اپنے دونوں بچوں کو دیکھا تھا جو اس کے دائیں بائیں آکر بیٹھ گئے تھے۔  
”پاپا!.....! جوئے لینڈ.....“ دونوں نے مطالبہ کیا تھا۔

تھا۔ منزہ کہہ رہی تھی اور فاروق نے حیرت سے سامنے فرش پر لہو لہان پڑی ماریہ کو دیکھا تھا۔ جس کا ابھی وہ اپنا بہت سارا غصہ نکال کر پٹا تھا۔ وہ روز بروز خاموش سے خاموش تر ہو گئی تھی اور اس کی خاموشی فاروق کو بہت زیادہ تاؤ دلانی تھی۔

پہلے وہ اس سے معافیاں مانگتی تھی۔ گزرتی تھی اب عرصہ ہوا وہ بس مار کھائے جاتی اور چپ رہتی یا خالی خالی نظروں سے اسے دیکھتی رہتی۔ ایسے میں فاروق کو بے حد غصہ آتا تھا وہ آپے سے باہر ہو جاتا کہ وہ کس ڈھٹائی سے بس اسے دیکھے جاتی ہے اور اب پہلی کی طرح معافی کیوں نہیں مانگتی۔ تو کیا ماریہ کی یہ حالت اس کی مرنی ماں کے لیے تکلیف کا باعث ہے؟ جس کی وجہ سے میری ماں بھی تکلیف رہے۔ تو میں اس کی اصلیت سب کو بتا دوں گا۔“

اس نے حقارت سے اسے گالی دی۔  
مگر نہ جانے کیوں یہ سب کرنے کے بعد بھی فاروق کو چین نہ ملتا تھا۔ وہ مار مار کر خود بھی ٹھک جاتا تھا مگر پھر بھی تسکین نہیں ہو پاتی۔ وہ خود بھی قید خانہ اور نارسائی کا دکھ چھیل رہا تھا اور پھر..... وہ بھی ایک کمزور انسان ثابت ہوا۔ وہی جیسے آزاد ماحول میں وہ بھی پارسانہ رہ سکا۔ ماریہ کو جلاتے اور تڑپاتے اس نے اپنے آپ کو تباہی کے کنارے پر لا کھڑا کیا۔ علیہ جو اثر اسے بزنس پارٹنر میں ملا کرتی تھی اس کے قریب آتی چلی گئی اسے ایک سیٹلڈ گروڈ انسان اثریٹ کر گیا تھا اور فاروق جو اسے دکھوں کا بارگاہ نفس کا شکار ہو چلا۔ اب تو اتنی ہمت چھپی اس میں آگئی تھی کہ دونوں ماریہ کے سامنے بیٹھ کر ایک دوسرے میں گم ہو جاتے اور ماریہ کچھ کہہ بھی نہ پاتی شاید وہ کا جذبہ اس میں ختم ہو چکا تھا یا فاروق سے بھی اسے رغبت ہی نہیں تھی جو اب کسی اور لڑکی کے لیے رقابت محسوس کرتی مگر چار سال میں اس نے اپنے مانی

کے لیے کھڑی ہوئی تو ایسا لگا کہ وہ نماز بھول گئی ہو۔ آمنہ آئی نے اسے ہمت دلانی تھی۔ بہت ہمت اور مشکل سے وہ خود کو اپنے رب کے حضور کھڑا کر پائی تھی۔ انک، انک کر اپنے آنسوؤں کی یلغار میں وہ بہ مشکل نماز مکمل کر پائی تھی۔

یہ اس کی توبہ کی پہلی نماز تھی! ایک گناہ گاری شرمندگی کا اظہار تھا۔ وہ سالوں سے اس توبہ کے موقع کو ترس رہی تھی لیکن ایک احساس کسری اور مایوسی میں فاروق نے اسے بری طرح جتلا کر دیا تھا کہ وہ اتنی زیادہ گناہ گار ہے کہ اس کی معافی ناممکن تھی لیکن آج اس کے گرد اندھیرا چھٹا تو اس نے جانا کہ وہ دنیا میں تنہا نہیں ہے بلکہ اس کا اللہ اس کے ساتھ ہے۔

☆☆☆

”بھائی پاکستان چکر لگائیں ناں آپ دونوں..... امی کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی۔ وہ آپ لوگوں کو دن رات یاد کرتی ہیں۔“ منزہ نے فاروق سے فون پر اظہار کیا تھا۔

”آں..... ہاں..... میں کوشش کروں گا کہ جلد ہی چکر لگاؤں۔“ فاروق کو اپنی آواز بے حد کمزور محسوس ہوئی تھی۔

”نہیں بھائی! اس بار کوشش نہیں..... یقیناً آنا ہے۔ چار سال ہو گئے آپ تو پردیس جا کر اپنوں کو ہی بھول گئے۔“

”نہیں منزہ، میں ضرور آؤں گا۔“ اس نے بہن کو یقین دلایا تھا۔

”بھائی اکیلے نہیں ماریہ بھائی کو بھی ساتھ لے کر آنا ہے، امی کا اصرار اور حکم دونوں ہی ہیں۔ اللہ جانے انہوں نے خواب میں خالد کو کیا کہتے دیکھا ہے، اب اٹھتے بیٹھتے ایک ہی رٹ ہے ماریہ کو پاکستان واپس بلاؤ..... میری بہن کو تکلیف ہے، میں نے خواب دیکھا ہے۔“ فاروق نے فون بند کر دیا



کارب ہے..... نہایت غالب، بہت معاف کرنے والا۔" ماریہ کی سائیس ایک دم سے تیز ہوئی تھیں اور وہ ایک دم ایک جانب لڑھک گئی۔ فاروق کو ایک عجیب سا احساس ہوا تھا جیسے اس کے ہاتھ سے کوئی ریت سی پھسل گئی ہو۔ جہاز میں اسٹریچر پر ڈال کر میڈیکل کا عملہ سیدھا ایرجنسی روم میں لے کر پہنچا۔ وہاں موجود ڈاکٹر نے برین ٹیمبرج بتایا تھا۔ جب تک ایبولینس پہنچی ماریہ کے وجود میں سے اس کی روح آزادی حاصل کر چکی تھی۔ فاروق کو کچھ بل تو یقین ہی نہیں ہوا۔ فوری طور پر اسے سمجھ نہیں آیا کہ وہ دکھی ہو یا خوشی محسوس کرے۔ ایک ایسی ناپسندیدہ ہستی اس کی زندگی سے چاچکی تھی جس کے ہونے پر اسے بے حد تکلیف ہوتی تھی لیکن اس سب کے باوجود جانے کیوں اس کا دل خالی سا ہو گیا تھا۔ اسے ایک دم خود اپنا وجود ادھورا محسوس ہونے لگا تھا۔

☆☆☆

جب وہ ماریہ کی ڈیڈ باڈی لے کر آیا تو تپتی دوپہر جون کے مہینے میں ایک دم بارش شروع ہو گئی تھی۔ امی، ابو، سلمان، منزہ دھکے سے ماریہ کو دیکھتے رہ گئے، اتنی کمزور ہڈیوں کا ڈھانچا وہ پہچانی تک نہیں جا رہی تھی۔

”ماریہ..... میری بیٹی.....!“ امی اپنی لاڈلی بھانجی کی یہ حالت دیکھ کر بے ہوش ہو گئی تھیں۔ وہ چلی گئی تھی بہت ساری خاموشی اور سوال چھوڑ کر۔ فاروق کی حیرت نہ ختم ہوتی تھی۔ وہ خود کو خالی ڈبے کی طرح لڑھکتا محسوس کر رہا تھا۔ اسے دفنا کر وہ اسی کمرے میں آکر لیٹا تھا جو کبھی اس کا تھا کروٹیں لیتے لیتے جب وہ تھک گیا تو وہ بے اختیار اٹھ کر اس بیگ کے پاس آ بیٹھا تھا جو ماریہ کا تھا۔ چھوٹا سا بیگ صرف ایک سوٹ، ایک چادر اور ایک ڈائری پر مشتمل اسے ایک دم یاد آیا کہ اس نے آج تک ماریہ کو گری ٹریدی

کا کوئی لباس نہیں خرید کر دیا تھا۔ اس کے پاس ضرورت کی کوئی چیز تھی یا نہیں تھی اس نے کبھی نہیں پوچھا تھا۔ گھر میں بھی کھانے یا پینے کو کچھ ہو یا نہیں اس نے بھی دیکھا نہیں تھا۔ ماریہ کیا کھاتی تھی؟ اس کے دماغ میں پہلا سوال گونجا تھا۔ وہ تو کھانا باہر کھا آتا تھا، کبھی کبھی دودھ گھر آتا تھا چائے کے لیے..... اس نے تو کبھی راشن بھی گھر میں نہیں ڈالا تھا۔ کبھی بکھار اس کے ساتھ گھر میں کھانے کی کوئی چیز آ جاتی یا کبھی پھل وغیرہ تو پھر ماریہ چار پانچ سال کہاں سے کھاتی رہی اور زندہ رہی.....؟ کون اسے کھلاتا تھا..... وہ کیسے زندہ تھی..... فاروق جیسے زلزلوں میں آ گیا تھا۔ وہ جاگ رہا تھا، ہوش کا پہلا چھینٹا پڑا تھا اور وہ لرز رہا تھا۔ اس نے لرزتے ہاتھوں سے ماریہ کی ڈائری نکالی تھی۔

”دن قیامت، وقت حساب.....“

2007ء

کیسے پوچھوں.....؟

ہے ایسا کیوں.....؟

بے زباں سایہ جہاں ہے

خوشی کے پل

کہاں ڈھونڈوں، بے نشان سا وقت بھی ہے یہاں

جانے کتنے لوگوں کو یہ نگلے ہیں

زندگی سے کئی فاصلے ہیں

اس جتنے سینے ہیں آنکھوں میں

لیکیریں جب چھوئیں ان ہاتھوں سے، بے وجہ جو بھیجی تھی دعا

وہ جا کہ آسمان سے یوں ٹکرائی

کہ آگئی ہے لوٹ کے صدا

سانسوں نے کہاں رخ موڑ لیا

کوئی راہ نظر میں نہ آئے

دھڑکنے نے کہاں دل چھوڑ دیا

کہاں چھوڑے ان جسموں نے سائے

یہی بار بار سوچنی ہوں تمہاں یہاں  
میرے ساتھ ساتھ چل رہا ہے یادوں کا دھواں  
جو بھیجی تھی دعا.....

وہ آسمانوں سے یوں ٹکرائی

کہ آگئی ہے لوٹ کے صدا.....

آگے ڈائری ٹوٹے پھوٹے جملوں سے بھری

ڈی تھی۔ فاروق اچانک ایک صفحے پر آ کر رکھا تھا۔

اگر تو میرا پیدا کرنے والا ہے۔

اگر تو مجھے موت دینے والا ہے۔

تو میری سزا کا حق بھی تیرا ہے.....

تو پھر میری معافی کا حق بھی تیرا ہے۔

اے اللہ.....

تو کبھی تو میری طرف بھی دیکھ لے۔

مجھے اے اللہ انسانوں کے سپرد نہ کر۔

نہ میری سزا، نہ میری معافی انسانوں کے حوالے

کر نہ میری رسوائی انسانوں کے حوالے کر.....

میں جانتی ہوں، میں مانتی ہوں کہ تو رحمان

ہے تو مجھے معاف کر دے گا اور رسوائی سے بھی

بچالے گا۔ بے شک تو نے آئندہ انہی اور انکل احمد کی

نکلیں میں مجھ پر اپنا کرم کیا ہے۔

2011ء ماریہ

جو مانتی ہے کہ اللہ رحمان اور معاف کرنے والا ہے۔“

☆☆☆

2012ء

”اے اللہ فاروق کو اس رسوائی اور سزا میں نہ

ڈالنا جو مجھے ملی۔ وہ اچھے سے برا بن رہا ہے۔ میں

جانتی ہوں ”اچھا“ فیذا اور ثابت کرنا سب سے مشکل

ہے۔ اللہ تو اسے بچالینا..... کیونکہ جو سزا رسوائی میں

ہے وہ بہت بھیا تک ہے جو سزا نہیں کی ہے جو تنہائی کی

ہے وہ بہت بری ہے۔ کل میں پاکستان جا رہی

ہوں۔ اے اللہ تو میری خطا کو اگر معاف کر دے گا تو

مجھے میرے وطن کی مٹی مل جائے گی۔“

ماریہ کی آخری تحریر تھی ڈائری میں جہاں شروع سے آخر تک مخاطب اللہ کی ذات تھی۔  
فاروق کے کانوں میں بے اختیار ماریہ کے الفاظ گونجتے تھے۔

”مالک ہے آسمانوں اور زمین کا اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، اس کا رب ہے نہایت غالب، بہت معاف کرنے والا۔“ فاروق کو زمین و آسمان آپس میں ملنے محسوس ہوئے تھے۔ ایک آئینہ سامنے موجود تھا جہاں اسے اپنا آپ ایک دم نظر آ گیا تھا۔ وہ ماریہ کو سزا دیتے ہوئے خود فرعون بن بیٹھا تھا۔ فاروق ایک دم زمین پر بیٹھ کر رو دیا۔ وہ خود کو کتنا پارسا سمجھ رہا تھا۔ کرے میں ہر طرف بہت سارے آئینے اُگ آئے تھے اور ہر آئینے میں فاروق کو اپنا آپ بہت بھیا تک لگ رہا تھا۔

☆☆☆

دروازے پر دستک ہوئی تھی۔

”کون.....؟“ فاروق نے پوچھا۔

”میں حمزہ.....“ اور وہ اندر آ گیا۔ ڈھیر ساری

خاموشی ان کے بیچ آن کھڑی تھی۔ وہ کتنے ہی پل

ایک دوسرے کو صرف دیکھتے رہے تھے۔

”وہ میں.....“ حمزہ کو سمجھ نہیں آرہی تھی کہ رسما

ہی سہی وہ آیا تو تھا فاروق سے افسوس کرنے منزہ کے

مجبور کرنے پر لیکن یہاں آ کر اس کے پاس الفاظ ختم

ہو گئے تھے۔

”میں آپ کی وائف کا افسوس کرنے آیا تھا۔“

حمزہ نے تھوک نکل کر نظر چرا کر کہا تھا۔ اسی پل منزہ

بھی بچوں کے ساتھ اندر داخل ہوئی تھی۔

”یہ دونوں بہت تنگ کر رہے ہیں آپ ذرا

انہیں آکس کریم دلا لائیں۔“ حمزہ نے بچوں کی

فرمائش کو غنیمت جانا اور فوراً انہیں لے کر باہر نکل گیا

تھا۔ فاروق خاموشی سے حمزہ کے خوب صورت بچے

اور اس کا مطمئن چہرہ دیکھتا رہ گیا تھا۔





## میں کا بھائی بھائی

عقیدہ حق

پانچ فٹ چھ انچ سے نکلتا قد..... کسا کسا  
خوب صورت سنگ مرمر سے تراشا ہوا بدن..... اور  
اس بدن پر بھی سیاہ نیٹ کی ساڑی، صراحی دار گردن  
میں سجا ہیروں کا ٹیکس اور کلائیوں پر آنکھوں کو خیرہ  
کرتی وائٹ گولڈ اور ہیروں کی چوڑیاں..... بے حد  
حسین انگٹھیوں سے نچی مخروطی انگلیاں، متناسب  
تراشے ہوئے ناخنوں پر بھی نیل پالش..... ماہرانہ  
انداز سے چہرے کے حسین نقوش کو ابھارتا ہوا ایک آپ

یہ شہر خوشاں تھا۔ بہت سالوں بعد وہ پاکیزہ  
آیا تھا۔ وہ ان پورٹ سے سیدھا قبرستان ہی آیا تھا  
ماریہ کی قبر سبزے سے بھری ہوئی تھی۔ فاروق کا  
سفید رنگ ایک دم پھیکا پڑ گیا تھا۔ وہ ساری باتیں  
ہار کر جیتی سوئی پڑی تھی۔

”تم بہت بُری ہو۔“ دعا مانگ کر ہمیشہ کی  
طرح فاروق نے اسے مخاطب کیا۔ ”کوئی ایسے ہی  
جاتا ہے؟ میں نے سارا وقت تمہیں سزا سنانی کم از کم  
مجھے سزا سنانا جاتیں کوئی بدلہ ہی لے لیتیں! بدلہ کیوں  
نہیں لیا؟ لیکن تمہیں پتا ہے مجھے خود کو ہمیشہ اچھا بننے  
اور دکھانے کا شوق تھا۔ میں تو آج بھی اسی عادت  
سے جان نہ چھڑایا۔“ فاروق کی آواز بھرا گئی تھی۔  
جو اچھائی میرے ساتھ کر گئی تھیں میں تو ضرور تم سے  
بدلہ لوں گا..... یہ سوچ کر آج میں نے ایک بہت بڑا  
ادارہ قائم کر لیا ہے جس میں اسلام کی تبلیغ اور اخلاق  
تعلیم اس طرح دی جا رہی ہے کہ لوگوں کو ڈرا کر نہیں  
پیارے اس اچھائی کے قافلے میں شامل کیا جاتا ہے۔  
پہلے والا فاروق جو گناہ گاروں کو ہانک کر جہنم کی طرف  
لے جاتا تھا۔ اسے پہلے بھی حق نہیں تھا کہ کسی کو جہنم کی  
طرف ہانکے یا جنت کی گارنٹی دے لیکن اب تو وہ کسی کی  
امید ختم نہیں کرتا۔“

فاروق نے آمنہ آنٹی اور احمد انکل کے ساتھ  
مل کر اسلام کی اخلاقیات اور حسن سلوک کے دروس کا  
اہتمام کیا۔ ایسا ادارہ جو رب کا نکت اور اس معلم  
اخلاق ﷺ کے ارشادات کو عام کر رہا تھا کہ جس کا  
مقصد اسلام کی مثبت تصویر پیش کرنا تھا نہ منفی..... اس  
کی قبر پر بیٹھا وہ آنسو بہا رہا تھا کہ معافی تو بت  
الضرت بھی اپنے گناہ گار بندے کو دے دیتا ہے مگر وہ  
خود کیسا مسلمان تھا کہ اپنے جیسے ایک مسلمان کو  
معاف نہ کر سکا اسی پچھتاوے کے مداوے کے لیے  
اس نے ماریہ کے نام سے ادارہ قائم کر لیا تھا۔

”کیا دیکھ رہے ہیں بھائی؟“ منزہ نے بھائی  
کے قریب آ کر پوچھا تھا۔  
”آں..... ہاں..... کچھ نہیں۔“ فاروق نے  
کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔  
”یہی ناں..... کہ قصور وار دونوں تھے اور سزا  
ایک کیوں سہہ کر گئی؟“  
منزہ نے دھماکا کیا تھا۔

فاروق حیرت اور جھٹکے سے پلٹا تھا۔  
”ہاں بھائی..... ماریہ نے خالہ کے فوت  
ہونے پر مجھے ساری سچائی بتادی تھی۔ وہ اس کی پہلی  
اور آخری کال تھی پھر مجھی میں نے اپنی زندگی اسی  
طرح گزاری کیونکہ یہ ماریہ کی خواہش تھی کہ جس گھر  
کو بچانے کے لیے آپ انسان سے حیوان بن گئے  
وہ گھر ضرور بچتا چاہیے تو میں نے اپنی بھائی، بہن اور  
دوست کی خاطر اپنا گھر بچا لیا پھر کچھ عرصے بعد مجھے  
محسوس ہوا کہ میری کسی کوتاہی سے حمزہ بھٹک گئے تھے  
میں بھول گئی تھی کہ میں کون سی پرفیکٹ ہوں جانے  
کس بات پر اللہ پکڑ لے پھر وہ جب لوٹے تو مکمل  
میرے تھے اور میرے بچوں کے تھے۔ بھائی آپ تو  
میرا اچھا کرنے نکلے تھے لیکن خود کا برا کیوں کر لیا۔  
کیوں اپنا گھر نہ بسایا؟ دل بڑا کر کے معاف بھی تو  
کر سکتے تھے۔“ منزہ پوچھ رہی تھی اور فاروق پھینکی سی  
مسکراہٹ لیوں پر سجا کر رہ گیا۔

”میری تو شروع دن سے اس کے ساتھ گھر  
بسانے کی نیت نہیں تھی تو پھر کیسے گھر بیٹا، میں نے تو  
بس چڑیا کے پر کاٹنے کی نیت کی تھی..... اور اسی طرح  
میری بہن کا گھر بچا پاتا۔“ فاروق کی آواز دکھ سے  
بھاری ہو گئی تھی۔

”وہ تو وقتی سزا پر اپنے سب کام ٹھیک کر گئی تھی  
یہاں تک کہ اپنی واپسی بھی وہ ٹھیک کر گئی ہاں صرف  
اپنی.....“ دو آنسو اس کی آنکھوں سے بہہ نکلے تھے۔

☆☆☆



..... یا قوتی لیوں سے لپٹی لپ اسٹک اور کمر پر پھیلے سیاہ بالوں کا آبشار.....  
اس نے مسکرائی نظروں سے ڈرینگ ٹیبل کے شے میں اپنا بھر پور جائزہ لیا اور پھر ڈرینگ ٹیبل پر سجے آن گنت پرفومز میں سے lady poison کی بوتل اٹھا کر..... وہ اپنے آپ کو..... خوشبو میں مہکا ہی رہی تھی کہ کمرے کے داخلی دروازے سے آنے والی آواز نے جیسے اس کے ہاتھ جکڑ لیے اور آئینے میں نظر آتے عکس کو دیکھ کر تو وہ جیسے پتھر کی ہو گئی۔

☆☆☆

”تو تم نے ہاں کہی دی.....“ بروسو پرانا شکوہ اس کے کانوں میں گونجا..... اور وہ ہڑا کر اٹھ بیٹھی۔  
ہر طرف خاموشی تھی..... اسی رات بیت چکی تھی، کمرے کی ہر چیز نائٹ بلب کی روشنی میں عجیب سا تاثر دے رہی تھی۔ اسے ایسا لگا کہ لفظوں نے کہنے والے کا وجود دھار لیا ہے۔ اس نے گہرا کر برابر میں گہری نیند سوتے عباس کو دیکھا..... اس کے چاروں طرف الفاظ گونج رہے تھے..... شور بڑھتا جا رہا تھا، اس نے اس خوف سے آنکھیں بند کر لیں کہ کہیں اس کے چاروں طرف گونجتا شور..... عباس کو نہ جگا دے۔

☆☆☆

تابندہ نے چائے تھرماس میں نکالی اور پہلے سے تیار ٹرے میں تھرماس رکھ کر بیڈ روم میں چلی آئی..... شام کے پانچ بج رہے تھے..... عباس کے آنے کا وقت ہو گیا تھا اور آفس سے آنے کے بعد وہ سب سے پہلے چائے پیتا تھا..... اور شادی کے ان بارہ سالوں میں بھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ تابندہ نے نا تم کا خیال نہ رکھا ہو۔  
تابندہ ایسی تھی تو نہیں..... لیکن وقت اور..... فیسے دایروں نے اسے سر تا پا بدل دیا تھا..... جس دن وہ

عباس کے ساتھ نکاح کی ڈور میں باندھی گئی بھول گئی کہ وہ کیا ہے؟ لیکن یاد رہا تو صرف یہ کہ اس پر بے حد مان تھا..... اور اپنے وقت رخسار اس کے سر پر چسپا تھا ہوا ہاتھ رکھ کر کہا تھا۔  
”بیٹا اچھی بیٹیاں سسرالوں میں عزت اور..... کے ساتھ رہ کر ماں، باپ کی عزتوں کو زندگی ویتا ہے اب تم یہ بھول جانا کہ تم اپنے ابا کی لاڈلی بیٹی ہو یاد رکھنا کہ اب تم کسی کی بہو اور کسی کی بیوی ہو..... سے جب ہی خوش ہوں گا جب عباس خوش ہوگا..... ہمیشہ یہ یاد رکھنا کہ عباس کیا چاہتا ہے۔ عباس کی پر خوش ہوتا ہے اور کس پر ناخوش..... عباس کیا پسند ہے اور کیا نا پسند!“

اور عباس وقت کا پابند تھا اور وقت کی پابندی پسند کرتا تھا اور تابندہ سب کچھ بھول گئی تھی..... انھیں تو صرف ابا کی نصیحتیں..... یاد تھا تو صرف یہ کہ عباس کیا چاہتا ہے! اس کی اپنی کیا عادتیں تھیں بھول چکی تھی۔

☆☆☆

”یا اللہ تم ابھی تک بڑی سوری ہو..... منحوس، کالج نہیں جانا کیا؟“ وہ جو آرام سے لحاف میں منہ دیے سوری تھی..... روشاٹھ کی آواز پر گہرا کر اٹھ گئی۔

”اوہ مائی گاڈ..... آٹھ بج گئے اور تم مجھے اب اٹھا رہی ہو..... وہ لحاف پرے پھینک کر بسترے اٹھتے، اٹھتے ناراضی سے بولی۔

”سب سے بڑی بات تو یہ کہ میں تمہاری ملازمہ نہیں ہوں..... دوسری اہم بات یہ ہے کہ مجھے شوق نہیں ہے کہ ہر روز تمہاری شکل دیکھوں، میرا دل چلے تو میں بھی تم کو یعنی miss late کو کالج کے لیے لینے نہیں آؤں بلکہ تمہارے گھر کے آگے سے گاڑی کا ہارن بجاتی نکل جاؤں..... لیکن..... میں اپنے بھائی کا کیا کروں؟ جس کی گاڑی کے رور

مجہ تمہارے دروازے کے سامنے بریک لگ جاتے ہیں اور پھر اس کی گاڑی تمہیں لیے بغیر اشارت ہی نہیں ہوتی..... وہ خود تو تمہارے چکر میں لیٹ ہوتا ہی ہے، میری بھی پہلی کلاس بس ہو جاتی ہے۔“  
روشاٹھ نے روز کی طرح اسے کھری کھری سنائیں کہ تابندہ کی وجہ سے تقریباً پچھتے میں چار دن تو اس کی پہلی کلاس نکل ہی جاتی تھی لیکن تابندہ بغیر برامانے ہنسی رہی اور تیار ہوئی رہی۔

”ویسے میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ تم ہمارے آنے سے پہلے تیار کیوں نہیں ہو سکتیں جبکہ میں صبح اٹھ کر سب سے پہلے تمہیں کال کرتی ہوں کہ اللہ کے واسطے اٹھ جاؤ..... لیکن میں ہی کیا..... خالہ جان خود تمہاری حرکتوں سے پریشان ہیں، وہ کمال خود ہی تیار نہیں تھیں کہ ایک کالج کیا، تم تو ہر جگہ ہی لیٹ ہو جاتی ہو..... ان بے چاری کو تو یہ حسرت ہے کہ تم کوئی کام تو وقت پر کرو، ویسے ایک مشورہ ہے اگر تمہارے نزدیک اس پیش قیمت کلاک کی کوئی حیثیت نہیں ہے تو یہ کسی غریب ہی کو دے دو.....“ روشاٹھ نے تابندہ کو شولڈر پر بریک لٹکا کر کمرے سے باہر نکلتے دیکھ کر اپنا بیک اٹھاتے ہوئے کہا۔

”اچھا..... اچھا خالہ کی بھانجی، اب چلو..... باتی مشورے، لیکچر سب راستے میں دے دینا.....“ اس نے پیچھے مڑ کر پیر پختے ہوئے روشاٹھ کو پھینکا۔

”راستے میں..... اوہو..... وہ..... وہ ہمارا بھائی ایک لفظ بھی کہنے دے گا..... اس کا بس چلے تو کان دو گئے تاخیر سے کھلوائے..... سورج تمہارے اٹھنے کے بعد نکلے..... ساری دنیا تمہارے لیے بدل جائے..... لیکن کوئی تمہیں کچھ نہ کہے.....“ روشاٹھ صرف سوچ کر رہ گئی۔

روشاٹھ تابندہ کی خالہ زاد تھی..... دونوں میں گہری دوستی تھی..... تابندہ کی لالباہی طبیعت کے باوجود روشاٹھ اس میں جان بھی اور جان تو اس میں

طوطی کی بھی تھی..... اور وہ طوطا..... کون تھا؟  
”میری سمجھ میں نہیں آتا تابندہ، تم آگے زندگی میں کیا کرو گی.....“ روشاٹھ نے فکر مندی سے کالج کارڈرو میں چلتے چلتے رک رک بڑی بے پروائی سے چونگ چاتی تابندہ سے اپنے دل میں اٹھتے خدشے کا اظہار کیا۔

”اوہ..... بات تو سوچنے کی ہے، آگے زندگی میں..... کیا ہوگا؟“ تابندہ نے اپنے اوپر مصنوعی... فکر مندی طاری کی اور پھر روشاٹھ کے حد درجہ سنجیدہ چہرے کو دیکھ کر اس کا بے ساختہ تہقہہ نکل گیا۔

☆☆☆

”عباس..... چائے؟“  
عباس نے کپ ہاتھ میں لیا تو بے ساختہ اس کی نظر دیوار پر لگی کلاک پر ٹھہری گئی، جہاں روز کی طرح 5:10 بج رہے تھے اور پھر خود بخود اس کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی۔  
”تابندہ کتنی چکنے نکل ہے۔“ وہ روز کی طرح صرف سوچ کر رہ گیا۔ اسی کتنا سمجھاتی تھیں۔

”تابندہ ایک بے پروا، غیر ذتے دار، ضدی اور اپنے باپ کی لاڈلی ہے..... تمہارے اور اس کے مزاجوں میں زمین آسمان کا فرق ہے..... ٹھیک ہے وہ میری بیٹی ہے، میں تمہاری خوشی کے لیے اس کو بیاہ تو لانی ہوں لیکن عباس اسے سر پر مت چڑھنے دینا، اس کو ہمیشہ دبا کر رکھنا، میں تو اس کی پھولی ہوں صبح پر بھی نوکوں کی تو بھائی سے بھی بری بنوں گی اور بیٹی سے بھی لیکن تم اس کے شوہر ہو، غلط بھی کرو گے تو کوئی ٹوکنے والا نہیں..... اور.....“

”کیا سوچ رہے ہیں؟“ تابندہ کی آواز اسے ماں کی یادوں سے باہر کھینچ لائی۔

”کیا مطلب..... کیا میں کچھ سوچ بھی نہیں سکتا.....؟“ عباس کے لہجے میں کئی اتر آئی۔  
”کیا ہوا عباس.....؟ ناراض کیوں ہو رہے



کون کہتا ہے کہ؟

# اولاد نہیں ہو سکتی

آج بھی لاکھوں گھرانے اولاد کی نعمت سے محروم سخت پریشان ہیں۔ مایوسی گناہ ہے۔ انشاء اللہ اولاد ہوگی۔ خاتون میں کوئی اندرونی پرالیم ہو یا مردانہ جراثیم کا مسئلہ۔ ہم نے دیسی طبی یونانی قدرتی جڑی بوٹیوں سے ایک خاص قسم کا بے اولادی کورس تیار کیا ہے۔ جو آپ کے آنگن میں بھی خوشیوں کے پھول کھلا سکتا ہے۔ آپکے گھر میں بھی خوبصورت بیٹا پیدا ہو سکتا ہے۔ آج ہی گھر بیٹھے فون پر تمام حالات سے آگاہ کر کے بذریعہ ڈاک وی پی VP بے اولادی کورس منگوائیں۔

المسلم دارالحکمت رجسٹرڈ (دواخانہ)

ضلع و شہر حافظ آباد۔ پاکستان

0300-6526061  
0547-521787

فون اوقات

صبح 9 بجے سے رات 11 بجے تک

آپ ہمیں صرف فون کریں  
دوائی آپ تک ہم پہنچائیں گے

جس جاتا ہے تو جاؤ..... پلیز مجھے تنگ مت کرو، تم چاہو تو دو چار دن اپنی اماں کے گھر رہ لینا، تم بھی خوش ہو جاؤ گی اور میں بھی چند دن تمہارے بغیر آرام سے گزار لوں گا۔“ عباس نے سفاکی کی انتہا کر دی۔ عباس اس کی طرف دیکھے بغیر اٹھ کر اندر کی طرف چل دیا، یہ دیکھے بغیر کہ وہ ایک عورت جو گھر سامنے کی تنہا میں ریزہ ریزہ ہو رہی ہے، اپنے آنسو اپنے آپ سے بھی چھپانے کی کوشش میں ملکان ہو رہی ہے۔ آنکھوں میں آئے آنسو وہ اسے دکھانا نہیں چاہتی اور اس صدمے کو بھی چھپانا چاہتی تھی جو اس کے رویے سے اسے پہنچا تھا کہ وہ اسے پیر کی جونی سمجھتا ہے، سمجھ لیکن اس کی ایک عزت نفس بھی تو ہے۔ عورت انا، عزت نفس کے بغیر ادھوری ہے اور وہ ایک مکمل عورت تھی۔

☆☆☆

”عباس!“ اس نے کافی دیر سے خاموشی کے لائق سے بیٹھے عباس کو مخاطب کیا..... عباس کی کتاب پڑھنے میں مگن تھا، کتاب ہی پڑھتا رہا۔ جیسے کچھ سنا ہی نہیں ہو۔

”عباس!“ اب اس کے رویے میں دبا دبا ہوا غصہ تھا۔

”کہو!“ عباس نے ذرا کی ذرا نظر اٹھا کر اس کو لائق سے دیکھتے ہوئے بیزار لہجے میں پوچھا۔

”پلیز بند کریں اس کتاب کو اور میری بات سنیں۔“ اب تابندہ کی قوت برداشت ختم ہو رہی تھی۔

”کیا ہے یار..... ایک دن چھٹی کا ہوتا ہے وہی بندہ چین سے نہیں بیٹھ سکتا۔“ عباس نے بیزار ہو کر کہا۔

”ہم بھی سارا ہفتہ آپ کی چھٹی کا انتظار کرتے ہیں۔“ تابندہ سوچ کر رہ گئی۔

☆☆☆

”جہاں آج پارٹی میں سب ہی میری تعریف کر رہے تھے.....“ تابندہ نے کوٹ بیٹگر کر کے الماری میں لٹکاتے ہوئے عباس سے کہا۔

”اچھا.....“ عباس نے جینٹل سرچنگ کرتے ہوئے کہا۔

”اور کیا جناب! اور وہ جو آپ کے دوست ہیں ناں، علی جمصر کی بیگم تو بار بار کہہ رہی تھیں.....“ عباس بھائی تو بہت خوش نصیب ہیں..... وہ تو ہر وقت آپ کے قصیدے پڑھتے رہتے ہوں گے.....“

”بائے رے..... لوگوں کی خوش بھی، انہیں کیا پتا تحریف اور قصیدے تو دور کی بات، آپ نے تو شاید آج تک مجھے غور سے دیکھا بھی نہیں ہوگا.....“

”تابندہ! عباس کا خوشگوار موڈ دیکھ کر شکوہ کر ڈالا۔

”تو تمہارا کیا خیال ہے، میں کیا کروں؟ تم ایسی ہو، جیسی تو تم سے شادی کی ہے۔“

”اچھا لگنے اور محبت میں بہت فرق ہوتا ہے۔“

”تابندہ کی آنکھوں نے شکوہ کیا۔

ہیں، ایسا کیا کہہ دیا میں نے؟“ تابندہ کے لہجے میں ان کی ناراضی چل گئی۔

”نہیں! تم نے کچھ نہیں کیا بلکہ تم عورتیں تو کچھ کرتی ہی نہیں ہو..... گھروں میں بیٹھ کر آرام کرتی ہو، عیش کرتی ہو اور ہم مردوں کی زندگی عذاب کرتی ہوں، حد ہوتی ہے..... حماقتوں کی! اب بندہ سوچے بھی تو تم سے پوچھ کر اور یہاں کیوں کھڑی ہو، کوئی کام نہیں ہے تمہیں..... جو ہر وقت میرے سر پر مسلط رہتی ہو۔“ عباس نے ہمیشہ کی طرح بات کا بیٹنگز بنا دیا۔ وہ تابندہ کے لیے ایسا ہی تھا..... جھگڑالو..... ناشکر اور روکھا پھیکا..... اور تابندہ جو خوشگوار موڈ میں آج عباس کا انتظار کر رہی تھی کہ اس نے pc میں نیپل بک کروا رکھی تھی کہ آج اس کی شادی کی سالگرہ تھی..... چپ کی چپ رہ گئی کہ عباس کے سامنے ایسے ہی اس کی بولتی بند ہو جاتی تھی۔

کہتے ہیں عورت کی چپ مرد کو توڑ دیتی ہے، ہر اسال کر دیتی ہے لیکن اس کی چپ سے عباس کو کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

☆☆☆

وہ موڈی تھی، شادی کے بعد وہ سارے موڈ بھول گئی..... وہ اپنے آپ کو مصروف رکھتی..... عباس کا بزنس کئی ممالک میں پھیلا ہوا تھا، وہ اکثر غیر ممالک کے دوروں پر رہتا، تابندہ گھر بھی سنبھالتی تو کاروبار کے سچ و خم بھی دیکھتی، رشتے دار یاں بھی نبھاتی تو بچوں کو بھی پورا وقت دیتی، عباس کی محبت حاصل کرنے کے لیے اس نے ہر کوشش کر ڈالی، اپنے آپ کو مٹا ڈالا..... لیکن عباس کا رویہ اکثر اسے پریشان اور دکھی کر دیتا اور وہ ذہنی یورث سے بچنے کے لیے اپنے آپ کو جسمانی طور پر بے پناہ مصروف رکھتی..... سال بھر بعد ہی اس کی گود میں مریم آگئی..... اور اس نے غم جاناں اور غم دوراں کو نظر انداز کر کے مریم کو اپنے سینے میں سمولیا..... اسے مریم

”تو میں کیا کروں؟ پوچھتے ہیں تو پوچھیں



”تم میرے گھر میں رہتی ہو، میری بیٹی کی ماں ہو، اس وقت میرے بیڈروم میں موجود ہو..... کیا یہ محبت نہیں ہے؟“ عباس نے اس کی آنکھوں میں چھلکا شکوہ بھی پڑھ لیا تھا۔

”نہیں، یہ محبت نہیں ہے، یہ سمجھتا ہے، تعلق ہے، گزارہ ہے لیکن یہ محبت نہیں ہے، محبت اظہار مانگتی ہے، دلیل مانگتی ہے، ثبوت چاہتی ہے، محبت میں تو اتنی گرمی ہوتی ہے کہ وہ پورے وجود کو پگھلا کر رکھ دیتی ہے، تن من قطرہ قطرہ پگھلتا ہے..... محبت اشتہار بن جاتی ہے، اگر تم مجھ سے محبت کرتے ہو تو احساس کیوں نہیں ہوتا..... میرا وجود تمہاری محبت سے ریزہ ریزہ کیوں نہیں ہوتا..... شاید اس لیے کہ ہمارے درمیان محبت ہے ہی نہیں... اور اگر تم محبت کرتے ہو تو ظاہر کرو، گناہ کی طرح چھپاتے کیوں ہو۔“ تابندہ سلگتے ذہن کے ساتھ سوچے چلی جا رہی تھی اور عباس نہ جانے کب گہری نیند میں ڈوب چلا تھا۔

محبت میں شب بیداری عورت کا مقدر ٹھہرتی ہے کیونکہ عورت محبت کرتی ہے تو پامال ہونا چاہتی ہے..... اور مرد تو دریافت کا پرندہ ہے اور جب عورت کو دریافت کر لیتا ہے تو اپنے ساتھ زندگی گزارنے کے جرم میں عورت کو اس قدر تھکا دیتا ہے کہ اس کی آنکھوں کے ساتھ دل بھی رونے لگتا ہے..... اور دل تو تابندہ کا بھی۔

☆☆☆

”میں نے ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ، ویل میز ڈ ہاؤس کیمپ کا بندوبست کر لیا ہے اور وہ خاتون کل صبح آجائیں گی۔“ تابندہ جو سارے کام نٹا کر رات کے اس پہر دودھ کا گلاس عباس کے لیے لے کر آئی تھی اس کی بات سن کر حیرن رہ گئی۔

”کیا مطلب؟ ہاؤس کیمپ..... لیکن کیوں؟ کیا ضرورت ہے؟“ تابندہ حیران ہوئی۔

”ضرورت ہے، میں چاہتا ہوں یہ مکان گھر نظر

آئے۔“ عباس کی نظریں بدستور لپ ٹاپ پر تھیں۔ ”تو آپ یہ کہنا چاہتے ہیں، میں آج تک اس مکان کو گھر نہیں بنا سکی، یہاں کوئی ڈسپلن نہیں ہے۔“ عباس کہنے سے پہلے آپ کو سوچنا چاہیے کہ آپ کہہ رہے ہیں، میں تھک گئی آپ کی آپ کے خاندان کی، آپ کے گھر کی خدمت کرتے کرتے اور آپ کہہ رہے ہیں یہ چار دیواری گھر نہیں ہے..... آپ ایک چھوڑ دس ہاؤس کیمپ رکھیے لیکن میری محنتوں اور خدمتوں کی قبر نہیں۔ میں نے کیا کیا کی چھوڑی مجھ میں نہیں آتا۔“ آسو تھے کہ دل پر گر رہے تھے اور ہونٹ ہمیشہ کی طرح ایک دوسرے میں پیوست اور سوچوں کے گرداب میں پھنسا رہی تھی۔

”ٹھیک ہے جیسے آپ کی مرضی۔“ سوچوں کے گرداب میں ڈوبے ابھرتے اس کے منہ سے نکلا۔ ”تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہے نا؟“ عباس نے رسماً پوچھا۔

”نہیں..... بات دراصل یہ ہے عباس کہ عورت زندگی میں بہت بڑے بڑے کام بھی انجام دے لیتی ہے اگر اس کے کاندھے پر بہت بڑا بوجھ چھکی دی جائے۔“ نہ چاہتے ہوئے بھی شکوہ منہ نکل ہی گیا۔

”لیکن تھکی والا کام بھی تو کیا ہو۔“ عباس کے سر و لفظوں نے..... ہنسی کی حدت سے گرم کر کے برف بھری دی، بستر، تکیہ، میز، کرسی سب برف سے ڈھک گئے۔ پورے کمرے کی ہر چیز سرد ہوئی اور اس ٹھنڈک نے تابندہ کے وجود کو بھی برف سے ڈھانپ دیا۔

”آپ درست کہہ رہے ہیں، غلطی میری ہی ہے، میں نے اپنی آدمی زندگی آپ کو خوش کرنے میں صرف کردی لیکن آپ کیسے خوش ہو سکتے ہیں آپ کو اپنے آگے کوئی نظر ہی نہیں آ سکتا.....“ تابندہ کی آنکھوں سے بہتے گرم آنسوؤں نے برف بنا

راست بنایا۔

”مقابلہ کوئی خاص چیز ہو تو نظر بھی آئے.....!“ لفظ تھے یا بھلا تابندہ کم مضمی ہو گئی۔

بس پھر کہنے کے لیے رہ گیا۔ وہ سوچ کر رہ گئی..... ”ان مردوں کو کون سمجھائے، زیور، کپڑوں کا جھیر، روپیہ، پیسہ، عورت کو اطمینان تو دے سکتے ہیں لیکن خوشی اور اعتماد، عورت کو مرد کی محبت ہی دیتی ہے، عورت، محبت فنا ہونے کے لیے کرتی ہے وہ اپنی محبت میں پامال ہو جاتی ہے اگر عورت سے محبت کے دو بول، بول دیے جائیں تو وہ ساری زندگی مرد کے پاؤں میں ملی کی طرح بیٹھ جاتی ہے۔ زندگی کے ہر لمحے میں وہ محبت کے لیے سرگرداں رہتی ہے، اپنی جان ہلکان کرتی ہے، راتوں کی نیند قربان کرتی ہے، بھی دوست کبھی ہمزاد اور بھی محبوبہ بن جاتی ہے اور بے میں کیا چاہتی ہے محبت بھرا اعتماد اور مان.....! اور یہ مرد جب توازن پر آتے ہیں تو ملکہ بنا کر تخت پر شاد دیتے ہیں گھر کی..... دانی بنا دیتے ہیں اور جب پامال کرتے ہیں تو مٹی میں ملا دیتے ہیں، ایسا کر دیتے ہیں کہ عورت آئینہ دیکھنے سے بھی ڈرنے لگتی ہے۔“

”کیا ہوا؟ یہ کمفرٹ تو چھوڑ دو..... جو بھی سوچنا ہے، سامنے صوفے پر بیٹھ کر سوچو..... لیکن مجھے تو سونے دو۔“ عباس نے تابندہ کی گہری خاموشی سے اٹک کر کہا۔

”دکھ اس بات کا ہے کہ آپ نے ہمیشہ مجھے ایک عورت سمجھا، انسان نہیں سمجھا، ہماری کون سی محبت کی شادی تھی لیکن میرا خیال تھا ساتھ رہنے سے ایک دن دو انسان ایک دوسرے کے ساتھ محبت کی دُور میں بندھ ہی جائیں گے..... میں نے کوشش کی تھی الامکان کوشش کی ایک محبت بھرا گھر بناؤں لیکن ایک آدمی ایسا کر سکتا ہے..... دکھ اس بات کا ہے کہ آپ کبھی اس انا اور حاکمیت کی سیڑھی سے اتر کر

میں صاف بقی تو ہوں

آئے ہی نہیں لہذا آپ کو کبھی میرے اندر کوئی اچھی بات نظر ہی نہیں آئی..... بلکہ یہ کہنا..... زیادہ درست ہوگا کہ آپ جیسے مرد کبھی کسی سے محبت کر ہی نہیں سکتے.....“ تابندہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا اور عباس کے برابر والے عینکے پر سر رکھ کر لیٹ گئی کہ ایک ہی بستر پر سونا بھی مقدر ہو چکا تھا اب انسان اپنی تقدیر سے تو نہیں لڑ سکتا۔

”میں کوئی غیر تو نہیں تھا..... تم مجھے جانتی تھیں..... شادی کے لیے ہاں کیوں کی تھی؟“ عباس نے کہتے ہوئے سائڈ لیپ بجا دیا۔

برسوں پرانا شکوہ، سوال بن کر ایک بار پھر سامنے آکھڑا ہوا تھا۔

☆☆☆

”ممی.....“ رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا..... کہ اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے جلدی سے سائڈ لیپ آن کیا تو دیکھا، دروازے پر اس کی دس سالہ بیٹی مریم سہمی ہوئی کھڑی تھی۔

”جی، میری جان..... خیریت؟“ اس نے گھبرا کر جلدی سے بیٹی کو ہاتھ سے اشارے سے اپنے پاس بلا لیا۔

”ممی مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے، لگ رہا ہے بہت سارے بھوت میرے کمرے میں آگئے ہوں۔“ مریم نے ماں سے لپٹتے ہوئے خوفزدہ انداز میں کہا۔

”تو بیٹا! رات کو ڈراؤنے پروگرام کیوں دیکھتی ہو، ڈر تو لگے گاناں، آیت الکرسی پڑھی تھی آپ نے یا نہیں؟“ تابندہ نے معصوم سی مریم کے بالوں میں محبت بھری انگلیاں بچھرتے ہوئے پوچھا۔

”جی آیت الکرسی پڑھی تھی اور چاروں قل بھی..... لیکن ممی پھر بھی ڈر لگ رہا ہے..... میں آپ کے پاس سو جاؤں؟“

”میرے پاس.....“ اس نے برابر میں سونے عباس کی طرف دیکھا اور پھر اپنے اور عباس کے بیچ



## ورزش سے علاج

آسٹریلیوی ماہرین کا کہنا ہے کہ ورزش سے بلڈ پریشر، ذہنی دباؤ اور ڈپریشن پر قابو پایا جاسکتا ہے۔ اچھی ورزشیں ان امراض کے لیے دواؤں سے بھی زیادہ مفید ہوتی ہیں۔ مینٹل ہیلتھ فاؤنڈیشن کی تحقیق کے مطابق ذہنی امراض کے ڈاکٹر ڈپریشن میں مبتلا افراد کو ورزش کے بجائے ادویات تجویز کرتے ہیں۔ حالیہ اعداد و شمار کے مطابق گزشتہ ایک دہائی میں ڈپریشن سے بچاؤ کی ادویات تجویز کرنے کی تعداد دگنی ہوئی ہے لیکن تحقیق سے پتا چلا ہے کہ... ڈپریشن کے مریضوں کو ورزشوں سے اتنا ہی فائدہ پہنچتا ہے جتنا کہ ان ادویات سے جبکہ ادویات کے مقابلے میں اس کا نقصان بھی کوئی نہیں ہے۔ ورزش کرنے سے انسانی دماغ ایسا کیمیائی مواد خارج کرتا ہے جو ذہنی صحت کے لیے مفید ہوتا ہے۔ اس سے قبل 2004ء میں اسپتالوں کے رہنما اصولوں میں خطرناک حد سے کم ڈپریشن کے مریضوں کو ورزشوں کا مشورہ دینے کی ہدایت کی گئی تھی لیکن مینٹل ہیلتھ فاؤنڈیشن کو تحقیق سے پتا چلا ہے کہ ملک میں ڈاکٹروں کی نصف تعداد ڈپریشن میں مبتلا افراد کو ایکسرسائز ریفرل اسکیم تک رسائی حاصل تھی جبکہ ہر چھ میں سے ایک فرد معاشی تنزیل کی وجہ سے ڈپریشن کا شکار ہے۔

مرسلہ: کلثوم عباس، کراچی

”کسی ہو؟“ ماؤ تھمیں میں آواز ابھری۔ وہ آواز جسے وہ سن کر کن ہو گئی۔ اس آواز کو تو وہ قبر میں لیٹ کر بھی پہچان سکتی تھی لیکن یہ آواز... ☆☆☆

”تو تم نے ہاں کر دی...“ وہ جو مہمانوں کے جانے کے بعد... برتن دھونے کے بعد چکن کینٹ میں دھلے برتن خشک کر کے لگا رہی تھی۔ رضا کے سوال پر پلٹی نہیں بلکہ خواہ خواہ ہی صاف سلیپ کو کمرے سے صاف کرنے لگی۔

”میں تم سے کچھ پوچھ رہا ہوں تابی...؟“ رضا کی آواز میں شکوہ تھا۔ وہ خاموش رہی۔

”میں جانتا ہوں بلکہ میں تم کو تم سے زیادہ جانتا ہوں تم آنسو پینے کی کوشش مت کرو... بس مجھے اتنا بتا دو... کہ تم نے اپنی مرضی سے رشتہ قبول کیا ہے یا...؟“ رضا کہتے کہتے خاموش ہو گیا کہ حلق میں چھپتے آنسوؤں نے اس کو مزید بولنے نہیں دیا۔ ☆☆☆

”بیٹا تمہاری بڑی پھوپھی نے اپنے بیٹے عباس کے لیے تمہارا بیغام دیا ہے، عباس اچھا ہے، تعلیم یافتہ ہے، اعلیٰ عہدے پر ہے... میں بھی جانتا ہوں کہ تمہاری خالہ رضا کے لیے تمہارا ہاتھ مانگ رہی ہیں، تمہاری رضا سے بہت دوستی ہے، تم اپنی خالہ کے گھر میں بہت سہلی لٹی ہو لیکن بیٹا میری بہن نے ساری زندگی مجھ پر احسانات کیے ہیں... انہوں نے صرف مجھے دیا ہے، میرے ماں، باپ کے بعد وہ میری ماں بھی تھیں اور باپ بھی... آج زندگی میں میری بار کچھ مانگا ہے... میں فیصلے کا اختیار تمہیں دیتا ہوں... لیکن فیصلے کے اختیار کے ساتھ ساتھ میں یہ سوال بھی کرتا ہوں کہ کیا تم مجھے میری بہن کے احسانات اتارنے کا موقع دو گی؟“ احمد علی نے اختیار بھی دیا اور کوئی راہ بھی نہیں چھوڑی۔

کہ یہ وہ لڑکی نہیں ہے جس کے ساتھ رہ کر میں برتری قائم رکھ سکوں... یہ بہت جلد میرے ساتھ اور پھر مجھ سے بہت آگے کھڑی ہوگی... اور میں برداشت نہیں کر سکتا، میری ماں نے مجھے اسے کال کر پالا اور پھر ساری زندگی میں نے ساری دنیا کو اپنی کلاس ہی سمجھا میں تائبندہ کو بھی اپنی کلاس ہی سمجھتا تھا لیکن چند دنوں ہی میں مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ اے بیس ہے وہ مانی گاڈ میں گھبرا گیا... مجھے اپنی حاکمیت اور برتری کا تخت ہلتا ہوا محسوس ہوا اور پھر میں اس کے سامنے ایک روایتی شوہر کے روپ میں جا کھڑا ہوا۔ میں نے اس پر اس کی شخصیت و اعتماد پر اپنی اپنی پرست مردانگی کا وزنی پتھر رکھ دیا اور وہ رسول، رواجوں میں لپٹی، ماں باپ کی عزت سنبھالنے اور گھر بسانے کی خواہش میں دقتی چلی گئی... مجھے اس کی بہت سی عادتیں پسند ہیں، اس کی فرمانبرداری میرے لیے نعمت ہے، اس کی انتظامی صلاحیتیں میرے گھر کے لیے اللہ کی رحمت ہیں اس کی ذہانت، اس کی برجستگی، اس کا اعتماد، اس کی ہر بات مکمل ہے لیکن میں اعتراف نہیں کر سکتا، میں اعتراف نہیں کروں گا کیونکہ میرا اعتراف اس کے اعتماد کو تقویت دے گا... وہ پہلے جیسی با اعتماد تائبندہ بن جائے گی اور مجھے خود مختار عورتیں بالکل پسند نہیں... وہ جو صورت، شکل، تعلیم، مزاج، اخلاق، ہر چیز میں مجھ سے بہتر ہے، جس کا احساس شاید اسے خود بھی نہیں اور نہ ہی میں ہونے دوں گا... اور جب اسے میں، میری ذات یعنی عباس مرتضیٰ کو خوش رکھنے کے لیے پریشان دیکھتا ہوں تو مجھے بہت اچھا لگتا ہے، ہر مرد کو محسوس عورت پسند ہے اور میں بھی تو ایک مرد ہی ہوں ناں!“ عباس ابھی کچھ سوچتے سوچتے سو گیا۔ ☆☆☆

”ہیلو...“ مسلسل جتنی تیل سے تنگ آ کر آخر اس نے فون اٹھا لیا۔

میں بستر پر موجود فاصلے کو دیکھا۔ ”ہاں ایک تمہارا وجود ہی تو ہے جو ہر رات مجھے اس بستر پر لاپختا ہے۔“ وہ صرف سوچ کر رہ گئی۔

”ممی... پلیز... میں یہاں سو جاؤں؟“ مریم بہت خوفزدہ تھی۔

”نہ بیٹا آپ کے بابا ڈسٹرب ہوں گے... ایسا کرو، اپنے کمرے میں چلو، میں وہیں چلتی ہوں، آپ کے کمرے میں آپ کے پاس سو جاتی ہوں... ٹھیک ہے۔“ تائبندہ نے بستر سے کھڑے ہو کر مریم کا ہاتھ پکڑ کر باہر نکلتے ہوئے اسے سمجھایا۔

اور مریم، مریم میں تو اس کی جان تھی... وہ اس کی ایک ہی بیٹی تھی... اکثر جب وہ پریشان، اکیلی اور اداس ہوتی تو اس کا دل چاہتا کہ وہ کسی کو تو شریک راز کرے، کوئی ایک تو ایسا کاندھا ہو، جس پر سر رکھ کر وہ رو سکے اور جب اس کی کوکھ میں امید کی کوئیل پھوٹی تو ہزاروں ماؤں کے برعکس اس نے اللہ سے بیٹی مانگی تھی... اور پھر اللہ نے اسے بیٹی دے دی... اکثر جب عباس کا سر درویشی اس کے اعصاب کو برف کی طرح سرد کر دیتا تو وہ مریم کو سینے سے لگا لیتی اور پھر مریم کی محبت کی گرمی سے اس کی آنکھ سے گرم گرم آنسو اس کے علم میں آئے بغیر اس کے بالوں میں جذب ہو جاتے۔

☆☆☆

”تائبندہ اچھی لڑکی ہے، خوب صورت، تعلیم یافتہ، سلیبی ہوئی، سمجھدار، بالکل ویسی جیسی ایک عورت کو ہونا چاہیے لیکن بیوی... بیوی کو سمجھدار نہیں ہونا چاہیے... تائبندہ ایک پرفیکٹ عورت ہے اور عورت کو پرفیکٹ نہیں ہونا چاہیے کیونکہ پرفیکٹ عورت سے ہم جیسے مرد خوش نہیں ہو سکتے۔

تائبندہ مجھے شادی سے پہلے پسند تھی، میں نے اماں کو بہت مشکل سے تائبندہ کے لیے راضی کیا تھا... لیکن شادی کی پہلی رات مجھے اندازہ ہو گیا تھا



## بڑبولا

ایکشن میں مرا مد مقابل  
کچھ ایسی بے یقینی سے کھڑا ہے

کہ سوتے میں بھی بول اٹھتا ہے اکثر

مرا جلسہ، مرا جلسہ بڑا ہے

شاعر: انور مسعود

پسند: فاطمہ حسن، اسلام آباد

حال کا شکار تھی..... تابندہ کی آنکھیں ناقابل یقین  
منظر دیکھ رہی تھیں۔ لاؤنج میں اماں کے ساتھ بڑے  
اطمینان سے رضا براجمان تھا۔

”کیسی ہو؟“ رضانا کھڑے ہو کر مسکراتے  
ہوئے پوچھا۔

”تم.....“ اس کے لب تھر تھرائے۔

”کون آیا ہے.....؟“ عباس نے اسٹڈی  
سے باہر آ کر پوچھا..... اور وہ جو رضا کو دیکھتے ہی  
برسوں پیچھے چلی گئی تھی، عباس کی آواز سے حال  
میں واپس آ گئی۔

”عباس، یہ میرے کزن رضا ہیں، امریکا میں  
رہتے ہیں کچھ دن پہلے ہی آئے ہیں اور اماں کے ساتھ  
آپ سے خاص طور پر ملنے آئے ہیں.....“ اس نے  
عباس کے برابر میں کھڑے ہوتے ہوئے رضا کا  
تعارف کرایا۔ تعارف کراتے ہوئے رضا کی مسکراتی  
آنکھوں کو اپنے مقام اور حیثیت کا بھی احساس دلایا۔

”بھئی مجھ سے ملنے کیوں آئیں گے.....  
تمہارے رشتے دار ہیں، تم ہی سے ملنے آئیں گے۔“  
عباس نے آہستگی سے سردی میں اس سے کہا۔

لیکن رضا کے تیز کانوں اور ذہن نے الفاظ

ہوئے اپنے آپ سے سوال کیا۔

”لیکن اس نے مجھے فون کیوں کیا؟ میں اس  
سے بات نہیں کر سکتی..... میں تانی نہیں ہوں، میں ہنر  
تابندہ عباس ہوں..... اور مسز تابندہ عباس اس سے  
بات کرنا نہیں چاہتی۔“ اس نے پُر اعتماد انداز میں  
اپنے اندر کی تانی کو ڈالنا۔

☆☆☆

اس نے آئینے میں اپنے سراپے کا جائزہ لیا،  
کالے کپڑے اس کے دو دھیا بدن پر چمک رہے  
تھے..... ہلکے ہلکے میک اپ میں اس کے چہرے کے  
حسین نقوش بہت زیادہ حسین لگ رہے تھے۔  
سکارے اور آئی لائٹ سے سچی آنکھیں بہت دلکش لگ  
رہی تھیں..... اس نے سیاہ ہینڈ بیگ اٹھا کر مریم کو  
ناروی۔

”مریم..... مریم چلو بیٹا دیر ہو رہی ہے۔“  
مریم کی دوست کی کتھ ڈے تھی اور وہ جانے  
کی ضد کر رہی تھی..... تابندہ جو ایک بہت ذمے دار  
پاس تھی، وہ مریم کو کہیں اکیلے نہیں بھیجتی تھی وہ جانتی  
تھی کہ بیٹی امانت ہوتی ہے اور وہ امانت کو امانت کی  
طرح پال رہی تھی..... گو آج اس کی طبیعت ٹھیک نہیں  
تھی لیکن مریم کے لیے تو وہ سب کچھ کر سکتی تھی۔

”مریم.....“ اس نے دوبارہ آواز دی۔

”کہاں ہو بیٹے؟“  
”مٹی میں نہیں جا رہی..... تانو آئی ہیں۔“ باہر  
سے مریم کی چپکتی ہوئی آواز آئی۔

”اماں..... اماں آئی ہیں..... اماں کیسے  
آئیں گی؟“ خود سے ہم کلام ہوتی وہ تیزی سے باہر  
آئی اور پھر وہ جہاں تھی وہیں کھڑی کی کھڑی رہ گئی  
کہ اس لمحے کے بارے میں تو اس نے سوچا بھی نہیں  
تھا..... بھی بھی ایسا لگتا ہے کہ زمین نے ہمارے  
پاؤں جکڑ لیے ہیں..... ہم چل نہیں سکتے..... ہم  
سائیکس نہیں لے سکتے..... وہ بھی ایک ایسی ہی صورت

جانتے ہو کہ منافقت تو میرے مزاج میں پہلے ہی  
نہیں..... آج تک تم میرے دل میں رہے تو میں نے  
کبھی کسی کو نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا..... کسی کو بھی ایک  
دم دل سے نہیں نکالا جا سکتا..... اور تم..... تم تو رضا  
ہو..... تم میرے لیے عام نہیں ہو..... لیکن میں یہ بھی  
جانتی ہوں کہ وقت ہر یاد کو دھندلا دیتا ہے..... اور  
دھند میں تو اکثر اپنی جگہ مجھے پہاڑ بھی نظر نہیں  
آتے..... آج میں نے عباس کے نام کی انگوٹھی پہن

لی ہے..... میرے شعور نے اس رشتے پر سمجھوتا کر لیا  
ہے..... جلد ہی میرا شعور بھی قبول کر لے گا..... آج  
سے پہلے میں نے بھی عباس کو غور سے بھی نہیں دیکھا  
تھا لیکن اب میں عباس کے علاوہ کسی اور کے بارے  
میں سوچنا بھی نہیں چاہتی کہ میں رشتوں میں سچائی کی  
قائل ہوں..... میں چاہتی ہوں کہ میں سچے دل اور  
جذبے کے ساتھ عباس کی زندگی میں داخل ہوں.....

میں عباس سے محبت کرنے کی کوشش کروں گی.....  
امید ہے تم مجھے معاف کر دو گے۔ تم کبھی میرے  
خوابوں میں نہ آنا کہ میں کوشش کروں گی کہ  
میں عباس کے خواب دیکھوں..... یہ مشکل بہت ہے  
لیکن ناممکن تو نہیں..... ہے ناں رضا..... تم سمجھ رہے  
ہو ناں؟“ رات بھر وہ ٹیکے سے باتیں کرتی  
رہی..... ٹیکے اس کے آنسوؤں سے بھیکتا رہا..... اور  
یہ ٹیکے کتنے بڑے راز دار ہوتے ہیں اس کا اندازہ

اسے آج پہلی بار ہوتا تھا۔

☆☆☆

”کیسی ہو تانی.....؟“ لہجہ بے قرار تھا۔  
”I am sorry this is wrong  
number“

اس نے پُر اعتماد لہجہ میں کہتے ہوئے فون  
کریڈل پر رکھ دیا۔

”رضا.....“ اس کے اندر سے آواز آئی۔  
”کیا رضا پاکستان آ گیا؟“ اس نے الجھے

وہ جو آج پونیورسٹی سے واپسی پر رضا کے ساتھ  
اُس کریم کھاتی ہوئی ابھی گھر پہنچی تھی اسے لگا جیسے  
ساتوں آسمان ایک ساتھ دھڑ دھڑ اس کے سر پر آگے  
ہوں اور وہ ان کے بلے تلے دب گئی ہو..... اس کی  
آرزوؤں اور اس کی خواہشوں کا دم گھٹ گیا ہو..... اس  
نے پُر امید نظروں سے اپنے باپ کی طرف دیکھا اور  
پھر غیر ارادی طور پر خود بخود اس کا سر اتر میں بل گیا۔

☆☆☆

”بتاؤ ناں تانی.....“ وہ اسی طرح دروازے  
کے پتوں بچ کھڑا تھا۔

”ہاں!“ تابندہ کے منہ سے سسکتا ہوا نکلا.....  
اور وہ جو بہت مان سے اس کے راستے میں آکھڑا ہوا  
تھا..... تابندہ کے منہ سے اقرار سن کر جیسے مٹی کا ڈھیر  
بن گیا..... اور وہ پٹنا ناز ساس کے راستے سے ہٹ  
گیا اور تابندہ اس کے پاس سے گزر کر اندر اپنے  
کمرے میں چلی گئی کہ دل کو سمجھانے کے لیے بہت  
سارا رونا تھا اور رونے کے لیے اسے تنہائی چاہیے تھی۔

☆☆☆

”یہ نہیں ہے رضا کہ مجھے تم سے محبت نہیں.....  
میں نے اپنی زندگی میں صرف تم سے ہی محبت کی ہے،  
تم ہی میرے واحد دوست، میرے مزاج آشنا، ہمدرد،  
ہم مزاج، ہمسگسار ہو، تم وہ ہو جس کے بغیر جینے کا میں  
نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا تم میرے لیے بہت کچھ ہو،  
لیکن اماں..... جنہوں نے آج تک صرف دیا ہی دیا  
ہے..... مگر آج پہلی بار مجھ سے کچھ مانگا ہے تم ہی بتاؤ

رضا کیا میں اپنے باپ کو خالی ہاتھ لوٹا دیتی.....  
نہیں لوٹا سکتی تھی..... یاد رکھنا رضا اگر آج میں اپنے  
باپ کو مایوس کرتی تو زندگی کے کسی موڑ پر تمہیں بھی  
مایوس کر سکتی تھی..... میں جانتی ہوں تم مجھ سے ناراض  
ہو گے..... جس دن تم میری مجبوری سمجھو گے تمہاری  
ساری ناراضی ختم ہو جائے گی۔ تم سے..... رضا تم  
سے آج میں دستبردار ہو رہی ہوں۔ رضا تم اچھی طرح



رضانے روز کی طرح سونے سے پہلے روشطا کا وہ خط نکال کر پڑھا جو اس کی واپسی کا سبب بنا تھا۔

☆☆☆

تابندہ ہر ممکن کوشش کرتی کہ اس کا اور رضا کا کبھی سامنا نہ ہو۔ رضا اس کے سامنے آتا وہ اپنے گھر آ جاتی۔ وہ فون کرتا، وہ ریسو نہیں کرتی، وہ نمبر بدل بدل کر فون کرتا اور جو غلطی سے ریسو بھی کر لیتی تو فوراً بند کر دیتی۔ رضا اسے جھنجھوڑ رہا تھا۔ وہ اس کے وجود میں دراڑیں ڈال رہا تھا۔ وہ تابندہ میں تابی کو کھوج رہا تھا۔

☆☆☆

”پلیز تابی پلیز میرا فون بند مت کرنا، میں صرف تمہاری خاطر آیا ہوں، اپنی تابی کے لیے پلیز میری بات سن لو۔ کیا تم اپنے دوست، رضا کی بات بھی نہیں سنو گی۔“ تابندہ خاموش رہی لیکن اس نے فون بند بھی نہیں کیا۔

”thank you Taabi“ میں جانتا ہوں تمہاری شادی ہو چکی ہے، تم ایک بہت اچھی اور وفادار بیوی ہو۔ لیکن تابی تمہاری اپنی بھی تو ایک زندگی ہے تم صرف بیٹی۔ بہن۔۔۔۔۔ بیوی تو نہیں ہو بلکہ ان سب کے ساتھ تم جیتی جاگتی بیٹے میں دھڑکتا ہوا دل رکھنے والی ایک عورت بھی تو ہو۔۔۔۔۔ ہونا؟“ رضا نے تائید چاہی لیکن تابندہ سانس روکے اور چہرے پر بیٹے آنسوؤں کے ساتھ صرف سستی رہی۔

”میں یہ تو نہیں کہہ رہا کہ تم عباس کو چھوڑ دو، گھر کو نظر انداز کرو، اپنے ابا کا مان توڑ دو، میں تو صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ زندگی صرف ایک بار ملتی ہے اور اس کا کچھ حصہ صرف اپنے لیے بسر کرو۔۔۔۔۔ اس تابی کے لیے جسے زندگی اور زندگی کے تمام رنگوں

جب سبھی اماں اس کے لاڈ اٹھاتیں تو اس کا دل چاہتا کہ اماں کو روک دے اور کہے اماں اب آپ کی لاڈ کی اوقات دو کوڑی کی ہے۔ آج بھی وہ یہی سوچ کر آتی تھی صبح صبح عباس نے آج اسے بہت باتیں سنائیں، اس کا صرف یہ تصور تھا کہ عباس کا موڈ میں آفس جانے سے پہلے بلیو کی جگہ گرنے شرٹ کا بن گیا تھا اور بجلی چلی گئی تھی۔ اور وہ اسے قصور وار ٹھہراتا رہا اور وہ بے قصور معافیاں مانگتی رہی۔ لیکن آج بھی ہمیشہ کی طرح اماں کے اطمینان بھرے چہرے پر نظر پڑتا ہی وہ سب کچھ بھول گئی، وہ کیسے اپنے جاننے والوں کو تکلیف دے سکتی تھی۔

لوگ کہتے ہیں عورت اپنی پہلی محبت کو کبھی نہیں بول سکتی۔ ہاں یہ بات درست ہوگی۔ لیکن رائف عورت یہ ضرور کرتی ہے کہ اپنی پہلی محبت کو دل کی گہرائیوں میں دھکا دے کر تالا لگا دیتی ہے۔ اور چابی گہرے سمندروں میں پھینک دیتی ہے۔ لیکن رضا۔۔۔۔۔ رضا چابی ڈھونڈ رہا تھا۔ رضا اس تالے کو توڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ تابندہ خوفزدہ تھی، وہ تالے پر تالا لگا رہی تھی اور رضا۔۔۔۔۔ اس کی ہر کوشش کو بے سود کر رہا تھا۔

☆☆☆

”پیارے بھائی رضا۔۔۔۔۔ خوش رہو۔۔۔۔۔ تم تو جوگ ہی لے کر بیٹھ گئے، تم کب آؤ گے؟“ آج تابی تمہاری زندگی میں ایسے بہت سارے رشتے ہیں جو تمہیں بہت یاد کرتے ہیں۔ تم نے پوچھا تھا تابندہ خوش تو ہے؟ تابندہ کہی ہے؟ وہ خوش ہے یا نہیں، وہ لاکھ جھوٹ بولے لیکن میں جانتی ہوں، سب کچھ میں خوشی اور سمجھوتے میں فرق ہوتا ہے۔ تم تابندہ کو دیکھو گے تو حیران رہ جاؤ گے، وہ تو سرتاپا بدل گئی ہے، ہماری تابندہ تو کہیں کم ہو گئی ہے، اس کی ہنسی جسے کوئی اب وہ تابندہ نہیں بلکہ مسز تابندہ عباس ہے۔ کہیں یقین نہ آئے تو آکر دیکھ لو۔ اپنا خیال رکھنا۔

تابی مت کہا کرو۔۔۔۔۔ میں ایک بار پھر بتا رہی ہوں میں اب مسز تابندہ عباس ہوں۔ یہ بات اب تمہیں سمجھ لینا چاہیے۔“ تابندہ نے جانے کا کپڑا ہاتھ رکھتے ہوئے دو نوک انداز میں رضا کو ٹوکا۔

”ہو کی تم ساری دنیا کے لیے مسز تابندہ عباس۔۔۔۔۔ لیکن میرے لیے تم تابی تھیں۔ تابی ہو اور تابی ہی رہو گی۔۔۔۔۔ وہ تابی جو ہنستی تھی تو دنیا گنگنا لے لگتی تھی، وہ تابی جو نظر اٹھاتی تھی تو ہوا ٹھہر جاتی تھی، وہ تابی جو چلتی تھی تو۔۔۔۔۔“

☆☆☆

گھر کی تعمیر چاہے جیسی ہو اس میں رونے کے لیے جگہ رکھنا آج رضا کی باتوں نے اسے بہت پر لایا کہ ایسی محبتوں کی تو وہ اب عادی ہی نہیں رہی تھی۔ کبھی کبھی اس کا دل چاہتا کہ ابا کے سینے سے لگ کر بہت رونے۔۔۔۔۔ انہیں بتائے کہ ان کی محبتوں کی قیمت ادا کرتے کرتے اس کے وجود کے ساتھ ساتھ اس کی روح بھی چھلنی ہو گئی ہے۔ لیکن ابا۔۔۔۔۔ ابا اس کی شادی کر کے ایسے مطمئن دیکھ کر کہ وہ چاہنے کے باوجود کچھ کہہ ہی نہیں پاتی۔ کبھی دل چاہتا کہ اماں کی گود میں منہ چھپا کر سو جائے، کبھی نہ اٹھے

اور لہجہ دونوں نوٹ کر لیے۔ وہ برسوں سے عباس کے بارے میں سن رہا تھا اور آج واضح ثبوت مل گیا تھا۔

تابندہ کی چمکتی آنکھوں میں در آتی شرمندگی رضا کو تکلیف دے گئی اور جب عباس نے شرمندہ سی کھڑی حسین و جمیل تابندہ کو دیکھا تو نہ جانے کیوں اسے اپنی طاقت اور حیثیت کا بڑا عجیب سا احساس ہوا اور وہ مسکراتا ہوا واپس اسٹڈی میں چلا گیا اور رضا سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی انجان بن گیا۔

☆☆☆

”رضا ویسا ہی ہے با اخلاق، ویل میٹرڈ، گریس فل۔۔۔۔۔“ رات کو بستر پر لیٹتے ہی سب سے پہلے تابندہ کو خیال آیا۔

☆☆☆

”تابی بالکل بدل گئی ہے، وہ ہنس کھ لالابلی، پُر اعتماد، شعر و شاعری کرنے والی تابی تو نہیں تھی۔ وہ تو کوئی ڈتے دار، سمجھدار ماں اور ایک تابعدار بیوی تھی۔ اس کی زندگی بہت محدود تھی، اس گھر کے ہر کونے میں تابندہ تھی۔۔۔۔۔ آج میری ملاقات مسز تابندہ عباس سے ہوئی۔ تابندہ کے وجود میں تابی نہیں تھی اور میں تو تابی سے ملنے گیا تھا۔ اپنی تابی سے۔“

☆☆☆

”تمہیں کیا ہو گیا ہے تابی۔۔۔۔۔؟“ آج جب تابندہ اپنی ماں کے گھر آئی تو اتفاق سے رضا بھی چلا آیا۔

”کیا ہو گیا ہے؟ جیسی تھی ویسی ہی ہوں لیکن تم کیوں میری فکر میں ہلکان ہوتے رہتے ہو؟“ تابندہ نے زکھائی سے کہا۔

”اس لیے کہ میں نے اپنی زندگی میں صرف تمہاری فکر کی ہے صرف تمہاری۔۔۔۔۔ تم اب ہنستی کیوں نہیں ہو؟“ رضا کے لہجے میں محبتوں کی شدتیں تھیں۔

”پہلے میں تابندہ احمد علی تھی اور آج مسز تابندہ عباس۔۔۔۔۔! فرق تو آئے گا ناں اور ایک بات تم مجھے



## چھوٹی سی بات

شمیم فضل خالق



”کیا مصیبت ہے..... نیند کیوں نہیں آ رہی.....؟“ زارا نے جھنجھلا کر کبیل اپنے پیروں سے اٹھا کر دور پھینک دیا۔ اس نے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے ہوئے سوچا..... قریب کے بیڈ سے رابی کے خراٹے سن کر وہ اور زیادہ تپ رہی تھی۔

”یا اللہ..... مجھے رابی کی بہن ہوتے ہوئے کیوں اس قدر حساس بنا ڈالا..... جبکہ یہ، یہ اتنی

بھی دے سکتا ہوں..... میرا وعدہ ہے تمہاری عزت پر میں کبھی کوئی حرف نہیں آنے دوں گا..... تم مجھ سے ملنے آؤ گی ناں اپنے رضا سے ملنے..... اور تمہارے اندر تو میری جان ہے جیسے جتن کی چابی طوطے میں ہوتی ہے..... اور تابی.....“ وہ بولے چلے جا رہا تھا اور تابندہ گم سمی فون پکڑے کھڑی تھی..... برسوں سے لگے رنگ آٹا تالے کی چابی رضا کے ہاتھ لگ گئی تھی۔

☆☆☆

آئینے میں نظر آتے عکس نے حیرت سے اسے دیکھا۔ وہ ساکت نظروں سے اسی کو دیکھ رہی تھی۔ ”ممی.....! آپ کہیں جا رہی ہیں کیا؟“ دس سالہ معصوم سی بیٹی اس سے پوچھ رہی تھی اور جیسے لفظ ممی اس کے چاروں طرف گونجنے لگا۔ آئینہ..... لپ اسٹک..... بلش آن..... مسکارا..... گردن سے لپٹا نیگلکس جسم سے لپٹی ساڑی، ہاڈی اسپرے اور پرفیوم سے مہکتا بدن سب ممی، ممی کہنے لگے۔ اس کے چاروں طرف لفظ ممی ناچنے لگا۔ ہنسنے لگا..... رونے لگا..... اس نے آنکھیں بند کر کے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے اور پھر وہ زمین پر بیٹھتی چلی گئی..... اس سارے فسانے میں وہ یہ بھول گئی تھی کہ بہن، بیٹی اور بیوی ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ماں بھی تو ہے اور عورت شاید ہر رشتے سے بے وفائی کر سکتی ہے لیکن جب وہ ماں بن جاتی ہے تو وہ صرف ماں ہوتی ہے اور اس وقت بھی تابندہ ہر رشتے کو فراموش کر کے صرف ماں بن گئی تھی..... اس نے پیچھے مڑ کر معصوم مریم کو دیکھا..... اور پھر اسے اپنے سینے سے لگا کر بھڑائی ہوئی آواز میں کہا۔

”نہیں بیٹا آپ کی ممی کہیں نہیں جا رہی ہیں۔ اور دھندلائی ہوئی آنکھوں کے ساتھ چہرے پر بھاری میک اپ صاف کرنے لگی۔

سے عشق تھا۔ ہم ساتھ بیٹھیں، باتیں کریں، ماضی کو یاد کریں، اپنی، اپنی یادوں کی پٹاری کھولیں، تم پہلے کی طرح ہنسو اور میں تم کو ہمیشہ کی طرح ہنستا ہوا دیکھوں، میں یہ کب کہہ رہا ہوں کہ ہم ماضی کی محبت کو دہرائیں، ایک دوسرے سے عشقیہ باتیں کریں..... ہم ایسا کر بھی کیسے سکتے ہیں لیکن کچھ وقت سب سے الگ ہم ایک دوسرے کے ساتھ تو گزار سکتے ہیں ناں..... تم پہلے والی تابی بن جاؤ اور میں تمہارا رضا..... تم سب کا کتنا خیال رکھتی ہو، عباس کا ابا کا اماں کا بھی تم نے سوچا تمہارا کون خیال رکھتا ہے..... عباس کو تم پسند تھیں اس کی اماں نے اپنے احسانات کے بدلے انہیں مانگ لیا اور تمہارے ابا نے تم سے اپنی بچتوں کا تاوان وصول کر لیا..... تمہاری اماں، جو جانتی تھیں کہ ہم ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ سکتے وہ خاموش رہیں، اب کوئی کسی کو کیا بتائے کہ زندہ رہنے اور جینے میں بہت فرق ہوتا ہے، تم زندہ ہو لیکن.....! رضا سانس لینے کے لیے رکا..... اور تابندہ کے آنسو چہرے پر سے ہوتے ہوئے اس کے گریبان کو بھگونے لگے..... رضا تالا توڑنا جانتا تھا..... تابندہ کا ڈر یقین میں بدل رہا تھا۔

”میں چاہتا ہوں ہم پہلے کی طرح دوست بن جائیں..... میں تم سے ملے بغیر نہیں رہ سکتا..... تم نے میرا سب کچھ چھین لیا تابی، کیا میری ایک خواہش پوری نہیں کرو گی..... میں جانتا ہوں تم بھی تنہا ہو، میں تمہارے دکھ اور تنہائی بانٹنا چاہتا ہوں، تم کو ابا کی فکر ہے ناں، ارے انہیں کیسے پتا چلے گا کہ ہم بھی کبھار فون پر بات کر لیتے ہیں..... تم کو اماں کی پریشانی ہے ناں، میں وعدہ کرتا ہوں انہیں یا خاندان میں کسی کو بھی حتیٰ کہ روشا کو بھی کبھی ہوا نہیں لگے گی کہ ہم رالطے میں ہیں..... تم عباس سے ڈرتی ہو ناں اپنی عزت کی فکر ہے ناں تو تابی تمہاری عزت میری عزت ہے، تمہاری عزت کے لیے تو میں اپنی جان



بے پرواہ ہے کہ اسے احساس تک نہیں کہ اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ وہ زیادہ دیر تک مبر نہ کر سکی تو لپک کر اس کا کبل کھینچ کر اسے گہری نیند سے جگا دیا۔  
”کیا مصیبت ہے زارا..... سونے کیوں نہیں دے رہی ہو؟“

”تمہارے مسئلے نے میری راتوں کی نیند اڑا دی ہے اور ایک تم ہو کہ گدھے، خچر سب بیچ باج کر اس اطمینان سے سو رہی ہو کہ.....“ اس نے مارے غصے کے دانت کچکاتے ہوئے کہا۔

”زارا پلیز..... میری نیند خراب مت کرو، تمہیں تو پاگل کتے نے کاٹا ہے لیکن مجھے کسی پاگل کتے نے نہیں کاٹا۔ سو تم جاگتی رہو اور مجھے سونے دو۔“ اور واقعی اتنا کہہ کر چند منٹ بعد رابی پھر سے گہری نیند میں چلی گئی۔ زارا نے بے بسی سے کبل میں اپنی خراشیں لیتی رابی کی طرف دیکھا اور ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کبل اپنے اوپر لے کر سونے کی کوشش کرنے لگی۔ لیکن وہ ساری رات زیادہ تر جاگتی اور سوچتی رہی..... اور فجر کے وقت تو آنکھوں نے گویا دوبارہ بند نہ ہونے کا سگنل دے دیا..... رابی اب بھی بے خبر سو رہی تھی۔ ایک نظر اس پر ڈالتی وہ بے آواز قدموں سے اپنے بیڈروم سے باہر نکل آئی..... سارے گھر میں خاموشی اور سناٹے کا راج تھا سوائے دادی کے کوئی بھی صبح جلدی نہیں اٹھتا تھا اور آج تو سنبھلے تھے۔ سنبھلے کو تو سارے گھر والوں کی صبح بچ کے ٹائم پر ہوتی تھی۔ بچن سے کھڑ پٹری آواز آرہی تھی..... فجر فجر کے وقت ماسی صفراں اپنا اور دادی کا ناشتا تیار کیا کرتی تھی، وہ سیدھی دادی کے کمرے میں ٹھس گئی۔ دادی فجر بڑھ چکی تھیں اور اب خاصی فریش بیٹھی بیچ بڑھ رہی تھیں..... اسے دیکھ کر بری طرح چونک گئیں۔

”کیا ہوا زارا..... تم آج اتنی جلدی کیسے اٹھ گئیں.....؟“ وہ دادی کو سلام کرنے کے بعد ان کے ساتھ ہی چار پائی پر بیٹھ گئی اور کسلمندی سے سران کے کندھے پر رکھ دیا۔  
”نیند نہیں آرہی تھی دادی.....“  
”نیند ویلے تو نہیں روشتی بیٹا..... کوئی وجہ ہوتی ہے۔“ دادی نے اس کے گال چتھپاتے ہوئے کہا۔  
”دادی.....!“ وہ سوچ میں ڈوبے لیچے میں بولی۔ ”میں دراصل رابی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔“  
”ارے.....!“ دادی ہنس پڑیں۔ ”رابی کے بارے میں کیا سوچتا..... اس کی کسی تو کنارے لگ گئی ہے خیر سے..... اب تم اپنے متعلق سوچو۔ تمہارے اور اس کے بیچ دو سال کا فرق ہے۔ بس شادی میں بھی اتنا ہی فرق ہونا چاہیے۔“  
”دادی.....“ وہ اپنی دھن میں بوٹے لگی۔ ”آپ لوگوں نے رابی کے لیے کیوں ہاں کر دی ہے؟“  
”ارے، ارے..... کہاں تو خدیجہ خالہ کوانا پسند کرتی تھیں اور کہاں اب.....“ وہ دادی کی بات کاٹتے ہوئے فوراً کہنے لگی۔  
”لیکن دادی..... خدیجہ خالہ کو پسند کرنے کا یہ مطلب نہیں نا..... کہ ہم ان کی محبت میں رابی کو جھونک دیں آگ میں۔“ دادی نے حیرت سے اسے دیکھا۔  
”آگ میں.....؟ کیا کہہ رہی ہو لڑکی تم..... کس نے آگ میں جھونکا ہے تمہاری بہن کو؟“ وہ منہ بسورنے لگی۔  
”ایک ایسے لڑکے سے اس کی شادی طے کر دی ہے آپ سب نے..... جو امریکا میں رہ رہا ہے، جے کسی نے دیکھا نہ بھالا..... معلوم نہیں وہ کن عادات اطوار کا مالک ہے..... بس امریکا کا نام سنا۔“  
خدیجہ خالہ کو دیکھا اور ہاں کر دی۔ ”دادی کچھ دو سوچتی رہیں پھر بڑے مطمئن انداز میں بولیں۔  
”بیٹا! خدیجہ بہت جتنی خاتون ہے..... اس کا بیٹا بھی اس کا پرتو ہوگا۔ اور خدیجہ کا بیٹا اگر بھلا ماں نہ ہوتا تو خدیجہ بھی رابی کا رشتہ نہ ملتی..... یہ تم بھی

جاتی ہوگی۔“ دادی نے تسلی دینے کی کوشش کی۔  
”ہاں دادی..... یہی ایک بات اطمینان کی ہے لیکن پھر بھی لڑکی دیتے ہوئے بہت سی باتیں سوچنی پڑتی ہیں اور پھر لڑکی بھی رابی جیسی..... جو اللہ میاں کی کاہنہ ہے۔ چنانچہ امی اور آپ نے کیسے اتنی جلدی ہاں کر دی۔ آپ کو کچھ وقت تو لینا چاہیے تھا اس سلسلے میں..... اور لڑکے کے اخلاق اور کردار کے بارے میں اپنے طور سے معلومات کرنی چاہیے تھی نا!“  
”ہاں بیٹا..... ایسا کرنا تو چاہیے تھا لیکن جب خدیجہ نے کہا کہ اس کا بیٹا امریکا میں رہتے ہوئے بھی پرانے خیالات کا مالک ہے، اسے اپنی ماں کی ہند پر بھروسہ ہے، وہ رابی کو نہ نیٹ پر دیکھنا چاہتا ہے نا اور طرح..... بس وہ جیسی بھی ہے اسے منظور ہے..... ہم نے پھر کوئی بات نہیں کی۔“ دادی نے سر ہلا کر اس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔  
”نہیں دادی..... یہ غلط ہے، آج کے دور میں ایسا ممکن ہی نہیں..... اپنے ملک میں اس طرح شادیاں نہیں ہوتیں نہ کہ وہاں..... معلوم نہیں اندر کی کیا بات ہے؟“ زارا نے اپنا سر زور، زور سے نفی میں ہلاتے ہوئے کہا۔ وہ بے حد تشویش کے عالم میں بول رہی تھی۔ ماسی صفراں دادی کا ناشتا لے کر آئی تو وہ ابھی ابھی دادی کے کمرے سے باہر آگئی۔  
☆☆☆  
رابی بہت سگن، بے حد خوش تھی۔ تعلق کی طرح کمرے کے اندر سے باہر اور باہر سے اندر ہوتی رہی جبکہ زارا کو ایک انجانی سی فکر نے گھیرے میں لیا تھا۔ وہ ایسی ہی حساس تھی..... دوسروں کے درد کو اپنے دل میں محسوس کرنے والی اور یہاں تو معاملہ اس کی عزیز باز جان بہن رابی کا تھا۔ ماں سے وہ دن میں کئی بار اس موضوع پر بحث کرتی..... سب مطمئن تھے سوائے اس کے..... اس دن جب اس کی فکر میں حدوں کو چھونے لگیں تو وہ خدیجہ خالہ کے گھر

## جھوٹی سی بات

جا پہنچی۔ خدیجہ خالہ، امی کی چھوٹی زاد بہن تھیں..... بے حد نرم خور..... ہمدرد اور اچھے مزاج کی عورت تھیں..... اپنے بیٹے کا مران کو انہوں نے بہت چھوٹی عمر میں خود سے جدا کر کے پڑھنے کے لیے اپنے دیور کے ساتھ امریکا بھیجا تھا..... یہاں ان کی دو بیٹیاں تھیں جن کی انہوں نے شادیاں کر دی تھیں۔ میاں کے بعد وہ تنہا تھیں اور اب چاہتی تھیں کہ کامران کی شادی کر کے خود بھی اس کے ساتھ امریکا چلی جائیں یا کامران مستقل یہاں آجائے۔ کامران، امریکا میں اپنی پڑھائی ختم کر کے اب وہاں ایک اچھی جاب کر رہا تھا..... اسے اپنے بچا کی سپورٹ حاصل تھی۔ خدیجہ خالہ ہر سال امریکا جاتی تھیں۔ کامران پاکستان کم کم آتا تھا اور اتفاق سے اگر آیا بھی تو زارا کے گھر میں کسی سے اس کی ملاقات نہیں ہوتی تھی، ہاں غائبانہ طور پر سب ہی اس سے واقف تھے کہ خدیجہ خالہ کی باتوں میں کامران ہی کامران ہوتا تھا..... جب انہوں نے رابی کا تھا اس کے لیے مانگا تو سب کو یہ رشتہ بہت پسند آیا سوائے زارا کے..... ناپسند تو زارا کو بھی نہیں تھا لیکن اس کے دل میں تو ہمت تھی، خدشات تھے جبکہ رابی بہت خوش تھی وہ الٹا زارا کے اس قدر وہمی ہونے پر اس کا مذاق اڑایا کرتی..... زارا آج اپنے خدشات مٹانے کے لیے خدیجہ خالہ کے گھر آئی تھی۔

”ارے آؤ آؤ..... آج یہ چاند کیسے راستہ بھٹک کر میرے گھر میں آ گیا۔“ انہوں نے لپک کر زارا کو گلے لگا لیا..... پھر اسے بڑی محبت سے اپنے بیڈروم میں بٹھایا اور نوکر کو پُر تکلف چائے لانے کا کہا۔ ان کا انداز ایسا نثار کر دینے والا تھا کہ زارا کو اپنے خیالات پر شرمندگی محسوس ہوئی لیکن آج اسے اپنے من سے یہ کاٹنا نکال دینا تھا۔  
”اچھا..... اب کہو..... آج خالہ کی یاد کیسے آگئی؟“ انہوں نے ایک بار پھر اسے اپنے ساتھ



لگاتے ہوئے پوچھا۔  
 ”خالہ.....“ اس نے بھی مزید لگی لپٹی رکھے بغیر کھل کر بات کرتے ہوئے کہا۔ ”دراصل مجھے رابی کی بہت فکر ہو رہی ہے۔“  
 ”اچھا..... لیکن کیوں جان..... خیر تو ہے ناں؟“ خدیجہ خالہ کو سخت حیرت ہوئی۔  
 ”خالہ..... کیا رابی، کامی کے ساتھ چل سکے گی..... میرا مطلب ہے..... وہ زیادہ تر امریکا میں رہا ہے جبکہ رابی سادہ سی لڑکی ہے..... اوپر سے دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا بھی نہیں۔“  
 ”تمہاری بات کو میں غلط نہیں کہوں گی..... اگرچہ کامی میرا تابعدار بیٹا ہے اور اس نے بڑی خوشی اور آسانی سے میری چٹی ہوئی لڑکی بغیر دیکھے قبول کر لی ہے..... ویسے بھی وہ شروع سے کہتا تھا کہ وہ شادی کسی پاکستانی لڑکی سے ہی کرے گا لیکن تمہاری طرح کی باتیں کچھ دنوں سے میرے ذہن میں بھی آ رہی تھیں..... سو میں نے اسے بلایا ہے اور وہ چند دنوں تک پاکستان آنے والا ہے۔ تب رابی اور وہ ایک دوسرے کو دیکھ لیں گے..... ایک دوسرے سے مل لیں گے۔“ خالہ اس کے ہاتھ پر محبت سے اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے بولیں۔  
 ”کیا.....؟“ وہ خوشی سے بے اختیار اچھل پڑی..... اسے ایسا لگنے لگا جیسے اس کا دل بالوں کی طرح ہلکا ہلکا ہو گیا ہو..... جیسے ایک بہت بڑا بوجھ اس پر سے ہٹ گیا ہو..... مارے خوشی کے اس نے خدیجہ خالہ کے گلے لگ کر بے اختیار ان کے پے درپے لگی ہوئے لے ڈالے..... خالہ بے اختیار ہنسنے لگیں۔  
 ”ارے تو کیا ہنستی ہے، کامی میرا بیٹا ہے تو کیا رابی میری بیٹی نہیں..... ارے اس کا میں زیادہ سوچتی ہوں بہ نسبت کامی کے۔“  
 ”اس میں کیا شک ہے خالہ.....“ زارا محبت بھری نظروں سے خدیجہ خالہ کو دیکھتے ہوئے منون لہجے میں

بولی۔ بہت ساری باتیں کرنے کے بعد جب وہ ان کے گھر سے آ رہی تھی تو اس کا دل خوشی سے جھوم رہا تھا..... وہ قدم کھین رکھ رہی تھی اور وہ بڑبکیں اور رہے تھے۔ ترنگ میں آکر اس نے رابی کی پسند پزیر خرید اور گھر آگئی۔  
 ”لوموٹو..... تم بھی کیا یاد کرو گی کہ کس رئیس بہن سے پالا پڑا تھا۔“ ڈبا اس کے سامنے لہراتے ہوئے وہ کہہ رہی تھی تو رابی نے حیران نظروں سے اسے دیکھا..... چند دن سے وہ بے حد بھیسی، جھجی اور گم صم صی دکھائی دے رہی تھی۔ رابی کو پتا تھا کہ وہ اس قدر اپ سیٹ صرف اس کی وجہ سے ہے لیکن آج ایسا کیا انوکھا ہو گیا تھا جو وہ یک دم خوش باش اور فریش دکھائی دے رہی تھی۔  
 ”پز اتو میں خیر کھا ہی لوں گی..... لیکن تم بتاؤ آج طبیعت میں اس قدر جولانی کیوں ہے، کہیں کچھ لگ گیا ہے کیا.....؟“ وہ ڈبا نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔  
 ”جانتی ہو میں کہاں سے آ رہی ہوں؟“  
 ”ہاں جانتی ہوں کہ تم پز لے کر آ رہی ہو۔“ اس نے بے پروائی سے کہا۔  
 ”لیکن وہاں سے جانے سے پہلے میں ایک اور جگہ گئی تھی۔“ زارا نے جاسوسی بھرے لہجے میں کہا۔  
 ”اچھا زیادہ سپنس نہ پھیلاؤ اور فوراً سے چیئر بتا دو۔“ رابی اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی اور ساتھ میں پز کا ایک ٹکڑا اٹھایا۔  
 ”میں تمہاری سسرال گئی تھی..... اور سب کچھ صحیح کر کے آ رہی ہوں..... اور یہ پز تمہیں اسی خوش خبری کے طفیل کھانے کو مل رہا ہے۔“ نوالہ رابی کے حلق میں چھسنے لگا تھا..... اس کی آنکھیں مارے دکھ اور حیرت کے چھلنے لگیں۔  
 ”تم نے..... کامی کے ساتھ..... میرا رشتہ ختم کر دیا.....؟“ وہ چھٹی چھٹی آواز میں بولی۔  
 ”ہاں میں گئی تو اسی ارادے سے تھی لیکن خدیجہ

گریت خاتون ہیں، معاملہ بڑی خوش اسلوبی سے حل ہو گیا۔“ اس کے چہرے کے بگڑتے نقوش پر غور کرنے والے ہوئے زارا بڑی بنجیدگی سے کہنے لگی۔ وہ بے ہمتی سے کہتی تھی۔  
 ”کیسا معاملہ..... کیا، کیا تم نے..... بتاؤ..... جلدی ہے۔“ رابی کے دل کو کچھ لگے تھے جبکہ وہ بڑے اطمینان سے کہہ رہی تھی۔  
 ”کامی کو خدیجہ خالہ نے بلایا ہے..... وہ جلد پاکستان آنے والا ہے۔ وہ تمہیں دیکھے گا، تم سے ملے گا، تم دونوں کی انڈر اسٹینڈنگ ہوگئی تو ٹھیک ہو.....“ ناٹیں ناٹیں قش ہو جائے گا.....“ وہ شہادت سے مکا ہوا میں لہراتے ہوئے بولی۔ رابی کے دل کو تھوڑا سا قراقرص صیب ہوا لیکن زارا بے فکر کر غصہ بھی آیا۔  
 ”تم رشتوں کو خیل سمجھ بیٹھی ہو زارا..... رشتے انسانی سے نہیں ٹوٹتے۔“ وہ غصے سے کہہ رہی تھی۔  
 ”میں تو میں چاہتی تھی رابی..... کہ تم دونوں کے درمیان رشتہ ہو جائے تو وہ مضبوط ہو..... تمہیں بن گئے..... تم سے بنا ملے وہ اس شادی پر تیار ہو جائے اور کل تم اس کے معیار پر پوری نہ آتیں تو..... بس اس لیے میں پریشان تھی۔“ زارا نے ایک نظر اس کے چہرے پر ڈالی اور بنجیدگی سے بولی۔  
 ”رابی نے اسے کوئی جواب نہیں دیا وہ پز اٹھانے میں لگ رہی..... زارا جانتی تھی جب وہ بات کرے گا تو کوئی تو کوئی مائی کا صل اسے بات کرنے پر آمادہ نہیں کر سکتا تھا..... سو وہ ایک گہری سانس لے کر وہ رابی سے بات کرنے چل دی..... وادی اس کی دوست اور دوست زیادہ تھیں..... اس وقت بھی وہ رابی کوئی کے کسی پرانے کنگھے سے اپنے بال دھو رہی تھیں..... وادی کے بال سفید ضرور ہوئے تھے لیکن اب بھی خاصے لمبے اور گھنے تھے۔  
 ”وادی..... آپ کے بال اس لیے اتنے لمبے اور

گھنے ہیں کہ آپ لکڑی کے کنگھے سے بال گھی کرتی ہیں۔“  
 ”اور نہیں تو کیا.....“ وادی اپنے بالوں کے بیچ اپنی مانگ کو انگلی سے سیدھی کرتے ہوئے بولیں۔  
 ”آج کل تو بڑش اور پلاسٹک کی کنگھیوں نے بالوں کا ستیاناس کر دیا ہے..... اوپر سے شیپو اور وہ بال سکھانے کی مشین..... ان سب کے ہوتے ہوئے بال کب زندہ رہ سکتے ہیں بھلا؟“  
 ”اچھا..... آپ ہمیں ڈرائیو کی بات کر رہی ہیں۔“ وہ وادی کے بال سکھانے والی مشین کی بات پر مسکرا کر بولی۔  
 ”ہاں..... بھی جب اس مشین سے گرم ہوا نکل کر بالوں کو سکھاتی ہے تو بالوں کی جڑیں اس گرمی سے جل جاتی ہیں اور بال بے چارے جھڑنے لگتے ہیں۔“ زارا کو اچانک اپنی بات یاد آگئی کہ وہ کیوں ان کے پاس آئی تھی۔ وہ بڑے جوش سے وادی کو بتانے لگی۔  
 ”وادی..... آج میں خدیجہ خالہ کے گھر گئی تھی۔“  
 ”ایں!“ وادی بڑی شدت سے چوکیں کھینچ کر بالوں میں پھنس کر رہ گئی اور وہ اپنی پوری آنکھیں کھول کر اسے دیکھنے لگیں۔ زارا نے ان کا ہاتھ تھاما اور محبت سے ان کا ہاتھ تھپتھپانے لگی۔  
 ”میری بات تو سنیں وادی..... میں بڑی خوش خبری لے کر آئی ہوں۔“ پھر اس نے دھیمے دھیمے انداز میں وادی کو ساری بات بتادی۔  
 ”یہ تو بہت اچھا ہوگا اگر کامی یہاں آجائے..... وہ بھی ہماری بچی کو دیکھ لے گا اور ہماری بچی بھی اس سے مل لے گی..... اسے بھی اپنی پسندنا پسند کا اختیار تو ہونا چاہیے۔“ وادی ساری بات سننے کے بعد کھل کر ہنس دیں۔  
 ”اختیار تو ہے وادی..... لیکن وہ آج کل کی لڑکی نہیں ہے..... وہ تو پرانی شیم آرا اور صبیحہ خانم ہے..... بس جس کے بچے بندھ گئی اسی کی ہو کر رہ گئی..... اب کامی جیسا بھی ہو، ہوگا تو اس کا مجازی



خدا اور اس کے بدلے کوئی شہزاد بھی قبول نہیں کرے گی وہ مجھے تو فکر یہ تھی کہ اگر کامی کو وہ نیک پروین پسند نہ آئی تو کیا ہوگا۔ وہ ایک نئی سانس لے کر بولی۔ ”اب تو شادی سے پہلے فیصلہ ہوگا۔ کامی کو اس کے ساتھ زندگی گزارنی ہوگی تو شادی ہو جائے گی نہ ہوگی تو۔۔۔۔۔“ آخری بات پر دادی جو اس کی باتوں پر مسکرا رہی تھی چونک پڑی۔

”کیا اتنا پ شاپ بولے جا رہی ہو۔۔۔۔۔ وہ کون سا ایسا راجا اندر ہے جو میری بیوی کی بیٹی کو رنجیکٹ کرے گا۔ آخر رانی میں کی کیا ہے؟“

”ٹھیک ہے دادی۔۔۔۔۔ چھوڑیں ان باتوں کو تو آپ برا نہ مائیں بس مجھے ایسے ہی ایک لکڑی کا کنگھا منگوادیں۔۔۔۔۔ میں آج سے اپنے سارے میسر برش ڈسٹ بن میں ڈال دیتی ہوں۔“

”یہ تو میرے پرانے بکسے میں بہت پڑے ہوئے ہیں۔ آج کل یہ کہاں ملتے ہیں، اچھا دے دوں گی، پرسنوں۔۔۔۔۔ اپنی امی کو بچ دو۔۔۔۔۔ تہماری والی خوش خبری تو اسے سنا دوں۔“ دادی نے ہنس کر کہا۔

☆☆☆

ڈانگ روم میں پڑی ہوئی بارہ چیزز کی ٹیبل یہاں سے وہاں تک کھانے کی اشیاء سے بھری ہوئی تھی۔ کامران اتنی ساری چیزیں دیکھ کر سٹ پٹا گیا۔

”آئی۔۔۔۔۔ ہم تو صرف دو بندے آپ کے ہاں آئے ہیں لیکن آپ نے اتنا زیادہ انتظام کیا ہے۔ آخر یہ سب کھائے گا کون؟“

”ہم ہیں کھانے والے۔ آپ دو بندے ہیں لیکن ہم تو چار بندے ہیں۔۔۔۔۔ میں، رانی امی اور دادی۔۔۔۔۔ اور چپکے سے ایک بات کہوں۔۔۔۔۔ عام حالات میں ہمیں اتنا اچھا کھانا نصیب بھی نہیں ہوتا۔۔۔۔۔ سو آج ہم ڈٹ کر کھائیں گے۔“ زارا اشارت سے ہنستے ہوئے بولی۔ کامی بے اختیار ہنس دیا۔

”زارا بہت شرارتی ہے۔۔۔۔۔ یہ اپنی باتوں سے

ماحول کو ہر دم شگفتہ بنائے رکھتی ہے۔“ خدیجہ خاں بے ساختہ ہنس کر کامران سے کہنے لگیں۔

”ہاں۔۔۔۔۔ یہ تو پتا چل رہا ہے۔ اور آپ۔۔۔۔۔ وہ رانی کی طرف جھک کر بولا۔ ”آپ بولتی بھی ہیں یا ہمیشہ چپ رہتی ہیں۔“ زارا کی انتہائی کوششوں کے باوجود رانی نے سادہ سے کپڑے پہنے جو لباس زارے نے اس کے لیے منتخب کیا تھا۔ اس نے اسے رنجیکٹ کر دیا۔ اور اب سر پر دو پٹالے بالکل خاموش میز کے سرے پر کامی کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھی آہستہ سے کھانا کھا رہی تھی۔

”ارے بیٹا۔۔۔۔۔ بولتی ہے، بولنے پر آجائے تو چپ نہیں رہتی۔۔۔۔۔ بس زارا کی بہ نسبت تھوڑی شرعی ہے۔“ دادی نے محبت سے رانی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

کھانا بڑے اچھے ماحول میں کھایا گیا۔۔۔۔۔

دادی اور زارا سب کو کامران بہت پسند آیا تھا۔۔۔۔۔ ایک سادہ سا انسان تھا جو نہ تو زیادہ انگریزی جھاڑ رہا تھا اور نہ اس میں کوئی غریلا پن تھا۔۔۔۔۔ لگتا ہی نہیں تھا کہ وہ امریکا سے آیا ہے۔۔۔۔۔ امی اور دادی کی باتوں میں وہ بڑی دلچسپی لے رہا تھا۔۔۔۔۔ زارا کی شوخی بھری باتوں کو وہ انجوائے کر رہا تھا لیکن ساتھ ساتھ وہ ایک گہری نظر رانی پر بھی ڈال لیتا تھا۔۔۔۔۔ کامران اور خدیجہ خاں کے جانے کے بعد گھر کے سارے لوگ بہت خوش تھے۔ بعد میں جب لاؤنج میں محفل جمی تو دادی نے اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا۔

”بھئی واہ۔۔۔۔۔ مزہ آگیا۔۔۔۔۔ کیسا بیبا بندہ ہے کامران، لگتا ہی نہیں کہ امریکا جیسے ملک سے آیا ہے۔“ اور کھانے میں ڈیرا خرا نہیں دکھایا جو بھی ڈش آگے کی۔۔۔۔۔ اس میں تھوڑا سا ہنس۔۔۔۔۔ لیکن ضرور کھایا۔۔۔۔۔ زارا کے ساتھ تو بہت بے تکلفی ہوئی تھی ملاقات میں۔۔۔۔۔ جیسے سالیوں سے مذاق چلے ہے ویسے ہی مذاق کرتا رہا۔۔۔۔۔ امی اور زارے نے بھی تائید کی۔

وہ سانبان بن گئیں۔۔۔۔۔ رانی کے چہرے پر بکھرے خوب صورت رنگوں نے زارا کو بتادیا تھا کہ رانی کو کامی سے مل کر مایوسی نہیں ہوئی تھی۔۔۔۔۔ رانی کی نیچر ایسی تھی کہ اگر کامی جیسا بھی ہوتا۔۔۔۔۔ رانی کو وہ قبول ہی ہوتا۔۔۔۔۔ شاید یہ رانی کی قسمت اچھی ہے کہ کامی میں بہت ساری خوبیاں نظر آرہی ہیں۔ ایسی ہی خوبیاں جو خدیجہ خاں میں ہیں۔“ زارے نے سوچا۔

زارا کی کوششوں سے ہی بعد میں رانی اور کامی کی ایک دو ملاقاتیں بھی ہوئیں۔ یہ ملاقاتیں ان کے گھر میں ہی ہوئی تھیں۔ زارا تو خیر ادھر ادھر ہو جاتی لیکن دادی اور امی بھی ان دونوں کو تنہائی فراہم کرتیں۔

اس دن زارا یونیورسٹی سے گھر لوٹی تو گھر میں بڑی خاموشی تھی۔

”رانی تو خیر سو رہی ہوگی کہ سونا اس کی فیورٹ ہانی ہے لیکن دادی اور امی تو اس وقت نہیں سوتیں؟“ زارا نے سوچا۔۔۔۔۔ ماسی کین میں کھٹ پٹ کر رہی تھی۔

”ماسی۔۔۔۔۔ سب لوگ کہاں ہیں؟ میرا مطلب ہے امی اور دادی۔۔۔۔۔“ چکن کے دروازے پر کھڑے ہو کر اس نے ماسی سے پوچھا۔

”چھوٹی بی بی تو اپنے کمرے میں اور بڑی بی بی اپنے کمرے میں ہیں۔“

”امی اور دادی نے کھانا کھالیا؟“

”نہیں، بس رانی بی بی نے کھالیا تھا۔۔۔۔۔ ان دونوں نے نہیں کھالیا۔“ وہ چونک پڑی۔

”کیوں۔۔۔۔۔ امی اور دادی تو دوپہر کا کھانا بڑی باقاعدگی سے کھاتی ہیں۔ آج کیوں نہیں کھایا؟“ ابھی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

”پتا نہیں۔۔۔۔۔ حالانکہ آج ان کی پسند کا کپڑا گوشت بنایا تھا۔۔۔۔۔ شاید کوئی پریشانی ہے۔“ وہ کندھے اچکاتے ہوئے بولی۔

زارا کے دل کو دھڑکا سا لگ گیا۔ کچھ دیر وہیں کھڑی کچھ سوچتی رہی پھر ایک دم بولی۔

”دادی۔۔۔۔۔ ہم کو وہ پسند آیا۔۔۔۔۔ یہ تو ٹھیک ہے لیکن ابھی رانی پسند آئی ہوگی یا نہیں۔۔۔۔۔ مجھے یہ فکر کھائے جا رہی ہے۔“ زارے نے پھر کچھ تشویش کا اظہار کیا۔

”ارے لو۔۔۔۔۔ ہماری پتی کوئی ناپسند کرنے والی ہے کیا؟ ہزار جان سے غار ہوا ہوگا۔۔۔۔۔ امریکا میں ایسا حسن کا ہے کہ کو دیکھا ہوگا۔“ دادی نے محبت سے رانی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ زارا نے رانی کو دیکھا۔ گلابی رنگ کے کپڑوں میں وہ سچ سچ کسی عورت کی طرح جیاری لگ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر فخر فخر کے رنگ بکھرے ہوئے تھے۔ سنہری بالوں کی ایک لٹ اس کے ماتھے پر پڑی بہت حسین لگ رہی تھی۔

”ہاں۔۔۔۔۔ لیکن دادی ہمیں ان دونوں کو موقع دے گا۔ ایک دو ملاقاتیں اور کر لیں۔ اسی طرح ایک دوسرے کے بارے میں کچھ جان سکیں گے۔ کیا خیال ہے آپ کا؟“ زارے نے ایک گہری سانس لی۔ دادی سر ہلا کر پرسوج لہجے میں بولیں۔

”مجھے اعتراض نہیں اس بات پر۔۔۔۔۔ اب جبکہ وہ اس مقصد کے لیے آیا ہے تو یہ ضروری ہے کہ وہ رانی سے ملے۔۔۔۔۔ بات چیت کرے بلکہ دونوں ایک دوسرے کو جانچ لیں۔۔۔۔۔ سچی کوئی حتمی فیصلہ ہو۔“ زارا کو دادی پر بے اختیار پیار آگیا۔۔۔۔۔ دادی پرانے زمانے کی ضرورتیں لیکن پرانے خیالات کی مالک تھیں۔۔۔۔۔ اور امی تو دادی کی ہر بات سے متفق ہوتی تھیں ویسے بھی گھر میں فیصلے کا اختیار دادی کو حاصل تھا۔ ابا بڑی جلدی گزر گئے تھے۔ امی دو بیٹیوں کے ساتھ تنہا رہ گئی تھیں تبھی دادی کا مضبوط ہاتھ ان کے گرد مضبوط حصار بن گیا تھا۔۔۔۔۔ مالی طور پر کوئی پریشانی نہیں تھی لیکن ابا کے بعد جو خلا پیدا ہوا تھا دادی کے وجود نے کسی حد تک وہ خلا بھر دیا تھا۔ ابا کی زندگی میں بھی دادی ہر فیصلہ خود کرنی لگی تھیں اور بعد میں تو اپنی بہو اور پوتیوں کے لیے جیسے









## تین پہر کا جیون

دورانے نشین



رکھتی ہوں مگر مجھے میری دودھیا رنگت، جسمانی  
خود خال اور قد و قامت نے کچھ خاص بنا دیا تھا۔  
میں جانتی تھی کہ کئی لڑکیاں بہانوں سے میرے حسن  
کے جلوے دیکھنے آتی تھیں۔ بے تکلف دوست

میں باران احمد، پنجاب یونیورسٹی سے حال ہی  
میں فارغ التحصیل ہو کر خانہ بدوشی سے خانہ نشینی میں  
آئی ہوں، اہیچہ کے مکتب کیا یاد آئے سب کچھ یاد  
آتا چلا گیا۔ میں چہرے کے حساب سے عام نقوش

چڑھانا چاہتا تھا۔ کیا میں نے اس کے لیے غلط  
سوچا؟“ وہ بے قراری سے اس سے پوچھ رہا تھا۔  
”آپ نے اپنے لیے غلط سوچا کامران  
صاحب جو محبت کرتے ہیں وہ اپنی محبت کو سچا راہ میں  
چھوڑ کر نہیں جاتے۔ آپ رابی کے لیے ایک ایسے  
ساتھی بنیں گے ہر قدم پر اس کا ساتھ دیں گے تو کوئی  
وجہ نہیں کہ وہ آپ کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر نہ چل  
سکے۔ آپ نے محبت کی طاقت کو آزمایا نہیں۔ کچھ وہ  
آگے سرکے گی اور کچھ آپ پیچھے آئیں گے تو فاصلہ  
خود بخود سنٹتے چلے جائیں گے اور آپ کو اس کا  
پاکستان سے کیا لیتا دینا۔ آپ دونوں تو ایک  
دوسرے کے جیون ساتھی بنیں گے۔ آپ دونوں کی  
زندگیاں ایک دوسرے کے ساتھ گزریں گی تو زندگی  
آسان ہونی جائے گی۔ یاد رکھیں محبت کی طاقت  
سے بڑی کوئی اور طاقت نہیں اور اسی طاقت کے  
ذریعے انسان مضبوط تر بنتا ہے۔“ وہ بڑے شوق  
لہجے میں کہہ رہی تھی۔ اچانک ہی کامران کی آنکھیں  
جگمگانے لگیں۔ چہرے پر خوشی پھیل گئی۔

”سوری زارا، میں یہ فلسفہ سمجھ ہی نہیں  
پایا۔ اتنی چھوٹی سی بات میں نہیں سمجھ پایا کہ محبت  
زندگی ہے اور اس کے آگے چھوٹی موٹی رکاوٹیں کچھ  
نہیں۔“ وہ اس کے پاس آ کر بولا۔

”مما سے تو میں معافی مانگ لوں گا لیکن  
تمہاری امی آئی مین آئی اور دادی مجھے معاف  
کر دیں گی کیا..... اور خاص کر رابی؟“

اچانک ہی زارا کے چہرے پر شادابی پھیل  
گئی۔ مارے خوشی کے اس کی باجھیں بٹھانے لگیں۔ اب  
اسے گھر جانے کی جلدی تھی کہ جب تک رابی غنیمت  
سے بیدار ہوتی اسے مٹی اور دادی کو سمجھاتا تھا کہ رابی  
کو کچھ معلوم نہ ہونے پائے۔ وہ مسرور تھی کہ اس نے  
اس چھوٹی سی بات کا پیرا پیرا لیا تھا۔



”یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ آپ اتنی دور سے اسی  
لیے آئے تھے کہ رابی کو دیکھیں گے، برہیں گے اور  
فیصلہ کریں گے تو فیصلہ آپ نے کر دیا لیکن مجھے غصہ  
اس بات پر ہے کہ آپ نے میرا نام کیوں لیا؟“ وہ  
شدید غصے میں تھی۔

”مجھے رابی بہت پسند ہے اتنی زیادہ کہ میں  
انکار کر کے اسے کھونا نہیں چاہتا تھا لیکن اس کی شرمیلی  
طبیعت نے مجھے اس فیصلے پر اکسایا ہے ورنہ دل ایک  
فیصد بھی اس فیصلے کے لیے آمادہ نہیں تھا اور ہی آپ  
کی بات تو مجھے اس کے لیے زبردستی خود کو آمادہ کرنا  
پڑا کیونکہ اگر میں دو ٹوک انکار کر دیتا تو مما کا دل  
بہت زیادہ ٹوٹ جاتا اور یہ میں نہیں چاہتا تھا۔“ وہ  
پھٹی پھٹی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ جو کچھ وہ  
کہہ رہا تھا وہ جھوٹ بھی ہو سکتا تھا لیکن کامران کے  
لہجے میں ایسی کوئی بات ضرور تھی کہ زارا کو لگ رہا تھا  
کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہا۔ بہت دیر لگی اسے خود کو  
سنجھانے میں آخر بڑی ہمت سے گویا ہوئی۔

”میں اپنی بہن کی طرف سے کوئی مقدمہ نہیں  
لڑوں گی۔ آپ کو بٹھلانے میں اسے وقت ضرور لگے گا  
لیکن آخر کار وہ آپ کو بھولنے میں کامیاب ہو جائے  
گی۔“ یہ کہہ کر وہ جانے لگی تو وہ پھر اس کے سامنے آ گیا۔  
”آپ اس طرح نہیں جاسکتیں زارا۔“

”کیا مطلب ہے آپ کا؟“ وہ حیرت سے کہنے  
لگی۔ ”اب کوئی فائدہ نہیں بات ختم ہو چکی ہے۔“  
”نہیں، بات ختم نہیں ہوئی ہے۔ رابی کو میں  
چھوڑنا نہیں چاہتا۔ اگر میں نے اس سے شادی سے  
انکار کیا ہے تو یہ بھی اس کی بہتری کے لیے۔ میں اپنی  
محبت میں خود غرضی نہیں چاہتا تھا۔ میرا خیال ہے وہ  
بہت سچیل سچیر کی ہے اور اسے خود کو بدلنا آسان نہیں  
ہوگا جبکہ امریکا کی زندگی بہت تیز رفتار ہے۔ میں  
نہیں چاہتا تھا کہ وہ اس دوڑ میں پیچھے رہ  
جائے۔ میں اسے وہاں کی تیز رفتاری کی سمجھ نہیں



## دعا

یہ دعاؤں کے ہیں جو سلسلے  
ہمیں جوڑتے ہیں اسی ذات سے  
میری رب سے ہے یہی دعا  
تجھے رمتوں سے نواز دے

مرسلہ: نغمہ نہال، لاہور

میں ساری مصروفیات گنوا رہی۔

”اس کا مطلب ہے کہ کم از کم چار مہینے ہو چکے  
ہیں۔ حد ہوگئی۔“ انہوں نے اتنا کہا تو میں رونے  
لگی۔ ویسے میں آج تک حیران ہوتی ہوں۔ میں  
نے اتنی بے نیازی اور جہالت کا مظاہرہ کیونکر کیا تھا  
اتنا وقت کیسے گزر گیا تھا مگر شاید ایسا ہونا ہی تھا۔ عامر  
مجھے تسلیاں دینے لگے۔

”کل ہی میموگرافی کراتے ہیں۔“ مگر میرا دل  
اب ڈوب چکا تھا۔ مجھے لگا کہ میں بہت بڑی مصیبت  
میں گرفتار ہو چکی ہوں۔

اس رات کی صبح میں صبح والی کوئی چمک  
نہیں تھی۔ بچوں کو اسکول روانہ کر کے ہم کلینک چل  
دیے۔ عامر ڈاکٹر تھے لہذا نائٹ لینے اور انتظار کرنے  
کی مجبوری نہ ہوئی تھی لیکن آج میں لائن میں بیٹھ کر  
برے وقت کو اپنے سے دور رکھنا چاہتی تھی۔ وقت  
گزارنا چاہتی تھی۔ ڈاکٹر کے کمپوٹر کی اسکرین نے  
بیماری کی تصدیق میں دیر نہ کی۔ مجھے بریسٹ کینسر  
تھا۔ اب محض کلگری، پھیلاؤ، گہراؤ کی رپورٹیں باقی  
تھیں۔ مجھے لگا کہ میں میز سے اتر کر اپنے پاؤں پر  
کھڑی نہیں ہو سکوں گی۔ میری دنیا اندھیر ہو چکی  
تھی۔ پتا نہیں کیوں ڈاکٹر ڈر صبح اور اس کے شوہر  
پروفیسر ڈاکٹر حوصلہ افزائی کے جملے بول رہے تھے،  
کہہ رہے تھے کہ اب کینسر ٹائیفاؤنڈلیریا کی طرح  
قابل علاج ہے اور مجھے لفظ کینسر کا اپنی ذات سے  
منسلک ہونا ہی ناقابل برداشت لگ رہا تھا۔ ڈاکٹر

ان دنوں عامر اپنے والدین کے ہمراہ حج پر  
جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ میرے پاس میری امی  
سو آ کر رہنا تھا۔ روزمرہ کی مصروفیات عامر کے نہ  
ہونے سے فزوں تر ہو گئیں۔ ذمے داریوں کا بوجھ  
زیادہ محسوس ہوتا۔ عامر کی عدم موجودگی کے چالیس  
دن چالیس مہینے لگ رہے تھے لیکن عامر خوش اور  
پر جوش تھے، ان کا اشتیاق دیکھ کر مجھے شرمندگی  
ہوتی۔ عامر شروع سے نماز پنجگانہ کے عادی  
تھے۔ اب وہ داڑھی بھی رکھنے لگے تھے۔ تراشی ہوئی  
سیاہ و سفید داڑھی انہیں زیادہ یرو قرار اور نرکشش  
بنا رہی تھی۔ وہ میچور لگتے مگر مجھے دیکھ کر سب کہتے تم  
دبلی کی دبلی ہو۔ میرا وزن متناسب رہا۔ میں اڑیس  
سال کی عمر میں اٹھائیس کی بھی نہیں لگتی تھی۔ انہی  
دنوں چھوٹی بہن تارے کی شادی کی بات چل رہی  
تھی۔ امی اور میرے درمیان یہ موضوع ہی کافی تھا۔  
باتوں کے ساتھ ساتھ ہم نے تارے کے جہیز کی  
تریداری کے چکر بھی لگانا شروع کر دیے۔ تارے  
کے پونیورسٹی میں آخری دن تھے وہ فون پر گپ شب  
کر رہی تھی۔ عامر کی واپسی کے ساتھ شادی کی تاریخ  
طے ہونا تھی۔ ایک دوپہر چل کے دوران میں نے  
دائیں چھاتی میں کچھ سخت حصہ محسوس کیا۔ یہ کوئی دو  
انچ کی جگہ تھی۔ اس میں کوئی درد یا تکلیف نہیں تھی۔  
شاید میں کہیں انجانے میں ٹکرائی ہوں اور اندر کی  
سوچن ہے۔ میں نے باہر نکل کر سوچا امی سے بات  
کی تو خواہ خواہ پریشان ہو جائیں گی۔ گہما گہما میں یہ  
چالیس دن گزر گئے۔ عامر واپس آئے تو ج کی  
بارگ باد دینے والوں کا تانتا بندھ گیا۔ لگ بھگ  
تین گزر گیا تھا کہ پھر ایک رات مجھے لیٹے، لیٹے  
بریسٹ میں سخت جگہ کا احساس ہوا۔ میں نے عامر کو  
متوجہ کیا ان کے تاثرات میں سخت سنجیدگی کے سائے  
دیکھ کر میں ہراساں ہو گئی۔

”کب سے ہے، پہلے کیوں نہیں بتایا؟“

معاملے میں سب کا شمس تھیں۔ میری ذمہ داری  
سب سے جدا ہوتی اور میں لباس کے معاملے میں  
ٹریڈ سٹر کہلائی جاتی کچھ خواتین تو ہو بہو ہوتی  
مگر مجھ پر لباس کچھ زیادہ ہی چلتا۔  
ایک مرتبہ میں ٹی وی چینل کے مارننگ شو میں  
گئی اور کمال یہ ہوا کہ مجھے ٹی وی ڈرامے کا ایک  
کیمریکٹر بھی آفر ہوا۔ تھی ناں ایک ناقابل غفلت  
بات۔ مگر عامر کو میرا ٹیکنگ جوائن کرنا پسند  
آیا۔ شاید میں عامر سے منوالیتی اور منوانے کا سلسلہ  
جاری رکھتی مگر مجھے میری طبیعت کی تبدیلی نے دوسرے  
بار خوشخبری کا احساس دلایا۔ ایک بار پھر ڈاکٹر  
ڈھالے لباس اور مونائے کا خوف الگ۔ میں  
ڈپریشنڈ رہنے لگی مگر امی اور دوستوں نے سمجھایا۔  
اولاد جوڑوں کی مثالیں دیں اور کہا۔

”تمہاری فیملی مکمل ہو جائے گی۔ دوست  
ہونے چاہئیں۔“ میں نے بھی دوسرے بچے  
لیے خود کو آمادہ کر لیا۔ عامر کو بچے اچھے لگتے تھے اور  
میرے ہر حلیے میں میری ستائش کرتے تھے۔ ایک  
دوست نازلی نے مجھے حاملہ خواتین کے خوب صورت  
آرام دہ اسٹیکلش ملبوسات کے میگزین لاد دیے۔  
واقعی ان ملبوسات نے میری شخصیت کے حسن کو دوبارہ  
کر دیا۔ پھر میں ڈیپورٹی کے لیے امی کے ہاں جا  
گئی۔ اللہ نے ابد کی پیاری سی بہن منال دے  
دی۔ میرا گھر میری جنت، میرے بچے میرے  
چاند کے ٹکڑے۔ زندگی ایک چمکتی ہٹی۔

☆☆☆

وقت کا پھیلا دھیرے دھیرے چلتا رہا۔ تین  
سالہ ابد اور گیارہ سالہ منال کو اسکول روانہ کر کے  
گیٹ سے لوٹی تو چکر سا آ گیا۔ بچوں کی اسکولنگ  
کو چنگ، عامر کا رات دیر تک انتظار نیند پوری نہیں  
ہو رہی تھی شاید۔ چائے بنے کا ارادہ ترک کر کے  
سونے کے لیے بیڈروم میں چلی گئی۔

شانے پر ہاتھ مار کر کہیں۔ ”یارتیری کیا بات ہے تو تو  
سلیپر ٹی ہے بنی بنائی۔“ تو کیوں ناں مجھے اپنے  
آپ پر ناز ہوتا۔ لڑکے کو رفتہ رفتہ میرے گھر تک  
پہنچنے لگے۔ اپنی ماؤں تک کو بھیجنے لگے مگر میرے بابا  
نے سوچ سمجھ کر میرا رشتہ ڈاکٹر عامر حبیب سے طے  
کیا جو لینڈ لارڈ کا بیٹا ہونے کے ساتھ ساتھ ایک  
وجہیہ نوجوان تھا۔

☆☆☆

سب نے کہا چاند سورج کی جوڑی ہے، مگنی  
کے بعد آٹھ ماہ تک ہم نے ایک دوسرے کی محبت کو  
دلوں میں بسالیا اور چالید یہ ایک یادگار وقت تھا۔  
ڈاکٹر عامر نے جناح گارڈن میں مجھے سامنے بٹھا کر  
غزل لکھی تھی حالانکہ وہ شاعر نہ تھا۔ میں نے اس سے  
کہا کہ مجھے سامنے بٹھا کر میرا بت تراشو، اس نے کہا  
یہ تو کوئی ماہر سنگ تراش بھی نہیں بنا سکتا، ہوش و حواس  
خود سے گا اور ہم پھر خوب بنے تھے۔ زندگی کتنی مد  
بھری تھی جیسے تیلوں کی دھنک۔ مہکتے پھولوں کی صبا۔

☆☆☆

عامر حبیب اور میری۔ یعنی ہماری شادی  
ہوئی تھی۔ اللہ نے ہمیں چاند سا بیٹا دیا۔ جس کا نام  
ابد عامر رکھا۔ عامر کی بردوشن بھی ہو گئی تھی۔ چار سو  
خوشیوں کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ ابد سب کی  
آنکھوں کا تارا بن گیا، ابد کی پیدائش کے بعد میرا  
وزن کچھ بڑھ گیا تھا مگر میں نے پوری توجہ سے اپنا  
وزن کم کیا اور پھر پہلے کی طرح اساتھ ہو گئی۔ مجھے  
باورچی خانے کے کاموں سے کوفت ہوتی تھی، اس  
سے ہاتھ اور ناخن خراب ہوتے تھے۔ عامر نے  
میرے لیے ایک ماہر باورچی رکھ دیا تھا۔ وہ میرا ہر  
طر خیال رکھتے تھے۔ ڈنر ہم اکثر باہر کرتے۔ ہمارا  
گھر یل پوش ایریا میں تھا جہاں ارد گرد پڑھی لکھی  
اور خوش حال فیملیز رہتی تھیں۔ جہاں لیڈیز آپس میں  
کم میل جول رکھتیں جو بھی تھا مگر ڈرینک کے



## تین بیس کا جیون

کر ٹوٹے دل سے اپنے بائیں اسٹول پر رکھا تو دیکھا سامنے وہ کھڑی تھی۔ اس نے مسکرا کر سلام کیا۔ مجھے اچلی خوش باش صحت مند خواتین دیکھ کر خوشی نہیں ہوتی تھی۔ اس نے فوراً ہی اپنا مختصر تعارف کر ڈالا جو یہ تھا۔

”کینسر کی سابقہ مریضہ..... مثال نہ ب۔“

میری کوفت کچھ کم ہوئی۔ اس نے اپنی مسکراہٹ کو قائم رکھتے ہوئے کہا۔

”بیاری باران احمد (نام کی تختی بیڈ پر تھی) تمہاری آنکھیں کتنی خوب صورت ہیں، تمہارے چہرے پر جو پیلاہٹ اور سوجن ہے یہ جلد ختم ہو جائے گی اور جب صحت یابی میں تمہارا رویہ دھانی

ملہم صرف کسی لڑکی کا، کسی لڑکے کا محبت بھرا دل توڑنا ہوتا ہے؟ دل توڑنے والوں کو احساس ہی نہیں ہوتا کہ کب کس کا دل ٹوٹا۔

وہ بھی دن گزرے کہ کیو تھراپی اور دواؤں کے زیر اثر میری انگلیوں اور ہاتھوں میں گرفت کی قوت نہ رہی تھی۔ جسم کھوکھلا ہو گیا تھا۔ کوئی مجھے پانی پلاتا تو لگتا احسان کیا ہے، میں نلیکیوں اور پٹیوں میں بیزی رہی۔ میرے سر کے بال گر چکے تھے..... اور جب لمبے عرصے بعد میرے حساب سے تو گویا برسوں بعد آئینہ میرے ہاتھ میں آیا تو ایک اُبڑا ہوا پھیکا ٹھال چہرہ جس کا سر سیاہ اسکارف سے ڈھکا تھا میرے سامنے تھا..... کہاں گیا غمزہ و ناز.....؟ میں اس شے میں چمکتی دھکی باران کو ڈھونڈتی کہ جوتی ہار گئی۔ کوئی نو حد سا میرے لمبوں میں بہتا چلا گیا۔ ابد اور

مائل میرے اس چہرے پر پیار کرتے رہے! میری بہن تارے میرے سامنے سر پر چوڑا دو پٹا ماتھے تک لپٹ کے آتی تھی حالانکہ اس نے بھی سر پر دو پٹا نہیں لیا تھا۔ عامر مجھے اس روپ میں دیکھتے ہوئے محبت سے دیکھ بھال کرتے تھے، امی سر داتوں میں اسپتال کے لان میں رد کے دعائیں مانگتی تھیں..... ”یہ سب مجھ سے بے لوث پیار کرتے ہیں! شک میری زخمی روح کا ناسور کیوں بن گیا تھا۔ میرا صرف بدن ہی زخمی نہ تھا روح بھی زخمی تھی۔

پری زخم خوردہ روح پر مرہم رکھنے والی وہ مثالی لڑکی تھی نہ بھولے گی..... وہ بھی آٹھ سال بیشتر اسی اسپتال میں علاج کے لیے داخل رہی تھی اور پچیس سال کی عمر پر عمر میں ایک چھانی سے محروم کردی تھی۔ مکمل میڈیکل فٹنس رپورٹ کے بعد دو سال پہلے اس نے شادی کی اور ایک بچی کی ماں تھی۔

اس مثالی لڑکی کا نام مثال نہ ب تھا۔ مثال نہ ب کے اب کمر تک لمبے بال ہیں مگر وہ گاؤں اور اسکارف اوڑھتی تھی۔ جب میں نے پہلی بار آئینہ دیکھ

لینے تک کے بیسے نہیں، روز کی روٹی میسر نہیں، انہیں بھی آزمائش میں ڈال دیتا ہے۔“ کچھ کہوں تو تمام لفظ میری سماعتوں سے اجنبی ہو کے گزر رہے تھے، میرے اندر بھانجھڑ تھا..... کیوں..... کیوں؟ کیوں؟ کا غوغا تھا۔ حالانکہ وہ تو پہلا درد تھا۔ آگے درد کا دریا تھا۔ اب علاج میں مزید دیر کے لیے کوئی وقت نہیں تھا۔ اب ایک دن بھی ضائع کیے بغیر گھر، آرام وہ نیند، بچوں کا ساتھ چھوڑنا اور اسپتال داخل ہونا تھا۔

شوکت خانم میموریل اسپتال نے کھلی ہاتھوں سے ایک اور درد گزیدہ کا استقبال کیا۔ مستعد عملہ، ہمدرد معاون معالج، صفائی ستھرائی، ہائی جینک ماحول اور فوری سروس نے جیسے کسی ترقی یافتہ ملک کا تاثر دیا۔ ڈاکٹر ذی پہلی کونسلنگ کا لب لباب یہ تھا کہ مجھے نسائی حُسن سے محروم ہونا تھا۔ اور یہ کہ حسن ثانوی چیز ہے زندگی اولین ترجیح ہے، زندگی ہی اصل نعمت ہے، مجھے بتایا گیا کہ بے شمار خواتین جن میں زیادہ تر جوان تھیں اور کچھ نوجوان اور غیر شادی شدہ بھی وہ بریسٹ رییمووسر جری کے بعد سالوں سے صحت مند زندگی گزار رہی ہیں۔ ڈاکٹر ذی کی فکر مندی جسم کا ایک حصہ رییموو کرنے سے متعلق نہ تھی بلکہ اس کی روئس کی اعضائے ریئیر تک رسائی نہ تھی۔ وہ مجھے شفقت سے شاک کی کیفیت سے نکل آنے کی تلقین کرتے رہے اور میرے شوہر کے بھرپور تعاون کی تحسین کرتے رہے۔

ایک شاک تو میرے اندر تھا دوسرا شاک معاشرتی رد عمل کا تھا جو مسلسل جاری رہتا ہے حتیٰ کہ امی، بہنیں، عامر کے گھروالے، اہل کالونی سب کے لیے میں عجب تھی۔ مقام عبرت تھی..... ہم لوگ نسائی آسانی سے کسی دھکی کو اپنی ترجم و تفسیک بھری گفتگو کا نشانہ بنا لیتے ہیں۔ ”بے چاری“ اور ”ایسی تھی“ کا صیغہ استعمال کرتے ہیں اور ہمیں دل آزاری کے گناہ کبیرہ کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ کیا دل توڑنے کا

میرے شوہر کو الگ لے گئے تھے مجھے معلوم تھا عامر نے مجھے مرض کی کوئی ہولناکی نہیں بتائی۔

عامر گاڑی چلا رہے تھے ان کا زبردستی تھمایا ہوا جوس میرے ہاتھ میں تھا اور میں خالی خالی نظروں سے سامنے دیکھ رہی تھی۔ آتے ہوئے ان راہوں میں امید کا شائبہ تھا مگر جاتے ہوئے تو اتنا جس تھا کہ دم گھٹتا تھا۔ علاج، رقم، صبر، سمجھوتے کی پلاننگ ہم دونوں کے دماغوں میں چل رہی تھی۔

پھر میرا کمر تھا، میں بیڈ پر اوندھی پڑی پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ میں چلا رہی تھی۔ ”ایسا نہیں ہو سکتا، یہ جھوٹ ہے، ڈاکٹروں کے نزدیک یہ مذاق ہے۔ معمول کی بات ہے، وہ ہنستے مسکراتے ہمیں مرض بتا دیتے ہیں۔ میرے ساتھ ایسا کیوں ہو، میں نے ایسا کون سا گناہ کیا ہے؟“

عامر نے مجھے سینے سے لگایا۔ بوسے دیے، اپنے اشکوں کو پی کے میرے اشک پونچھے آخر میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

”ایسے نہ بولو باران..... بس کرو یا ر..... کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی کفر کا کلمہ منہ سے نہ نکل جائے۔“

”عامر تم مجھے چھوڑ جاؤ گے؟“ میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے آنکھیں مگر گزرا لال بھوکا چہرہ اٹھا کر عامر سے سوال کیا۔

”کبھی نہیں جانی..... کیسی بات کی تم نے، کبھی ایسا نہیں ہو سکتا، ایسی بات پھر منہ سے نہ نکالنا، تم نے تو مجھے انسانی سطح سے گرا دیا۔“ عامر نے فرط جذبات سے پھر ایک بار مجھے سینے سے لگالیا۔ توقف کے بعد اپنے آنسوؤں کا گولہ نگل کر بولے۔

”جانی..... آغا خان جا کے دیکھو، شوکت خانم دیکھو، کسی بڑے اسپتال میں دیکھ لو، کینسر کے اُن گنت پیڈنٹ ہیں..... بارو! تمہارے شوہر کے پاس کروڑوں کی زمینیں ہیں، ان کو بیچ کر پیسہ پانی کی طرح بہا دوں گا، ان کو دیکھو جن کے پاس بخاری دوا

**WELCOME BOOK SHOP**

**WELCOME BOOK SHOP**

**WELCOME BOOK SHOP**

**WELCOME BOOK SHOP**

**WELCOME BOOK SHOP**

**WELCOME BOOK SHOP**

**WELCOME BOOK SHOP**

**WELCOME BOOK SHOP**

**WELCOME BOOK SHOP**

**WELCOME BOOK SHOP**

**WELCOME BOOK SHOP**

**WELCOME BOOK SHOP**



رسالے ہیں اور وہ بھی پاکیزہ مجھے تو پاکیزہ بہت پسند ہے۔ اکثر بڑھتی رہتی ہوں۔ برمانہ مانیں تو کچھ رسالے لے جاؤں، بچہ محترمہ ذرا تجھیں بھی میں رسالے اب دے رہی ہوں۔ لے کر بڑھتی ہیں۔

”بعد شوق آپ ضرور لے جائیں۔“ کچھ دیر بات چیت رہی پھر چلے وقت وہ کچھ رسالے لے گئیں اور میں اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔ ہفتہ بعد آئیں، بہت افسردہ، پریشان۔

”کیا بات ہے؟“ میں نے ان کو اس طرح کبھی نہیں دیکھا تھا۔  
رسالہ دیکھ کر کہیں کہیں۔ ”کیا بتاؤ کل شام تک تو ہمارے شوہر نامدار ٹھک ٹھاک تھے۔ بس بول رہے تھے رسالہ دیکھ کر کہنے لگے

خزیا لکھا ہوتا ہے ان میں جو اتنے شوق سے پڑھی ہو۔ رات پڑھتے پڑھتے سو گئے۔ دفتر جاتے ہوئے کہنے لگے۔ ”یہ اپنے جہیز کا قیام لوسی  
ماں اٹھا کر چیک کدو سام اوسپر ایفر لال لاؤ گا۔ ڈرانگ روم خالی ہو۔“ میں پریشان کر ان کو اچانک کیا ہو گیا۔ ان کے جانے کے بعد  
میں کی چادر اور کمر درست کرنے لگی تو پانچ کمرہ رسالہ کھلا رکھا دیکھا غائب پڑتے پڑتے سو گئے تھے۔ میں نے جو صفحہ دیکھا۔ انجم انصار نے کسی  
ڈرانگ روم کا نقشہ پیش کیا تھا۔ جلتے رنگ میں جو لکھا تھا، لگتا تھا وہ میرے ہی ڈرانگ روم کا ذکر ہے۔ وہی کچھ تھا جو میرے ڈرانگ روم میں  
رسالہ بہت پراٹھا تھا پائیں کب انجم انصار نے میرا ڈرانگ روم دیکھ لیا۔ ہائے انجم انصار تم سے خدا سمجھے، اب میں تم کو کیا کہوں۔“ شام کو  
ان کے گھر میں ادھر ادھر سامان رکھنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اختر بھائی بنا فریج لے آئے تھے۔ دونوں بچے خوشی سے بھر پور آواز میں اونچا  
رکھا بول رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد ان کا بیٹا مٹھائی کا ڈبا لے آیا اور خوش خوش تانے لگا۔

”و آئی آئیں ہمارا ڈرائنگ روم دیکھیں۔ بہت اچھا لگ رہا ہے۔ اب میں اپنے دوستوں کو بلا سکوں گا۔“ جاتے وقت کیزہ زندہ باد کا نعرہ لگا گیا۔

تحریر: بنتِ عزیز الرحمن، راولپنڈی

”انشاء اللہ تم سمجھ جاؤ گی۔“ اس نے اتنا ہی کہا۔  
اس کے بعد ہماری کچھ ملاقاتیں ہوئیں۔ وہ  
ہمیشہ سفید اسکارف اور گرے گاؤن میں خوشبو کی  
طرح دلوں کو چھوٹی پاکیزگی لیے اور ہمیشہ مسکراتی  
ہوئی دکھائی دی۔ اس دن بھی وہ میرے لیے ایک  
خوب صورت گلدستہ لائی تھی۔

”باراں جب ماڈل جیسی لڑکی تھی (یہ اسے میں نے بتایا تھا) تو اس نے ماڈل بنانے والے کا کتنا شکریہ ادا کیا؟ جس کی عطا پر unlimited سٹاکس سمیٹی اس غنی کا کتنا شکریہ ادا کیا؟ اس کو تو تم سے، مجھ سے اور اپنی بے زبان مخلوق سے ہوا میں اڑتے اس پرندے سے یکساں محبت ہے مگر اس نے عطا کو یکساں کیوں نہیں رکھا۔ چاہتا تو کہہ سکتا تھا، ہے ناں؟“ میں کچھ بولی نہ پانی ٹس ننتی رہی۔

”ہمارے لیے ہر نعمت فار گر انڈل..... پھر بھی

اللہ کی عطا کردہ نعمت ہے۔ عطا تو عطا ہوئی ہے ملکیت  
میں ہوتی۔ میں تمہیں ایک قلم، ایک دوپٹا، ایک  
بیک عطا کروں پھر ان میں سے ایک چیز واپس  
الٹاؤں تو کیا تم مجھ سے جھگڑو گی؟ جہلاتم اُن چیزوں  
کے لیے کیوں جھگڑو گی جنہیں لے کر بھی تم نے کتنا  
برتاؤ تھا؟ خوب صورت مکمل اور توازن بدن لے کے بھی  
اُسے چند برسوں بعد اسے زیرِ خاک ہی ملاتا ہے۔  
”تم ہر بات ٹھیک کہہ رہی ہو نہ ب۔“ میں  
سے عجیب انداز سے کہا۔

”ہاں مثال زنب“  
 ”ہاں مثال زنب مگر میں تمہارے جتنی اعلیٰ  
 ترنس نہیں ہوں۔ میں تو مذہب کو بس ہلکا سا جانتی  
 ہوں میں ہمیشہ کامل رہی ہوں، میں اس کی کے ساتھ  
 کیسے جیوں گی اور ایک بات یہ ہے کہ مجھے اپنے شوہر  
 کی محبت ترس لگے گی بلکہ کسی کی بھی محبت۔“

## زندہ باد

موسم سرما بارخصت ہو رہا تھا اور گرمیوں کی آمد آمد شروع ہو رہی تھی۔ سوچا آج الماریوں کی دیکھ بھال کروں۔ ان کی صفائی کروں لیکن پہلے کسی الماری سے کام شروع کروں۔ ہاں، پہلے اپنی اس الماری سے کام شروع کروں جس میں رسالے رکھتی ہوں۔ خاص طور پر بایکڑہ رسالہ..... الماری کھولی سب رسالے باہر نکالے اور برآمدے میں تخت پر رکھوا دیے۔ اتنے میں میری پڑوس آگئیں جن کو ہم سلیقہ بیگم کہتے ہیں۔ واقعی سلیقہ بیگم ہیں، ہر چیز خوب حفاظت سے رکھتی ہیں۔ خاص طور پر اپنے جھینر کی چیزیں..... ڈرائنگ روم پر خاص توجہ ہوتی ہے۔ خیر سے شادی کو پندرہ سولہ سال بیت گئے ہیں مگر ڈرائنگ روم کی سجاوٹ ابھی تک ویسی ہی ہے جیسی جب تھی۔ شوہر بہت اچھی پوسٹ پر ہیں، گھر میں خوش حالی ہے۔ اللہ نے ایک بیٹے اور ایک بیٹی سے نوازا ہے۔ دونوں بہت ذہین اور خوب صورت ہیں۔ اللہ نے ہر نعمت سے نوازا ہے دیگر رشتے داروں کی طرح ہمارے گھر میں بھی ان کے سلیقہ کی دعوم ہے۔ ہمارے سر تا ج اس بات کے بہت معترف ہیں۔ اس برہمراں سے اختلاف ہو جاتا ہے۔ اتنا سلیقہ بھی اچھا نہیں..... اتنا وقت گزر گیا، جھینر کی ہر چیز سینے سے لگے بیٹھی ہیں۔ ڈرائنگ روم کی ہر چیز اپنا رنگ روپ کھو چکی ہے۔ پر دے، قالین سب کے رنگ پھیکے پڑ گئے ہیں۔ کپڑا کھین کھین سے گھس چکا ہے۔ پٹائی نہیں چلتا کیا رنگ تھا اور کیسے گل بوٹے تھے۔ صوفے الگ اپنی عمر تمام کر چکے مگر وہ ابھی تک ان ہی کی جھاڑ پونجھ میں لگی رہتی ہیں۔ شوہر پریشان اپنے دوستوں کو اس ڈرائنگ روم میں کیسے بلائیں۔ بچے الگ پریشان کیسے اس بویدہ سے ڈرائنگ روم میں اپنے کلاس فیلڈ کو بلا لیں۔ کئی بار یہ معاملہ زیر بحث آیا کہ اب ڈرائنگ روم کا علیحدہ بدل دیں مگر ان کو ان سب چیزوں سے اتنا پیار ہے کہ وہ سناتا کہ گوارا نہیں کرتیں۔ خیر میں نے ان کو خوش آمدید کہا۔

”کےسے، صبح آتا ہوا؟“ ساتھ ہی ملازمہ سے جانے کا بھی کہا۔

”اتنے سارے رسالے ہیں آپ کے پاس۔“ میری بات کا جواب دیے بغیر وہ رسالوں میں الجھ گئیں۔ ”اتنے سارے

نہیں رہتی تھی۔ آنسو بہتے رہتے تھے اس لیے کہ تب میرا ذہن ایک چھوٹے دائرے سے آگے سوچنا نہیں تھا۔ ویسے نہیں بھی پتا ہوگا خالق نے ہمیں a big capacity کا دماغ دیا ہے مگر ہم اسے بس تنہا سرچ کر کرتے ہیں، قریب کی خوشی اور غریب کے غم کے سوا ہمیں کچھ نظر نہیں آتا۔ مصلحت ربانی

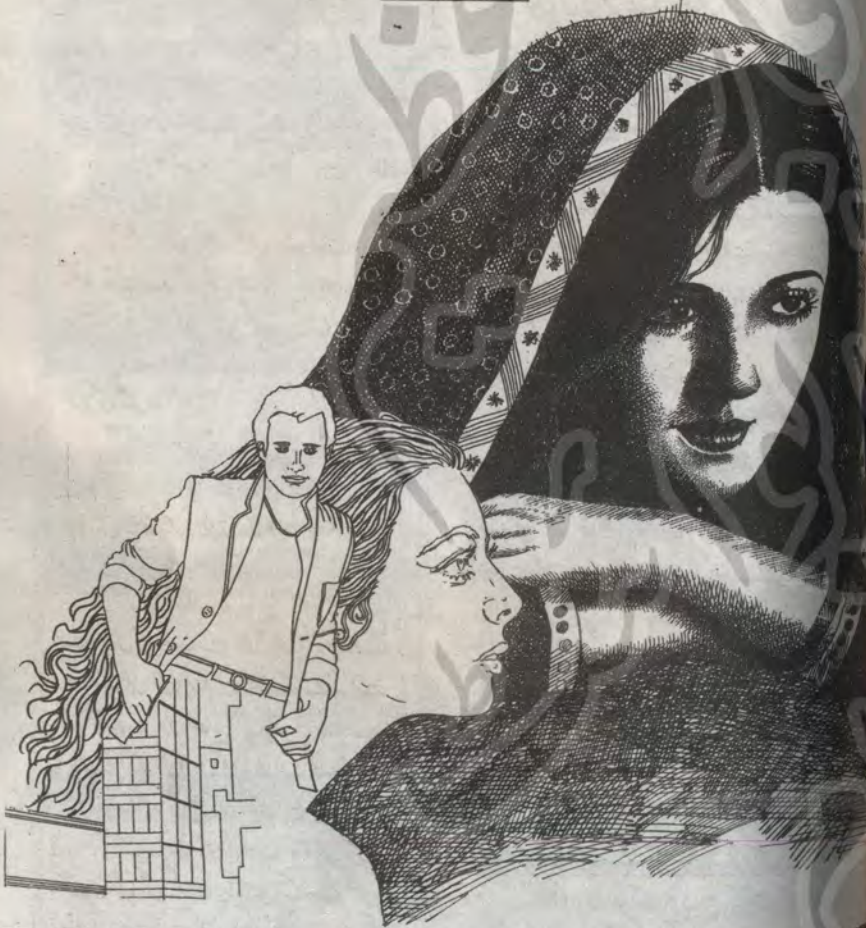
”میں تم سے کچھ بات کرنا چاہتی ہوں۔“ اس  
 نے مزید کہا۔  
 ”بیٹھو.....“ میں نے آہستہ سے کہا۔  
 وہ بیٹھتے ہوئے مجھے بتانے لگی۔  
 ”میں یہاں روٹین کے چیک اپ کے لیے  
 تیار رہتی تھی اب تو میرا آنا ڈاکٹرز ویلکم کرتے

”نہیں..... یہ چھوٹا بچہ نہیں ہے۔“ میں کسمالی  
 ”دیکھو..... کئی بندوں کے پیدا کئی عضو نہیں  
 ہوتے۔ کئی حادثاتی طور پر کھو بیٹھے ہیں، ہمارا جسم بھی



## اکتیار پھر کو

نسرین خالد



جیسے ہی سب نے سنا کہ شاہ زیب بھائی کے سوا چاہے اس کے خاندان میں جب کوئی بیٹی پیدا ہوتی ہے تو سب ہی ممکن ہو جاتے تھے۔  
 ”ماں! یہ بیٹیاں اتنی بری ہوتی ہیں کیا کہ ان کی کاترے ہوئے منہ دیکھ کر بہت دکھ ہوا تھا۔  
 ”کیا بیٹیاں اتنی بری ہوتی ہیں؟“ اس نے دکھ پیدائش پر سوگ منایا جانے؟“ بابا جان کے جاتے ہی

ہر میسر ویلے سے..... ہزار دعا میں ہیں سرطان کا اسپتال بنانے والوں کے لیے باراں۔ ایسے ہی کام کریں استطاعت والے، انسانیت کی خدمت میں جو لطف، حلاوت اور سکون ہے وہ ہمیں دو جہاں میں ہارنے نہ دے گا۔ سلامت رہو باراں۔“ ایک بھر پور مصافحے کے بعد وہ رخصت ہو گئی۔

☆☆☆

میری بیماری کو چار برس بیت گئے۔ میں تندرست ہو گئی۔ عامر استنبول (ترکی) میں تعینات ہوئے اور اب ہم وہی رہتے ہیں۔ عامر نے اگرچہ سے پہلے زندگی کو بخیردگی سے سمجھ نہ لیا ہوتا تو ممکن ہے میرا صرف جسمانی تعلق والے شوہر کی سطحی سوچ سے سامنا ہوتا۔ اگر ایسا بھی ہوتا تو میں نے سوچ لیا تھا میں نے اپنے لیے زندہ رہنا ہے۔ محبت دینی ہے اس کی واپسی کا انتظار نہیں کرنا۔

میں اب اپنے شانوں تک بڑھے بال ڈھانچتی ہوں اور جسم کی نمائش سے مجھے نفرت ہو گئی ہے حالانکہ بظاہر میں مکمل نظر آتی ہوں اور میرا جسم بھدا یا مونا نہیں، میں تو اللہ نے ڈائریکٹ کہا ہے اپنی اوڑھنیاں اپنے گریبانوں پر پھیلا لو کاش میں یہ پہلے جانتی۔  
 مجھے اب خوب صورتی یا لباس کی تعریف سن کر خوشی نہیں ملتی۔ جب میری پندرہ سالہ بیٹی منال کو دیکھ کر عورتیں کہتی ہیں۔ ”خوب صورت لڑکی ہے۔“ ”سب تعریف اللہ کے لیے ہے۔“ وہ جوابا کہتی ہے تو مجھے اندر سے بچی خوش ہوتی ہے۔

میں سوچتی ہوں یہی وہ کی تھی جسے راست ہونا تھا۔ یہی وہ مصلحت تھی جو تربیت کی اگلی کڑی کو ٹیڑھا ہونے سے بچانے کے لیے تھی یا شاید مصلحت اب بھی پوشیدہ ہو، میں یہ نہیں کہتی کہ میری کہانی ہر سلطان کی مرئیہ کی کہانی ہے مگر میری کہانی میں کوئی امید ضرور انہیں بھی مل سکتی ہے۔



کی ہوتو ہم پوچھتے ہیں، ہمارے ساتھ یہ کیوں ہوا؟ کیا اب بھی تمہارے پاس بے حساب نعتیں نہیں؟“ ”کچھ نہیں رہا۔“ میری سرد آہ زبان بن گئی۔  
 ”کچھ نہ رہا وہ ہوتا ہے جو حضرت ایوب علیہ السلام سے ہوا۔ گھر، مال، دولت، مویشی، سرمایہ، خادم، شان، جوان اولاد، تن بدن صحت، دیکھنا، سنانا، چلنا پھرنا، اٹھنا بیٹھنا، صبر کے آخری افق تک صبر کیا۔“ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”اچھا چلو یہ بتاؤ تمہیں میری یہ باتیں پور تو نہیں کرتیں؟“ ”نہیں۔“

”اور بیماری سے پہلے..... میں ایسی باتیں کرتی تو پور ہو جاتیں؟“ میں لمحہ بھر سوچ کر صداقت سے بولی۔  
 ”بلکہ سننا پسند نہ کرتی۔“  
 ”تو تم نے روحانی ارتقا کی طرف قدم بڑھا دیے، میری بہن۔“ وہ مسکرا کر مجھ سے ہاتھ ملانے لگی۔

☆☆☆

میں چلتے پھرنے کے قابل ہوئی تو وہ مجھے اور عامر کو اسی مرض میں مبتلا ایک چھیا لیس سالہ مرئیہ کے گھر لے گئی۔ چھوٹے سے گھر کے صحن میں نیم کے درخت تلے کھٹولے پر نیم غنودگی سے کراہ رہی تھی اور ”دکھی آوازیں نکال رہی تھی۔ اس کی ساس مرغیاں، اندھے بیچتی، شوہر ریڑھی بان تھا۔ علاج کے لیے اسپتال تک جانے کا کرایہ جب تک جوڑا بہت دیر ہو چکی تھی۔ کینسر گردے اور ریڑھ کی ہڈی تک پھیل چکا تھا۔ منال نینب نے اسے پیڈسٹل فین لے کر دیا دردم کرنے والے انجکشنز اور دوائیں لے کر جاتی۔ اسی نیم کے درخت تلے منال نینب نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا تھا۔

”خدا کی قسم مجھے زندگی کا کوئی ارفح مقصد نظر نہیں آتا سوائے انسانیت کی خدمت کے۔ خواہ پیشی زبان سے، کام کرنے والے ہاتھوں سے، پیسے سے،



دو چار گے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں

**گھر بیٹھے**  
رسالے حاصل کیجیے

جاسوسی ڈائجسٹ سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ ماہنامہ سرگرمی

باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں، اپنے دروازے پر

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زر سالانہ  
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 700 روپے

امریکا کینیڈا آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 7,000 روپے

بقیمہ مالک کے لیے 6,000 روپے

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد  
رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ تم اسی حساب سے  
ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر  
رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔

یاد کی طرف اپنے یادوں کے لیے بہترین تحفہ ہو سکتا ہے  
بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا مینو گرام کے  
ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر  
بھاری بینک فیس عاید ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔

رابطہ: شمر عباس (فون نمبر: 0301-2454188)

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63 فیروز ٹینس ہاؤسنگ اتھارٹی مین گارڈ، کراچی  
فون: 35895313 فیکس: 35802551

دیکھیں، میں آپ کو یقین دلانا ہوں وہ خاندان کی  
عزت پر کسی حرف نہیں آنے دے گی۔“

اور پھر حیدر خان کو اس کی ضد کے آگے گھٹنے ٹیکنے  
پڑ گئے۔ جہانزیب ان کا لاڈلا اور ضدی بیٹا تھا۔ پریش  
کا ایڈیشن یونیورسٹی میں ہو گیا۔ وہ چھٹیوں میں گھر آتی  
ہوئی تھی۔ شاہ زیب بھائی کی بیٹی کا سن کر سب کے  
اترے چہرے دیکھ کر آج اس نے ماں سے وجہ پوچھی  
اور آج اس کی برسوں کی الجھن دور ہو گئی تھی۔

☆☆☆

ہشام کی بات پر وہ حق رو دے گئی تھی اس کی  
نظروں میں چھپی پسندیدگی اسے نظر تو آتی تھی مگر اسے  
اندازہ نہیں تھا کہ وہ ایسے اظہار بھی کر دے گا حالانکہ وہ  
سب کچھ جانتا تھا۔

”تم..... تم کیا کہہ رہے ہو ہشام، تمہیں پتا ہے  
ناں میری منگنی میرے بچے کے بیٹے سے ہو چکی ہے۔“  
پریش نے اسے حیرت سے دیکھا۔

”صرف منگنی ہی ہوئی ہے ناں، منگنی تو نوٹ بھی  
سکتی ہے۔“

”مگر بابا جان کبھی منگنی نہیں توڑیں گے، تمہیں معلوم  
تو ہے ہمارے خاندان میں منگنیاں نہیں ٹوٹا کرتیں۔“

”مجھے سب پتا ہے پری، مجھے یہ بھی پتا ہے کہ  
تمہارے بابا کبھی تمہاری شادی مجھ سے نہیں کریں  
گے۔“ ہشام نے دیکھ بھری انداز میں کہا۔

”حالانکہ تم بھی مجھ سے محبت کرتی ہو۔“ ہشام  
نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ خاموشی  
سے ہونٹ کاٹنے لگی تھی میں سر ہلاتا مشکل لگا۔ حقیقت  
سے نظریں چرائی نہیں جا سکتیں۔

”بولو، کرنی ہوناں مجھ سے محبت؟“ وہ اس کے  
منہ سے سنتا چاہتا تھا۔ پریش نے بیسی سے اسے دیکھے  
گئے۔ وہ کیوں اسے اس آزمائش میں ڈال رہا ہے۔

”کیوں ان رسموں، رواجوں میں جکڑی ہوئی  
ہو توڑ دو ان زنجیروں کو، ہم کورٹ میرج کر لیتے ہیں

بے چینی سے پوچھا۔

”وہ نہیں چلی گئی تھی..... پتا کرنے پر معلوم ہوا  
کہ اس نے اپنے ایک پروفیسر سے کورٹ میرج کر لی  
تھی۔ سب نے بہت ڈھونڈا اسے مگر وہ نہیں ملی۔ باب  
اور بھائیوں کی عزت کی دھجیاں اڑا کر وہ ایسی کم ہوئی  
کہ آج تک نہیں ملی۔ اس کی اس حرکت پر تمہارے بابا  
اور بیٹیوں چچا دباؤ میں مار مار کر روئے تھے۔ آغا جان کو تو  
بارٹ ایک ہو گیا تھا۔ وہ زندگی کی بازی ہار گئے تھے۔  
انہیں یقین ہی نہیں آیا تھا کہ جس بیٹی کو انہوں نے اسے  
ناز و نعم سے پالا تھا وہ ایسے ان کا سر جھکا دے گی۔ بس  
پھر اس دن سے زمینیں مر گئی اور اب خاندان میں کوئی  
بیٹی پیدا ہوتی ہے تو سب کے چہروں پر خوف آ جاتا ہے  
کہ نہیں..... کہیں پھر سے ایک اور زمینیں نہ پیدا  
ہو جائے جو ان کا سر شرم سے جھکا نہ دے۔ ان کی عزت  
کو ملیا میٹ نہ کر دے۔ بس یہی ڈر ہے ان سب کو۔“  
آمنہ خان نے آج اس کے بہت سے سوالوں کا  
جواب دے دیا تھا۔ اسے یاد تھا جب اس کا یونیورسٹی میں  
ایڈمیشن ہو رہا تھا تو بابا جان بالکل نہیں مان رہے تھے مگر  
جہان بھائی بھی اس کی حمایت میں اڑے رہے تھے۔  
”تم نہیں سمجھو گے جہانزیب خان، لڑکیوں کے  
لیے زیادہ پڑھائی خطرناک ہوتی ہے۔“ بابا جان نے  
اپنے ضدی بیٹے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”یہ کون سی حدیث میں لکھا ہے بابا جان؟“  
جہانزیب اپنے موقف سے ایک انچ ہٹنے کو تیار نہیں تھے۔  
”کل کو کوئی اونچ نیچ ہو گئی تو ہم کسی کو نہ دکھانے  
کے قابل نہیں رہیں گے۔“ بابا جان نے انہیں سمجھانا چاہا۔

”کوئی اونچ نیچ نہیں ہوگی، پریش میری بہن ہے  
وہ کبھی ہمارا سر نیچا نہیں کر سکے گی، اس بات کی گارنٹی تو  
میں آپ کو دیتا ہوں۔“ جہان نے اعتماد سے کہا۔

حیدر خان خاموشی سے اسے دیکھے گئے۔ کبھی ایسا  
ہی اعتماد انہیں زمینیں پر تھا۔

”آ..... آپ ایک بار اس پر اعتماد کر کے تو

اس نے ماں سے پوچھا۔

”نہیں، بیٹیاں تو بہت پیاری ہوتی ہیں۔“ ماں  
نے پیار سے اس کا گال چھوا۔

”تو پھر ان کے آنے پر اتنے دکھ کا اظہار کیوں کیا  
جاتا ہے؟“ پریش نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔  
”اس لیے شاید کہ ماں، باب کو ان بیٹیوں کے  
نصیب سے ڈر لگتا ہے اور کبھی یہ بیٹیاں ماں، باب  
کے لیے آزمائش بن جاتی ہیں۔“

”آزمائش..... وہ کیسے؟“ پریش نے ان کی بات  
سے تھوڑا الجھ گئی۔

”تم یہاں بیٹھو، تمہیں ایک کہانی سنائی ہوں۔“  
آمنہ خان نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے اپنے  
سامنے بٹھالیا۔ وہ ابھی ابھی کی انہیں دیکھ رہی تھی۔  
”تمہیں پتا ہے ناں، تمہارے بابا جان کی ایک  
بہن بھی تھیں۔“

”جی۔“ پریش نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”وہ  
بچپن میں فوت ہو گئی تھیں۔“

”نہیں..... وہ مری نہیں، وہ اب تک زندہ ہے۔“  
”ک..... ک..... کیا؟“ پریش حیرت سے چلائی۔

”زمینیں تمہارے بابا جان اور بیٹیوں چچاؤں کی  
بہت لاڈلی تھی سب سے چھوٹی اور اکلوتی ہونے کی وجہ  
سے سب ہی اس پر جان چڑھتے تھے۔ اسے پڑھنے  
لکھنے کا بہت شوق تھا۔“ پریش حیرت سے آنکھیں

پھیلانے انہیں سن رہی تھی۔ وہ اب تک شاک میں تھی  
اس کی ایک پچھو بھی ہیں اور اسے آج تک پتا نہیں چلا۔  
”اس زمانے میں ہمارے خاندان میں کوئی لڑکی  
نہیں پڑھتی تھی مگر وہ پڑھنے کے لیے شہر گئی تھی۔

آغا جان بہت سخت گیر انسان تھے مگر زمینیں کی ضد کے  
سامنے ہمیشہ ہتھیار ڈال دیتے تھے اور پھر چاروں بھائی  
بھی اس کے حمایتی تھے مگر اس نے کسی کا نہ سوچا۔“

آمنہ خان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔  
”ایسا کیا کیا تھا انہوں نے؟“ پریش نے بڑی



## دعا خیرہ

### فاقت جاوید



فوزیہ نے دوپٹے سے سرکس کر باندھا اور  
چٹک پر لٹ کر ہائے کا درد کرنے لگیں۔ سر تھا  
کہ درد کے مارے پھٹنے کو تیار تھا۔ ملک کرامت  
محسن شان بے نیازی سے باہر جا چکے تھے۔ تینوں  
بیٹیاں در شہوار، میمونہ اور دردانہ اپنے کمرے میں  
سکتے کے عالم میں خاموش بیٹھی ہوئی تھیں۔ ایک  
طویل توقف کے بعد دردانہ ہمت کر کے اٹھی اور  
سیدھی ماں کے کمرے میں چلی گئی۔ ماں کی ناگفتہ بہ

توڑ سکتی ہے، وہ کیسے ان کے اعتبار کی دجیاں اڑا سکتی  
ہے۔“ پریش نے ایک کرب سے سوچا۔  
”اگر اپنے بھائی کا مان توڑنا محبت ہے تو مجھے  
معاف کر دینا ہشام میں تم سے محبت نہیں کرتی۔“  
”اے..... ایسے مت کہو پری۔ میں تمہارے  
بغیر نہیں رہ سکوں گا۔“ ہشام کی آنکھوں میں آنسو تھے۔  
”تمہیں میں نے بتایا تھا کہ میں جو یہاں پڑھ  
رہی ہوں وہ صرف جہان بھائی کی وجہ سے، ان کی  
سپورٹ کی وجہ سے میں یہاں تک پہنچی ہوں۔ پتا ہے  
آج سے بیس سال پہلے بھی ایسے ہی ایک جہانزیب  
نے اپنی بہن پر اعتماد کیا تھا مگر اسے ایک ہشام مل گیا تھا  
وہ لگی اس ہشام کے سنگ چل دی اسے خوابوں کو  
حقیقت بنانے، اپنے پیاروں کو جیتے جی مار کر اس نے  
اپنی منزل پالی تھی۔ اگر آج پھر وہی کہانی دہرائی گئی  
تاں تو پھر کوئی بھائی اپنی بہن پر اعتماد نہیں کرے گا۔  
ہمارے خاندان سے کوئی پریش پڑھنے کے لیے شہر  
نہیں آئے گی۔“ ہشام خاموشی سے سن رہا تھا۔  
”اس لیے ہشام مجھے معاف کر دینا، میں تم سے  
محبت نہیں کرتی۔“ پریش نے کی نہیں فوراً وہاں سے چل دی۔  
ہشام وہیں گھاس پر جھکا تھا کہ سا بیٹھ گیا اس کی  
آنکھوں میں آنسو تھے۔  
”میرے ساتھ ایسا کیوں ہوا، اگر وہ میرے  
نصیب میں نہیں تھی تو مجھے ملی کیوں؟“  
جہانزیب خان ساکت کھڑا یہ سب دیکھ رہا تھا۔ وہ  
کسی کام سے شہر آیا تھا تو واپسی پر پریش سے ملے  
یونیورسٹی آ گیا۔ اسے ڈھونڈتے ہوئے جب وہ یہاں پہنچا  
تو یہ سب دیکھ کر اس کے ماتھے پر شکنیں نمودار ہو گئیں مگر  
پریش کی باتیں سن کر اس کا سر فخر سے بلند ہو گیا۔  
اس نے ایک نظر نیچے بیٹھے شخص کو دیکھا وہ ہر لحاظ  
سے پریش کے لیے بہترین تھا اس نے سینکڑوں میں سوچ  
لیا تھا کہ اب اسے بابا جان سے ایک اور ضد کرنی ہے۔

میں تمہیں بہت دور لے جاؤں گا۔ تمہارے باپ  
بھائیوں کی پہنچ سے دور۔“ ہشام نے اس کی ہمت  
بڑھانی چاہی۔  
”گورٹ میرج.....؟ پریش کی آنکھیں حیرت  
سے پھٹی رہ گئیں۔  
”ایک اور زمین.....“ پریش نے عجیب سی  
نظروں سے ہشام کو دیکھا۔ وقت خود وہاں رہا تھا۔ کل  
یہیں زمین کھڑی تھی اور آج پریش..... ہشام اس  
کے جواب کا منتظر تھا۔  
وقت بھی جیسے ختم گیا تھا۔ وقت بھی منتظر تھا پریش  
کے جواب کا..... کیا پریش بھی وہی فیصلہ کرے گی جو  
زمین نے کیا تھا۔ ایک بار پھر بھائیوں کا مان ٹوٹے گا  
ایک بار پھر حویلی میں صدف ماتم بچے کی ایک بار زمین  
مری گی اب پریش مرجائے گی۔  
”بولو..... مجھ سے محبت کرتی ہوتا؟“ ہشام کو  
اس کی خاموشی بری لگ رہی تھی۔ اس لیے ایک بار پھر  
اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔  
”اگر یہ محبت ہے کہ میں اپنے باپ، بھائیوں کی  
عزت کی دجیاں اڑا کر تمہارے ساتھ چل پڑوں تو آئی  
ایم سوری ہشام خان میں تم سے محبت نہیں کرتی۔“  
پریش کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ محبت سے دستبردار  
ہونا آسان نہیں ہوتا۔  
”اگر یہ محبت ہے کہ میں اپنے بابا جان کو جیتے جی  
مار دوں تو میں، میں تم سے محبت نہیں کرتی۔“ ہشام کے  
چہرے کا رنگ اڑ گیا تھا، اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ  
پریش یہ سب کہے گی۔  
”آپ اس پر ایک بار اعتماد کر کے تو دیکھیں،  
میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ وہ خاندان کی عزت پر  
کبھی حرف نہیں آنے دے گی۔“ اسے جہان بھائی کے  
الفاظ یاد آ رہے تھے۔  
”پریش میری بہن ہے، وہ کبھی ہمارا سر نہ چا نہیں  
کرے گی۔“ اتنا مان، اتنا اعتبار..... وہ کیسے ان کا مان



ملک کرامت حسین ایک نا اہل وکیل تھے، اپنے جذباتی اور بے صبرے پن کی وجہ سے نہ تو نام کما سکے نہ ہی دولت کی دوڑ میں آگے نکل سکے۔ ان کے گھر میں وہی ہوتا تھا جو وہ چاہتے تھے، مزاج میں ضد اور غصہ ہم وزن تھا۔ تین عدد بیٹیاں بچپن میں پلٹ کر نہ آیا۔ عتاب کے لیے بیٹیاں نظروں کے سامنے تھیں۔ ان کی قوت گوہی سلب کرنے اور ان کی حرکات و سکنات پر کڑی نظر رکھنے میں البتہ وہ خاصے ماہر تھے۔ بیوی تو کسی کھاتے میں نہ آتی تھیں اس لیے اسے بل بھر میں جوتی کی نوک پر لے آنا کوئی ان سے سکھے۔ بقول ملک صاحب اسے ہی مردانگی، اتنا اور غیرت کہتے ہیں۔

وہ فائلیں بکھیرے اپنے کیس پر غور و خوض کر رہے تھے کہ فوزیہ اضطرابی کیفیت میں ان کے قریب ہی پلنگ پر بیٹھ کر ان کی طرف دیکھ کر بولیں۔ ”ملک صاحب ایک بات کہوں برا تو نہیں منائیں گے؟“

”ایسی بات ہی مت کرو۔۔۔۔۔ ضرور کوئی اول قول ہی بکنے والی ہو، جو بیگم بی بی بیٹی ہو۔“ وہ ان کی طرف دیکھے بغیر ہی بولے تو وہ تھلا اٹھیں۔

”آپ سے بات کرنے کا مطلب ہے بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈال دیا کر کیا کروں مجبور ہوں، بیٹا آپ کی ختیوں سے تنگ آکر باہر چلا گیا۔ اب بیٹیاں اگر بغاوت پر اتر آئیں ناں تو بہت برا ہوگا۔ میں آپ کو بتا رہی ہوں، ہاں!“

”کیا کر لیں گی میرا۔۔۔۔۔؟ بولو سب کی زبانیں کاٹ دوں گا۔۔۔۔۔“ ٹائلیں توڑ دوں گا، کیا جھتی ہیں خود کو میرے مہر مقابل کھڑی ہو جائیں گی۔“ وہ غیظ و غضب سے بولے۔

”ان نصیحوں جلی کو راہ راست پر رکھنا ماں کا

آپ کو اپنے دل کی آواز سناؤں گی اور آپ کو سننا ہوگی ہر صورت۔۔۔۔۔ میں یعنی دردانہ ملک آپ کی بڑی دو عدد بے وقوف، نادان اور کم ہمت بیٹیوں جیسی ہرگز نہیں۔۔۔۔۔ وہ بزدل آپ کے لحاظ اور آپ کی عزت کا پاس رکھتے ہوئے آپ کے دو بدو فرمانبرداری اور تابعداری کا ڈھونگ رچاتی ہیں، بیٹن مانے گا پیٹھ پیچھے اعتراضات کی ایک فہرست نکل جاتی ہے، آپ کے تمام مظالم اور ستم ان کے ہوش و حواس پر نفرت و حقارت کی پرچھائیاں بن کر باقی ہو جاتی ہیں، بات تو سچ ہے کہ آپ دونوں شرافت اور خاموشی کا ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہیں، وہ ان دور نہیں، جب وہ آپ کے فرسودہ خیالات کے خلاف نعرہ بلند کریں گی، اس کمزور بنیاد پر کھڑے اس گھر کی دیواریں بل جائیں گی، بھونچال برداشت نہیں کر پائیں گے آپ لوگ۔ تب آپ کو اس بات کا احساس ہوگا۔“ وہ عجیب انداز میں ماں سے مخاطب تھی۔

”اچھا تو دھمکیاں دینے آئی ہو مجھے؟ میری بیٹیاں تو بسم اللہ کا حکم ہیں، مجھے خطرے کی بو تو تمہاری باتوں سے آرہی ہے، ہم اپنے آپ کو کیا جھتی ہو؟ کوہ قاف کی پری یا شہزادی؟ تمہارے ابو بہت جہاندیدہ اور بائے کے وکیل ہیں، میں تو ان کے فیصلے پر ان کا ہی ساتھ دوں گی۔“ ماں زہر آگیں لہجے میں بولیں۔

”میرا خیال ہے امی آپ کو میرا موقف سمجھ نہیں آ رہا۔ میں کھلے لفظوں میں اس بات کا اقرار کرتی ہوں کہ میں آپ کی اور باجو کی طرح منافق نہیں، نہ ہی ان کی طرح اپنی خواہشات کو آپ کے فیصلوں پر قربان کر کے داد و تحسین وصول کرنے کا شوق رکھتی ہوں۔ امی خدا کے لیے میری بات سمجھیں، آپ کے لیے سوچیں ان کے پاس زیادہ وقت نہیں رہا گھر ہلانے کا۔ وہ آپ کی اپنی اولاد ہیں۔“ اور ماں نے اس کی تمام باتوں کے جواب میں منہ پھیر لیا تھا۔

بیت جائے گی، کیا ہم اپنے مقدر میں محض حسرتیں اور آہیں ہی لکھوا کر پیدا ہوئی ہیں؟ کیا ہمیں سکون و اطمینان کی کوئی ضرورت نہیں؟ یہ بھی بھلا کوئی زندگی ہے، کاش کہ ہم پیدا ہوتے ہی مگر مری ہو تیں، موت سے بدتر ہے ہماری زندگی۔“ وہ کئی و تاسف بھرے لہجے میں بولی۔

”شادی کے لٹو ذائقے میں شیریں مگر اثرات بہت کڑوے ہوتے ہیں، ہر شادی شدہ عورت سے پوچھ دیکھو۔۔۔۔۔ اس لیے زیادہ دھی ہونے کی ضرورت نہیں، اپنی سہیلیوں کی سچی جھوٹی شیشیوں پر کان دھرنے کے بجائے اپنی آنکھوں پر بھر دسارکو، میری زندگی پر غور کرو کہ عملاً ایک زندہ لاش بن چکی ہوں۔“ وہ نہایت نرم لہجے میں احتجاج کرتے ہوئے آنکھیں بند کر کے لیٹ گئیں۔

”ہم تینوں بیٹیاں آپ کے ساتھ زندہ لاشیں بننے سے انکار کرتی ہیں امی۔ ہمارے رشتے طے کرنے کا عمل اتنا پیچیدہ ہو جائے گا کتنی حیرت کی بات ہے، یہ ابو کے بنائے ہوئے قانون اور ضابطے توڑنے کے لیے ہی بنائے گئے ہیں، ہم ان کے تمام ظالمانہ و بے رحمانہ اصولوں کے خلاف جلوس نکالنے والی ہیں، اپنے شوہر کو بتا دیجیے گا۔“ جارحانہ انتباہ لہجے میں نمایاں تھا۔

”زبان کو لگام دو تم ہوش میں نہیں ہو، یہاں سے دفع ہو جاؤ، ورنہ اتنے جوتے لگاؤں گی کہ پتہ نہ رہے۔“ طبق روشن ہو جائیں گے۔ یہ مت بھولو کہ تمہارا باپ ایسی ناہنجار اولاد کو زندہ درگور کرنے کا حوصلہ رکھتا ہے۔“ فوزیہ کے رگ و ریشہ میں غصہ سرایت کر گیا تھا۔

”ہم آپ پر ناقابل برداشت بار ہیں امی، آپ نے ہمیں تعلیم دلا کر شعور کو بیدار کرنے کا کام کیوں کیا؟ اور اب ہمیں اپنے حقوق کے حصول کی خاطر ایک لفظ بولنے کی اجازت تک نہیں مگر آج میں

حالت دیکھ کر دردانہ نے انہیں پن کڑی اور نہایت ملاحت سے ان کا سر دبانے لگی۔ وہ اپنی ہی سوچ میں محو تھی۔ سر درد جو نبی بہتر ہوا تو فوزیہ نے بیٹی کے ہاتھوں کو چوم لیا تو دردانہ کی آنکھوں میں بے بسی کی جھڑی ابل پڑی۔ بسا اوقات انسان کس قدر بے بس و مجبور ہو جاتا ہے کہ نیر بہائے بنا سکون نہیں ملتا۔ دل میں بھڑکتے ہوئے شعلے مدھم نہیں پڑتے مگر چنگاریاں ذرا سی ہوا پر شعلوں میں تبدیل ہوتے دیر نہیں لگاتیں۔

”بیٹا کیا بات ہے؟ وجہ جانتے ہوئے بھی پوچھ بیٹھی ہوں۔“ فوزیہ نے بے حد دھی لہجے میں کہا۔

”امی! اچھا بھلا رشتہ تھا۔ ابو کے انکار کی وجہ میری سمجھ سے تو بالاتر ہے۔ آپ انہیں سمجھانے کی کوشش تو کریں۔ امی جب ماں ہی کمزوری اور۔۔۔۔۔

بے بسی کا شکار ہو جائے تو اولاد تو جتنے جی ہی جہنم رسید ہوگئی ناں۔ ہم تو عالم برزخ میں لٹکی ہوئی بیٹیاں ہیں آپ کی۔ ہماری خاطر ہی ذرا مضبوط ہو جائیں۔“ دردانہ نے ماں کے چہرے پر ہلکے سی ابھری ہوئی شکلوں کو دیکھ کر قدرے آہستگی سے کہا مگر الفاظ خاصے ہر آلود تھے۔

”تم مجھے خاموش ہی رہنے دو، یہ زبان چل نکلی تو رک نہیں پائے گی اور گھر فساد کا اکھاڑا بن کر رہ جائے گا۔ تم یہاں سے اٹھو، جاؤ اپنا کام کرو، شام ہونے کو ہے، ابھی تک چوہا ٹھنڈا پڑا ہے۔ تمہارا باپ ہم سب کی چٹنی بنا کر کھانا کھا سکتا ہے، جانتی تو ہو۔۔۔۔۔ اور بڑی کو جاکر کہو کہ سوگ منانے کا وقت گزر چکا ہے، خود کو نادل رکھنے کی کوشش کرے۔

شادی۔۔۔۔۔ شادی اس بکواس میں کیا رکھا ہے، سرباب ہے یہ، سراسر سرباب کے سوا کچھ نہیں، اسے جاکر سمجھاؤ۔“ وہ سخت ناگواری سے بولیں۔

”امی! مجھے تو اب سو فیصد یقین ہو چلا ہے کہ ہماری تمام زندگی اس گھر کے چولہے جھونکتے ہی



انگریزی سال کے پانچویں مہینے کی پہلی تاریخ یعنی یکم مئی کو مزدوروں کا عالمی دن منایا جاتا ہے۔ بڑے بڑے ہولٹوں کے کنونشن ہالز اور سینما رومز میں پروگرام منعقد کیے جاتے ہیں۔ لوگ مزدوروں کے عالمی دن اور ان کے حقوق سے متعلق دھواں دھار تقاریر کرتے ہیں۔ ان کی مشکلات پر مگر کچھ کے آنسو بہاتے جاتے ہیں۔ اعلانات بھی ہوتے ہیں لیکن اس کے بعد شاندار قسم کے لچ، ڈنر یا ریفرنڈم ٹیفٹ نوش فرما کر لوگ اپنی خوب صورت انٹرکٹائیو گائڈوں میں سوار ہو کر اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہو جاتے ہیں لیکن وہ مزدور جس کے نام پر چند بول ادا کر کے یہ لوگ اپنا پیٹ بھرتے ہیں وہ بے چارہ اس روز یعنی اپنے عالمی دن پر بھی کام سے رخصت نہیں لے سکتا۔ وہ روزانہ کے معمول کے مطابق بیسیوں اشیاں اپنی کمر پر لاوے سیکڑوں میں یہاں چڑھ رہا ہوتا ہے۔ شاید اسے معلوم ہی نہیں ہوتا کہ آج اسی کے لیے عالمی دن منایا جا رہا ہے۔ یہی نہیں بلکہ ان کے بعد مزدور ایسے بھی ہیں جن کے جنموں نے اپنے بچوں کو بھی اپنے ہمراہ کام پر لگا رکھا ہے۔ اس کے باوجود وقت تو کیا انہیں ایک وقت کی روٹی بھی بہ مشکل ہی مل پاتی ہے۔ بات یہیں ختم نہیں ہوتی بلکہ اپنی غربت کے ہاتھوں مجبور ہو کر کتنے ہی گھرانے اپنے بچوں کو ٹیکسٹ بکس کے ہاتھوں چند روپوں کے عوض فروخت کر چکے ہیں۔ یہ بچے سڑکوں پر، کمپنیوں میں، دکانوں پر، کارخانوں میں، کیران میں انتھک محنت کرتے نظر آتے ہیں لیکن انہیں اس محنت اور مشقت کے عوض کیا ملتا ہے؟ شاید بلکہ یقیناً کچھ بھی نہیں۔ کتنے ہی ادارے بنے، کتنی ہی تحریکیں چلیں اور کتنی ہی انجمنوں نے بچوں کی مزدوری کے خلاف آواز اٹھائی لیکن اصل مسئلہ جوں کا توں رہا۔ یہ یقیناً صرف سوچ کا نہیں بلکہ عمل کا نکل ہے۔

جب تک یہ روز اٹکا رہے گا تم دونوں کا بھی میری طرح اس گھر سے ڈولی کے بجائے جنازہ ہی اٹھایا جائے گا۔ اس لیے میری التجا ہے کہ کم از کم تم دونوں امی کو تو اعتماد میں لے سکتی ہو کہ مجھے موسیٰ ہمیشہ سے بہت پسند تھا۔ اس کی ہم راہی میں میری زندگی پُر سکون اور پُر مسرت گزرے گی۔ اس کی میں گارنٹی دیتی ہوں۔ اس لیے اس رشتے کو ہاتھ سے مت جانے دیں، بس کسی طرح ایو کو منالیں۔“ وہ بھرپور اعتماد اور جوش سے بولے جا رہی تھی اور وہ دونوں پچھلے تجربوں کی بنیاد پر افسردگی و ترس کے جذبات لیے اسے نکلے جا رہی تھیں۔ ڈیر شہوار نے ان کی خاموشی کو بھانپ کر نصف آہ اندر ہی دہالی۔

”تو ٹھیک ہے، میری سفارش مت کرو، گھانا صرف میرا ہی نہیں۔ خسارے میں تم دونوں بھی رہو گی۔“ اب کے اس نے تنبیہی انداز اپنایا۔

”ہمیں علم ہے آپی، افسوس کہ بہتر حالات کا قیاس ناممکن ہے، ابو کے قواعد و ضوابط کے ریلے میں خوشی کی کوئی رشتہ ہمیں نہیں ملے گی۔ چند سالوں کی بات ہے آپی، یہ جو ذہن کی پکار ہمیں اپنا گھر سامنے

قابلِ غور بھی تھا سامنے آ گیا۔ موسیٰ، ڈیر شہوار کا کلاس فیلو تھا۔ بہت سلجھا ہوا اور اچھے خاندان کا پروردہ تھا۔ آج کل ایک پرائیویٹ کمپنی میں منیجر کی پوسٹ پر فائز تھا۔ پوش ایریا میں خوب صورت گھر، اپنی ذاتی گاڑی..... دونوں کا جواں دل زمانہ طالب علمی سے ایک دوسرے کا گرویدہ تھا۔ مگر عدم اعتمادی دونوں کے درمیان ایک مضبوط اور ناقابلِ عبور دیوار کی طرح حائل رہی۔ ڈیر شہوار کے کانوں تک جب یہ بڑا دردِ راحت پہنچا تو وہ اندر ہی اندر شرم کا جھوم سی گئی۔ ابو سے خوش آمد آس اور امیدیں وابستہ کر کے بہنوں کو موسیٰ کے بارے میں تفصیلاً بتانے لگی مگر بہنوں کے چہروں پر امید کی ٹپکی سی رقت بھی نہ ابھری۔ اس کا دل اداسیوں اور مایوسیوں کی اتھاہ گہرائی میں جا ڈوبا۔ اک طویل توقف کے بعد ڈیر شہوار نے ایک مرد آہ بھری اور پھر گویا ہوا۔

”تم دونوں خاموش کیوں ہو؟ کیا یہ رشتہ بھی ناقابلِ قبول ہے اگر اسے ٹھکرا دیا تو پھر اس در پر ایسا موزوں رشتہ کبھی نہیں آئے گا..... اور ہمیشہ کے لیے تم دونوں کی راہ میں روڑا بن کر رہ جاؤں گی۔“

تھیں۔ اگر ملک صاحب چاہتے تو تینوں کے رشتے کیے بعد مگرے کر کے فارغ البال ہو جاتے مگر وہ تو اس معاملے میں ایسے دقیق نوی، کم حوصلہ اور قدامت پسند نکلے کہ ہر رشتے پر پہلے تو تیج پا ہوتے، فوزیہ کے سمجھانے، سمجھانے پر اگر مان بھی جاتے تو شجرہ نسب کے الجھاؤ میں پھنس کر رہ جاتے۔ لڑکے کی تعلیم اور ماہانہ انکم کو انتہائی ضروری سمجھنا جائز تو تھا مگر بے جاتم کی مین مین نکالنا ناقابلِ برداشت ہو جاتا تھا اگر بیوی کے کہنے پر طوعاً و کرہاً خاموش رہتے تو تاثرات سے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کر کے بھگا دیتے۔ اسی آنکھ مچوٹی میں ڈیر شہوار تیس سال کی ہو گئی مگر ملک صاحب اپنے تجربات و مشاہدات سے سبق نہ سیکھ پائے۔ آج بھی قابلِ قبول رشتے کی چھان بین میں کوئی کسر اٹھانہ رکھی۔ حقارت و غیر یقینی سے ان کے خاندان کا حسبِ نسب اور شجرے کے بوسیدہ اور سال خوردہ برت پر گفتگو کرتے ہوئے ایسا نکتہ نکال لائے کہ وہ لوگ اپنا سامنہ لے کر واپس چلے گئے۔ کئی سالوں سے یہ سلسلہ چل رہا تھا جس کے روح فرسا اثرات بچیوں کے ہر عمل سے نظر آنے لگے تھے۔

فوزیہ کے اعتراض پر گھر کی مایوسی، ناامیدی اور اداسی برطعون و تشویشوں میں اضافہ ہو چکا تھا۔ کھینچا تانی کا باز آ کر گرم رہتا اور گھر کا ماحول میدانِ کارزار کا سماں پیش کرتے ہوئے بیٹیوں کو مزید ہراساں و پریشان کرنے لگا تھا۔ ملک صاحب کے اس جارحانہ رویے کو دیکھ کر رشتے داروں نے لاکھ سمجھایا مگر وہ اپنی ایک طرفہ غیر مناسب سوچ کے مطابق کہ گھری اجلی سفید دودھ کے مانند چادر پر کالے رنگ کا دندا میوند کنگر لگائیں۔ ان کے سینے پر پتھر کی بھاری اور ذہن پر رخ بستہ برف کی بیل کو کوئی ذی

روح آنچ بھرنہ ہلا سکا۔

اسی کشمکش میں چند مہینے گزر گئے اور ایک اور رشتہ جو ان کی حیثیت کے لحاظ سے قابلِ ستائش اور

اہم فرض ہے، بیٹیوں کے معاملات میں باپ کی دخل اندازی سراسر بے غیرتی اور بے حیائی ہے، اس لیے تم غور سے سن لو۔ انہوں نے کسی قسم کا احتجاج کرنے کی کوشش کی تو تمہارا سر چل کر رکھ دوں گا سمجھ گئیں؟“ ”اچھا..... اچھا۔“ وہ سہلا کر بولیں۔ ”میں نے تو آپ کا رعب داب خوب سہہ لیا، ہر جائز ناجائز بات پر جی حضوری کر کے اپنی جان بخشی کراتی رہی۔ اب نکل آئیں اپنی جھوٹی آن بان کے چنگل سے۔“ وہ تنک کر بولیں۔

”اب دھمکیوں سے کنارہ کشی اختیار کر لیجیے۔ بہتری اسی میں ہے اور بڑی کے رشتے کا فیصلہ کیجیے۔ آج کا رشتہ مجھے ہر لحاظ سے بے حد پسند آیا ہے۔“ ”تم خاموش رہو..... روز بروز سر پر چڑھ کر ناپنے لگی ہو، فیصلہ کر لو، یہ کوئی مذاق نہیں، اپنا کام کرو، ورنہ جانتی ہو تم سے پنتا تو مجھے خوب آتا ہے۔“ وہ چیخنے کے انداز میں بولے۔

”ماضی میں تو کچھ کرنے سکے۔ اب جودل میں آئے کر ڈالیں۔ مجھے منظور ہے، میں بھی روز بروز کی بک بک سے تنک آگئی ہوں“ وہ اکثر کر بولیں۔ ”اگر تم نے ان نادان لڑکیوں کی باتوں کا اثر لیا تو پرچا ہاتھ میں تھا کہ گھر سے باہر نکال دوں گا۔“ وہ غصے میں لرز اٹھے۔

”اب میں ان دھمکیوں سے ڈرنے والی نہیں ہوں، ایک بات مت بھولے گا۔ میں اپنی جوان اولاد کو چھوڑنے والی نہیں، نہ ہی اپنے اس گھر کو۔“ وہ پہلے تو لڑیں پھر خود پر قابو پا کر بڑی دلیری سے بولیں تو ملک صاحب حیرت و تجسس سے دیکھنے لگے..... میز پر ایک زوردار گھونسا مارا اور باہر نکل گئے۔

☆☆☆

ڈیر شہوار نے جونہی ہوش سنبھالا تو اپنی اور غیروں کی طرف سے رشتوں کا تانتا بندھ گیا۔ میمونہ اور وردانہ بھی ساتھ ہی جوانی کی ولینز پر قدم رکھ چکی



پر اسکا پی رہتی ہے، مہم پڑ جائے گی، آپ اپنے دل کو مضبوط رکھیں، ابو کی ضد و بہت دھری کے سورپ ہیں۔ دردانہ کا انداز گفتگو حقیقت پر مبنی تھا، در شہوار کی آنکھیں اشک بار ہوتی چلی گئیں۔

”دردانہ اگر تم اتنی کم ہمت پڑ گئیں تو ہم دونوں پکھے سے لٹک کر جان دے ڈالیں گی، تمہیں امی سے بات کرنا ہوگی۔ ہمیں نہیں معلوم کہ تم کیسے انہیں رام کر سکتی ہو۔ میرے ساتھ ہی میمونہ کے رشتے کو بھی ہاں کر دیں۔ وہ لوگ بھی بہت شریف انشس ہیں۔“

در شہوار نے تڑپ کر کہا۔

دردانہ نے یہ سب احوال ماں کو سنا دیا تھا مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئیں کیونکہ شوہر کی جابر اور ضدی فطرت کا عصا ان کی زبان لنگ کر گیا۔ دردانہ کے بار بار غیرت دلانے پر فوزیہ نے ہمت پکڑی اور ملک صاحب سے عاجزانہ طریقے سے بات منوانے کی کوشش کی۔ کبھی بچیوں کی عمر بڑھنے کے خوف سے ڈرایا، کبھی ان کے تاریک اور حسرت زدہ مستقبل کی بھیاں نکال کر تصویر پیش کر کے دھمکا یا پھر ان کے بڑھاپے کی تنہائی اور محتاجی کا ایسا نقشہ کھینچا کہ وہ سوچنے پر مجبور ہوئی گئے کہ اس رشتے کو بھی پرکھنے میں مضائقہ ہی کیا ہے؟ بیکم کو لڑکے والوں کو بلانے کا اجازت نامہ تو مل گیا مگر ان کے چہرے پر خوشی کی ہلکی سی جھلک بھی نظر نہیں آرہی تھی۔ خدا خدا کر کے مہمانوں کی آمد ہوئی۔ بیٹیوں میں چہ گونیاں اور پیش گونیاں طول پکڑنے لگیں۔ گھر بھر کی صفائی ستھرائی اور پھر ٹرائی کی جج و جج اور بیٹیوں کے استری شدہ صاف ستھرے زیب تن لباس اور پرامید چہرے دیکھ کر وہ چونک سے گئے۔ اس سے پہلے کہ موسیٰ کی ماں در شہوار کے دیدار کے لیے ڈرائنگ روم سے باہر لاؤنج میں آئیں۔ ملک صاحب نے تفصیلاً پوچھ پچھ کے بعد ایسا اچھوتا اور نازیبا نقشہ نکالا کہ سب ان کی عقل پر ماتم کناں ہوئے بغیر نہیں رہ سکے کیونکہ موسیٰ کی نانی کا تعلق ملک ذات کے بجائے مغل ذات

سے تھا۔ خون میں ایسی آمیزش تو انہیں کسی صورت منظور نہیں تھی۔ نہایت بے دردی اور سنگدلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بے لچاری سے انہیں مکا سا جواب دیا اور سرعت سے باہر نکل گئے۔ موسیٰ کی ماں نے اپنی اس ہنک آمیزی پر وہاں ایک سیکنڈ رکنا گوارا نہیں کیا۔ چائے کی پیالی میز پر رکھ کر، شرمندگی اور تاسف سے فوزیہ کو دیکھا اور انہیں ملال بھری تسلی کی تھکی دے کر باہر نکل گئیں۔ گھنٹے میں ہی وہ ان کے ماحول سے آشنا ہو چکی تھیں بچپن کا رشتہ نہ ہونے کی وجوہات کھل کر سامنے آ گئی تھیں۔

☆☆☆

”باعزت اور باوقار لوگوں کا یہ شیوہ نہیں ہوتا کہ گھر آئے مہمانوں کو یوں حقارت و تحقیر سے دھتکار دیا جائے۔ ملک صاحب ہم اسی جرم کا غیازہ بھگت رہے ہیں۔ اب ہماری بچیوں کے لیے آسمان سے فرشتے نازل ہونے سے تو رہے۔ آخر اسی زمین پر بستی خدا تعالیٰ کی مخلوق سے ہی لڑکے کا انتخاب کیا جائے گا۔ آج اس رشتے کو لڑک معمولی سی بات پر رد کرنے کا افسوس مجھے چین نہیں لینے دے رہا۔ مائیں نہ مائیں رشتہ لا جواب تھا۔“ فوزیہ تنہا ہوتی بولے جا رہی تھیں۔ اور ملک صاحب انہیں کھاجانے والی نظروں سے گھرے جا رہے تھے۔

”تم کو اس بند رکھو، کہاں یہ گھیارے اور کس برید (mix breed) کے تیز بیر لوگ، تمہاری عقل۔۔۔ تو ہر رشتے پر گھاس چرنے نکل جاتی ہے۔ تمہارا جس چلتا تو ان معصوم بچیوں کو کب کا جہنم میں جھونک دیا ہوتا۔ ان سے اپنی جان چھڑانے کا جو منصوبہ تم نے بنا رکھا ہے بہت بھیاں اور جان لیا ہے۔ میں ان کا دشمن نہیں، ٹھوک بجا کر چھلنی میں چھان کر فیصلہ کرنے کو اولیت دیتا ہوں۔ جاؤ جا کر چوٹا ہانڈی کرو، کپڑے اور برتن دھوؤ۔ یہی تمہارا کام ہے بس۔۔۔۔۔ یہ فیصلے و بھلے کرنا عورتوں کا کام نہیں۔ اپنی حیثیت بچاؤ اور اپنی تاسی اور کم

میرے ذہن میں اٹھیلنے کی کوشش مت کرو۔ یہاں ایسی بے ہوشی کی کوئی جگہ نہیں۔“

لہجہ اتنا ہنک آمیز تھا کہ وہ احساس تضیک سے بھوٹ بھوٹ کر رونے لگیں حالانکہ یہ انہوی اور عجب بات نہیں تھی۔ ہر رشتے کے انکار کے بعد اپنے ہی دل دکھانے والے ڈائلاگ بولے جاتے اور گھر کی مہینوں تک سو گواہی کی نذر ہو جاتا۔ پھر سے آنے والا تیار شدہ چند دنوں کے لیے حالات معمول پر لے آتا اور فوزیہ نئے نئے سرے سے امید و بیم کے نشے میں ڈوبتی ابھرتی تیاری میں مصروف ہو جاتی۔ اس بار کے انکار نے گھر کی فضا میں کشیدگی اور تناؤ کو غیر معمولی طور پر بڑھا دیا تھا کیونکہ در شہوار کی طرف سے جو آمادگی اور پسندیدگی تھی بچیاں کرے میں مقید اور ماں سا رواق سے باندھے ہوئے ٹنگ توڑا کرتی تھیں۔ ملک صاحب نے گھر میں آزدگی اور خشکی کو محسوس تو کر لیا تھا مگر اپنے فیصلے کو بدلنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ انہیں شک ہو چلا تھا کہ ہونہ ہو یہ رشتہ در شہوار کی شہ پر آیا ہے، یونیورسٹی کے زمانے میں اس کا کلاس فیلو ہونے کا تا نا انہیں گمبیر سوچوں میں الجھائے رکھتا تھا۔ اندر ہی اندر پیچ و تاب کھاتے رہتے مگر اپنا خدشہ کسی سے بیان نہ کیا۔ یہ ان کی غیرت کو گوارا نہیں تھا۔

ادھر در شہوار کی زبان تو بند تھی لیکن سوچوں پر تو باپ کا پہرہ نہ تھا۔ کبھی تو اس کا ذہن باغیانہ خیالات کی آماجگاہ بن جاتا اور بھی خود کو ہی اہانت ملامت کر کے چپ کر لیتی۔ مگر اس کے دل میں شاہیں پار پی ہوئی باغیانہ خواہش دہنے کا نام نہ لے رہی تھی۔ اس کا من دہانی دے رہا تھا کہ وہ اپنے بے لگام اور منہ زور جذبات کو جوانی کے دھارے میں بہہ جانے دے۔ حیا اور نسوانی وقار کے پردوں کو چاک، چاک کر ڈالے اور اس ماحول کو خیر باد کہہ کر اسکی حسین دل پزیر دنیا کی باسی بن جائے۔ جسے وہ اپنی پناہ گاہ کہنے کی حقدار ہو اور ایسی محفوظ آغوش ہو

کہ کبھی کم مائیگی اور بے بسی کا احساس تک نہ ہو لیکن ہر بار کی طرح وہ پھر سے آنسوؤں سے اپنے دکھ و غم دھوئی چلی گئی۔ اپنی روایات کا پاس اپنے خاندان کی ذلت و رسوائی کا اندیشہ اور والدین کے چھتاوؤں کا دکھ اور اپنی شرافت و عزت کا لحاظ اس کے پاؤں کی بھاری بھر کم بیڑیاں بن گئیں۔ آج بھی وہ زمانے بھر کی ان دیکھی رنگینیوں کو اپنے دامن میں بھرنے کی ناکامی پر تلملا اٹھی۔ وہ ابو کے تجویز کردہ اصولوں راہوں پر گامزن رہنے پر اکتفا کر گئی۔ اٹھارہ آنکھوں سے اس نے اپنے سامنے دھندلے اور سال خوردہ آئینے میں خود کو دیکھا۔ اس کا دلکش حسن اس سے بھیک مانگ رہا تھا۔ اس کا سحر زدہ سراپا اس سے شکوہ کر رہا تھا اور دل میں جذبات و احساسات کی شوریدگی قلب و ذہن پر غالب آچکی تھی۔ دل نے پھر سے گستاخانہ انداز میں سوچا مگر طبعاً اگلے ہی لمحے ذہن کی پکار پر وہ سر جھکا کر بیٹھ گئی۔۔۔۔۔ اور اپنے کنوارے جذبول اور بری نویلی سوچوں پر پھر سے بند باندھ کر اپنی زندگی میں رواں دواں ہونے کے لیے تیار ہو گئی کیونکہ ابو کا تیار کردہ مل صراط پار کرنا اس کے بس کا روگ نہ تھا۔ اس پر پاؤں رکھتے ہی وہ جہنم رسید ہونے کے خوف سے سوکھے پتے کے مانند لڑزنی ہوئی خود کو لعنت ملامت کرتی میمونہ کو بھی پہنچنے کی تلقین کرنے لگی۔۔۔۔۔ اور دردانہ کو بھی گوشہ تنہائی سے نکلنے پر آمادہ کرتی ہوئی کچن کی جانب چل پڑی جہاں کاؤنٹر پر استعمال شدہ برتن بکھرے ہوئے اس کا منہ چڑا رہے تھے۔

☆☆☆

دردانہ حسرت و یاس کی تصویر بنی اپنی سوچوں میں غلطان تھی۔ اس سانچے کے بعد اسے اپنی آپنی کی کروڑوں کی قیاس آرائی مضطرب کر رہی تھی کہ وہ دونوں یہاں سے کفن پہن کر ہی نکلنے کی امید رکھیں۔ وہ تڑپ اٹھی تھی۔ بلکہ ہوتے خود سے سرگوشی کی کہ میں ابو کی خواہش کے مطابق خاموشی اور شرافت کے



کھونٹے سے بندھی رہ کر صوفیانہ و شریفانہ زندگی بسر کرنے کو گناہ تصور کرتی ہوں۔ قدیم آدش اور فرسودہ خیالات کی جھینٹ چڑھنے سے پہلے وہ کسی عملی قدم کے بارے میں سوچنے لگی..... اور ایک دم اس نے مسکرا کر موبائل پر ایک شناسا سے نمبر پر فون کر دیا۔

لمبی چوڑی گھنٹو کے بعد اس کا ذہن لمحہ بہ لمحہ حسن و شباب کی سرکش موجوں کی گرفت میں اچھٹا چلا گیا۔ اسی اٹھاؤ اور تناؤ میں اس نے کوئی فیصلہ کیا اور رات کی تاریکی میں وہ اپنی خواہشات کے تقاضوں کا آنچل تھا سے اور جو دراک ماں کی تربیت اور باپ کی سخت مزاجی سے اس کے حصے میں آیا تھا، اس کی سیسہ پلائی ہوئی تمام دیواروں کو پھلانگ کر گھر سے روپوش ہو گئی۔ جس کا فیصلہ درِ شہوار نہ کر سکی اس نے یہ آسانی کر لیا تھا۔

گھر میں کہرام کا چٹا اک فطری امر تھا۔  
دُربہوار اور میمونہ اس کی اس حرکت پر پریشان و  
ہراساں ہو گئیں۔ ان پر زندگی اور تنگ کر دی گئی۔  
فوزیہ اپنی جگہ مارے ندامت کے شوہر سے نظریں  
دوچار کرنے سے قاصر تھیں۔ ملک صاحب گھر بھر  
میں بیٹی کی اس بے باکانہ حرکت پر پھنکارتے  
پھرتے۔ دوسروں کے سامنے زبان نہ کھولتے۔ حیلے  
بہانوں سے ہر جگہ فون کر کے بیٹی کی تبریٰ کرنے لگے  
مگر ہر طرف سے ناکامی نے ہی سامنا کیا تھا لیکن  
ابھی تک انہیں اپنی غلطی کا احساس تک نہیں ہوا تھا۔  
ہر گناہ، جرم اور غلطی کی ذمے دار فوزیہ کی تربیت تھی۔

اب وہ بھی خاموشی سے تمام لعن طعن سن کر دروازہ کو ہی  
مورد الزام ٹھہرانے لگی تھیں۔ بات تو جی سچی ہے کہ اپنا  
خالص خون ہی عزت کی بھولی کھیل گیا۔ انہیں دعا  
دے گیا۔ ملک صاحب نے تو اپنے چہرے پر عجب د  
داب کے رنگ چڑھائے، پورے داری میں چپ  
سادے شہر کا کونہ کونہ چھان مارا تھا۔ فوزیہ بھی منہ پر  
پٹی باندھ بیٹھی تھیں کہ چند دنوں بعد دروازہ کی ای  
میل دیکھ کر ملک صاحب کا سر گھوم گیا۔ مارے غصے

کے منہ سے جھاگ ابل پڑا۔ فوزیہ نے ملاحت سے انہیں شہنشاہی پلا کر تسلی و تسفی دینے کی کوشش کی۔ مگر ہمیشہ کی طرح ان کے بھیجے میں کچھ نہ بیٹھا۔ جو منہ میں آیا بولے چلے گئے۔ ذرا غصہ کم ہوا تو پیشانی سے عرق جلال کو خشک کر کے ای میل پڑھنے لگے۔

”میری قابل احترام ہستی  
آپ کو میرا خلوص اور پیار بھر اسلام!  
میں اپنے تاریک مستقبل کے پیش نظر اتنا زباں اور  
اہم فیصلہ کرنے پر مجبور ہو گئی۔ میں آپ سے فقط ایک  
سوال کرنے کی گستاخی کر رہی ہوں کہ آپ کو ہماری  
نمریں اتنی تیزی سے گزر جانے کا احساس کیوں نہیں  
ہو رہا۔ اب آپ کی تینوں بیٹیاں اپنی شرافت اور پاک  
دامنی میں اپنی مثال آپ ہیں۔ کیا ہمیں اس کی سزا  
دی جا رہی ہے۔ ایسا کیوں ہے ابو؟ ہم نے کیا تصور کیا  
ہے؟ ہمیں اس دنیا میں لانے کے ذمے دار آپ خود  
ہیں پھر مجرم ہمیں کیوں ٹھہرایا گیا ہے۔ اسی فرسٹریشن  
کے نتائج میں نہ چاہتے ہوئے میں اپنے محلے کے ایک  
لڑکے سے والہانہ پیار کرنے لگی۔ مجھے علم تھا کہ آپ  
کسی قیمت پر میری شادی اس سے نہیں کریں گے  
کیونکہ وہ آپ کے معیار پر پورا اترنے سے کوسوں دور  
ہے۔ اس لیے آپ کی بے جا خواہشات کی کبھی نہ ختم  
ہونے والی اذیت نے مجھے کورٹ میرج کرنے پر  
مجبور کر دیا۔ مجھے امید ہے کہ میرا کیا ہوا یہ خوش آئند  
فیصلہ اور اٹھا ہوا بے باک قدم در شہوار اور مینو نے  
لیے بھی مشعل راہ ہوگا، انشاء اللہ۔ اگر آپ فرخ دلی  
سے مجھے معاف فرماتے ہیں تو میں اپنے جیون سماجی  
کے ہمراہ آپ کی دعائیں لینے کی خواست گار ہوں۔  
میرا خیال ہے کہ آپ نے میرے اس فیصلے سے عمر بھر  
کے لیے ایک بہترین سبق سیکھ لیا ہوگا کہ ہر بچہ اپنی  
الگ اور مفرد فطرت کا مالک ہوتا ہے۔ میں دوبارہ  
نہیں بن سکتی۔ اس کی طرح بزدل، ڈرپوک اور قربانی  
کا بکرا بننے کا مجھے قطعاً شوق نہیں۔ ہر عمارت کو تاج محل  
کا نام دینا مناسب ہے نہ ہی ہر بیسی سے موتی کی امید

رکھی جاسکتی ہے۔ ابو ایسی توقعات رکھنے والے لوگ  
عاقبت ناندیش اور ناقابل فہم گردانے جاتے ہیں۔  
پلیز میرے تحریر کردہ ایک، ایک لفظ پر دھیان دیجیے  
گا..... اور سوچیے گا کہ میں درست کہہ رہی ہوں کیا  
آپ اپنی جگہ پر سو فیصدی درست ہیں..... اگر میں  
غلطی پر ہوں تو مجھے انعام کرنا مت بھولے گا  
..... حاجت آپ کو اپنی منحوس شکل نہیں دکھاؤں گی اور  
انشاء اللہ بہت جلد اپنی آپنی اور باجو کو اس قید تہائی سے  
آزادی دلا کر انہیں دور بہت دور آکاش کی بلندیوں  
کی سیر کراؤں گی۔ جہاں ان کے ہم سفران کے ساتھ  
ہوں گے۔ ان کی زندگی ان کی پسند کے مطابق ہوگی  
اور جنت کا گہوارہ ان کا گھر ہوگا۔ اور ہم بھی پلٹ کر  
آپ کو دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کریں گی۔ نہ ہی  
آپ کی یاد میں تڑپ اور کسک ہمیں ستائے گی۔ ابو!  
ماں بہت یاد آئے گی۔ مجبور، بے بس اور مظلوم.....  
جس کی زندگی میں کبھی شہنائی نہیں ہوئی۔ میں آپ کو  
ایک بات سمجھانا چاہوں گی۔ جس سے انکار کرنا  
سراسر کفر ہے۔ نکاح کرنا سنت ہے۔ یہ ہمارے  
فرائض کے زمرے میں آتا ہے۔ میں نے آپ پر  
زیادتی نہیں کی، نہ ہی بے انصافی برتی ہے۔ جب  
آپ ہی والد ہونے کے ناتے اپنے فرائض کو پس  
رشت ڈالنے پر شاداں و فرحاں ہیں تو پھر ہمیں اپنی  
زندگی کے بارے میں فیصلہ کرنے کا حق پہنچتا ہے اور  
میں نہ ہی اپنے اس فیصلے پر آپ کے اور دنیا والوں  
کے سامنے نامد ہوں۔ پسندیدگی گناہ نہیں اور نہ ہی  
اس کی کوئی سزا جویز کی گئی ہے۔ بلکہ اس کی اجازت  
دئی گئی ہے۔ میرا شریک سفر میری تمام مجبوریوں سے  
باجر ہے۔ میں جس جگہ پر پاؤں رکھتی ہوں وہ وہاں  
میں محبت و عقیدت بھری نظریں بچھا دیتا ہے۔ میں  
نے جس شریک سفر کا انتخاب کیا ہے۔ وہ آئیڈیل تو  
نہیں ہو سکتا کیونکہ ایک انسان کے اندر تمام خوبیاں سا  
نہیں نکلتیں، پھر ہم اپنے من گھڑت دیوتا کی جتو میں  
اپنے جتو، وقت، کا، زار، کرا، کر، تر، پر، پلیز، الہ

میری باتوں پر غور ضرور کیجیے گا۔ دل پر گراں گزریں تو  
پنی غصے کی لٹاخی سے ان کا قلع قح کر دیجیے گا۔ مجھے  
دعاؤں میں یاد رکھیے گا اور آپنی اور باجو کے لیے فیصلہ  
کرنے میں دیر مت کیجیے گا۔ ورنہ وہ بھی مجبور ہو  
جائیں گی میری طرح۔ معاف فرمائیے گا۔

آپ کی بیٹی دردانہ! دردانہ کی خوددائی اور بے باکی پہلے ہی تھمک چکا تھا۔ رہی سہی کسر میل نے نکال دی۔ دونوں بھینس نفرت و حقارت سے دردانہ کو برا بھلا کہتے نہ سمجھتی تھیں۔ اب انہیں یقین ہو گیا تھا کہ دردانہ کی اس بے حیائی اور دیدہ دلیری کا پردہ فاش ہوتے ہی وہ بھی حقارت سے دیکھی جائیں گی اور یکسر اپنے ہاتھوں پر سہاگ کی مہندی کے رنگ کی موہوم سی امید بھی غارت ہو جائے گی۔ سپنوں کے شہزادے کا ہمیشہ کے لیے قتال ہو جائے گا کیونکہ معاشرے میں اس غلطی کی بخشش کی گنجائش ہی نہیں تھی۔

بھلا بامشریاسے پاتال میں تماشائے والے  
خاندان کی طرف کوئی عزت و درگاہ اٹھا کر انہیں سینے  
سے کیونکر لگائے گا جبکہ اس گھر کی عزت کی پاسداری  
رکھنے والی ہی ہے راہ رو ہو گئی۔ ایسی سوچیں شب و  
روز ان کے ذہن پر غالب رہیں۔

گھر کی فضا تو ساہلہ سال سے مکدر تھی۔ اب بھی چہروں پر اضطرابی اور پریشانی ہوید اٹھی۔ فوزیہ کے ہونٹوں پر آہوں کے ہمراہ بیٹی کے لیے بددعا نکلتی جبکہ یہ غیر متوقع عمل تھا۔ ملک صاحب کے ہونٹوں پر چپ کا تالا لگ گیا تھا۔ اپنے دفتر میں سر جھکائے سوچوں میں گم رہتے۔ گھر کی سبھی ہوئی فضا، بجھا سا ماحول اور چہروں پر بے بسی، چال ڈھال میں لاغرین کب تک پروے میں رہتا۔ خاندان والے درد ان کی غیر موجودگی کو محسوس کرتے ہوئے سرسری طور پر اس کا ذکر باتوں، باتوں میں کرنے سے باز نہ آتے۔ جنہیں فوزیہ مختصر سا جواب دے کر خود کو مطمئن کر لیتی۔ کہہ کر آج بھوکے ماسز اگئی ہوئی



کھلے ہیں۔“ درِ شہوار حیرت سے ابو کو دیکھتی چلی گئی۔ دونوں کی شادی کی تیاریاں روز بروز زور پکڑتی گئیں مگر گھر کی گہما گہمی اور رونق میں اداسی و مایوسی کی آمیزش چھپائے نہ چھپ رہی تھی۔ ملک صاحب نے دل پر پتھر کی سل رکھ کر بتائے بغیر دردانہ کو ای میل کر کے اپنے بدلے ہوئے خیالات کا اظہار کیا اور اس سے معافی کی عرضداشت پیش کر دی۔ چند گھنٹوں بعد دردانہ کی طرف سے جواب موصول ہوا تو وہ بے تابی سے پڑھنے لگے۔

”میرے پیارے ابو!

آئی ایم سوری، میں نے آپ کو ذہنی اغتیار میں مبتلا رکھا۔ میرے سپنوں کا شہزادہ آپ ہی منتخب کرنے کے حق دار ہیں کیونکہ آپ کا کیا ہوا فیصلہ نیک نیتی اور بغیر کسی طمع و لالچ کی بنیاد پر کیا جائے گا۔ میں بڑے تاجا جی کے گھر میں محفوظ ہاتھوں میں ہوں۔ آپ بے فکر ہیں، کل ہی آپ کے حضور واپس آ رہی ہوں۔ ایک بار پھر معافی کی التجا کرتی ہوں۔ گھر میں سب کو میری طرف سے مبارک باد پہنچا دیجیے گا۔ یو آر وری گریٹ ابو! آئی لو یو۔“ وہ ایک دم ٹھنک کر لرز گئی۔ وہ یہ انکشاف کرنا نہیں چاہتی تھی کہ تایا جان نے موسیٰ کے والد صاحب کو تمام حالات بتا کر وہاں دوبارہ جانے پر رضامند کیا تھا کیونکہ لو ہا گرم تھا۔ کامیابی کی امید تھی۔

ملک صاحب ایک دم سے اٹھے۔ آج چال میں قناتہ نہیں تھی۔ چہرے کی لکیروں میں تناؤ کے بجائے سکراہٹ کی شگفتگی تھی اور ہونٹوں کا تالاکھل گیا تھا۔ زبان شیرینی میں نہائی ہوئی تھی۔ بہنوں کا بس چلتا تو وہ دردانہ کے ہر قدم پر اپنی جان بچھا کر دیتیں اور ماں اس کے ہر لفظ پر سجدہ ریز ہو جاتیں کیونکہ اسی کی ہمت نے آج ابو کو قائل کر لیا تھا۔ گھر گل و گلزار بن چکا تھا۔

جونہی موسیٰ مع والد صاحب کے ان کے گھر پہنچا تو اپنی فطرت پر جبر کر کے ملک صاحب نے اشکبار آنکھوں اور دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ ہاتھ دے کر خیر کے لیے اٹھا دیے۔ فوزیہ کی آنکھوں سے سادوں بھادوں کی چمڑی اٹھ اٹھی تھی۔ نہ جانے یہ آنسو خوشی کے تھے یا دردانہ کی عدم موجودگی کے تھے۔

”فوزیہ، میمونہ کے رشتے کے بارے میں بھی میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ انہیں کل لالچ پر انوائٹ کر لو۔ دعائے خیر کہہ کر شادی کی تیاری شروع کرتے ہیں۔“ ملک صاحب نے مُردنی آواز میں کہا اور باہر نکل گئے۔

جب یہ مژدہ راجت درِ شہوار کے کانوں تک پہنچا تو خاموش اور صابر بیٹی بھاگنے کے انداز میں ابو کے کمرے میں آ گئی۔ اپنی بے ترتیب پھولی ہوئی سانسوں کو درست کرتے ہوئے گویا ہوئی۔

”ابو آج موسیٰ آپ کی توقعات پر پورا کیسے آرا؟ اس کے شجرہ نسب میں گڑ بڑ ہے۔ اس کا رنگ بھی گندہ ہے۔ تنخواہ بھی قلیل ہے۔ یہ معاملہ کرنا میرے لیے مشکل ہو گیا ہے کہ آپ نے اپنے معیار اپنے اصولوں اور قانون کی کسوٹی کیوں جج دی۔ ان لوگوں کو اتنا فانا کیسے قبول کر لیا؟“ اس کے ہر لفظ میں سانپ کے سنسنے کا زہر اور پچھوٹوں کے ڈنک کی اذیت نمایاں تھی۔ وہ نظریں جھکا کر پڑمردہ لہجے میں بولے۔

”کاش دردانہ کی زندگی تاریکیوں اور ذلتوں کے پردہ ہونے سے پہلے ہی میں سبق سیکھ جاتا۔ بیٹا! زندگی میں وقت شناسی کا ہتھیار کبھی ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ ورنہ انجام میرے جیسا ہوگا۔ خوشی، خوشی سنے گھر جانے کی تیاری کرو۔ میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔ اور کل ہی میمونہ کی دعائے خیر سے سکدوش ہونے کا فیصلہ بھی میں نے کر لیا ہے۔ کاش دردانہ واپس آ جائے اپنے شریک حیات کے ہمراہ۔۔۔۔۔ میرے گھر کے دروازے اس کے لیے

دکھولا نہ رہے اور پاگل پن کے مرض میں مبتلا ہو کر بھونکتا چلا جائے تو مالک اسے اپنی مرضی اور خواہش کے مطابق خاموش کر داتا ہے۔۔۔ اس کی بیماری کا علاج نہیں کروا سکتا۔“ انہوں نے ذومعنی جواب عمدہ طریقے سے دے کر ان کی طرف غور سے دیکھا۔

”ملک صاحب اپنی فطرت کے ہاتھوں مجبور ہیں۔ وہ اپنی جبلت کے پیش نظر اپنے باؤں کے ضمیر کی آواز سن کر اسے راہِ راست پر لانا ہی نہیں چاہتے۔ ضمیر کو بھی اپنے مطابق ہی ڈھال لیا ہے انہوں نے۔۔۔۔۔ ورنہ وہ دل کے برے نہیں ہیں۔ بیٹیوں پر جان بچھا کر کرتے ہیں۔ شاید اس لیے اتنے شکی مزاج اور بے ہمت ہو گئے ہیں کہ فیصلہ کرنا ان کے بس میں نہیں رہا۔“ وہ مزید یہ کہہ کر خاموش ہو گئیں۔ اگلے لمحے ہی ملک صاحب نگاہیں نیچی کیے ڈرائنگ روم میں وارد ہوئے۔ فوزیہ سر تا پا لرز اٹھیں۔ موسیٰ کی ماں بھی تیزی سے سیدھی ہو کر بیٹھ گئیں۔ شاید وہ ان کی گفتگو سن کر نہ جانے کون سی قیامت سمیٹ اندر آئے ہیں۔

”بہن جی! بھائی صاحب کو بھی ساتھ ہی لے آئیں۔ آج ہی دعائے خیر کی رسم ادا ہو جاتی۔“ وہ صوفے پر بیٹھ کر نہایت عاجزی و انکساری سے بولے۔ فوزیہ نے سمار فلادای قلعے کو حیرت و جس سے دیکھا۔ آہ اولاد بھی کتنی ظالم اور کبھی نہ ختم ہونے والی آزمائش کا نام ہے کہ اوچے شعلے اور غیرت مند والدین کو بھی ناکوں چنے چو ادے۔ بل بھر میں ان کی اعلیٰ وارفع ہستی کو ریزہ ریزہ کر کے دھرتی کا حصہ بنا ڈالے۔ آج سماں ایسا ہی تھا۔

”بہت بہت شکریہ بھائی صاحب۔ ہم زندگی بھر آپ کے احسان مند رہیں گے۔ میں ابھی اور اسی وقت باپ اور بھائی کو بلا لیتی ہوں۔ نیکی کے کام میں دیری خوشیوں کو نگل لیتی ہے۔“ وہ مسرت آمیز لہجے میں بولیں۔

ہے مگر کب تک جھوٹ کا سہارا لیا جاتا۔ ایک دن تو حقیقت کھل کر سامنے آنے کے خدشے پر بھی دہل جاتے کہ آنے والا وقت نہ جانے اپنے ساتھ کتنے ہی طوفان لے کر وارد ہونے کو ہے۔

☆☆☆

”فوزیہ بہن ہم آپ کی چوکھٹ اس وقت تک نہیں چھوڑیں گے جب تک درِ شہوار کی آپ حامی نہیں بھر لیتیں۔ اب ہمارا اوڑھنا بچھونا یہاں ہی ہے۔“ موسیٰ کی ماں نے فوزیہ کے بار بار انکار پر حتیٰ اور آخری فیصلہ سنا دیا اور ڈرائنگ روم میں ہی صوفے پر ناگئیں پھیلا کر بیٹھ گئیں۔

”زبردستی اور زور آوری سے تو رشتے ہونے سے رہے۔ بے شک آپ کے تمام دلائل ٹھوس اور حقیقت پر مبنی ہیں مگر میں مجبور ہوں۔ آپ کو میرے شوہر کے موڈ کا اندازہ تو ہے ہی۔ اپنی بات پر اُڑ جالیں تو پھر خاموشی ہی بہتر ہے۔ آپ خود جہاندیدہ اور عقل مند خاتون ہیں۔ آپ کو علم تو خوب ہوگا کہ شوہر رخت مزاج کا ہو تو پھر بیوی کی دال نہیں گنتی۔ اس رشتے سے انکار کے بعد اقرار کرنا ان کی فطرت کے خلاف ہے۔ اس لیے آپ ضد اور زبردستی سے دور رہیں تو بہتر ہوگا۔ میں خواہ مخواہ میں چکی کے دو پاؤں میں پس جاؤں گی۔ مجھ پر رحم کیجیے اور تشریف لے جائیں۔“ وہ سہمے ہوئے لہجے میں بولیں۔

”جب شیر دھاڑنے لگے اور بے قابو ہو جائے تو اسے رام کرنے کے لیے اس کے آگے گوشت کا انبار لگا دیتے ہیں۔ آپ نے اپنی ازدواجی زندگی میں یہ تک تو سیکھا نہیں۔ بیٹیوں کو کیا درس دیا ہوگا فوزیہ بہن۔ ایسی ہی باؤں کی بیٹیاں زندگی، دکھوں کی آماجگاہ میں گزارتی ہیں۔“ وہ ذومعنی بات سے انہیں اور بے بس کر گئیں۔

”آپ نے بالکل درست فرمایا مگر ایسا بھی تو ہے کہ جب گھر کی چوکھٹ کا کتا ہی جان و مال کا





جذبہ حب الوطنی سے معمور شخصیت کو مساجدِ حبیب سے پرکھنا

اپنے پاکیزہ قارئین سے مخاطب ہونا بہت اچھا لگ رہا ہے۔ میں اپنے قارئین کی مشکوہوں کا انہوں نے کبھی مجھے فراموش نہیں کیا۔ میں لکھوں یا نہ لکھوں انجم انصار

ساجدہ آپنی کی سب سے بڑی خصوصیت یا وصف جو مجھے حد درجہ محسوس ہوا وہ یہ کہ انہیں عزت و مان سب کو اچھی طرح دینا اور نبھانا آتا ہے۔ یہ لفظوں سے صرف کھینچتی نہیں بلکہ ان کی تحریر میں عملی اظہار محسوس ہوتا ہے۔ ان کے انداز تحریر میں گہرائی و گیرائی ہے جیسی وہ تحریر قاری کے دل پر اثر کرتی ہے۔ قارئین میری اس بات سے اتفاق کریں گے کہ کسی بھی تحریر کو پڑھ کر اس کے سخن میں کھوجانا اور دل میں انقلابی کیفیت محسوس ہونا ہی اس تحریر کی

عزیز قارئین! آج ہمارے ساتھ ایک ایسی پیاری، پُر خلوص اور شفیق ہستی موجود ہیں کہ جن کے بارے میں یہ مصرعہ کہ آپ اپنا تعارف ہوا بہار کی ہے..... سو فیصد پورا اترتا ہے۔

ساجدہ حبیب صاحبہ دنیائے ادب کا ایک بڑا معتبر نام ہیں۔ یہ وہ روشن ستارہ ہیں کہ جن کی روشنی





آرمی آرڈیننس لیڈر کلب کے زیر اہتمام جشن بہاراں کے موقع پر (دائیں سے) ساجدہ حبیب، مسز اویس،  
حطیہ حسن خان، فاطمہ سلیم اعوان، یاسمین سلیم اور شازیہ جلال کے ساتھ

افسانہ نہ لکھ سکی کیونکہ یہ حادثہ واقعی اتنا شدید تھا کہ بقول شخصے ”برسوں تک اس کے اثرات باقی رہے۔“ نومبر 1970ء میں تھرڈ ایئر میں داخلے کے بعد میں نے باقاعدہ طور پر اپنا پہلا افسانہ سہارا کے نام سے لکھا چونکہ اس افسانے کا ہیرو فوجی افسر تھا۔ اسی بنا پر اسے پسندیدگی کی سند عطا کی گئی۔ 1965ء کی جنگ کے بعد کسی بھی تحریر میں فوجی افسر کا کردار اس تحریر کو اوج ثریا تک پہنچانے میں بڑا اہم کردار ادا کرتا تھا۔ لہذا سہارا کو پسند کیا گیا۔ گورنمنٹ کالج میر پور آزاد کشمیر میں اکنامکس کے استاد جناب اکرم طاہر صاحب شاعری بھی فرماتے تھے۔ آزاد کشمیر ریڈیو مظفر آباد کے توسط سے میرا ایک مضمون ان کی نظروں کے سامنے آیا پھر ان کی نظر کرم سہارا پر پڑی۔ استاد محترم لاہور سے شائع ہونے والے اس زمانے کے مشہور رسالے ”ماہنامہ حور لاہور“ میں ایک مستقل سلسلہ ”کیرئیر وومن“ کے نام سے لکھا کرتے تھے۔ بالکمال مہربانی انہوں نے ”سہارا“ کو ششواہی بخشی اور اپنے توسط سے یہ تحریر ”ماہنامہ حور لاہور“ میں شائع ہونے کے لیے ارسال کی گئی۔ یہ افسانہ شائع ہوا تو میری

نڈمت کی گئی۔ اس شور شرابے کو سن کر استانی صاحبہ تقریباً لائیں۔ اب کا پی ان کے ہاتھ میں تھی اور اس عظیم تحریر کی مصنفہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ محترمہ عظمت یزدانی صاحبہ نے اس تحریر پر ایک نظر ڈالی صفحات پلٹ کر آخر تک پڑھا اور پھر فرمایا۔ ”تم لکھ تو سکتی ہو لیکن ابھی قبل از وقت ہے۔“ اس کے بعد انہوں نے مسودے کے فقط چار کونے کیے اور میرے ہاتھ میں تھما دیے۔ یعنی کہ ایک شہید راہ الفت کو انہوں نے واقعی شہید کر دیا اردو کا پیریدہ ختم ہوا تو ہماری آنکھوں سے رواں آنسوؤں کی جھری نے تمام جماعت کو باقاعدہ طور پر ہم سے تعزیت کرنے پر مجبور کر دیا۔ ہماری ایک دانش ور کلاس فیلو نے ہمیں تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ”کوئی بات نہیں ساجدہ، تم اسے دوبارہ لکھ لیتا۔“ اور ہم نے زندگی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ ”اسی تحریریں بھلا روز بروز کہاں لکھی جاسکتی ہیں۔“ پیاری نزہت یہ خوب صورت یادیں میں اپنے قارئین سے شیئر کر رہی ہوں۔ امید ہے جواب کی طوالت تمہیں پریشان نہیں کرے گی۔ (ہرگز نہیں آئی) بہر حال..... اس حادثے کے بعد کالج لائف تک کوئی

ادب سے قطع نظر میں نے نثر نگاری میں مضامین اور افسانہ لکھنے کی کوشش سے اپنے اس سفر کی شروعات کی۔ اس ضمن میں پہلا افسانہ جماعت نہم میں پہنچنے ہی لکھ ڈالا کیونکہ جماعت ہشتم تک اردو کی استانی صاحبہ محترمہ عظمت یزدانی کی طرف سے اس قسم کی تحریروں پر بڑی زبردست پابندی عائد تھی۔ جس میں ہیرو، ہیروئن کے روایتی تصور کے ساتھ عشق جیسی خرافات پر مبنی تحریریں قلمبند کی جائیں۔ چنانچہ جماعت نہم میں پہنچنے کے بعد جب ہم نے نئی پریم چند کا ”غم نہ داری بڑ بھڑ“ پڑھ لیا اور جناب غلام عباس کے افسانے ”اوور کوٹ“ سے متاثر ہوئے تو ایک ایسی تحریر لکھی۔ جس میں ہیروئن بے چاری تو غلام سہاج کے دکھ سہہ کر قبل از وقت اللہ کو پیاری ہو جاتی ہے اور ہیرو صاحب زمانے کے بے کراں ستم سہنے کے بعد جب خود کشی کرنے کا سوچتے ہیں تو پیچھے کے ساتھ ہی باندھنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے عین وقت پران کی سابقہ محبوبہ اچانک نمودار ہو کر ان کی اس کوشش کو ناکام بنا دیتی ہیں پھر دونوں شادی کر لیتے ہیں اور ہیروئن پر تین حرف بھیج کر نئی خوشی رہنے لگتے ہیں۔ اس افسانے کا نام ”ایک شہید راہ الفت“ رکھا گیا۔ مجھے یاد ہے کہ آن واحد میں اس افسانے کی خبر ایک حقیقت بن کر تمام جماعت میں پھیل گئی۔ میری کلاس فیلو زینہ بیٹ عرف بھولو پھلو ان نے اپنے بھاری وزن کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے کاپی میرے ہاتھ سے چھینی اور استانی صاحبہ کی جماعت سے غیر حاضری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی بھاری آواز میں یہ تحریر ساری جماعت کو سنائی۔ احباب کا خیال تھا کہ چونکہ اس افسانے کا مرکزی خیال اس زمانے کے مشہور اداکار وحید مراد اور اداکارہ زیبا بیگم کی ایک سپر ہٹ فلم سے ملتا جلتا تھا لہذا ہیروئن کی وفات پر تو آنسو بہائے گئے لیکن ہیرو کی وفاتی پر یعنی کہ خود کشی جیسے فعل سے ہٹ کر شادی جیسی حماقت کرنے پر خوب

..... کے توسط سے بہنوں کی محفل میں میرا ذکر خیر کسی نہ کسی حوالے سے ضرور ہوتا ہے۔ اس امر کے لیے میں آپ سب کی بے حد شکر گزار ہوں۔ پاکیزہ ❖..... آپ نے اپنے قارئین کو اپنی تازہ تحریروں سے محروم کیوں کر دیا۔ اس کی وجہ کوئی اور مصروفیت ہے؟ ساجدہ حبیب ❖..... شکر الحمد للہ کہ اپنے ادبی کیریئر کے ابتدائی تیس سالوں میں میری تحریریں باقاعدگی سے چھپتی رہیں۔ دراصل میں ایک آمد کی کیفیت کے تحت لکھتی ہوں۔ آمد نہ ہو تو باوجود کوشش کے کبھی نہیں لکھ سکتی۔ اب یہی دیکھ لیں کہ وردی، وعدہ اور وفا میں کے بعد تین سال کے عرصے میں میری کوئی تحریر سامنے نہیں آئی حالانکہ گزشتہ سال ماہ اپریل میں سیاحین کے محاذ پر رونما ہونے والے سانحے کے بارے میں ساری صورت حال ذہن میں تو گردش کرتی رہتی ہے لیکن میں ابھی تک اسے احاطہ تحریر میں نہیں لاسکی۔ اس لیے کہ فقط اس سانحے کے بارے میں نہیں..... بلکہ وطن عزیز میں برپا ہر ایک قیامت صغریٰ کو دیکھ کر ہر محبت وطن پاکستانی کی طرح میرا دل بھی خون کے آنسو روتا ہے اور اب کوئی اور مصروفیت تو کوئی خاص نہیں بس عجیب سا ڈپریشن ضرور طاری رہتا ہے کہ خدا جانے اس ارض پاک کو کس کی نظر لگ گئی؟ اور یہ کہ..... کیا کبھی ان حالات میں بہتری آئے گی؟ یہی سوچ کر جب قلم اٹھاتی ہوں تو عجیب وحشت سی ہوتی ہے۔ بہر حال ان دنوں طبیعت قدرے بہتر ہے۔ انشاء اللہ کوشش کروں گی کہ میرے قارئین میری تحریروں سے محروم نہ رہیں۔ پاکیزہ ❖..... آپ کے قلمی سفر کا آغاز کب اور کیسے ہوا؟ اگرچہ بیشتر قارئین آگاہ ہوں گے مگر پھر بھی ہم جاننا چاہیں گے۔ ساجدہ حبیب ❖..... شعور کی منزل پر پہنچنے ہی لکھنے اور پڑھنے کا شوق بیدار ہو چکا تھا۔ بچوں کے





ساجدہ حبیب اپنی والدہ محترمہ کے ساتھ

کے بارے میں بتائیں..... کوئی خوشگوار یادیں؟  
ساجدہ حبیب:..... یہ دلکش یادیں تو زندگی کا  
سرماہ ہیں، میں ان سنہری دنوں کی یادوں کو ”پاکیزہ“  
کے ایک سلسلے ”مجھے یاد ہے سب ذرا“ کے لیے لکھ  
چکی ہوں۔ ان خوب صورت یادوں کو حد تحریر میں  
لانے کے لیے ایک دفتر درکار ہے۔ اب تم نے یاد دلا  
ہی دیا ہے تو یادوں کے اس سرمائے میں سے چند  
یادیں قارئین کے لیے نکال ہی لاتی ہوں۔  
میں یقیناً بڑی خوش قسمت تھی کہ رشتے داری کے  
ہر سنگ میل پر مجھے بے حد پیار نصیب ہوا۔ لاشعور سے  
شعور تک کے سارے لحاظ لاعلمی میں گزر گئے۔ میرا  
بچپن بہت ہی خوب صورت تھا۔ یہ سن ساٹھ کا عشرہ تھا  
اور میرے اسکول کا زمانہ..... گورنمنٹ گرلز ہائی اسکول  
مظفر آباد آزاد کشمیر کا وہ ماحول اور بیٹا ہوا ہر ایک منظر  
ابھی تک میری یادوں میں زندہ و تابندہ ہے۔ جہاں  
میں نے اپنی تعلیم کے ابتدائی مدارج طے کیے۔ وہ  
بڑی وضع داری کا زمانہ تھا۔ تمام اساتذہ کرام پر خلوص،  
مہربان اور لگن سے کام کرنے والے لوگ تھے۔ یہ  
ہماری قوم کی وہ قابل احترام نسل تھی۔ جس کی قربانیاں  
ایک ملک کو بنانے اور ایک ملت کو ایک پلیٹ فارم تلے

پاکیزہ..... چالیس سال  
قبل کی لڑکی کی سوچ اور آج کی لڑکی  
کی سوچ میں کیا تقابل کریں گی؟  
ساجدہ حبیب:..... یہ  
ایک طویل عرصہ ہے، پیاری  
نہت، چالیس سالوں میں چار  
نسلیں جوان ہو جاتی ہیں تو پھر  
سوچ میں ایک واضح فرق بھلا  
کیوں کر نہیں ہوگا؟ ربی بات  
بنیادی سوچ کی تو آج کے دور  
میں لڑکیوں کی وہ بے تحاشی بہت  
کھلتی ہے۔ جسے ”بولڈ ٹین“ کا  
نام دیا گیا ہے۔ اسی ”بولڈ ٹین“ کی وجہ سے لڑکیوں  
میں قوت برداشت اور سمجھوتے کی کمی ہے۔ ہمارے  
دور میں سماج معاشرہ، رسم رواج اور مشرقیت کے علاوہ  
بزرگوں کے فیصلوں کو زندگی میں آگے اور اپنی ذات کو  
بہت پیچھے رکھا جاتا تھا جبکہ آج کل ایسا نہیں ہے۔ اب  
اس ضمن میں نئی نسل کے دلائل ماشاء اللہ اتنے وزنی  
ہو گئے کہ بزرگوں کے لیے ماسوائے خاموشی اختیار  
کرنے کے اور کوئی چارہ نہیں ہوتا۔ چالیس سال پہلے  
کے لوگ اپنے بزرگوں کی مرضی سے جیتے تھے آج کے  
دور میں اپنی مرضی سے جیتنے کو ترجیح دی جاتی ہے۔ بس  
یہ فرق ہے۔  
پاکیزہ:..... شادی سے پہلے کا زمانہ کیا تھا؟  
یا شادی کے بعد اس زمانے کی یادوں نے بھی ستایا؟  
ساجدہ حبیب:..... شادی سے پہلے کا زمانہ  
بہت حد شاد تھا۔ کوئی ڈتے داری نہیں تھی۔ بے فکری  
اور تھا اور سکون تھا۔ شادی کے بعد اس دور کی  
ساری باتیں ہمیشہ میرے ساتھ رہیں اور یادیں تو ہمیشہ ستاتی  
رہیں۔ میں بنیادی طور پر ناظمیہ کی مریض ہوں اور  
کچھ اپنے ماضی میں زندہ رہتی ہوں۔  
پاکیزہ:..... کچھ اپنے اسکول اور کالج لائف

ادبی حلقوں میں پزیرائی ملی اور پھر دوستی، محبت اور  
خلوص کا یہ سرائیم انصار اور نہت اصغر کی معیت میں  
محترمہ عذرا رسول کے ساتھ آج تک جاری ہے۔  
پاکیزہ:..... آج کل ڈائجسٹ کی رائٹرز ٹی وی  
چینل پر بہت پزیرائی حاصل کر رہی ہیں آپ کو یہ سب  
کیا لگتا ہے؟  
ساجدہ حبیب:..... ظاہر ہے کہ مجھے اس  
امر کی بہت خوشی ہے۔ نہت میں نے وہ دور دیکھا  
ہے جبکہ ڈائجسٹ میں لکھنے والوں کی ادبی حیثیت کو  
تسلیم ہی نہیں کیا جاتا تھا۔  
(اور شاید اب بھی نہیں) ہماری ان لکھاری  
بہنوں نے ادب کی اس اجارہ داری کو توڑنے کے  
لیے بے حد محنت کی ہے۔ وہ پرنٹ میڈیا سے نکل کر  
الیکٹرانک میڈیا تک آگئی ہیں اور ماشاء اللہ ان کی  
تحریریں ڈرامائی تشکیل کے بعد معاشرے پر مثبت  
اثرات مرتب کر رہی ہیں۔ بلاشبہ یہ ایک بہترین  
کامیابی ہے۔  
پاکیزہ:..... پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا  
جدا ہیں تو کسی ناول کی ڈرامائی تشکیل میں ناول کا اصل  
حسن برقرار رہتا ہے؟  
ساجدہ حبیب:..... جی نہیں، اکثر اوقات تو  
کہانی اور کرداروں کو کچھ اس طرح منسج کر دیا جاتا ہے  
کہ ناول کا اصل حسن تو کیا..... کہانی ہی باقی نہیں رہتی  
بلکہ کچھ کا کچھ بن جاتا ہے۔  
پاکیزہ:..... آج کل انٹرنیٹ اور موبائل کلچر  
ہے اس سے معاشرے پر کیا اثرات مرتب ہوئے ہیں؟  
ساجدہ حبیب:..... ساری قوم بخوبی جانتی  
ہے کہ سائنس کی اس ترقی نے ہمارے معاشرے کو  
تیزی کی کس حد تک پہنچا دیا ہے چونکہ ہمیں ہر چیز کو  
مثبت کے بجائے منفی انداز میں لینے کی عادت ہے لہذا  
اس کلچر نے بھی ہمارا جو حشر کیا ہے وہ سب کے سامنے  
ہے۔

خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ ”حور“ کے کئی شمارے خرید  
کر احباب کی لمبی چوڑی فہرست میں بنائے گئے۔ اس  
موقع پر میرے بھائی راجا فاروق افضل نے دادی  
جان (مرحومہ) کے سامنے جو تبصرہ کیا وہ تاریخ کے  
صفحات میں ہمیشہ محفوظ رہے گا۔ انہوں نے فرمایا۔  
”بے جی کوئی دیگ فیک پکوار کر بانٹیں، آپ کی لاڈلی  
دنیا نے ادب کا آفتاب بن کر چمکنے والی ہے۔“ پھر یہ  
سلسلہ کچھ اس طرح چل نکلا کہ ”حور“ میں ”چمن کالہو“  
شائع ہوا۔ ان ہی دنوں پاکیزہ کا اجرا ہوا تو میں نے  
اپنے کالج میگزین ”سروش“ میں شائع شدہ افسانہ  
”چننا“ کے نام سے ”پاکیزہ“ میں شائع دیا۔ یہ افسانہ  
چھپ گیا لیکن میں اس سے بے خبر رہی۔ دوستوں  
نے مطلع کیا تو اس شمارے کا حصول ایک نامکن امر بن  
گیا کہ یہ شمارہ تو ہاتھوں ہاتھ بک چکا تھا۔ بڑی مشکل  
سے یہ شمارہ ملا۔ اس کے بعد کی تحریر ”کون جیتا کون  
ہارا“ کے نام سے پاکیزہ میں شائع ہوئی تو ایک سبیلی  
نے فون پر بتایا کہ بھی تمہارا افسانہ چھپا تو ضرور ہے  
مگر میرے بچے اس رسالے کا حشر نشر کر چکے ہیں۔ یہ  
1978ء کی بات ہے۔ ان دنوں ہماری پوسٹنگ  
پشاور میں تھی۔ منزیجر (اب بریگیڈیئر ریٹائرڈ) وقار  
نوید کے توسط سے ایک مہربان علم دوست شخصیت تک  
ہماری ٹوٹی بھوٹی اور تقریباً بے معنی تحریروں کی خبر پہنچی تو  
انہوں نے توجہ فرمائی اور ماہنامہ دو شیزہ کراچی کے  
لیے ہماری ایک تحریر ”دو پٹا“ کے نام سے ارسال  
فرمائی گئی۔ محترمہ رخسانہ سہام مرزا اور رعنا فاروقی نے  
اسے شرف قبولیت بخشا۔ محترمہ جناب سہام مرزا نے  
راہنمائی فرمائی۔ رعنا فاروقی نے بلاشبہ اپنے قیمتی  
مشوروں سے نوازا اور بلاشبہ میری تحریروں پر محنت  
کی۔ ستمبر 1979ء میں حبیب صاحب کی پوسٹنگ ملیر  
کینٹ کراچی ہو گئی۔ یہاں ادبی رفقاء کی شفقت  
نصیب ہوئی۔ پاکیزہ کی محترمہ صفیہ ملک اور خواتین  
ڈائجسٹ کی امت الصبور نے باکمال مہربانی میری ہر  
تحریر کو نمایاں جگہ دی۔ ”دو شیزہ رائٹر ایوارڈ“ ملنے پر





میرے ناولٹ ”وردی“ وعدہ اور وفا میں“ کے لیے تقریباً رومانی منتقد کی گئی اور سانحہ مشرقی پاکستان کے حوالے سے تحریر کردہ اس ناولٹ کی تعریف کی گئی کہ برسوں بعد جب یہ سانحہ جانثار کرداروں کے روپ میں سامنے آیا تو یہاں تک کہا گیا کہ یہ تحریر بہتے آنسوؤں کے ساتھ پڑھی گئی ہے۔ پیاری نریت یہ ایک اجتماعی دکھ ہے، جس کے زخم ابھی تک مندمل

ساجدہ حبیب محترمہ جیلانی بانو اور محترمہ ہاجرہ مسرور کے ساتھ

منظر کی تفصیل لکھنے کا بھی خیال آیا؟

ساجدہ حبیب ✨..... کہانی جس خطہ زمین کے حوالے سے بھی لکھی جاتی ہے، اسی کے بارے میں منظر نگاری بھی تحریر کے عمل میں لائی جاتی ہے۔ میری زیادہ تر کہانیاں وادی جنت نظیر کشمیر کے حوالے سے ہیں، لہذا ان میں اسی پس منظر کی عکاسی نظر آتی ہے۔ 1993ء میں انگلینڈ سے واپسی پر میں نے ایک ناولٹ ”جائے پناہ“ کے نام سے لکھا تھا جو پاکیزہ اکتوبر 1994ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ اگرچہ اس کہانی کی بنیاد تو تحریک آزادی کشمیر پر مبنی تھی لیکن یہ انگلینڈ کے پس منظر میں لکھی گئی تھی۔ لہذا تمام تر منظر نگاری بھی اسی پس منظر کے حوالے سے تحریر کی گئی تھی۔ پاکیزہ ✨..... آپ کی تحریروں کی نمایاں خصوصیت جذبہ حب الوطنی میں ڈوبے جذبات و خیالات ہیں جو آپ کو ہم عصور میں ممتاز مقام دیتے ہیں۔ اس کے بارے میں کیا کہیں گی؟

ساجدہ حبیب ✨..... یقیناً حب الوطنی کا یہ درد، اپنے وطن عزیز سے محبت اور اپنے پیارے قاعدہ کی اس عظیم الشان قوم کی اس زبوں حالی کا یہ دکھ میں نے کچھ زیادہ ہی پالا ہے۔ شاید یہ اپنے اپنے احساس کی

نہیں ہوئے۔ اس کے علاوہ ”دل درگاہ اور دیا“ کو بھی پزیرائی حاصل ہوئی۔ پاکیزہ ✨..... کیا ادبی تحریروں میں مرد حضرات اور خواتین لکھاری کے اسلوب نگارش میں فرق ہوتا ہے؟ ساجدہ حبیب ✨..... جی ہاں، بالکل، ایک نمایاں اور بنیادی فرق ہوتا ہے چونکہ سوچ ہی مختلف ہوتی ہے لہذا تحریر میں اس کا عکس نمایاں نظر آتا ہے۔ پاکیزہ ✨..... ایک اچھے قلم کار کے لیے کیا، کیا اوصاف ضروری ہیں؟

ساجدہ حبیب ✨..... کوئی بھی تحریر خواہ کسی بھی معاشرے، مذہب یا ملک میں لکھی جائے وہ ہر مصنف کی ذہنی سوچ کی عکاسی کرتی ہے۔ انسانی سوچ ہی وہ بنیادی نقطہ ہے جس پر تحریر کے غلط یا پھر صحیح ہونے کا دارومدار ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ایک اچھے قلم کار کے لیے سوچ کی بلندی، اعلیٰ ظرفی، حب الوطنی اور معاشرے میں رواداری کے ساتھ زندگی گزارنے کے اوصاف بہت ضروری ہیں۔

پاکیزہ ✨..... آپ کی تحریروں میں پُر کیف منظر نگاری خصوصاً وادی کشمیر کے حوالے سے بہت خوب ہوتی ہے۔ کبھی کہانی کے تناظر میں بیرون ملک کے

ہر ایک سطر گویا دل میں اتر جانے والی ہوتی۔ شوکت رانا ”حور“ میں لکھتیں۔ ان کا افسانہ ”جنگی“ آج تک میرے ذہن پر نقش ہے۔ میرے لکھنے کا محرک ایک غریب عورت کے بے تحاشا بہتے ہوئے آنسو تھے جو میرے قلم کی سیاہی بن گئے۔ بچپن بڑا ظالم بچہ بھی ہے۔ بہت جلد پرواز کر کے آسمان کے دھندلوں میں کھوجاتا ہے مگر گھرے انٹ نقوش چھوڑ جاتا ہے۔ دنیائے ادب نے مجھے احسانات کے بوجھ تلے دبا رکھا ہے۔ میں بھی یہ قرض ادا نہ کر سکوں گی کہ اس دنیا نے مجھے ایک نام دیا، ایک پہچان دی۔ دوستوں کا ایک وسیع حلقہ دیا اور وہ قارئین عنایت فرمائے جو میری تحریروں کے منتظر رہتے ہیں۔

پاکیزہ ✨..... قلم و فرط اس کے اس سفر میں چھوٹی بڑی کیا مشکلات پیش آئیں۔

ساجدہ حبیب ✨..... کوئی خاص مشکلات پیش نہیں آئیں بلکہ فضل تعالیٰ۔ اسباب بنتے چلے گئے اور پھر ڈائجسٹ کی دنیا میں ایک نمایاں مقام اور قارئین کا ایک باشعور و محبت وطن حلقہ میسر آیا۔ جنہوں نے حب الوطنی پر مبنی میری تحریروں اور بطور خاص کشمیر کے حوالے سے لکھے گئے ناولٹ کو بے حد سراہا۔

پاکیزہ ✨..... جب کسی تحریر کے حوالے سے قارئین سراہتے ہیں تو کیا لگتا ہے؟

ساجدہ حبیب ✨..... مجھے بے حد خوشی ہوتی ہے اور بقول شمس لکھنے کا عزم جوان ہو جاتا ہے۔ یہ تحریریں میری ذات اور زندگی کی پہچان ہیں لہذا یہ امر میرے لیے باعث مسرت ہے۔

پاکیزہ ✨..... اب تو آپ کے افسانے اور ناولٹ کتابی شکل میں آرہے ہیں، ان مجموعوں کی اشاعت پر کیا رد عمل سامنے آیا؟

ساجدہ حبیب ✨..... الحمد للہ..... بہت اچھا رد عمل دیکھنے کو ملا..... دوست احباب اور قارئین نے بے حد پزیرائی بخشی، آرمی ایئرڈ فیض لیڈز کلب میں

جمع کرنے کے سلسلے میں کام آئیں۔ کلاس روم کی اپنی دنیا بے حد حسین ہوا کرتی۔ پڑھائی سے زیادہ شراوتوں پر دھیان رہتا۔ ہمیشہ سے اردو میں میرے نمبر بہت اچھے آتے۔ میری ان یادوں میں سن انیس سو پینٹھ اور سن اکہتر کی یادوں کے کئی کردار ابھی تک زندہ ہیں۔ میرے آباؤ اجداد کا آبائی پیشہ ساہ گری تھا۔ چنانچہ فوج کی زندگی سے آج تک گہرا تعلق رہا۔ فوج آپ کو ہمیشہ ایک بہترین زندگی عطا کرتی ہے۔ نظم و ضبط، تناسب و ترتیب اور قرینہ و سلیقہ..... زندگی گزارنے کے یہ سب انداز اس ادارے کی دین ہیں۔ میرے دادا جان محترم نے ہماری تعلیم و تربیت میں ان تمام چیزوں کو روا رکھا اور حب الوطنی کا درس گویا کہ گھٹی میں ڈالا۔ اپنے بچپن میں ہم نے کشمیر کی سر زمین پر کھڑے ہو کر پاک سر زمین کے مقدس ترانے سے اپنی ہرج کا آغاز کیا۔ ہم آج بھی الحاق پاکستان کے حامی ہیں۔ چنانچہ جب جنگ کا آغاز ہوا تو گویا یہ ہماری عملی زندگی کا پہلا جہاد تھا۔ جبکہ ساری قوم ایک محاذ پر تھی۔ آج جبکہ میں اپنی نئی نسل کے بے حد آسودہ حالات اور معمولات دیکھتی ہوں تو دعا کرتی ہوں کہ وطن سلامت رہے اور جنگ کبھی نہ ہو۔ کالج اور یونیورسٹی کا دور ہنگامہ خیز رہا۔ آج کے دور کے بہت سے اہم نام ہمارے ہم کتب تھے۔ آل پاکستان مباحثے، مشاعرے اور دیگر غیر نصابی سرگرمیاں جاری رہتیں۔ اخبار کی ہر خبر کو پڑھنا میرا مشغلہ تھا۔ میں ابرہیم جلیس اور ابن انشا کے کالم ”وغیرہ وغیرہ“ اور آپ سے کیا پردہ“ کی کٹنگ محفوظ رکھا کرتی تھی۔ حور اور زیب النسا باقاعدگی سے پڑھتا..... حور میں لکھنے والی مصنفات اکثر رومانی تحریریں لکھتیں۔ قدرت اللہ شہاب سیارہ ڈائجسٹ میں لکھا کرتے۔ اشفاق احمد اور بانو قدسیہ کی تحریر کے بغیر کوئی پُرچاکم نہ ہو پاتا۔ ادبی افق پر بشری رحمان کا نام طلوع ہوا۔ ان کا انداز بیان خوب صورت اور



مصروفیات ہیں؟

سادہ حبیب ✨..... وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ زندگی کی روشیں بدلتی رہتی ہے، ہمارے ساتھ دوست احباب، مہربان اور قدردانوں کا ایک وسیع حلقہ ہے۔ جس نے ہمیں کبھی تنہا نہیں چھوڑا۔ ہمہ وقت سب سے رابطہ رہتا ہے۔ مطالعہ میری زندگی کی اولین ترویج ہے۔ میرے قارئین مجھے یاد رکھتے ہیں مجھے اس بات کی بہت خوشی ہے۔ یہاں کی سوشل لائف میں ”کیریشن لیڈز کلب“ اور ”انٹرنیشنل لیڈز کلب“ کی بہت اہمیت ہے۔ فوج سے ریٹائرمنٹ کے بعد رت کریم نے پرانے دوستوں کے علاوہ نئے قدر دانوں کا ایک گروپ عنایت فرمایا ہے۔ ماشاء اللہ میرے بھائیوں کی - اولاد مجھے مصروف رکھتی ہے۔ گزشتہ سال فقط گیارہ ماہ کے عرصے میں ہمارے ہاں دو بچوں کی شادیاں ہوئیں لہذا پہلے عمر آرمی انٹرنیشنل لیڈز کلب کے ایک فنکشن میں فاروق اور پھر عالیہ سعید کی شادی کے سلسلے میں بے حد مصروفیت رہی۔ البتہ ایک خلش ضرور ہے چکن رکھتی ہے۔ یہی کہ گزشتہ دور کی نسبت اب میں زیادہ لکھ نہیں سکتی اور کبھی کبھار یہ احساس ضرور ہوتا ہے کہ میں وقت ضائع کر رہی ہوں۔

پاکیزہ ✨..... آپ اپنے اس سفر سے کس حد تک مطمئن ہیں؟

سادہ حبیب ✨..... شکر الحمد للہ کہ میں بہت مطمئن ہوں گزشتہ تین دہائیوں میں بہت کچھ لکھا جو سراہا بھی گیا۔ تعریف کا عمل لکھاری کو مطمئن رکھتا ہے۔ مجھے اپنے ادبی کیریئر میں تنقید کی نسبت تعریف



حالات جس انتشار و کرب اور وحشت کا سامنا کر رہے ہیں۔ ہمارے راہنماؤں کی سوچیں جوڑنے کے بجائے توڑنے کے سفر پر گامزن ہیں۔ اس خطرناک صورت حال میں ضرورت اس چیز کی ہے کہ حب الوطنی کا درس دیتے ہوئے نئی نسل کو تحریر کے ذریعے ان بزرگوں کی سوچ سے روشناس کرایا جائے جنہوں نے اپنے عظیم کارناموں سے ایک تاریخ مرتب کی اور عظیم الشان قربانیاں دے کر اس عظیم وطن کی تخلیق کی۔ ہمیں آزادی عظیمی نعمت عطا کی۔ ہمیں اس تاریخ کو از سر نو مرتب کر کے ایک پیغام کی صورت میں پہنچانا چاہیے۔

پاکیزہ ✨..... آپ نے بہت کچھ لکھا، اب کیا لکھنے کی خواہش ہے؟

سادہ حبیب ✨..... جیسا کہ میں پہلے ہی عرض کر چکی ہوں کہ میں کسی خواہش پر نہیں بلکہ آمد کی ایک خاص کیفیت کے تحت لکھتی ہوں چونکہ یہ ملاجرت قدرت کی طرف سے ایک خاص عطیہ ہے، مستقبل میں صحت سلامت رہی اور آمد کا یہ سلسلہ جاری رہا تو انشاء اللہ ان ہی موضوعات پر لکھوں گی جو میری پہچان ہیں یعنی کہ کشمیر، مشرقی پاکستان اور پاک آرمی۔

پاکیزہ ✨..... کالم نگاری کی جانب آنے کا کبھی خیال آیا؟

سادہ حبیب ✨..... جی نہیں، میں نے ایسا کبھی نہیں سوچا حالانکہ کالم نگاری ایک پسندیدہ صنف ضرور ہے لیکن الحمد للہ میں اپنی ہی فیلڈ میں مطمئن ہوں۔

پاکیزہ ✨..... آج کل آپ کی کیا روشیں اور

ڈائجسٹ کی رائٹر ہونے کے حوالے سے ہم لوگ زبردست تنقید کا شکار تھے۔ ہماری ادبی حیثیت کو قطعی طور پر تسلیم نہ کرتے ہوئے کبھی سوچا ہی نہیں گیا کہ یہ ڈائجسٹ اور ان میں شائع شدہ ادب کہاں کہاں تک پہنچتا ہے دیگر دوسرے عوامل کی طرح ہمارا ادب بھی عوام اور خواص میں بٹا ہوا تھا۔ جب ڈائجسٹ کی دنیا سامنے آئی اور اس توسط سے یہ ادب عوام تک پہنچا تو اس اجارہ داری میں دراڑ پڑنے لگی۔ عوام میں پڑھنے کا شعور اجاگر ہوا تو اس خاص طبقے کو بڑی ٹھیں پڑیں۔ آج بھی آپ دیکھیں تو صاف نظر آئے گا کہ خواتین لکھاری کے ڈرامے یا مقصد ہونے کے باوجود خواہ مخواہ تنقید کا شکار ہیں اور یہ کہا جا رہا ہے کہ ”ڈائجسٹوں میں لکھنے والے ڈراما نگار بن گئے ہیں۔“ حالانکہ ان خواتین رائٹرز کے ڈراموں کو جو پزیرائی حاصل ہوئی وہ سب کے سامنے ہے۔

پاکیزہ ✨..... آج کے اس الیکٹرانک دور میں کتابوں کی اہمیت اور ضرورت کس حد تک ہے؟

سادہ حبیب ✨..... اس الیکٹرانک دور میں دنیا تو اگرچہ ایک، گلوبل ویج بن چکی ہے لیکن اب نظریں کتاب کے بجائے پنڈاچ کی اسکرین پر مرکوز ہو چکی ہیں۔ ہمارے اس دور کے بچے کتاب جیسی اہم چیز کی اہمیت سے نہ تو آشنا ہیں اور نہ ہی انہیں اس امر کا احساس دلانے کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے۔ شاید اب مطالعے کا دور گزر چکا۔ کتاب سے کمپیوٹر تک کے اس سفر میں ہم ادبی ورثے سے محروم تو ہو چکے لیکن خدا جانے ہمیں اس ورثے کے کھوجانے کا قطعی کوئی تم کیوں نہیں ہے۔ آج ہم انٹرنیٹ کی دنیا میں خوش ہیں اور یہ جانے بغیر مطمئن ہیں کہ ہم تنزل کے کس دور کی طرف جا رہے ہیں۔

پاکیزہ ✨..... آپ کے نزدیک مختلف رسائل میں شائع ہونے والی تحریروں کوئی زمانہ کیا ہونا چاہیے؟

سادہ حبیب ✨..... آج ہم جس تنزلی کا شکار ہیں، ہمارا معاشرہ جس بے چارے چکا ہے ہمارے ملکی

بات ہے اور میرے دادا جان محترم کی اس تربیت کا نتیجہ بھی..... جنہوں نے اس دور کے باقی بزرگوں کی طرح حب الوطنی کا درس ہمیں کھٹی میں دیا۔ یہی وجہ ہے کہ بچپن سے اس وقت تک ہماری سوچ کا محور اپنا وطن اور صرف وطن ہے اور یہی سوچ اور احساس ہماری تحریروں پر بھی محیط ہے۔

پاکیزہ ✨..... آپ کے موضوعات اگرچہ متنوع مگر گہر اور مادر وطن کی مٹی اور اس سے محبت کے گرد گھومتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے گھریلو مسائل اور صرف عورت کے گرد گھومتی کہانیاں کیا آپ کو اٹریکٹ نہیں کرتیں؟

سادہ حبیب ✨..... پیاری نزہت، میں بھی اسی معاشرے کا ایک حصہ ہوں، جہاں عورت کا وجود ایک مظلوم کردار کے طور پر اکثر سامنے آتا ہے اور عورت کا استحصال کرتے ہوئے اس کے بنیادی حقوق تک چھین لیے جاتے ہیں۔ میں نے اس معاشرتی رویے پر بھی قلم اٹھایا ہے۔ چھوٹے چھوٹے گھریلو مسائل اور صرف عورت کے گرد گھومتی کہانیاں اٹریکٹ تو ضرور کرتی ہیں لیکن ہر تحریر میں فقط منصف نازک کی مظلومیت کا روٹنا ہی روتے رہنا مجھے پسند نہیں۔ آج کی عورت نسبتاً آزاد اور باشعور ہے۔ وہ اپنے حق کے لیے لڑنا جانتی ہے اور اپنے گھریلو مسائل کو بخوبی حل کرنا بھی جانتی ہے۔ لہذا کسی بھی تحریر میں عورت کو ایک انتہائی مظلوم کردار میں پیش کرنا کچھ زیادہ مناسب عمل نہیں ہے۔

پاکیزہ ✨..... ایک زمانے میں ڈائجسٹ کی رائٹرز کو اہل ادب کے ایک خاص طبقے کی جانب سے ٹولفت کا بورڈ بٹا تھا اور آج انہی رائٹرز کے ڈرامے ہر طبقہ فکر سے واہ واہ سمیٹ رہے ہیں آپ کی اس بارے میں کیا رائے ہے؟

سادہ حبیب ✨..... ہمارے ہاں زندگی کے دیگر شعبوں کی طرح ملکی ادب پر بھی اجارہ داری کا غلبہ ہمیشہ رہا۔ میں نے وہ زمانہ دیکھا ہے جب فقط کی بھی

ڈائجسٹ کی رائٹر ہونے کے حوالے سے ہم لوگ زبردست تنقید کا شکار تھے۔ ہماری ادبی حیثیت کو قطعی طور پر تسلیم نہ کرتے ہوئے کبھی سوچا ہی نہیں گیا کہ یہ ڈائجسٹ اور ان میں شائع شدہ ادب کہاں کہاں تک پہنچتا ہے دیگر دوسرے عوامل کی طرح ہمارا ادب بھی عوام اور خواص میں بٹا ہوا تھا۔ جب ڈائجسٹ کی دنیا سامنے آئی اور اس توسط سے یہ ادب عوام تک پہنچا تو اس اجارہ داری میں دراڑ پڑنے لگی۔ عوام میں پڑھنے کا شعور اجاگر ہوا تو اس خاص طبقے کو بڑی ٹھیں پڑیں۔ آج بھی آپ دیکھیں تو صاف نظر آئے گا کہ خواتین لکھاری کے ڈرامے یا مقصد ہونے کے باوجود خواہ مخواہ تنقید کا شکار ہیں اور یہ کہا جا رہا ہے کہ ”ڈائجسٹوں میں لکھنے والے ڈراما نگار بن گئے ہیں۔“ حالانکہ ان خواتین رائٹرز کے ڈراموں کو جو پزیرائی حاصل ہوئی وہ سب کے سامنے ہے۔

پاکیزہ ✨..... آج کے اس الیکٹرانک دور میں کتابوں کی اہمیت اور ضرورت کس حد تک ہے؟

سادہ حبیب ✨..... اس الیکٹرانک دور میں دنیا تو اگرچہ ایک، گلوبل ویج بن چکی ہے لیکن اب نظریں کتاب کے بجائے پنڈاچ کی اسکرین پر مرکوز ہو چکی ہیں۔ ہمارے اس دور کے بچے کتاب جیسی اہم چیز کی اہمیت سے نہ تو آشنا ہیں اور نہ ہی انہیں اس امر کا احساس دلانے کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے۔ شاید اب مطالعے کا دور گزر چکا۔ کتاب سے کمپیوٹر تک کے اس سفر میں ہم ادبی ورثے سے محروم تو ہو چکے لیکن خدا جانے ہمیں اس ورثے کے کھوجانے کا قطعی کوئی تم کیوں نہیں ہے۔ آج ہم انٹرنیٹ کی دنیا میں خوش ہیں اور یہ جانے بغیر مطمئن ہیں کہ ہم تنزل کے کس دور کی طرف جا رہے ہیں۔

پاکیزہ ✨..... آپ کے نزدیک مختلف رسائل میں شائع ہونے والی تحریروں کوئی زمانہ کیا ہونا چاہیے؟

سادہ حبیب ✨..... آج ہم جس تنزلی کا شکار ہیں، ہمارا معاشرہ جس بے چارے چکا ہے ہمارے ملکی

بات ہے اور میرے دادا جان محترم کی اس تربیت کا نتیجہ بھی..... جنہوں نے اس دور کے باقی بزرگوں کی طرح حب الوطنی کا درس ہمیں کھٹی میں دیا۔ یہی وجہ ہے کہ بچپن سے اس وقت تک ہماری سوچ کا محور اپنا وطن اور صرف وطن ہے اور یہی سوچ اور احساس ہماری تحریروں پر بھی محیط ہے۔

پاکیزہ ✨..... آپ کے موضوعات اگرچہ متنوع مگر گہر اور مادر وطن کی مٹی اور اس سے محبت کے گرد گھومتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے گھریلو مسائل اور صرف عورت کے گرد گھومتی کہانیاں کیا آپ کو اٹریکٹ نہیں کرتیں؟

سادہ حبیب ✨..... پیاری نزہت، میں بھی اسی معاشرے کا ایک حصہ ہوں، جہاں عورت کا وجود ایک مظلوم کردار کے طور پر اکثر سامنے آتا ہے اور عورت کا استحصال کرتے ہوئے اس کے بنیادی حقوق تک چھین لیے جاتے ہیں۔ میں نے اس معاشرتی رویے پر بھی قلم اٹھایا ہے۔ چھوٹے چھوٹے گھریلو مسائل اور صرف عورت کے گرد گھومتی کہانیاں اٹریکٹ تو ضرور کرتی ہیں لیکن ہر تحریر میں فقط منصف نازک کی مظلومیت کا روٹنا ہی روتے رہنا مجھے پسند نہیں۔ آج کی عورت نسبتاً آزاد اور باشعور ہے۔ وہ اپنے حق کے لیے لڑنا جانتی ہے اور اپنے گھریلو مسائل کو بخوبی حل کرنا بھی جانتی ہے۔ لہذا کسی بھی تحریر میں عورت کو ایک انتہائی مظلوم کردار میں پیش کرنا کچھ زیادہ مناسب عمل نہیں ہے۔

پاکیزہ ✨..... ایک زمانے میں ڈائجسٹ کی رائٹرز کو اہل ادب کے ایک خاص طبقے کی جانب سے ٹولفت کا بورڈ بٹا تھا اور آج انہی رائٹرز کے ڈرامے ہر طبقہ فکر سے واہ واہ سمیٹ رہے ہیں آپ کی اس بارے میں کیا رائے ہے؟

سادہ حبیب ✨..... ہمارے ہاں زندگی کے دیگر شعبوں کی طرح ملکی ادب پر بھی اجارہ داری کا غلبہ ہمیشہ رہا۔ میں نے وہ زمانہ دیکھا ہے جب فقط کی بھی



سمجھوتوں کے ساتھ جینا میری فطرت ہے۔  
 پاکیزہ ✧..... کیا اچھی افسانہ نگاری سیکھی جاسکتی ہے؟  
 ساجدہ حبیب ✧..... میرے خیال کے مطابق یہ صنف ایک عطیہ خداوندی ہے۔ آپ ایک اسکول آف تھاٹ کے مطابق عمل تو کر سکتے ہیں سیکھنا..... بہر حال مشکل ہے۔  
 پاکیزہ ✧..... قارئین پاکیزہ کے لیے اپنی نئی تحریر کب دے رہی ہیں؟  
 ساجدہ حبیب ✧..... انشاء اللہ بہت جلد..... ان ہی صفحات میں ایک ناولٹ کے ساتھ حاضری دوں گی۔  
 پاکیزہ ✧..... سیر و تقریر کے لیے کہاں جانا پسند ہے؟  
 ساجدہ حبیب ✧..... اپنی جائے پیدائش کوہ مری، سوات اور کشمیر۔  
 پاکیزہ ✧..... شعر و شاعری سے کس حد تک دلچسپی ہے؟ کوئی پسندیدہ شاعر اور پسندیدہ شاعر؟  
 ساجدہ حبیب ✧..... مجھے شاعری پڑھنا پسند ہے، پسندیدہ شعروں میں سر فہرست ہے۔  
 شہر خموشاں دیکھ کے جی دنگ رہ گیا ہر سر کے سرہانے فقط سنگ رہ گیا ☆☆☆  
 انگارے تھے عذاب آشنائی کی انگلیٹھی میں مگر گوشہ نشین سمجھا گوہر و گل رکھے ہیں ☆☆☆  
 زندگی جبر مسلسل کی طرح کاٹی ہے جانے کس جرم کی پانی ہے سزا یاد نہیں ساغر صدیقی  
 مجھے ذاتی طور پر ساغر صدیقی، احمد فراز، ناصر کاظمی اور امجد اسلام امجد کا کلام پسند ہے۔  
 پاکیزہ ✧..... ہر نئی لکھنے والی فوراً ساجدہ حبیب جیسی رائٹر بننا چاہتی ہے جبکہ یہ ایک طویل سفر ہے۔  
 اس بارے میں آپ کیا کہیں گی؟

ادارے سے وابستہ ہوئے چالیس سال کا طویل عرصہ گزر گیا اس ادارے سے وابستہ ہر دور کے افراد نے بے حد عزت افزائی بخشی اور شروعات ہی ہے حوصلہ افزائی کا عمل جاری رکھا۔ اس طرز عمل نے ہی رائٹرز کے قلم کو روانی عطا فرمائی اور ڈائجسٹ کی دنیا میں کئی نام آئے۔ صفیہ ملک جب تک ادارے میں موجود رہیں انہوں نے بڑی بہنوں جیسا احترام بخشا۔ انجم انصار اور نزہت اصغر کے ساتھ محترمہ عذرا رسول صاحبہ نے اپنے کردار اور عمل سے ہمیں اپنائے رکھا اتنے طویل عرصے تک اپنوں جیسی محبت اور خلوص عنایت فرمانا واقعی بڑی اعلیٰ ظرفی کی مثال ہے۔  
 پاکیزہ ✧..... آپ ایک حد درجہ حساس دل و دماغ رکھتی ہیں تو ایسے میں کون سا طرز عمل ناگوار خاطر گزارتا ہے؟  
 ساجدہ حبیب ✧..... اپنے ارد گرد بسنے والوں اور اپنے پیاروں پر نظر کرنا بے حد باعث تکلیف ثابت ہوتا ہے۔ دوسرا عمل ہے غیبت کرنا، جو ہم اکثر اوقات کسی بھی قسم کا تکلف روار کھے بغیر کرتے ہیں آج کل کے دور میں انہوں کے رویے بے حد پریشان کرنے لگے ہیں بعض اوقات انہوں کی بے درخی اور غلط طرز عمل دل و دماغ میں ایک قیامت برپا کیے رکھتا ہے۔  
 پاکیزہ ✧..... ایک فوجی شوہر کے ساتھ زندگی گزارنا کیسا لگتا ہے؟  
 ساجدہ حبیب ✧..... شکر الحمد للہ کہ فوج آپ کو ایک شاندار اور بہترین زندگی گزارنے کا موقع فراہم کرتی ہے۔ گزشتہ چالیس برس قدرے سکون اور امن کے ساتھ گزرے اور اب رب کریم کی مہربانی سے حال بھی بہت اچھا جا رہا ہے چونکہ میری تربیت ایک فوجی ماحول میں ہوئی لہذا ڈسپلن اور پابندی وقت جیسی عادات ہماری سرشت میں شامل تھیں۔ شادی کے بعد ایک فوجی شوہر کی عادات قبول کرنے میں مجھے کوئی خاص مشکل پیش نہیں آئی۔ اس لیے کہ زندگی میں

میں کیا اظہار خیال کریں گی؟  
 ساجدہ حبیب ✧..... پیاری نزہت اس ضمن میں کیا عرض کروں، آج جو صورت حال ہے وہ ہر ذی شعور پاکستانی مسلمان کو خون کے آنسوؤں میں ڈبو کر رہا ہے اور قابل احترام قائد اعظم کے پاکستان کا یہ حشر کس نے کیا؟ وہ کون سی نادیدہ قوتیں ہیں جو ہمیں آپس میں لڑا رہی ہیں؟ اسلامی جمہوریہ پاکستان میں مذہب کے نام پر دہشت گردی کا کھیل کن قوتوں کے اشارے پر کھیلنا جا رہا ہے؟ آج کے پاکستان میں پاکستانی قوم متحد کیوں نہیں ہے؟ اقوام عالم کی برادری میں ہم نفرت کی نشانی کیوں بن چکے ہیں؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کا جواب شاید کسی کے پاس نہیں، ہم وہی قوم ہیں ناں کہ سن ساٹھ کی دہائی میں جن کے پاس کورین ماہرین ملکی ترقی کا راستہ پوچھنے کے لیے تشریف لائے تھے آج کو یہاں کہاں ہے اور ہم کہاں ہیں؟ ہم نصف صدی سے زائد کا سفر طے کرنے کے بعد زوال پزیر ہیں، ہمارا روشنیوں کا شہر تاریکی کا شکار ہو چکا لاء اینڈ آرڈر کی چوہین گڑ بچکی، قوم کی زندگی سے سکون رخصت ہو گیا اور ہم ایک خوف و دہشت کی فضا میں جی رہے ہیں، ہمیں سننے پاکستان کے خواب دکھائے جا رہے ہیں لیکن سوال تو یہ ہے کہ قائد اعظم کے پاکستان کا کیا بنے گا..... آج ہم لوڈ شیڈنگ کا عذاب جھیلنے ہوئے کسی خضر راہ کی تلاش میں جو ہمیں چراغوں کی روشنی میں ہی سہی کوئی سیدھی سمت تو دکھائے مگر..... افسوس کہ ہر طرف مایوسی ہے ایسے میں رب العزت سے التجا ہے کہ وہ ہماری خطاؤں کو معاف فرما کر ہمارے حال پر رحم و کرم فرمائے۔ (آمین ثم آمین)  
 پاکیزہ ✧..... اگر پاکیزہ کے حوالے سے بات کی جائے تو بتائیں کہ اس ادارے سے وابستگی کیسی رہی؟  
 ساجدہ حبیب ✧..... ماہنامہ پاکیزہ کہراچی سے میری وابستگی کوئی دو چار دن کی بات نہیں بلکہ اس

کی نعمت زیادہ نصیب ہوئی لہذا میں مطمئن ہوں۔  
 پاکیزہ ✧..... حبیب صاحب کی طرف سے آپ کو لکھنے میں تعاون ملا؟  
 ساجدہ حبیب ✧..... جی ہاں، بلاشبہ یہ ان کے تعاون ہی کا نتیجہ ہے کہ وطن عزیز کے ایک حساس ادارے، سانحہ مشرقی پاکستان اور تحریک آزادی کشمیر جیسے اہم موضوعات پر میری تحریروں کو پسندیدگی کی سند ملی۔ میں نے ان موضوعات پر باقاعدہ ریسرچ ورک کرنے کے بعد قلم اٹھایا اور اس ضمن میں حبیب صاحب کا تعاون ہمیشہ شامل حال رہا۔  
 پاکیزہ ✧..... رشتے دار یاں نبھانا کیسا لگتا ہے؟  
 ساجدہ حبیب ✧..... رشتے دار یاں نبھانا بہت پسند ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں نہایت عاجزی اور محبت کے ساتھ تمام رشتے دار یاں اچھے طرز عمل سے نبھائی ہیں لیکن آج نفسا نفسی کے اس دور میں بعض رشتے داروں کے رویے جب تکلیف پہنچاتے ہیں تو بہت دکھ ہوتا ہے۔  
 پاکیزہ ✧..... کس سوچ کے حامل لوگوں۔  
 جلدی گھل جاتی ہیں؟  
 ساجدہ حبیب ✧..... اپنی معاشرتی زندگی میں بہت جلدی بے تکلفی میری فطرت کا حصہ ہے۔ میں محبت وطن اور دین دار سوچ کے حامل لوگوں سے جلدی گھل جاتی ہوں۔  
 پاکیزہ ✧..... کیا عمر کے اس حصے میں بچوں اور نوجوان نسل سے دوستی ہے یا پھر اپنی بزرگی کا رعب رکھتی ہیں؟  
 ساجدہ حبیب ✧..... میں عرض کر چکی ہوں کہ بے تکلفی میری فطرت کا حصہ ہے تو پھر پیاری نزہت کہاں کی بزرگی اور کیسا رعب.....؟ عمر کے اس حصے میں میری نوجوان لڑکیوں اور بچوں سے دوستی کا ایک بہت پیارا رشتہ قائم ہے۔  
 پاکیزہ ✧..... آج کے ملکی حالات کے بارے



پاکیزہ۔۔۔۔۔ آج کل لکھنے والی لڑکیاں اپنی پہلی تحریر کو ہی شاعرانہ قرار دیتی ہیں، آپ کی اس بارے میں کیا رائے ہے؟

ساجدہ حبیب۔۔۔۔۔ نئی لکھنے والی بچیاں اور نئی نسل کی اکثریت اگر مائنڈ نہ کرے تو میں بھد ادب عرض کروں گی کہ آج کل کی بچیوں میں خود پسندی کا عنصر بہت زیادہ پایا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی پہلی تحریر کے ذریعے ہی اونچ تریاں تک پہنچ جاتا ہے۔

پاکیزہ۔۔۔۔۔ اپنے قارئین کے نام کوئی بات، کوئی پیغام، کوئی نصیحت؟

ساجدہ حبیب: فقط یہی کہ محبت وطن پیئے تاکہ وقت اور زندگی آپ کی اپنی رہے۔

☆☆☆

پیارے دوستوں! امید ہے ساجدہ حبیب سے چڑچڑھٹ مگر ساتھ ساتھ کھری اور حقیقت پر مبنی سچ گفتگو آپ کو بے حد پسند آئی ہوگی۔ ساجدہ آئی کا از حد شکریہ کہ انہوں نے ہماری اور تمام قارئین کی فرمائش کو عزت بخشی اور ڈپریشن اور استحال کی کیفیت کے باوجود بھرپور باتیں ہماری ذوق بصارت و بصیرت کی نذر کیں تو قارئین میری طرح آپ بھی یقیناً ساجدہ آپ کی نئی تحریر کا آج سے ہی انتظار شروع کر دیں گے۔ اس دعا کے ساتھ کہ پروردگار وطن عزیز کے ان مخلص اور محبت باسیوں کو وطن کے سائے میں سلامت رکھے تاکہ ہم ان ہستیوں کے افکار سے مستفید ہوتے رہیں۔ چھوٹی سی بات کے ساتھ آپ سے اجازت کہ خوش رہنا اور خوش رکھنا سیکھیں۔ اللہ حافظ!

ان صفحات کے لیے آپ کی قیمتی آرا کا انتظار رہے گا۔ جنوں کے راستے یوں تو کٹھن سے لگتے ہیں مگر یہ راستے منزل تک نکلتے ہیں زمانہ ہر قدم پہ راہ روکنے والا عزائم پختہ ہوں جن کے وہ کب بھٹکتے ہیں

☆☆☆

کی شخصیت بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہوا؟

ساجدہ حبیب۔۔۔۔۔ میرے محترم دادا جان جیسا کہ پہلے بھی بتا چکی ہوں ان کی شخصیت، ان کی تربیت نے میری زندگی بنانے میں نہایت اہم کردار ادا کیا۔ میں روز فجر میں نماز کے بعد ان کی بخشش کے لیے خصوصی دعا کرتی ہوں اور شکر ادا کرتی ہوں کہ ان کی اعلیٰ تربیت کے باعث میں اس مقام پر پہنچی ہوں۔

پاکیزہ۔۔۔۔۔ آج کے بچے پاکستانی تاریخی کرداروں سے واقف نہیں لیکن غیر ملکی اداکاروں سے بخوبی واقف ہیں، اس بارے میں آپ کیا کہیں گی؟

ساجدہ حبیب۔۔۔۔۔ میرا خیال ہے کہ اس ضمن میں ہماری نئی نسل کچھ زیادہ قصور وار نہیں، بحیثیت بزرگوں کے کیا ہم نے انہیں اس آگہی کا شعور بخشا؟ ہم نے انہیں اپنی تاریخ سے آگاہ کیا؟ یا پھر ہم نے انہیں غیر ملکی کچر کی طرف راغب ہونے سے روکا؟ جب ہم لوگ خود ہی بزرگی کو دوستی کی سطح پر لے آئے تو پھر یہی کچھ ہونا تھا جو ہمارا ہے۔ نزہت، حال ہی میں پاکستان کے ایک قومی ہیرو ڈاکٹر کوڈور (ریٹائرڈ) ایم، ایم عالم کا وصال ہوا یہ وہ عظیم ہستی تھی جس نے 1965ء کی جنگ میں فقط چند سیکنڈز کے اندر دشمن کے پانچ جہاز مار گرائے ہم اس قومی ہیرو کی رحلت پر رنجیدہ تھے اور کسی نوجوان کی جانب سے کیا جانے والا یہ سوال کہ یہ ایم ایم عالم کون تھے؟ اس وقت مجھے اپنے آپ سے عنایت محسوس ہوئی لیکن پھر وہیں اپنے بھی نوجوان تھے کہ جنہیں معلوم تھا کہ یہ ہستی کون تھی۔ ہمیں ہمارے بزرگوں نے بتایا تھا کہ پاکستان کیسے وجود میں آیا اور کن جلیل القدر ہستیوں نے اس میں اہم کردار ادا کیا۔ جناب حضرت قائد اعظم کی زندگی کے ایک ایک گوشے سے روشناس کرایا مگر آفسوں آج ہمارے پاس اتنا وقت ہی نہیں کہ ہم اپنی نئی نسل کو پاکستانی تاریخی کرداروں سے آگاہ کر سکیں۔

بھی کبھار میں خود اپنا محاسبہ بھی کر لیتا چاہیے۔

یہ ہے کہ موسیقی روح کی غذا تھی۔ لہذا باقاعدہ سنی جاتی تھی۔ اب عارفانہ کلام پسند ہے لیکن کبھی کبھار یا پھر دوران سفر سنتی ہوں، پرانے گلوکار تو اب بھی تنگ ذہن پر چھائے ہوئے ہیں، اس دور کی موسیقی کو فراق اموش نہیں کیا جاسکتا۔ اللہ یا کہ بخشش نصیب فرمائے (آمین) بہتے جھرنوں جیسی آواز کی مالک مہناز بہت پسند تھیں۔

پاکیزہ۔۔۔۔۔ کیا فلمیں دیکھنے کا کبھی شوق رہا، کوئی تازہ فلم جو دیکھی ہو؟

ساجدہ حبیب۔۔۔۔۔ زمانہ طالب علمی میں یہ شوق عرش معلیٰ سے بس کچھ ہی اودھ واقع تھا۔ اس زمانے کے اداکار محمد علی، زینا بیگم، وحید مراد اور صبیحہ خانم سنٹوش کے نہ صرف یہ کہ ہم لوگ باجماعت عاشق تھے بلکہ ان پر جان قربان کرنے کا عزم لے کر سینما ہاؤس میں تشریف لے جایا کرتے تھے لیکن مشکل یہ تھی کہ بزرگوں کی طرف سے فعل کو انجام دینے کی قطعی اجازت نہیں تھی لہذا اس بارے میں سہیلیوں کے ساتھ باقاعدہ مشاورت کے بعد پروگرام بننے کی صورت میں ہمیں گھر سے تیز گھنٹے کی غیر حاضری کے لیے بعض اوقات کسی کے گھر میلاد یا قرآن خوانی کروانی پڑتی تھی پھر بھی اگر اجازت نہ ملنے کا مشکل مرحلہ درپیش آتا تو ہمیں اپنی کسی بھی کلاس فیلو کی قریبی رشتہ دار کو خواہ فوت کردانا پڑتا یا پھر بتایا جاتا کہ بس اب وہ اپنے آخری دموں پر ہیں اور ہمیں بلارہی ہیں کہ جلدی آکر اپنا دیدار کروا جائیں ورنہ پچھتاوے ساری زندگی پیچھا کرتے رہیں گے۔ پیاری نزہت یہ تو سہرے دنوں کی خوشگوار یادیں ہیں، اب تو وقت کے ساتھ ساتھ یہ شوق بھی ختم ہو گیا۔ چند برس قبل کمر پٹن لیڈر کلب کے زیر اہتمام فلم اسٹارشان اور ازراش کی فلم تیرے پیار میں دکھائی گئی تھی۔ یہ فلم کشمیر کے موضوع پر تھی اور اس کے بارے میں پیاری بہن مسز صدف خالد کا خیال یہ تھا کہ اس فلم کا اصل نام بارڈروں یا رحمت ہونا چاہیے تھا۔

پاکیزہ۔۔۔۔۔ کوئی ایسی شخصیت جس نے آپ

ساجدہ حبیب۔۔۔۔۔ زندگی میں ایک طویل سفر طے کرنے کے بعد ہی منزل نصیب ہوئی ہے، نئی لکھنے والی بچیوں کو یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ اس مقام تک پہنچنے کے لیے برسوں کی محنت اور ریاضت درکار ہوتی ہے۔ اس سفر کو ایک ہی جست میں طے نہیں کیا جاسکتا۔

پاکیزہ۔۔۔۔۔ امور خانہ داری سے دل چسپی کس حد تک رہی؟

ساجدہ حبیب۔۔۔۔۔ بس صرف اس حد تک کہ گھر بہت زیادہ صاف ستھرا ہو، ہر چیز سلیقے اور قرینے سے اپنی جگہ رہے، کچن لاش چمکا ہوا نظر آئے۔ باقی رہے کچن سے متعلق امور خانہ داری تو میرے لیے دنیا کی سب سے بڑی خوش خبری یہ ہے کہ ”آئیے جی کھانا تیار ہے۔“

پاکیزہ۔۔۔۔۔ سنا ہے کہ افواج پاکستان سے متعلق جگمگات بہت اچھی بیکنگ کرتی ہیں، مہمان نواز ہوتی ہیں، آپ اپنے مہمانوں کی خاطر کے بارے میں کس بات کا خیال رکھتی ہیں؟

ساجدہ حبیب۔۔۔۔۔ پیاری نزہت آپ نے بالکل صحیح سنا ہے، ہمارے ہاں گھریلو امور کی تربیت میں لیڈر کلب ایک انسٹیٹیوٹ کا فریضہ انجام دیتے ہیں، جہاں کوکنگ، بیکنگ، فلاؤر اریج منٹ اور سیونگ جیسے اہم کاموں کی سکھلائی کے لیے نہ صرف یہ کہ باقاعدہ کلاسز ہوتی ہیں بلکہ اکثر اوقات میٹنگ میں باقاعدہ demonstration دی جاتی ہے بے شک ہماری خواتین مہمان نواز ہوتی ہیں اب رہی بات میری مہمان نوازی کی تو اس ضمن میں آپ انجم انصار اور عظمیٰ آفاق سے پوچھ لیجیے۔ میری زندگی کے اس رخ کی وہ بہترین چشم دید گواہ ہیں۔

پاکیزہ۔۔۔۔۔ موسیقی سننا کس حد تک پسند ہے؟ اور کون سا گلوکار پسند ہے؟

ساجدہ حبیب۔۔۔۔۔ بیٹے برسوں کی بات



## سنگرم کا اہتمام

شائستہ زین

جہاں کیلنڈر کی تاریخ بدلتی ہے وہاں ہمارا سارا گھر روشن ہو جاتا ہے اور پھر یک کاٹا جاتا ہے مجھے تحائف دیے جاتے ہیں۔ یہ اہتمام میرے بچے اپنے والد محترم کے ساتھ مل کر کرتے ہیں۔ اس کے



راجیلہ فردوس

علاوہ ہر سالگرہ پر میرے لیے کچھ نہ کچھ سر پرانز ہوتا ہے۔ چھوٹا بیٹا میرے لیے کمپیوٹر سے پیارے پیارے کارڈ نکالتا ہے۔ ایک سالگرہ پر اس نے کارڈ پر میری تصویر بنائی تھی۔ میری بیٹی نے میرے لیے نظم کہہ کر اپنے جذبات کا اظہار کیا تھا۔ میرے بچوں کی یہ تخلیقی کاوشیں میرے لیے بیش قیمت سوغات ہیں۔ میرے شوہر مجھے میری پسند کا ریفیوم دیتے ہیں۔ سالگرہ کی صبح ان کی جانب سے سالگرہ کا خاص الخاص تحفہ ملتا ہے یعنی ناشتا جو وہ مجھے ہر سالگرہ پر خود اپنے ہاتھ سے بنا کر دیتے ہیں۔ اس کے بعد میری کسمپرسی

چھوٹی چھوٹی خوشیاں زندگی کو کتنا حسین بنا دیتی ہیں اس کا احساس اس وقت شدت سے ہوتا ہے جب ہمارے قریبی عزیز، دوست احباب سب بلا کسی غرض کے ہماری خوشی میں شریک ہو کر اس کا لطف دو بالا کر دیتے ہیں۔ نوعیت خواہ کوئی بھی ہو خوشی بغیر اہتمام کے منائی نہیں جاسکتی، بالخصوص اپنے جنم دن کی خوشی تو ہر ایک کو ہونی ہے بس اس خوشی کے اظہار کے طریقے مختلف ہوتے ہیں۔ اپنے جنم دن کے موقع پر بعض لوگ بہت اہتمام کرتے ہیں، بعض بالکل ہی بے نیاز ہوتے ہیں، کسی بھی قسم کے عملی اہتمام کو ضروری نہیں سمجھتے اور بعض لوگ اس لیے بھی مطمئن رہتے ہیں کہ انہیں یقین ہوتا ہے کہ ان کے چاہنے والے ان کے جنم دن کا اہتمام ان سے زیادہ خوش اسلوبی سے کر لیں گے۔

اپنے جنم دن کے موقع پر آپ کیا اہتمام کرتی ہیں؟ یہ جاننے کے لیے ہم نے پاکیزہ کے سالگرہ نمبر 2 کے لیے ایک سروے رپورٹ کا اہتمام کیا ہے۔

## راجیلہ فردوس

(سابق نیوز کانسٹیبل وی، نعت خواں۔ نیوجری) میری سالگرہ کا اہتمام ..... مجھ سے بڑھ کر میرے گھر والے اور دوست احباب کرتے ہیں۔ رات بارہ بجے سے کچھ پہلے ہمارے گھر میں اندھیرا چھا جاتا ہے اور پُر اسرار سرگرمیوں کی صدائیں بلند ہوتی ہیں اور پھر رات کے بارہ بجتے ہی

فرینڈز مجھے پوش کرتی ہیں۔ قریبی فرینڈز میرے لیے پھولوں کے تحائف لاتی ہیں، وہ جانتی ہیں کہ پھولوں کی مہک مجھے بہت بھاتی ہے۔ ان کی آمد میرے لیے ہمیشہ اچانک اور خوشگوار ہوتی ہے۔ اگر میری سالگرہ چھٹی کے دن آجائے تو VIP ٹرے ٹیبلٹ کے لیے ہم کہیں باہر ضرور جاتے ہیں۔ ریسٹورنٹ کا کھانا سالگرہ کا لطف بڑھا دیتا ہے۔

## ربیعہ اکرم

(پروگرام منیجر ریڈیو پاکستان کراچی) میری سالگرہ 13 اگست یعنی وطن عزیز کی سالگرہ سے ایک دن پہلے آتی ہے لہذا ملک بھر میں



ربیعہ اکرم

بہز ہلائی پرچموں کی بہار اور عمارتوں میں چراغاں ہوتا ہے۔ جس سے میری خوشی بڑھ جاتی ہے۔ میں اپنی سالگرہ پر نیا سوٹ ضرور پہنتی ہوں۔ بقیہ اہتمام میرے شوہر اور بچے کرتے ہیں۔ اتفاق سے گزشتہ تین سال سے میری سالگرہ رمضان میں آ رہی ہے اس لیے میرے بچے وقار و فاضی اسپیشل افطاری تیار کرتے ہیں، مجھے پکڑنے میں جانے کی اجازت تک نہیں دیتے۔ یک کا اہتمام ضرور ہوتا ہے جو اکرم اریج کرتے ہیں بہت سے تحائف ملتے ہیں لیکن مجھے

سب سے زیادہ انتظار اسے شوہر کے تحفے کا رہتا ہے جسے پا کر ہمیشہ مجھے دلی خوشی محسوس ہوتی ہے۔ ایک سالگرہ پر اکرم نے موبائل گفٹ کیا تھا۔ جب میں FM101 میں ہوا کرتی تھی تو میرے سسر ز اور کارنر مجھے بہت پیارے، پیارے کارڈز اور SMS بھیجا کرتے تھے، بے شمار کڑائیاں۔ دفتر کے دیگر ساتھی بھی میری سالگرہ مناتے تھے ڈی جیبل کر میرے لیے یک لاتے۔ بے پایاں محبتیں اور خلوص مجھے ناقابل بیان مسرت سے سرشار کر دیتے ہیں۔ قارئین سے التماس ہے کہ ہر سال 13 اگست کو مجھے اپنی خصوصی دعاؤں میں یاد رکھیں۔

## نصرت حارث

(ہوسٹ پروگرام صبح نوپنی وی نیوز کراچی مرکز) ہر سال مختلف لوگوں کے ساتھ سالگرہ کے موقع پر تین چار یک تو کٹ ہی جاتے ہیں، میری سالگرہ 18 نومبر کو آتی ہے جو 17 سے 19 نومبر تک منائی جاتی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اپنی سالگرہ کا اہتمام میں نہیں کرتی۔ گھر والے، آفس والے،



## نصرت حارث

دوست احباب مختلف وقتوں میں سالگرہ مناتے ہیں۔ سب سے پہلے 17 نومبر کی شب میاں اور



کا اہتمام نہایت زور شور سے کرتی ہوں۔ جس میں دوستوں اور رشتے داروں دونوں کو شامل کرتی ہوں اور سب سے تحائف وصول کر کے بڑی خوشی محسوس ہوتی ہے۔ دوپہر کو اپنی دوستوں کو بلانے کے لیے لے جاتی ہوں وہاں ہم بہت انجوائے کرتے ہیں رات کو امی گھر پر ڈنر پر کرناز کو مدعو کرتی ہیں اور ہم سب مل کر



فاطمہ تنویر

بہت ہلا گلا کرتے ہیں۔ یوں تو امی کھانے میں بہت کچھ اہتمام کرتی ہیں لیکن میری خصوصی فرمائش پر ”لڑائی“ ضرور بناتی ہیں جسے اس روز کھانے میں جو لطف آتا ہے وہ سال کے اور کسی دن کھانے میں نہیں آتا۔ جب تک میری مومو خالہ (نیلوفر عباسی) پاکستان میں تھیں میری سالگرہ کے اہتمام میں پیش، پیش رہتی تھیں۔ اب بھی وہ کسی سے پیچھے نہیں سب سے پہلے بارہ بجے شب مومو خالہ اور ان کے بچوں ہی کا فون نیویارک سے آتا ہے مجھے وش کرنے کے لیے۔ مومو خالہ میری ہر سالگرہ پر مجھے میری پسند کا سرپرائز گفٹ بھیج کر میری سالگرہ کی خوشی میں کئی گنا اضافہ کر دیتی ہیں، آپ کی محبتوں کا بہت شکریہ مومو خالہ۔

یسری مرسلین

(طالبہ ایم اے)

اپنی سالگرہ کے دن غالباً ہر ایک کی خواہش یہ ہوتی



ماورا

سرخ رنگ کا کسٹرائز ایک لے کر آئے۔ خوب ہلا گلا ہوا میرے ڈائریکٹر صاحب بھی موجود تھے۔ باہر جاوید صاحب اور دیگر لوگ بھی تھے سب نے بہت انجوائے کیا، اس سے قبل جیو کے مارننگ شو میں مجھے سرپرائز دیا گیا۔ میری سالگرہ منائی میرے دوستوں کو مدعو کیا، جنہیں خاص طور پر لاہور سے آیا تھا پروگرام میں شرکت کرنے۔ اپنی بیویوں سالگرہ پر میں جتنی ایکساٹنڈ تھی اتنی ہی اللہ نے مجھے خوشیاں بھی دیں، ممانے بھی گھر میں سالگرہ کا اہتمام کیا سب نے تحائف دیے بہت مزہ آیا اور ہمیشہ کی طرح سب سے زیادہ اچھا تحفہ میری بہن عروہ نے دیا۔ اور ممانی دعاؤں کا تو کوئی مول ہی نہیں ہے۔ میرے تمام چاہنے والوں کی دعاؤں اور پیار کا بہت شکریہ۔

فاطمہ تنویر

(طالبہ میڈیکل)

سالگرہ کا دن ہر انسان کے لیے خاص موقع ہوتا ہے کیونکہ اس روز وہ سب کے لیے سب سے زیادہ اہم ہوتا ہے۔ زندگی کا ایک سال کامیابی سے گزر چکا ہوتا ہے اور آئندہ سال کے لیے وہ ہر امید ہوتا ہے کہ آنے والا سال بھی کامیابیاں اور خوشیاں لے کر آئے گا، اسی احساس کے تحت میں اپنی سالگرہ



ڈاکٹر رفیعہ رفیق

کرتے ہیں جو ہمیشہ بہت انوکھا، پیارا اور میری سالگرہ کی خوشی دو بالا کرنے والا ہوتا ہے۔ مثلاً گزشتہ برس میں اپنے کلینک میں مصروف تھی کہ اچانک میرے دوستوں نے دعاوا بول دیا۔ تمام دوست سالگرہ کا گیت گاتے بہت سے غبارے اور ایک لیے کلینک میں داخل ہوئے تو میرے ساتھ میرے مریض بھی خوشگوار حیرت میں مبتلا ہو گئے۔ ایک کاٹا گیا، غبارے پھاڑے گئے، خوب ہلا گلا گیا۔

ماورا

(ٹی وی آرٹسٹ)

میری سالگرہ 28 ستمبر کو آتی ہے اور میں اس کا اہتمام بہت زور شور سے کرتی ہوں۔ سالگرہ کے لیے خاص ڈریس بخواتی ہوں جو عموماً میری خالہ جرنی سے بھیجتی ہیں اور کبھی میں یہاں سے اسٹیکل ڈریس تیار کرواتی ہوں۔ کسٹرائز ایک بخواتی ہوں۔ پچھلے سال جب میں 19 سال کی ہوئی تو میں نے پریل ٹکڑ کا ایک بنوایا تھا، اس سال چونکہ میں پورے 20 سال کی ہوئی تو مجھے اس کی بہت خوشی تھی اس لیے میں سالگرہ کا انتظار بھی بہت پہلے سے کر رہی تھی۔ اس سالگرہ پر میرے دوستوں نے مجھے زبردست سرپرائز دیا اور ”میں گنہگار نہیں“ کے سیٹ پر میرے لیے

بچوں کی طرف سے ایک کفٹا ہے جس کا اہتمام بھی وہی کرتے ہیں اس کے بعد فون کا لڑا اور sms کی صورت میں مبارکباد کا سلسلہ شروع ہوتا ہے جو رات گئے تک جاری رہتا ہے 18 نومبر کو آفس میں ایک کفٹا ہے اور اہتمام بھی ان لوگوں کا ہی ہوتا ہے اور میں بے لوث محبتوں، پھولوں اور تحائف کے حصار میں ناقابل بیان خوشی محسوس کرتی ہوں۔ شام کو گھر پر قریبی عزیزوں کی موجودگی میں ایک کفٹا ہے۔ 19 نومبر تک یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اپنی شادی کی سالگرہ کا اہتمام میں خاص طور پر کرتی ہوں لیکن وہ ”خالص پرسنل گید رنگ“ ہوتی ہے۔ جس میں ہم دونوں اور بچے ہوتے ہیں۔ ہمارے درمیان تحائف کا تبادلہ ہوتا ہے اور ہم خاص طور پر باہر کھانا کھانے جاتے ہیں۔ بہت خاص اہتمام میں اپنے شوہر اور بچوں کی سالگرہ کا کرتی ہوں اور کوئی نہ کوئی سرپرائز ضرور رکھتی ہوں مثلاً شوہر کی سالگرہ پر بچوں کی طرف سے ان کے لیے کوئی نہ کوئی سرپرائز گفٹ ضرور لیتی ہوں۔ بچوں کی طرف سے انہیں sms بھیجتی ہوں۔ بینا فرمائش کر کے اپنی پسند کے تحفے لیتا ہے جس پر ان کی چھوٹی بہن بھی حق جتاتی ہیں اگلوٹی بہن جو ٹھہریں۔

ڈاکٹر رفیعہ رفیق

(ڈینیٹل سرجن۔ ہوسٹ مارننگ شو۔ میٹروون) اپنی سالگرہ کا میں کوئی اہتمام نہیں کرتی گھر والوں اور دوستوں کے ہوتے ہوئے مجھے اس کی ضرورت ہی نہیں پڑتی، امی کا تحفہ اور اہتمام دونوں ہی بہت خاص ہوتے ہیں خاص کر وہ ایک جو امی خود میرے لیے بناتی ہیں اس کا تو جواب ہی نہیں۔ سالگرہ کا لطف بڑھ جاتا ہے امی کا بنایا ایک کھاکے۔ دنیا میں میرے والدین کے بعد میرے دوست ہی میرے لیے سب سے بڑی نعمت ہیں۔ میرے دوست عموماً سالگرہ پر مجھے سرپرائز دینے کے لیے کچھ نہ کچھ پلان





زویا عامر

بھائی ہمارے لیے گفت لینے گیا اور ہمارے لیے نیل پالش لے آیا اور خوشی کی بات یہ تھی کہ وہ بالکل ویسا ہی... کلر تھا جیسا کہ ماما عام طور پر لگاتی ہیں، ہمیں حیرت اور خوشی ہوئی کہ دس سال کا بچہ ایسا تھخہ لایا جو نہ صرف ہماری پسند بلکہ ہمارے استعمال کا بھی تھا۔ اس مشترکہ سالگرہ کی خاص بات یہ ہے کہ ماما گفت ہمیشہ میرے گفت سے بازی لے جاتا ہے۔ ماما اور ان کی ممتاز زندہ یاد۔ جہاں تک دوستوں کی بات ہے تو ان کا تو اپنا ہی طریقہ ہے کہ گفت دینا تو دور کی بات خود دعوت مانگ کر کھاتے ہیں، اسی طرح ہنسی مذاق میں یہ دن گزر جاتا ہے۔

قارئین: کتنا بھلا لگتا ہے ناں جب خوشی ہماری ہو اور اہتمام ہمارے اپنوں کی جانب سے ہو۔ بالخصوص جنم دن کے خاص موقع پر جب ہمارے اپنے ہماری خوشی میں ہم سے بڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ اپنوں کی جانب سے ملنے والی یہ سالانہ سوغات ہمارے لیے قیمتی اثاثہ اور آنے والے کل میں ماضی کی وہ خوشگوار یاد جس کا تصور ہمیں ہمیشہ خوشی سے سرشار رکھے گا۔ ایسے میں دل سے یہی دعا نکلتی ہے خدا اس محبت کو آباد رکھے، آمین!



خاص طور پر بھائی مجھے جی بھر کر ستائے بنا تیار کرے یہ ممکن ہی نہیں۔ میری سالگرہ کا اہتمام امی ابو ہمیشہ گھر پر ہی کرتے ہیں اور اس کا لطف ہی اور ہوتا ہے، امی، ابو اور بھائی میرے لیے زبردست پارٹی ارنج کرتے ہیں۔ ایسے میں میری دوستوں کے آنے کے بعد خوب ہلاکلا ہوتا ہے۔ دوستوں کی جانب سے ملنے والے تحائف بھی ان کی اور بھی میری پسند کے ہوتے ہیں۔ چونکہ مجھے چائیز بہت پسند ہے اس لیے امی خاص طور پر میرے لیے چائیز بناتی ہیں اور بھائی میری اس خوشی میں مجھ سے بڑھ کر حصہ لیتا ہے اور زبردست گفت دے کر میری سالگرہ کی خوشیوں کو دوبالا کر دیتا ہے۔ گھر والے نہایت محبت سے میری سالگرہ کا اہتمام کر کے میرا مان بڑھا دیتے ہیں یوں میری ہر سالگرہ میرے لیے بہت اہم اور یادگار بن جاتی ہے۔ اسی لیے تو میں اپنی سالگرہ کا انتظار سالگرہ ختم ہوتے ہی شروع کر دیتی ہوں۔

زویا عامر  
(طالبہ)

میری سالگرہ 18 ستمبر اور ماما کی 15 ستمبر کو آتی ہے اور ہم 16 ستمبر کو مشترکہ سالگرہ مناتے ہیں لیکن کسی بہت بڑی تقریب کا اہتمام نہیں کیا جاتا۔ بس رات کو کھانا فیملی کے ساتھ کسی پسندیدہ ریسٹورنٹ میں کھایا جاتا ہے۔ سالگرہ کا اہتمام خود بخود اس وقت ہو جاتا ہے۔ جب کبھی کبھی خالہ اپنی فیملی کے ساتھ اچانک آکر ہمارا موڈ خوشگوار کر دیتی ہیں اور یہ مسرت مزید بڑھ جاتی ہے جب خالہ اپنے ہاتھ کا بنایا ہوا ایک اور کوکیز وغیرہ ساتھ لے آتی ہیں ان کے بچے بھی اپنے ہاتھوں سے بنے ہوئے گفت جیسے فلاور، بیگز یا بیگلز وغیرہ لے آتے ہیں، میرا چھوٹا بھائی بھی پوری کوشش کرتا ہے کہ مجھے اور ماما کو ہماری پسند کے مطابق تحفے دے۔ ایک مرتبہ ہم مال میں تھے ہمارا پارلر جو اسی مال میں ہے ہمیں وہاں چھوڑ کر

ہمارے خوب صورت تہوار ہیں اور کسی خاص ہی دن کیوں..... محبت کا اور خوشی کا ہر دن ہو سکتا ہے، ہمارے ہاں خوشیاں ڈھونڈی نہیں جاتیں بلکہ خوشیاں پیدا کی جاتی ہیں۔ جیسے آج میں لڑائیہ بناؤں گی سب سہیلیوں کو بلا لیتے ہیں یا آج سب کو موسم گرما کا جوڑا گفٹ کرتے ہیں۔ رمضان اور عید کے مواقع پر جتنے بھی تحائف دیے جائیں وہ کم ہیں۔

دانیہ احمد



دانیہ احمد

(طالبہ بلاغ عامہ)

سالگرہ کا دن محبت اور بھرپور طریقے سے منانا چاہیے۔ اپنی سالگرہ کے خیال ہی سے مجھے بے چینی شروع ہو جاتی ہے کہ یہ وہ خوش قسمت دن ہے جب میں نے دنیا میں آکر تصور کا سنات میں مزید خوب صوت رنگ بھر دیے تھے۔ اسی لیے میری سالگرہ کا دن جوں جوں قریب آتا ہے میری خوشی بڑھ جاتی ہے کیونکہ اپنی سالگرہ کی تیاری میں نہیں میرے بہت سے چاہنے والے کرتے ہیں اور حسب معمول میں ایک، ایک کو یاد دلاتی ہوں تیاری شروع کرو میری سالگرہ آنے ہی والی ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ تیاری سب کرتے ہیں لیکن انجان بنے رہتے ہیں



سیری مرسلین

ہے کہ اسے خصوصی توجہ دی جائے، وہ سب کی آنکھ کا تارہ ہو اور اس کی خواہشات بن کبے پوری ہو جائیں، کچھ بھی کیفیت میری بھی ہوتی ہے اور میری خوش بختی کہ یہ خوشی میرے حصے میں آتی بھی ہے یہی وجہ ہے کہ اپنی سالگرہ والے دن میں خود کو کسی شاہزادی سے کم نہیں سمجھتی۔ اس دن میں جتنی مصروف اور اپنے خاندان اور حلقہ احباب میں جتنی مشغور ہوتی ہوں اتنا تو امریکا کا صدر بھی نہیں ہوتا ہوگا۔ ایک دن قبل بارہ بجے شب سے ہی جو دوستوں، کزنز اور دوسرے رشتے داروں کے فون، sms آتے ہیں تو صبح ہو جاتی ہے سب کا شکریہ ادا کرتے کرتے۔ سالگرہ کے دن دہری خوش محسوس ہوتی ہے۔ ایک طرف میں اپنی دوستوں کے ساتھ سالگرہ کی بھرپور خوش منانی ہوں تو رات کو گھر میں رشتے داروں کی تحفیں اور تحائف سمیٹتی ہوں، امی اپنے ہاتھ سے میرے لیے میری پسند کی ڈشز بنا کر میری سالگرہ کا خاص اہتمام کرتی ہیں تو سالگرہ کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ یوں سالگرہ کے دن کے اختتام تک میں مصروف کے ساتھ معروف بھی ہو جاتی ہوں۔

گفت آرا

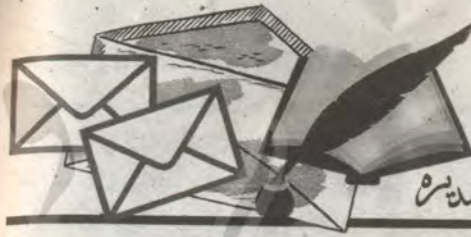
(طالبہ بی بی اے)

سالگرہ کوئی اسلامی رسم نہیں ہے جس کو منایا جائے، خوشیاں منانے کے بہت سے دن ہیں۔



# بہنوں کی محفل

مدیر



☆ عزیز از جان بہنو! السلام علیکم رحمۃ اللہ وبرکاتہ!

☆ حمد و ستائش اس ذات کے لیے جس نے کارخانہ عالم کو جو بخشا اور درود سلام حضرت محمد ﷺ پر جنہوں نے دنیا میں حق کا بول بالا کیا۔

☆ پیاری بہنو! آپ سب کی زندگیوں سے ممنون ہوں کہ پاکیزہ کا سالگرہ نمبر ایک آپ کے معیار پر پورا اتر اور پاکیزہ محل کی شہزادیوں سے مل کر سب کو ہی خوش ہوئی۔ ظاہر ہے کہ ہونی ہی تھی کہ وہ عام شہزادیوں سے نہیں ارفع و اعلیٰ شہزادیاں ہیں بلکہ قلم کی اصل بیرونی ہیں اور اب آپ آئے ایک بہن کے فون کی جانب ہماری ایک قاری بہن نے اپنا مسئلہ ہم سے پیش کیا تو ہمیں لگا کہ ایسے مسائل ہمارے اکثر گھروں میں بھی موجود ہیں۔ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکی کو جب اس کی طرح تعلیم یافتہ برہنیں ملتا یا اس کے مقابلے میں کم ہوتا ہے تو وہ شادی سے ہی انکار کر دیتی ہے۔ کیا اس کا یہ اقدام صحیح ہے یا غلط اس بارے میں کچھ کہنا نہیں چاہوں گی کہ اب وہ وقت نہیں رہا ہے کہ کسی لڑکی کی شادی زبردستی کر دی جائے یا اس کی پسند ناپسند کو اہمیت ہی نہ دی جائے مگر صرف اتنا کہوں گی جب ایک مرد اپنے سے کم تعلیم یافتہ لڑکی سے خوشی، خوشی شادی کر لیتا ہے تو ایک لڑکی اپنے سے کم تعلیم یافتہ شخص سے شادی کیوں نہیں کر سکتی۔ اس دور میں لڑکے، لڑکیاں دونوں کما کر ہیں زیادہ تر اب اگر لڑکے کی تعلیم یا اس کی جاب لڑکی کے مقابلے میں کم بھی ہے تو اس میں کوئی برائی تو نہیں ہے۔ ہاں اگر لڑکا اخلاقی لحاظ سے کم ہے، بکرا در کے حوالے سے پست ہے تو وہ بے شک کتنا ہی تعلیم یافتہ کیوں نہ ہو کتنا ہی صاحب حیثیت کیوں نہ ہو اسے ری جیکٹ کیا جاسکتا ہے لیکن صرف تعلیم اور جاب کی وجہ سے مسترد کر دینا میرے خیال سے کوئی عقل مندی نہیں ہے۔

☆ پیاری بہنوں گزشتہ ماہ پاکیزہ محل میں آپ کی شہزادیوں سے تو ملاقات ہوئی تھی اب آپ آجائیں پاکیزہ محل کی بارہ دری میں۔ یہاں خوب صورت پارک کے ساتھ ساتھ دونوں جانب نہریں بھی چل رہی ہیں اور یہاں بہنیں مسکراتی جو راج کمار یاں نظر آ رہی ہیں وہ سب پاکیزہ کی تمبر نگار ہیں یا کسی نہ کسی حوالے سے پاکیزہ سے جڑی ہوئی ہیں۔

☆ آئیے سب سے پہلے جس شہزادی سے ہم آپ کی ملاقات کروائیں گے انہیں یہی شہزادی بھی کہہ سکتی ہیں۔ جی ہاں ڈاکٹر ممتاز ضیا کا قد چھ فٹ کے قریب، قریب تو ہوگا۔ بے حد سادہ حراج کی ہیں جس وقت بھی فون کریں پہلے یہ پوچھتی ہیں کہ انجمن متصرف تو نہیں ہو، کیا میں بات کر سکتی ہوں۔ اپنے تمبروں میں دوستیاں نہیں نبھاتی بلکہ ان کا تمبر بے لاگ ہوتا ہے اور اکثر مصنفات کی تو یہ خواہش ہوتی ہے کہ ڈاکٹر ممتاز ان کے افسانے کے بارے میں رائے دیں۔

☆ یہ بہنیں مسکراتی خوب صورت سی خاتون بے حد گورے رنگ کی مسز عظمیٰ خورشید ہیں۔ شوہر اور پھر جوان بیٹی کی رحلت کے بعد وہ ٹوٹ کر رہ گئی ہیں مگر پاکیزہ اور مجھ سے رابطے میں رہتی ہیں۔ عمیرہ احمد کی دل سے عاشق ہیں، ان کے تمبرے کھرے ہوا کرتے ہیں۔

☆ شہزادی صفیہ بیگم جب لالہ موسیٰ سے مجھے فون کرتی ہیں تو سب سے پہلے سارے گھر کی فردا فردا خبریت پوچھتی ہیں اور پھر اپنی خبریت بتاتی ہیں۔ مجھے ان کے بھانجوں کی باتیں سن کر خوش ہوتی ہے جو وہ اپنی خالہ سے اتنی محبت کرتے ہیں کہ انہیں اپنے پاس جرمی بلا کر وہاں کی سیر تک کروانا چاہتے ہیں۔ صفیہ چونکہ لڑکی ڈلی ہیں اس لیے سب لوگ ان سے بہت محبت کرتے ہیں۔

☆ شہزادی عرشہ جنید اب فون کم کرتی ہیں تمبرے آنے بھی کم ہو گئے ہیں مگر تقریبات میں اکثر ملاقات ہو جاتی

## بہنوں کی محفل

ہے۔ جتنی خوب صورت ان کی ہنسی ہے اتنی ہی خوب صورت وہ خود بھی ہیں۔ کپڑے بھی خوب صورت پہنتی ہیں۔ اکثر ہم سے کہتی ہیں کہ اگر ان کے گھر جاؤں تو وہ برس برس روڈ کے دہی بوے کھائیں گی مگر کہیں جانا کہاں آسان ہے میرے لیے۔

☆ اور یہ دہلی پتلی نازکی یونے سے قد والی شہزادی جو خراباں خراباں چلی آ رہی ہیں یہ شاملہ کھیل جاوید ہیں۔ یہ شاعرہ بھی ہیں اور پاکیزہ کی تمبر نگار بھی ہیں، ان کی باتیں بھی بڑی محبت بھری ہوتی ہیں۔

☆ اب جس شہزادی کی باری ہے اسے محکمہ انفارمیشن میں کسی اچھی پوسٹ پر ہونا چاہیے۔ کوئی بھی رائٹر کسی بھی چینل پر نظر آ جائے زیر کا فون اسی لمحے میرے پاس آ جائے گا۔ انجمن باقی اس وقت شیریں حیدر آئی ہوئی ہیں۔ نیلو فر عیسیٰ باقیں کر رہی ہیں وغیرہ وغیرہ ہماری بہن بے حد محبت کرنے والی ہیں۔

☆ شازہ صدیقی بھی سینئر تمبر نگار شہزادی ہیں مگر کافی عرصے سے لاپتا ہیں۔ یہ سطور پڑھ کر فوراً آجائیں ان کو کچھ نہیں کہا جائے گا۔

☆ شہزادی سویرا فلک اپنی شادی سے پہلے پاکیزہ میں خوب ان تھیں اور اب آؤٹ ہیں۔ ظاہر ہے بچے اور میاں کو سنبھالنا نفل نامم جاب ہے۔

☆ شہزادی فرزانہ مسعود اول پٹری میں افشاں کالونی میں رہتی ہیں۔ سرخ و سفید رنگت والی کشمیری شہزادی ہیں۔ ایک وقت تھا کہ تمبرے بھی باقاعدگی سے آتے تھے اور فون بھی اب دونوں ہی غائب ہیں، کیا بات ہے فرزانہ، خبریت سے تو ہوتا؟

☆ شہزادی نجمہ ابراہیم داؤد پہلے اسلام آباد میں رہا کرتی تھیں تو ان سے میل ملاقات رہا کرتی تھی مگر یہ جب سے منقطع گئی ہیں تب تمبرے آرہے ہیں اور نہ ہی فون۔ ہاں تجھ میں نے مارچ اور اپریل کے پاکیزہ تمہارے ایڈریس پر پوسٹ کر دیے ہیں مل جائیں تو بتا دینا۔

☆ شہزادی زنگنم کچھ عرصہ پہلے بڑی باقاعدگی سے تمبرے بھیجا کرتی تھیں۔ اب یہ بھی غائب ہیں۔ یہ ہنستے ہوئے بات کرتی ہیں اور خاصی گاڑھی پچاخی میں بات کرتی ہیں اور میں ان کو ہلکی پھلکی پچاخی میں جواب دے پاتی ہوں۔

☆ شہزادی ناہیدہ بنت نورواہ سنٹ ورکس میں رہتی ہیں۔ ایک مرتبہ ان سے ملاقات بھی ہو چکی ہے۔ بے حد دین دار لڑکی ہے۔ اتنی سادہ اور بھولی لڑکیاں کم کم ہی دیکھی ہیں جو سب کی تعریف کرتی ہیں اور سب سے بے انتہا محبت۔ ہاں ان کا نکتہ کلام نہیں جی ہے۔

☆ شہزادی فیروزہ بیگم سخت اور کھری تمبر نگار ہیں۔ اردو اور انگریزی دونوں میں لکھتی ہیں۔ ان کا زیادہ وقت عبادت کرنے میں گزرتا ہے۔ صبح تین بجے اٹھ جاتی ہیں مگر یہ ایسی شہزادی ہیں جو تمام رائٹرز اور تمبر نگار تو کیا قاری بہنوں تک کو اپنی دعاؤں میں یاد رکھتی ہیں، ماشاء اللہ۔

☆ شہزادی زہرتہ اشفاق، کراچی میں رہتی ہیں۔ ان کے تمبرے بھی قدرے سخت ہوتے ہیں۔ بات چیت میں بے حد دھمے حراج کی ہیں۔ ہم سے تو بہت محبت کرتی ہیں۔ ان کی پسندیدہ مصنفہ ناہیدہ سلطانہ اختر، قیصرہ حیات، سیکندہ فرخ، شیریں حیدر اور ڈاکٹر ذکیہ لکھرا ہیں۔

☆ شہزادی رخسانہ امجد پنجاب میں رہتی ہیں۔ اچھی تمبر نگار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک محبت کرنے والی لڑکی ہیں۔ بے حد جذباتی سی ہیں۔ جب خوش ہوتی ہیں تو جلدی، جلدی بات کرتی ہیں، ان کے بولنے کی رفتار 250 میل فی



باوجود وہ مجھ سے ملتے آئیں، بے حد محبت کرنے والی خاتون ہیں اور بے حد دعائیں دینے والی۔ اللہ انہیں سلامت رکھے، آمین۔

☆ شہزادی پروین افضل شاہین کے بارے میں دورائے ہیں۔ پچاس فیصد بہنوں کا خیال ہے کہ یہ پروین کے شوہر افضل شاہین لکھنے ہیں پچاس فیصد کا خیال ہے کہ یہ پروین خود لکھتی ہیں چونکہ یہ ہمیں پروین کے نام سے موصول ہوتے ہیں اس لیے ہم اول الذکر خیال کے حامی ہونے کے باوجود اسے پروین کا ہی سمجھا کرتے ہیں۔ وہ بڑی باقاعدگی سے تبصرہ ارسال کرتی ہیں۔ وہ وقت کا اتنا خیال رکھنے والی ہیں کہ ان کا بس چلے تو آئندہ ماہ کا شمارہ آنے سے پہلے بھی اس پر بھر پور تبصرہ ارسال کر سکتی ہیں۔ یہ تو خیر مذاق ہے مگر یہ شہزادہ یا شہزادی بے حد ایکٹو ہے۔

☆ شہزادی نور افشاں، شکار پور میں رہتی ہیں مگر بے حد ذہین اور سلیکٹڈ ہیں۔ سنجی طرزِ تحریر میں خط لکھا کرتی ہیں۔ لہجہ ایسا ہے جسے شربت کے گلاس میں کوئی 20 گچھے چینی ڈال دے۔ تبصرہ اپنے منفرد انداز میں کرتی ہیں اور لطافت ایسے بھیجا کرتی ہیں جس کو پڑھ کر آپ کو کسی سے گدگدی کروائی پڑے گی۔

☆ اب آئیے آکسفورڈ کی شہزادی سے ملتے ہیں۔ ان کا نام تانی چوہدری ہے۔ یہ سپل سے تبصرے اور نظمیں ارسال کرتی ہیں اور بالکل ایسا ہی انداز نگینہ ضیائش، نسرین خالد اور نجم گلزار کا ہوا کرتا ہے۔

☆ شہزادی غبر وسم، گوجرانوالہ کی شہزادی ہیں۔ صفحے کے انتہائی بائیں جانب خط یا مراسلات لکھا کرتی ہیں۔ شروع کا صفحہ خالی رہتا ہے۔ تبصرے کے مقابلے میں مراسلات بہت اچھے ہوتے ہیں۔ تبصرہ لکھتے وقت شاید تنجیدگی سے کام نہیں لیتیں۔ یہ میرا خیال ہے جو ہو سکتا ہے کہ غلط بھی ہو۔

☆ صائمہ شاہ یہ شہزادی راولپنڈی کی ہیں اور ہماری بہت پرانی تبصرہ نگار ہیں۔

☆ یاسمین کنول، پسرور کی شہزادی ہیں اور اچھی شاعرہ ہونے کے ساتھ اچھی تبصرہ نگار بھی ہیں۔

☆ شہزادی صائمہ سلیم اچھی تبصرہ نگار ہیں۔

☆ شہزادی ردا حسین ہماری نئی تبصرہ نگار ہیں۔ دعا زہرہ بھی ہماری نئی تبصرہ نگار ہیں۔ نفیہہ آرا اور سعدیہ اسکاٹ لینڈ بھی ہماری نئی تبصرہ نگار ہیں۔ ہاں تمینہ زہرا یہ شہزادی ہماری سینئر تبصرہ نگار ہیں۔

☆ شہزادی نوشاہہ رئیس کا تعلق لاہور سے ہے، وہ اور ان کی امریکا میں مقیم بیٹی ڈاکٹر عظمیٰ کم کم ہی اس محفل میں حاضر ہوتی ہیں۔ ہاں نوشاہہ اب آپ کے شوہر کی طبیعت کیسی ہے؟ بہت دنوں سے آپ کا فون بھی نہیں آیا۔

☆ منور شہزادی کو میں شہزادی نہ بھی لکھوں تو کوئی فرق نہیں پڑے گا کیونکہ شہزادی تو ان کے نام کا حصہ ہے۔ ہماری یہ شہزادی لہجے میں ذائقہ بھر کر بات کرتی ہے اور تبصرہ صرف اپنی من پسند تحریر پر کرتی ہیں۔ شہزادی طلعت رانا، چچہ وطنی بھی ایسی ہی ہیں۔

☆ شہزادی مسرت خلیل کا تعلق کراچی سے ہے۔ بہت اچھے تبصرے بھیجتی ہیں اور وہ یا ان کی فیملی کا کوئی بھی فرد عمرے یا حج کے لیے جائے ہمارے لیے اور پاکیزہ میں شامل تمام مصنفات اور قارئین بہنوں کے لیے دعا کیا کرتا ہے۔ جس کے لیے میں ان کی واقعی احسان مند ہوں اور ایسی ہی ایک پیاری تبصرہ نگار حال ہی میں پاکیزہ محفل میں شامل ہوئی ہیں۔ اس شہزادی کا نام شہزادی افشین شاہد ہے جو جدہ میں رہتی ہے اور اپنے ہر عمرے اور طواف میں مجھے اور پاکیزہ بہنوں کو یاد رکھتی ہیں۔ سیر احمد فاروق بھی بے حد سادہ اور محبت کرنے والی شہزادی ہیں جو اکثر تبصرے کرتی ہیں اور اپنا موقف خوبی سے بیان کرتی ہیں۔

☆ شہزادی شمع حسین تو واقعی میں شہزادی ہیں۔ جب دل چاہتا ہے تبصرہ کرتی ہیں اور جب دل نہیں چاہتا نہیں کرتیں۔ شمع کی یادداشت بہت شاندار ہے اگر کوئی رائٹر اپنا 25 سال پرانا افسانہ دوبارہ دے دے تو شمع فوراً مجھے بتاتی ہے کہ یہ فلاں جگہ شائع ہوا ہے۔

☆ شہزادی روینہ اسلم، لیاری کی معروف شخصیت ہیں۔ لوگوں کے کام آنا ان کے مزاج کا حصہ ہے۔ تبصرے تو

## بہنوں کی محفل

زیادہ شائع نہیں ہوتے، ہاں ان کے ایس ایم ایس میرے پاس بہت آتے ہیں۔ کبھی ملاقات نہیں ہوتی مگر ان سے باتیں کر کے گلتا ہے کہ بے حد دین دار اور نیک خاتون ہیں لہجہ بھی دعائیہ ہوتا ہے۔

☆ ڈاکٹر راضیہ فوجدار سے میری ملاقات کے میں حرم شریف میں ہوئی تھی۔ ان دنوں وہ بہت بیمار تھیں مگر ان سے ایک ٹیلی فون رابطہ رہتا تھا جو کئی سالوں سے منقطع ہے۔ راضیہ شہزادی اپنی خیریت سے مجھے آگاہ کرو۔

☆ شہزادی صاعقہ ریاض کا تعلق حیدرآباد سے ہے۔ تبصرے اور شاعری دونوں مزے کی کرتی تھیں اب کم شدہ ہیں و خصوصاً کرانے والے کو ان کی نظمیں سنائی جائیں گی۔

☆ شہزادی شمیم ناز صدیقی اچھی تبصرہ نگار، اچھی شاعرہ ہیں۔ ایک طویل عمر سے تک رابطے میں تھیں مگر اب غیر حاضر ہیں۔

☆ شہزادی صدف رضوان، اسلام آباد میں ہوا کرتی تھیں، بہت خوب صورت لکھائی ہے۔ ان کے تبصرے بڑے جامع ہوا کرتے تھے۔ یہ وہ دور تھا جب فائزہ افتخار چند اور صائمہ اکرم کے تبصروں کا ڈنگا بجا کرتا تھا۔ پیاری صدف دوبارہ رابطہ کرو۔

☆ شہزادی گلشاندہ یمن موجی شہزادی ہے۔ جب دل چاہے گا تبصرہ لکھے گی مگر ابھی گلشاندہ سے حال ہی میں ملاقات ہوئی ہے۔ یہ مری میں رہتی ہیں۔ گزشتہ دنوں میں اپنی سنجی کی شادی میں اسلام آباد گئی تو ان کا اسرار تھا کہ میں مری ضرور آؤں۔ میں نے کہا کہ شادی کے کھرے لگنا بہت مشکل کام ہوتا ہے۔ تو یہ شہزادی مری سے اسلام آباد آئی۔ ایک گھنٹے میرے پاس رکی اور واپس مری چلی گئی۔ سارا وقت اپنے سرال والوں کی تعریفیں کرتی رہی۔ جو اس کے شوہر کے انتقال کے بعد اس کا بے حد خیال رکھتے ہیں۔ ہمیشہ خوش رہو، آمین۔

☆ شہزادی قیسرہ قدیر کینیڈا میں رہتی مگر پاکیزہ اور ہم سے بے حد محبت کرتی ہیں۔ ان کے تبصرے بھی خوب کھرے ہوتے ہیں۔ قیسرہ کی پسندیدہ مصنفہ رفعت سراج اور ذکیہ بلگرامی ہیں۔

☆ شہزادی یاسمین رشید کے تبصرے تو بہت زیادہ شائع نہیں ہوئے مگر ان سے بات چیت زیادہ رہتی ہے۔ اپنے کام سے کام رکھنے والی ہیں۔ بے حد ایکٹو اور اپنی پیاری عادات کی وجہ سے دوستوں کے دل میں گھر کرنے والی ہیں۔

☆ شہزادی شائستہ اعجاز کے بھی تبصرے بہت زیادہ شائع نہیں ہوئے مگر وہ رابطے میں رہتی ہیں اور ان سے باتیں کر کے مجھے یہ احساس ہوتا ہے کہ انہیں لکھنے اور مطالعہ کرنے کا شوق زمانہ طالب علمی سے رہا ہے اس لیے یہ بھی دھماکا کر سکتی ہیں۔ میرا مطلب ہے کہ یہ بھی کہیں بھی ایڈیٹر یا افسانہ نگار کی حیثیت سے ابھر سکتی ہیں۔

☆ شہزادی سائرہ سعید، جرنی میں رہتی ہیں۔ اپنے طالب علمی کے دور سے شادی ہونے تک باقاعدگی سے

پاکیزہ میں تبصرے اور اپنی نظمیں بھیجتی رہیں۔ اب سال میں ایک آدھ مرتبہ بھیجتی ہیں اپنے گھر کی مصروفیات اور بچوں میں انہیں وقت ہی نہیں ملتا مگر آج میں تمہیں پکار رہی ہوں کہ سائرہ واپس آ جاؤ۔

☆ شہزادی شمسہ الماس، ناروے میں رہتی ہیں اور انہیں اعزاز حاصل ہے کہ پاکیزہ میں رجسٹر کے 85 صفحات کا طویل ترین تبصرہ لکھ کر بھیجا تھا۔ شاعری بھی ٹھیک ٹھاک کر سکتی تھیں مگر اب تین بیٹوں کی مامان جانے کے بعد ان کا زیادہ وقت بچوں کی دیکھ بھال میں صرف ہوتا ہے۔ اب تبصرے کم کم آتے ہیں۔ شمسہ اس محفل میں پہلی طرح ان رہا کروناں۔

☆ شہزادی عذرا کنول کا تعلق دیر غازی خان سے ہے۔ بہت ٹرسٹ کرتی ہیں، مجھ پر۔ اپنے دل کی ہر بات مجھ سے کرتی ہیں۔ عذرا باقاعدگی سے ہمیں تبصرے بھیجتی ہیں جو بے حد طویل ہوتے ہیں اور انہیں لگانے سے پہلے ہمیں تبصرے کا چھوٹا سا آپریشن کرنا پڑتا ہے۔

☆ شہزادی ارم احتشام ان دنوں ملتان میں ہوتی ہیں۔ انہیں پاکیزہ اور ہم سے بے حد پیار ہے۔ ان کی پسندیدہ مصنفہ تابد سلطانہ اختر ہیں۔ یہ پاکستان کے مختلف شہروں میں گھومتی رہتی ہیں کہ بریگیڈیری کی بیگم ہیں مگر ان کے تبصرے ہمیں وقتاً فوقتاً ملتے رہتے ہیں ان کے تبصرے قدرے کھٹے ہوتے ہیں۔



نور جہاں کی دل سے عاشق ہیں۔

☆ شہزادی نسیم حفظ الرحمن بھی میں رہتی ہیں۔ دو چار بار تبصرے بھی شائع ہوئے ہیں۔ پہلے فون بہت کرتی تھیں مگر اب گاہے بگاہے کرتی ہیں۔ پاکیزہ سے اور ہم سے بے حد محبت کرتی ہیں۔ اپنے بیٹے کی بیماری کی وجہ سے بے حد پریشان رہتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے بیٹے کو صحت کاملہ عطا فرمائے۔ آمین، ہم آئیں۔

☆ شہزادی نادیا فاطمہ رضوی پاکیزہ کی اچھی تبصرہ نگار بھی تھیں اور مصنفہ بھی۔ اچانک ہی غائب ہو گئی ہیں۔ اب کس سے پوچھیں کہ تم کہاں ہو؟ آخری ملاقات ان سے ریڈیو انٹرویو ہوئی تھی۔ جب وہ ہمارا انٹرویو لے رہی تھیں۔

☆ شہزادی کوثر خان تو کئی بار میرے گھر تک آئی ہیں۔ تبصرہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ اچھی شاعرہ بھی ہیں مگر جب سے یہ اپنے شوہر کو بیماری ہوئی ہیں وہ سب کو بھول گئی ہیں، خوش رہو۔

☆ شہزادی روحیلہ خاں بھی غائب ہو جانے والوں میں ہیں۔ یہ اچھی تبصرہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ اچھی افسانہ نگار بھی ہیں۔ نازک سی لڑکی فون پر بڑی اتنی قسم کی باتیں کیا کرتی تھی مگر پتا نہیں کہاں ہے یہ؟

☆ مسز نگہت غفار من موجی شہزادی ہیں۔ تبصرے میں پتے پتے بوئے کو دعائیں دیتی ہیں۔ اس دور میں دعائیں دینے والے عقائد میں مکران کے پاس ہر وقت نوکرے بھرے رہتے ہیں۔ شاعرہ بھی ہیں اور افسانہ نگار بھی مکران کے تبصرے سب کو بہت پسند آتے ہیں کہ یہ صرف دل کی آنکھ سے پڑھتی ہیں۔ فی زمانہ ایسے لوگ کمیاب ہیں۔ اللہ آپ کو خوش رکھے، آمین۔

☆ شہزادی نیر رانی تبصرہ نگار، شاعرہ ہونے کے ساتھ ساتھ کہانیاں بھی لکھتی ہیں۔ کئی کتابوں پر ملکی سطح پر ایوارڈ تک مل چکے ہیں۔ آج کل ان کا قلم آرام کر رہا ہے۔

☆ شہزادی مریم، لاہور میں رہتی ہیں۔ جوان، خوب صورت لڑکی مگر بے حد دین دار۔ روحانی مشورے کے صفات تو فوٹو اسٹیٹ کروا کے اپنی فریڈز میں بانٹتی رہتی ہیں۔ تبصرے تو کم ہی شائع ہوتے ہیں مگر رابطے میں رہتی ہیں۔ عمیرہ احمد کی بہت بڑی عاشق ہیں۔ آواز میں بے حد دلکشی ہے۔

☆ شہزادی حرا انور ملاقات تو ایک ہی بار ہوئی ہے مگر فون پر رابطہ عرصے سے قائم ہے۔ تبصرہ بھی شائع کروانے کے لیے نہیں بھیجا مگر پاکیزہ کی مصنفات کی تحریروں میں بے حد شوق سے پڑھتی ہیں۔ عمیرہ احمد، عتیقہ محمد بیک، فائزہ افتخاری تحریروں میں پڑھتی ہیں۔ یہ لڑکی بے حد سادہ، معصوم اور پیاری عادتوں کی ہے۔

☆ شہزادی امہ جنیں صفدر ان سے بھی ملاقات ایک ہی بار ہوئی ہے مگر یہ پاکیزہ کی مصنفات کی تحریروں کے بارے میں بڑی اچھی رائے رکھتی ہیں۔ نگہت سیما کے افسانے پسند ہیں۔ عمیرہ احمد کے افسانے اور ڈرامے دونوں ہی پسند ہیں۔ نمرہ احمد اتنی چمپی ہوتی کیوں رہتی ہیں۔ ہمارا ناول چاندنی اچھا لگا تھا مگر اس کا پتا ہوا سوپ انہیں بالکل پسند نہیں آیا۔ سوپ میں جو اضافہ اور ترمیم کی گئی اس نے سوپ کا خم ختم کر دیا۔ مہ جیں بے لاگ اور کھری رائے دینے کی عادی ہیں اور ان کی لڑکیاں مجھے اچھی لگتی ہیں۔

☆ شہزادی سنبھل ملک ہماری نئی تبصرہ نگار ہیں۔ بے حد جذباتی سی ہیں۔ ان کا تبصرہ کئی مہینوں سے متواتر لگ رہا ہے مگر ان کا شکایتی خط ہر ماہ ہمارے پاس موجود ہوتا ہے۔ لگتا ہے جلد بازی میں ان سے بہنوں کی محفل پوری پڑھی تک نہیں جاتی۔

☆ شہزادی سدرہ یاسن بہت ٹیلنٹ ہے اس لڑکی میں۔ تبصرے بھی دلچسپ ہوتے ہیں اور مراسلات بھی اور ایک دفعہ تو حد ہی ہو گئی اس لڑکی نے افسانہ تک لکھ کر بھیجا تھا۔

☆ شہزادی افتخار شوق، میاں چنوں میں رہتی ہیں۔ ہنسی مسکراتی خاتون ایک بڑی سرکاری افسر بھی ہیں مگر لہجے میں انکسار ہوتا ہے۔ تبصرہ بھی کبھی جیتتی ہیں، موڈی ہیں۔

☆ شہزادی نسیم علوی، دہلی میں رہتی ہیں۔ افسانہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ دلچسپ تبصرے بھی کرتی ہیں۔ اگر وہ

☆ ڈاکٹر شازیہ جمال کے تبصرے ان کے موڈ کے حساب سے آتے ہیں۔ ہم ان کو ڈاکٹر اس لیے کہتے اور لکھتے ہیں کہ یہ معروف سرجن ڈاکٹر جمال الدین کی بیگم ہیں مگر دوران گفتگو اس قدر ادویات تجویز کرتی ہیں کہ مجبوراً ہم نے ان کو بھی ڈاکٹر شازیہ کہنا شروع کر دیا ہے۔ بے حد پیاری شخصیت ہیں جوان بچوں کی ماں کے اندر ایک نٹ کھٹ اور شوخ لڑکی چھپی ہوئی ہے۔

☆ شہزادی قمر جہاں غلیل بڑے جانداز تبصرے لکھتی ہیں۔ پروفیسر صاحب اس وقت سے لکھ رہی ہیں جب وہ سرسید گرلز کالج میں پڑھا کرتی تھیں۔ ریٹائرڈ ہونے کے بعد ان کے تبصرے باقاعدگی سے تو نہیں آتے مگر آتے رہتے ہیں۔ بے حد دھمے مزاج کی خاتون ہیں۔ ان سے ہماری دوستی ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی کے توسط سے ہوئی تھی۔

☆ قمر شمس الحق یہ ہمارے جھنگ کی شہزادی ہیں۔ ان کے تبصرے باقاعدگی سے آتے ہیں اور بے حد تفصیلی آتے ہیں۔ فون پر بھی بات ہوتی رہتی ہے۔ بے حد نفسی خاتون ہیں۔

☆ سمیرا مجاہد، یہ شہزادی بہت محبت کرنے والی ہے۔ اس کا لہجہ دعائیہ ہوتا ہے۔ پاکیزہ پہلے ان کی امی کے گھر آتا ہے پھر وہاں سے ان کے گھر اس لیے تبصرہ بھیجے میں دیر ہو جاتی ہے۔ اس شہزادی کے لہجے اور تبصروں میں محاسن ہی محاسن ہوتی ہے اور یہی انداز عاتقہ خالد کا ہوتا ہے۔

☆ ڈاکٹر شہلا عامر یہ شہزادی تو حقیقی زندگی میں بھی شہزادی ہیں۔ ڈاکٹر عشرت العباد کی بھادج ہیں۔ اپنے گھر کی آئے دن کی تقاریب میں ہمیشہ مدعو کرتی ہیں مگر مجھ جیسی لیکن نہ جانے والی ان سے ہمیشہ معذرت ہی کرتی ہے۔ بے حد پیار سے بات کرتی ہیں لہجہ کی براڈ کاسٹر کا سا ہے اور دیکھنے میں ہیر وڈن لگتی ہیں۔ ہاں پاکیزہ کی بہنوں کی محفل کو پاکیزہ کی فیس بک کا نام شہلانہ ہی دیا تھا۔

☆ شہزادی نوخیز انجم جب تک پاکستان میں تھیں ان کے تبصرے اور شاعری باقاعدگی سے آتی رہی مگر جب وہ لندن شفٹ ہو گئیں تو ان کی ڈاک آتا بند ہو گئی۔ نوخیز تم اپنی تحریروں پر بڑی فیکس بھی بھیج سکتی ہو۔

☆ شہزادی رفعت یمن رنی ہماری باقاعدہ تبصرہ اور مراسلہ نگار ہیں۔ ان دنوں وہ امریکا میں ہیں۔ اس لیے ان کی غیر حاضری لگ رہی ہے۔ رفعت ہم تمہاری کمی محسوس کر رہے ہیں وہاں سے اپنے تبصرے بھیجو۔

☆ شہزادی زینا حسن پہلے شہزادی ثروت کے نام سے لکھا کرتی تھیں اور یہ بیوی کلینک کی انچارج ہوا کرتی تھیں بعد میں تبصرے لکھنے شروع کیے اور اب جوان بیٹی کے انتقال کے بعد وہ سب کچھ بھول گئی ہیں۔ پیاری زینا اپنے آپ کو سنبھالو اور دوبارہ لکھنے کی جانب آؤ۔ اللہ تمہیں خوش رکھے۔

☆ نیر خان شہزادی، تم تبصرے بھی کرو گے جیتتی ہو اور مراسلے بھی، افسانے خاصے بہتر ہوا کرتے تھے۔ شادی کی اطلاع دی تھی تو وقفہ پڑا تھا پھر بیٹے کی اطلاع تو وقفہ بڑا ہو گیا اب ماشاء اللہ آبادی کہاں تک پہنچی؟ پڑھنے لکھنے کی فرصت ملتی ہے یا نہیں؟

☆ شہزادی افشاں کوثر، طیر آخری مرتبہ تم نے فون پر بات کی تھی۔ وہ بات مجھے یاد ہے مگر گزرا تم تو بہت خوب صورت تبصرے لکھا کرتی تھیں وہ لکھنے کیوں چھوڑ دے چلو جلدی سے آ جاؤ، میں انتظار کر رہی ہوں۔

☆ شہزادی امہ جنیں شہزاد غالب کی آنی کی کالونی کراچی سے مجھے تبصرے ارسال کیا کرتی تھیں۔ کبھی کبھار فون پر بات بھی ہو جایا کرتی تھی مگر پھر ایک دم ہی کھو گئیں، میں نہیں ڈھونڈ رہی ہوں جلدی سے آ جاؤ۔

☆ شہزادی عینی، کاٹھڑہ کالونی ہے حد مختصر تبصرہ لکھتی ہیں۔ بے حد لائن کلر کا قلم استعمال کرتی ہیں۔ بے بی پنک یا لائن گرین لکھ رہی تھیں۔ ہوسکتا ہے کہ وہ کچھ اور لکھتی ہوں مگر نہیں جو کچھ میں آتا ہے وہی شائع کر دیتے ہیں۔

☆ تہمت عبد الرحمن پاکیزہ کی لاپتا شہزادی ہیں جنہوں نے ایک دم تبصرے بھیجے بند کر دیے۔ کہاں ہو رابطہ تو کرو؟

☆ شہزادی عالیہ بشر طویل عرصے سے غائب تھیں پتا چلا کہ بیرون ملک میں تھیں۔ اب آئی ہیں تو انہوں نے رابطہ کیا ہے۔ یہ اچھی تبصرہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھی شاعرہ بھی ہیں۔ ایک دو بار ملاقات بھی ہوئی ہے۔ یہ گلوکارہ



## بہنوں کی محفل

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری فاشین شاہد، جدہ نے ہماری مصنفہ لبنی عروج مرحومہ کے نام کا عمرہ ادا کیا۔ (جزاک اللہ)  
☆ مصنفہ راس تنویر، کراچی ایک پیاری سی بیٹی کے پایا بن گئے۔ (مبارک باد)  
☆ انٹرنیشنل پوکر فیڈریشن سوئٹزرلینڈ نے ہمارے ادارے کے نمائندہ لاہور سید افراز علی تاشز کو پاکستان پوکر ایسوسی ایشن کا بانی جنرل سیکریٹری منتخب کر لیا ہے۔ پاکستان پہلا اسلامی ملک ہے جو انٹرنیشنل ماسٹرز ایسوسی ایشن کا ممبر بنا ہے۔ (مبارک باد)

☆ ہماری شاعرہ پروین عذرا ایشہ ان دنوں علیل ہیں۔ ان کی کلی صحت کے لیے دعا کریں۔  
☆ پاکیزہ کی مستقل قاری شہلا ظفر، کراچی کی صحت یابی کے لیے دعا کریں۔  
☆ پاکیزہ کی مستقل قاری ڈاکٹر میمونہ غوری کی کلی صحت کے لیے دعا کریں۔  
☆ اس ماہ ہماری ان پیاری بہنوں کی سالگرہ ہے۔  
☆ رفاقت جاوید، تبصرہ نگار تمثیلیہ زاہد کی بیٹی آئرشہ سعیدہ کی سالگرہ۔

☆☆☆

رخ چوہدری، کراچی سے۔ ”پاکیزہ کی روح رواں محترمہ عذرا رسول کو سالگرہ بہت بہت مبارک ہو اور ان کے شریک حیات محترم جناب معراج رسول کو صحت کا ملکہ عطا فرمائے۔ اللہ تعالیٰ اپنے حفظ و امان میں رکھے، آمین۔  
انجمن پاکیزہ کی سالگرہ ہر سال بہت اہتمام سے نئے رنگوں کی قوس قزح میں اور آئندہ کے لیے نئے خوابوں، نئے ارمانوں کی جلت رنگ میں منائی ہیں، ہر سال ایک نیا رنگ ہوتا ہے مگر اس بار تو آپ نے نئے پن اور خوب صورتی کی حد کر دی۔ اپنی، اپنی تحریر کی ہیر و منیر کو اپنی رائے کو اپنی شہزادیاں بنا کر اپنے دربار میں حاضر کر لیا۔ تو یہ کینز رخ چوہدری جس کو آپ نے اپنی محبت کا تاج پہنا دیا اور اپنے ٹرسٹ کا اعزاز اس کے ہاتھ میں دیا تو یہ کینز جو آپ کا اعزاز پانے کے لیے شہزادی بن چکی ہے۔ آپ کے دربار عالیہ میں بے حد پیار، محبت، عقیدت و احترام اور دعاؤں کے نذرانے لے کر حاضر ہوئی ہے اور آپ کی فراخ دلی سے توقع کرتی ہے کہ آپ اس نذرانے کو قبول فرما کر اپنی شہزادی کی عزت افزائی فرمائیں گی۔  
شکریہ ماشاء اللہ، ماشاء اللہ آپ کا دربار تو آپ کی حسین شہزادیوں سے سجا ہوا ہے۔ سب کتنی پیاری لگ رہی ہیں۔ آداب شمیم فضل خالق آپا، تسلیات شوکت آپا، رضوانہ پرنس آپ تو ہیں ہی پرنس۔ ملکہ عالیہ آپ کی طرح ہم بھی آپ کی چننے شہزادیوں کو جاننے ہیں باقی شہزادیوں کو ہم نے آپ کی نظر سے دیکھا۔ آپ کے میٹھے شہزادائیں لہجے سے ان کے بچوں کو سنا۔ آپ کی صحبتوں کے پیراہن میں دیکھا تو ہمیں سب کی سب مس و دلزدہ لگیں۔ اسی لیے تو پاکیزہ کا آنگن ہر گھر میں چھوڑ دیا کہ چاند بن کر اترتا ہے۔ ملکہ عالیہ ہمیں آپ کی کچھ شہزادیوں سے کچھ شکایت بھی ہے اور چونکہ آپ محبت کا دربار سجائے بیٹھی ہیں تو ہمیں پورا یقین ہے کہ آپ انصاف کریں گی اور ہماری ان ساتھی شہزادیوں کو اپنے دربار میں حاضر فرمائیں گی اور نرم سے نرم الفاظ میں ان سے کہیں گی کہ پیاری شہزادیوں کی وی چینل سے وابستہ ہونے کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ آپ دوستوں کو بھول جائیں..... ناں جی ناں بری بات ہے ایسا نہیں کرتے۔ پیارے قارئین ہماری انجمن ادیب کو ایک ماہر طبیب بھیجتی ہیں جبکہ ان کو اندازہ نہیں کہ ان کا بیٹھا لہجہ ان کی محبت بھری کلمی اور نصیحتیں ہم جیہوں کے لیے بانی پاور ڈاٹ کام اثر رکھتی ہیں۔ آج کی محفل کا سب سے خوب صورت اور مختصر عذرا رسول صاحبہ کا سالانہ خطاب ہے۔ مختصر الفاظ میں انہوں نے اپنی رائے کی تعریف بھی کی اور اصلاحی کلمات میں تحریر سنوارنے کا شورہ بھی دیا۔ انہوں نے سالانہ خطاب میں انجمن انصار کو پاکیزہ کی کپتان قرار دیا اور جب کسی پرواز کا کپتان اتنا نیک نیت، محنتی، مخلص ہو جس کا لہجہ شہدائیں، لفظ کلیوں سے ہوں تو پرواز بلند سے بلند تر ہوتی جاتی ہے۔ انجمن آپ نے اپنی شہزادی کی اتنی تعریف کی ہے کہ ہر ایک سے بات کرنے اور دوستی کرنے کو دل چاہنے لگا ہے۔ آپ کا اقبال بلند ہو ملکہ عالیہ آپ کی اس محفل میں بہت سے نئے نام یعنی نئی شہزادیاں لکھ رہی ہیں بہت اچھا لکھ رہی ہیں جیسے عتیقہ محمد بیگ، بہت اچھا اور خوب صورت اضافہ ہیں۔ پلاٹ میں انفرادیت بھی ہے اور تحریر میں سادگی کا حسن بھی مگر جیسے آپ نے کہا کہ کینے کا عمل کبھی

ہر ماہ ایک دلچسپ خط ہمیں ارسال کریں تو ان کا خط یقیناً خصوصی نوعیت کا ہوگا۔

☆ شہزادی گیتی آرا افسانہ نگار بھی ہیں اور تبصرہ نگار بھی۔ انہوں نے ہمیں بتایا تو نہیں مگر ہمارا خیال ہے کہ شاید وہ ڈاکٹر ہیں۔ اس لیے ان کا تبصرہ ہم مشکل سے پڑھ پاتے ہیں۔  
☆ شہزادی سدرہ کلثوم، مکی مروت سے تعلق ہے۔ تبصرہ لکھتے ہوئے اپنے ہاتھ میں تین چار رنگ برنگے مار کر رکھتی ہیں۔ تبصرے پر پھول بھی ہوتے ہیں اور تبصرہ بھی قوس قزح کا حامل ہوتا ہے۔

☆ اب پائین بارغ کے اس گوشے میں آجائیں جہاں شہزادیاں بڑے سلیقے سے گجرے بن رہی ہیں حالانکہ یہ کام مالوں کا ہے مگر ہماری شہزادیاں لفظوں سے پھول جھلانا چاہتی ہیں۔ ان بہنوں کی لکھائی ایسی ہے جیسے موتی بکھرے ہوں۔ یہ شہزادیاں بیقر رانا، چکوال کی ہیں۔ فضا بٹول، بھارہ کوہی ہیں۔ سامعہ نسیم کا تعلق ملتان سے ہے۔ ارم کمال کا فیصل آباد سے۔ جبین ہاشمی کا بمبیرہ سے۔ انعم حنیف کا بکھر سے۔ ایشل شادیاں اور شبانہ کا گولارچی سے اور شازیہ رباب کا نند پور کا موٹی سے۔

☆ شہزادی گلشن ناصر کا اپنا بیوٹی پارلر بھی ہے۔ وہ جب بھی مجھے فون کرتی ہیں وہ بھی منوری ہی نظر آتی ہیں۔ وہ اور ان کے شوہر ایک جیسے کڑھائی والے سوٹ پہنا کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے ان کی شہرت کپل آف پنجاب تک تو پہنچ چکی ہے مگر وہ وقت دوڑیں کہ وہ کپل آف پاکستان بھی بن جائیں۔ ماشاء اللہ ہر شوہر کو اپنی بیوی کا ایسا ہی عاشق بنا کر رکھے۔  
☆ شہزادی نجمہ ناز اصغر ہماری نئی تبصرہ نگار ہیں اور ایسے محبت بھرے لہجے میں بات کرتی ہیں کہ لگتا ہے کہ یہ تو ہمیں اپنی کوئی چھڑی ہوئی بہن ہیں پتہ چلتا نہیں کب ہم سے جدا ہو گئی تھی۔

☆ سچی بات تو یہ ہے کہ تبصرہ نگار بہنوں کی تعداد ہماری مصنفات کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے اور اس وقت میرے قلم کے دماغ میں سب کے نام بھی نہیں آ رہے ہیں مگر مجھے آپ کی خشکی کا ڈر بھی ہے اس لیے ان شہزادیوں کا ذکر جو بارغ کی غلام گردشوں میں گھومنے کے باعث پکڑ میں نہیں آ رہی ہیں ان کا ذکر پھر بھی بلکہ یہ سلسلہ ابھی جاری ہے کیا.....؟ اب کوئی ناراض ہو کر تو دکھائے۔ آخر ہوں ناں آپ کی باجی اللہ آپ سب کو بل پل خوشیاں عطا فرمائے، صحت کا ملکہ کے ساتھ۔ آمین، ثم آمین اور آئیے اب سرگرمیوں پر نظر ڈالنے سے پہلے دروازہ ابھی پڑھتے ہیں جو نماز میں پڑھا جاتا ہے اور اس کے بعد صرف تین بار آیت کریمہ پڑھ کر اپنے لیے، اپنے ملک کے لیے اور عالم اسلام کی پریشانیوں کو رفع کرنے کے لیے ضرور دعا کریں۔ ابھی پڑھ لیں۔

لا الہ الا انت سبحانک انی کنت من الظالمین

☆☆☆

مصنفات، شاعرات اور قارئین پاکیزہ بہنوں کی تازہ بہ تازہ سرگرمیاں

☆ نئی نسل کی معروف مصنفہ عتیقہ محمد بیگ کے افسانوں کا مجموعہ دل کے آئینے شائع ہو گیا ہے۔ جس میں ان کے بہترین افسانے اور ناول شامل ہیں۔ اس ضخیم کتاب کی قیمت صرف تین سو روپے ہے۔ جسے خزانہ علم و ادب الکریم مارکیٹ، اردو بازار لاہور سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری جناب و بیگم ڈاکٹر محمد ارشد کی پیاری بیٹی وجیہہ ارشد کی شادی محسن جاوید سے خوب دھوم دھام سے ہوئی۔ جس میں ہم نے بھی شرکت کی۔ (مبارک باد)

☆ پاکیزہ کی تبصرہ نگار اور شاعرہ مسز مع حسین اپنی بیٹی نازیہ حسین کے ساتھ ٹورنٹو سے کراچی ایک شادی کی تقریب میں شرکت کرنے کے لیے آئیں۔ (ماشاء اللہ)

☆ پاکیزہ کی تبصرہ نگار مسز قصیر قد رگزشہ دنوں کینیڈا سے لاہور آئیں۔ اپنے عزیز واقارب سے ملاقات کے لیے۔  
☆ میرے چھوٹے بھائی ڈاکٹر شکیل انصار اور بھابی نادرہ امریکا سے واپسی پر عمرے کی سعادت حاصل کرتے ہوئے اسلام آباد آگئے۔ (مبارک باد)



ملاقات بھر پور رہی ان کا انٹرویو اچھا رہا۔ پاکیزہ ڈائری بہت اچھا سلسلہ ہے جس میں بہت کچھ ملتا ہے۔ بس آپ جب جب ہمیں یاد کریں گی ہمیں ساتھ پائیں گی پاکیزہ کے لیے اور بہنوں کے لیے اور حیرت انگیز دعائیں۔ اس دعا کے ساتھ کہ اللہ رب العزت ہمیشہ اپنے ذکر میں مشغول رہے اور ہمیں اپنے حبیب پاک ﷺ اور آل رسول ﷺ کی محبت عطا فرمائے، آمین۔“ (جزا اللہ)

حضرت خیمہ خالق، پشاور سے۔ ”سب سے پہلے تو میں آپ کا ناول سے شکر یہ ادا کرنا چاہوں گی کہ آپ نے مجھے بہنوں کی محفل میں اس محبت سے، اتنی عزت سے پکارا۔ واقعی جو لوگ خود قابلِ عزت ہوں وہ دوسروں کو بھی اتنی ہی عزت دیتے ہیں۔ آپ ہمارے لیے ایسی شہزادی ہیں جو تمام شہزادیوں کے دلوں پر راج کرتی ہیں۔ خدا آپ کو صحت اور زندگی عطا فرمائے اور پاکیزہ کے اوراق پر ہمیشہ آپ کا قلم راج کرتا نظر آئے، آمین۔ میں نے اس بار پاکیزہ جلدی ختم کیا تو سوچا اس بار تیرہ کردوں۔ امانت، رفعت سراج کا ناول ہے تو یقیناً اچھا ہو گا لیکن ابھی اس کی شکل نہیں لگی دو چار سطروں کے بعد ہی صحیح صورت حال سامنے آئے گی۔ کہیں وہ پبلشرز کیساتوں قسط اچھی لگی۔ سر پرانز میں سیکرٹ فرین نے ساسوں کو بڑا خوب صورت سبق دیا ہے کہ اگر وہ چاہیں تو بیٹے کا گھر اجڑنے سے بچ سکتا ہے۔ عزیزہ سید کا شام شہر یاراں کی پہلی قسط بہت پسند آئی آگے چل کر یہ مزید غور جائے گی۔ کاشالاہ کالا صاعدا کرم کی تحریر تو اس شارے کی جان بنی۔ پڑتے پڑتے کسی بار بہنوں نے کسی کا فورا چھوٹا بڑے مزے کی تحریر بھی۔ شیریں حیدر کی تحریریں مجھے ہمیشہ سے پسند ہیں میں بڑے شوق سے سب سے پہلے ان کی تحریر پڑھتی ہوں لیکن ان کی تحریر پیارم سے ہے ایسا پڑھ کر جہاں مجھے نگار کی تگ و دو اچھی لگی۔ اس کا جذبہ اپنیل بچوں کے لیے کاوشیں سب ٹھیک تھا لیکن اسے گھر سے بھاگنے کی مال باپ کا دل دکھانے اور ان کی عزت پامال کرنے کی ساز اور دینی چاہیے تھی جو کہ شیریں نے نہیں دی۔ شاید میری طرح اور بہنوں نے بھی ایسا محسوس کیا ہو، سوئی شیریں۔ مکمل ناول بہار ہمارے میں ہے ثریا انجم کا بے مثال ناول ہے۔ تیرہ کردار بہت پسند آئے کسی اس حوالے سے قائم رہی کہ لاسٹ میں تیور بھی کہیں سے آجا تا اور دینی اور بیٹے کے ملاپ پر خوش ہو جاتا۔ وہ آئے بزم میں، میں حینہ معین سے ملاقات، بہت اچھی رہی۔ تصویر میں ایک ماڈرن لباس میں بلوئیں حینہ کو دیکھ کر ایک خوشگوار سی حیرت ہوئی۔ نزہت اصغر آپ کا شکر یہ کہ آپ ہم سے اتنے اچھے، اچھے لوگوں کی اچھے طریقے سے ملاقات کرواتی ہیں۔ جلتز کو حسب معمول جلتز تک ہی بجا رہا تھا۔ سب سے اچھا اس مرتبہ اور یہ دن لگا۔ انجم میرے نوکر کو ہمیشہ میری سہیلیوں سے یہ شکایت رہتی ہے کہ وہ کبھی کوئی رہنمی اسے ٹھیک سے نہیں بتا میں جبکہ میں اسے بتی ہوں کہ تم میری کوئی چیز نہ کر کے ہو گے ورنہ وہ یوں غلط بتائیں گی۔ بہر حال جلتز گ بہترین تھا۔“ (تیرے کا شکر یہ)

حضرت سعدیہ رئیس، کراچی سے۔ ”شہزادیوں کی محفل پڑھ کر کچھ چلیے خیالات دماغ میں آئے تو انہیں لکھنے کو دل چاہا۔ سب سے پہلے تو اپنا بچپن یاد آ گیا۔ عرصہ ہوا اپنے لیے اس قسم کے الفاظ سے ہوئے کہ اب تو اپنے بچوں کی ماں اور میاں جی کی بیگم ہیں۔ کسی کی بچپو، کسی کی خالہ، کسی کی بھانجی وغیرہ وغیرہ۔ یہ شہزادی، نگریا اور ننھی کے الفاظ تو میری امی ہی بولا کرتی تھیں سو بڑے عرصے کے بعد یہ گشتہ لفظ اپنے لیے دیکھ کر بڑی خوش ہوئی اور دوسرا خیال بڑا ٹھنڈا تھا وہ یہ کہ جس وقت شہزادی کا لقب اپنے لیے پڑھا تو اس وقت موصوفہ شہزادی صاحبہ جن کی گری سے بے حال پینوں میں ڈوبی اس انتظار میں تھیں کہ کب پسینہ خشک ہو اور نہانے کے لیے جاؤں۔ سو ٹیلی جیلی شہزادی کا تصور مزہ دے گیا اور ساتھ ہی یہ خیال بھی آیا کہ باقی ساری شہزادیوں اس وقت کیا، کیا کر رہی ہوں گی جب ان کے ہاتھ میں اپنا شہزادی کا ایوارڈ آیا ہوگا۔ کیوں نہ ان سب شہزادیوں کی ایک محفل ایسی سجائی جائے جس میں۔ سب سے تیا میں کہ جب انہیں شہزادی کا خطاب ملا تو وہ اس وقت کیا کر رہی تھیں اور آخر میں جس طرح آپ نے ساری شہزادیوں سے معافی طلب کی اس میں بے شک آپ کی عاجزی و انکساری شامل ہے مگر مجھے لگا کہ آپ نے انہیں بلکے چھلکے انداز میں وارننگ سی دی ہے کہ شہزادیوں اپنے اپنے مزاج کو قابو میں رکھو زیادہ سر پرمت چڑھو جیسے بچپن میں ہماری کسی بات پر بڑے ڈانٹتے ہیں کہ لو ابھی شہزادی صاحبہ کا مزاج ہی نہیں مل رہا۔ شہزادیوں کی طرح غرے ہو رہے ہیں۔ خیر یہ ایک مذاق تھا۔ یہ آپ کا بڑا اپن ہے کہ آپ نے سب مصنفات کو محبت سے یاد کیا۔ آپ کا بہت، بہت شکر یہ۔“ (پسندیدہ کی کا شکر یہ۔ میری لیے تمام

رکتا نہیں ہے ہمیں ہر وقت بیکھتا ہے۔ بڑوں سے چھوٹوں سے۔ غور کریں تو ماحول سے چرند پرند سے۔ ملکہ عالیہ مجھے تو اب بہت کچھ کہتا ہے مگر ڈرتی ہوں کہ کہیں چھٹی طوالت کی سزا نہ پائے اور آپ نے میرے لیے جس اعتماد، جس ٹرسٹ کا اظہار کیا ہے یہ میرا ایوارڈ ہے سالانہ ایوارڈ۔ یہ میری زندگی کا سب سے قیمتی ایوارڈ ہے۔ کسی کا اعتماد حاصل کرنا کسی ایوارڈ سے زیادہ قیمتی ہوتا ہے۔ اللہ کا احسان اور شکر ہے کہ اس نے یہ ایوارڈ مجھے آپ سے دلوایا۔ تیرے کی پہلی قسط ہے مافی آئندہ ماہ انشاء اللہ بشرطِ زندگی۔ اللہ تمہارا۔ اللہ تمہارا۔ اللہ تعالیٰ کرے کہ آپ ہر سال ایسا دربار سجا لیں، آمین۔“ (شہزادی صاحبہ! میں ملکہ عالیہ نہیں بلکہ اس دربار کی ایک کنیز ہوں جو ہاتھ جوڑ کر معافی بھی مانگا کرتی ہوں۔ اللہ ہم سب کو خوشیوں اور صحت کے ساتھ سلامت رکھے، آمین)

حضرت اقبال بانو، وہاڑی سے۔ ”پاکیزہ مجھ میں شہزادیوں سے مل کر بے حد خوش ہوئی۔ انجم تم کو یہ کیسے پتا چلا کہ میرا فیورٹ کلر سرخ اور بلیک ہے۔ مگر محبت جلوں کا شکر یہ۔ اپریل کے شارے میں عزیزہ سید کے ناول کی پہلی قسط نے ہی قاری کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ شیریں حیدر کا افسانہ بھی بہت اچھا لگا۔ قیصرہ حیات کے ناول کی قسط بھی ٹھیک رہی۔ رفعت سراج کے ناول مجھے ہمیشہ سے پسند رہے ہیں مگر معذرت کے ساتھ کہنا چاہوں گی کہ اس دفعہ پڑھ کر مزہ نہیں آیا۔ تمام ٹی وی چینلوں اور تمام رسائل میں سازشی قسم کی کہانیاں نظر آ رہی ہیں۔ کیا اب ہر طرف سازشوں کے ہی جال بنے جاتے ہیں۔ ہاں حینہ معین کا انٹرویو اور تصاویر دیکھ کر کچھ خاص نہیں لگا۔ نفسا فانی کے اس دور میں ایسا تو ہو رہا ہے اور جہاں نہیں ہو رہا وہ اس نائپ کے ڈرامے دیکھ کر ایسا بننے کی کوشش کر رہے ہیں۔“ (تیرے کا شکر یہ)

حضرت سیمنا مناف، کراچی سے۔ ”محترمہ عذرا رسول کا پیغام بے حد محبت بھرا اور دل کو چھو لینے والا تھا۔ پاکیزہ مجھ کی تمام شہزادیوں سے مل کر بہت مزہ آیا۔ رفعت سراج تمہارا ناول بہت اچھا لگ رہا ہے۔ اس کی ہر قسط میرے لیے عزیزہ سید کا ناول دیکھ کر کبھی خوشی ہوئی۔ دیگر تحریریں بھی بہت اچھی تھیں اور ایک خاص بات پاکیزہ شہزادیوں کے بارے میں انجم تم نے بڑی چچی باتیں لکھی ہیں۔ ہماری شاکرہ عزیز فون کٹ جانے کو واقعی خدا حافظ سمجھ لیتی ہیں۔“ (ہاں یہ تو ہے)

حضرت ذکیہ ایوب، کراچی سے۔ ”سالگرہ نمبر بہت شاندار ہے۔ پورا ہی پرچا منفرد تھا مگر پاکیزہ مجھ کی شہزادیوں سے ملاقات کا بہت مزہ آیا۔ ہر شہزادی کے بارے میں تمہارے پہلے دل کو چھوتے رہے۔ مجھے اس شارے میں تمہارے افسانے یا ناول کا انتظار تھا مگر تم نے پاکیزہ مجھ کی سیر کروا کر اس کی کو پورا کر دیا، جتنی رہو اور اس طرح کے نئے اور منفرد آئیڈیے لے کر پاکیزہ کو کھانی رہو۔ حینہ معین سے ملاقات بھی مناسب تھی۔ عزیزہ کی پہلی قسط پسند آئی۔ رفعت سراج کا ناول بھی آپ کچھ سمجھ میں آئے لگا ہے ان کے دیگر ناولوں کی طرح یہ بھی جس سے بھر پور ہے۔ سیکرٹ فرین کی سر پرانز بہت اچھی کہانی تھی۔ قیصرہ حیات کا ناول بھی ٹھیک چل رہا ہے۔ راحت و قالا اور والی نے مذاق لکھ کر لڑکیوں کو سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ صاعدا کرم نے بہت محفوظ کیا۔ کرداروں کے نام ہم کو کبھی بچھلے دور میں لے گئے۔ بہت عرصے کے بعد صاعدا اپنے پرانے رنگ میں نظر آئیں۔ شیریں حیدر نے اپنیل بچوں پر لکھا مگر ہر لڑکی نگار بھی مضبوط نہیں ہو سکتی۔ ثریا انجم نے بھی اچھا لکھا۔ جلتز تک کے تمام خاگوں نے سکرانے پر مجبور کر دیا۔ ہمیں یہ جان کر بے حد خوش ہوئی کہ تم نے اپنے ناول کا کچھ سی لڑکی کا مناسب امینہ عندلیب کے نام کیا ہے۔ ہم امینہ عندلیب کی صحت اور زندگی کے لیے دعا گو ہیں۔“ (آمین)

حضرت اختر شجاعت، کراچی سے۔ ”آپ کی خوب صورت محفل جس میں محبتوں کے رنگ بکھرے ہوئے ہیں اور یہ آپ کی بے حد محبت ہے کہ ہم بھی کم کلم ہستی کی باتیں سن لیتی ہیں ورنہ آپ کا مطالعہ..... بس خیر کیا کہیں ماشاء اللہ... انٹھارویں کتاب کی اشاعت پر بہت مبارک باد۔ آپ کو پاکیزہ کی سالگرہ کی بے حد مبارک باد۔ عذرا رسول صاحبہ اور ان کے تمام اراکین کو میری جانب سے دلی مبارک باد۔ پاکیزہ ہمیشہ سے میرا ہٹاؤ انجسٹ رہا ہے۔ اس لیے بھی کہ اس میں دل کو چھو لینے والی تحریریں شائع ہوتی ہیں۔ اس بار ادارہ ہمیشہ کی طرح بہت شاندار اور بے حد جاندار اور باور آپ کا پاکیزہ مگل اور ہماری شہزادیوں سب بے حد بردست رہا۔ پڑھ کر حیرتوں لطف آیا بہت سی یادیں تازہ ہو گئیں۔ حینہ معین سے



شہزادیاں باعث شکریم ہیں)

”جنگہ جیل عزیز کی، ڈی آئی خان سے۔“ تازہ شمارہ حسب معمول بے حد اچھا لگا۔ مجھے کچھ کہنا ہے تو دل موہ لیتا ہے۔ رفعت سراج کی امانت دھیرے دھیرے ہمیں اپنے سحر میں جکڑ رہی ہے۔ کہیں ویپ جلے کہیں دل قیصرہ حیات کی خوب صورت تحریر اپنا آپ منور ہی ہے۔ باقی افسانے اچھے تھے۔ نئے ناول کا شدت سے انتظار ہے۔ انٹرویو بہترین تھا۔ آپ کی تحریر کا انتظار ہوتا ہے گوکہ جلتی رنگ کی صورت میں ہر ماہ قاری بہنوں کے لبوں پر مسکرائیں تو آپ بخیر ہی رہتی ہیں۔“ (شکر یہ)

”مسز عظمیٰ خورشید، لاہور سے۔“ اپریل کا سالگرہ نمبر بہت پسند آیا ساری شہزادیوں سے مل کر بہت مزہ آیا اور ہم کو بھی ایسا لگا جیسے ہم کسی گل میں موجود ہوں۔ کمال کی منظر نگاری تھی۔ عزیزہ سید بہت اچھی رائٹر ہیں ان کے ناول کی پہلی قسط نے ہی قاری کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ بہت اچھا لکھا انہوں نے، بہت مبارک باد۔ اس ماہ تقریباً سارے ہی افسانے اچھے تھے مگر سیکینڈ فرخ کے سر پر اترنے تو بازی جیت لی۔ اب واقعی ایسی ہی ساسوں کی ضرورت ہے، ویل ڈن۔ روحانی مشورے اور جلتی رنگ کی تو تعریف ہی نہیں کر سکتی۔ ہاں انجمن میں بھی تمہاری اس رائے سے متفق ہوں کہ ترکی کے ڈرائے فوراً بند ہونے چاہیں ورنہ یہ معاشرے میں گند پھیلا دیں گے۔“ (تبرے کا شکر یہ)

”سمیرا حمید فاروقی، کراچی سے۔“ پاکیزہ کا سالگرہ نمبروں بہت کیونٹ سالگرہ۔ سب سے زیادہ خوشی پاکیزہ محل میں آکر شہزادیوں سے مل کر ہوئی۔ اس ماہ سب سے اچھا ناولٹ صائمہ اکرم کا رہا۔ بہت عرصے کے بعد صائمہ نے اپنے رنگ میں لکھا ہے۔ شیریں حیدر کی تحریر میں ہمیشہ ایک پیغام ہوتا ہے اور انہوں نے بہت عمدگی سے اپنا افسانہ لکھا ہے۔ عزیزہ سید کے ناول کی پہلی قسط پسند آئی۔ قیصرہ حیات بھی بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ ہاں حینہ معین کا انٹرویو بھی بہت اچھا لگا۔“ (پسندیدگی کا شکر یہ)

”فیروزہ تنیم، کراچی سے۔“ محل کی سب شہزادیوں کو سلام، دعا، پیار۔ سب سے مل کر بے حد خوشی ہوئی۔ آپ نے جس محبت سے اپنی مصنفات اور شاعرات کا ذکر کیا ہے۔ وہ تحریر سے چمن کر دکھائی بھی دے رہا ہے۔ سیکینڈ فرخ کا افسانہ سب سے زیادہ پسند آیا۔ شیریں حیدر نے اچھا تو لکھا ہے مگر مجھے، اس کے اختتام سے اختلاف ہے۔۔۔۔۔۔ ہر ایک کی رائے مختلف ہی ہوتی ہے۔ صائمہ اکرم کی تحریر بہت اچھی رہی۔ قیصرہ حیات کی قسط اسی ماہ بھی جاندار تھی۔ رفعت سراج کا ناول بھی اپنی جگہ بنانے میں کامیاب ہو چکا ہے۔ ہاں حینہ معین کی تصاویر پسند نہیں آئیں۔ انٹرویو بھی بس ٹھیک ہی لگا۔“ (تبرے کا شکر یہ)

”انتظار شوق، میاں چنوں سے۔“ پاکیزہ سے میری جذباتی وابستگی ہے۔ اس کے بغیر زندگی میں پھیکا پن لگتا ہے۔ پاکیزہ نگل میں ڈھیر ساری شہزادیاں ہیں، جن کے بارے میں آپ نے بڑی محبت سے جملے لکھے تھے اور آپ مجھے بھول گئیں مگر آپ نے پہلے ہی معذرت کر لی ہے اس لیے معاف تو کرنا پڑے گا مگر اپنی شکایت بھی تو آپ سے ہی کرنی ہے تاکہ آئندہ نہ بھول سکیں۔“ (آپ کی شکایت برحق ہے)

”شائستہ انجم، کراچی سے۔“ انجمن آپ کا بے حد شکر ہے۔۔۔۔۔۔ آپ نے پاکیزہ محل میں مجھے جگہ دی۔“ (ارے شکر یہ تو آپ سب کا ہے آپ شہزادیوں کی خوب صورت تحریروں کی وجہ سے پاکیزہ محل کی دلکشی قائم ہے)

”پروین حمید، پنجاب سے۔“ شکر ہے کہ میں نے یہ سطور پڑھ لیں کہ پاکیزہ نگل میں تبصرہ نگاروں کا ذکر نہیں کیا گیا۔۔۔۔۔۔ ورنہ تو میں آپ کا کیا حشر کرتی؟“ (شکر یہ تو مجھے کرنا چاہیے کہ میرا کیا ہوتا)

”انیلا ناہید، لاہور سے۔“ شہزادیوں کی اتنی بڑی تعداد سے مل کر بڑی خوشی ہوئی، ویسے یہ اتنا منفرد اور خوب صورت آئیڈیا کس نے دیا تھا آپ کو؟ (میرے دل نے دیا تھا) اس ماہ تمام افسانے اور ناولٹ شائد ار رہے۔ شیریں حیدر، سیکینڈ فرخ، قیصرہ حیات نے کمال کر دیا۔ حینہ معین کا انٹرویو تو اچھا ہی تھا مگر ان کی جوانی سے بڑھاپے تک کی تصاویر بہت شائد ار ہیں۔“ (شکر یہ)

## بچوں کی محفل

✉ سیدہ برحیس رباب، ٹیکسلا۔ خوش آمدید تمہاری شاعری نظر سے گزری ہے اور اچھی لگی ہے اور میرا یہ پکا خیال ہے کہ تمہارے اندر ایک شاعرہ چھپی ہوئی ہے۔ ابھی افسانہ نہیں پڑھا ہے جب پڑھ لوں گی تو رائے دے دوں گی ہاں۔۔۔۔۔۔ آپ سب بچوں کے گھر کے فرد جتنی ہی اہمیت کی حامل ہیں۔ آپ مجھے دن کے گیارہ سے شام چار تک اس نمبر پر فون کر سکتی ہیں۔ 021-36981952

”جمہ، نیویارک سے۔“ یہاں کی سب سے بڑی شاپ منصور بکسٹال ہے۔ یہاں سب رسائل آتے ہیں مگر اس میں پاکیزہ نمبروں ہے۔ مجھے سب سے زیادہ اچھا غنڈہ رسول کا انٹرویو لگا تھا۔ اب انجمن آپ ایسا انٹرویو ضرور دیجیے۔۔۔۔۔۔ پاکیزہ میں اپنا خط پاکر مجھے بے حد خوش ہوئی تھی یہ محفل واقعی ہر فیملی کا لاؤنج ہے۔ آپ کی سب سے اچھی بات درود پاک پڑھنے کی تلقین ہے اور یوں ہر ماہ لاکھوں کروڑوں سرشتیہ درود پاک اور آیت کریمہ پڑھا جاتا ہوگا۔ میں پاکیزہ کے کس، عکس سلسلے کی تعریف کروں، سب ہی تحریریں مجھے پسند آتی ہیں مگر اس میں سب سے نمایاں آپ کا اپنا پن ہے جس نے ہمیں ایک ہی ڈوری میں باندھ رکھا ہے۔“ (پیاری نجمہ، اب اس محبت کو قائم رکھنے کے لیے آپ بھی باقاعدگی سے شرکت کریں، اپنے تجربات سے بہنوں کو مستفید کریں، مجھے خوشی ہوگی)

”کنیم، ماروے سے۔“ سالگرہ مبارک، پاکیزہ کی تحریریں ہمارے لیے ایک اچھے سبق کا درجہ رکھتی ہیں۔ انجمن باجی آپ ادارہ لکھیں یا جلتی رنگ۔۔۔۔۔۔ آپ کا پیغام بڑا زبردست ہوتا ہے۔ اب آپ کے افسانے اور ناول کا انتظار ہے۔ عمیرہ احمد کے عکس کا اثر ابھی تک دل و دماغ پر ہے۔ بس ان سے ایک چھوٹی سی بات پوچھنی تھی انہوں نے شاید ابتدائی قسط میں لکھا تھا اس میں ایک بیکیلی ہے تو اس میں کون سی بیکیلی تھی۔۔۔۔۔۔؟ (مجھے نہیں یاد کہ عمیرہ نے ایسی کون سی بات لکھی تھی)

”انیسہ حامد، کراچی سے۔“ پاکیزہ وقتاً فوقتاً پڑھتی ہوں اور مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ سب سے زیادہ جلتی رنگ پسند ہے اس کے بعد بہنوں کی محفل۔۔۔۔۔۔ انجمن باجی آپ عموماً ذاتی باتوں کے جواب نہیں دیا کرتی ہیں مگر پڑھنے والوں کو اپنی رائے کی ذرا احتیاط سے بھی گہری دلچسپی ہوا کرتی ہے۔ آج صرف ایک چھوٹا سا سوال پوچھنا چاہتی ہوں کہ آپ نے اپنی زندگی میں کیا خوبیاں اور کیا پایا۔“ (پیاری انیسہ۔۔۔۔۔۔ جو میں نے کھویا وہ میری نادانی تھی اور جو میں نے پایا وہ میرے رب کی مہربانی ہے)

”صبا نور، لاہور سے۔“ پاکیزہ نگل میں رائٹر شہزادیوں کی اتنی بڑی تعداد دیکھ کر خوشی ہوئی اور حیرت اس بات پر ہوئی کہ ہر شہزادی کے بارے میں آپ کی رائے مختلف تھی۔ کسی رائے میں شکر اربک نہیں تھی۔۔۔۔۔۔ سب سے مل کر یوں لگا جیسے ہم کسی محل میں آگئے ہوں اور انہیں رو رو دیکھ رہے ہوں۔ عمیرہ احمد تو بہت ہی پیاری لگ رہی تھیں۔ قیصرہ حیات کی پٹی تک سنائی دے رہی تھی۔ سیما مناف کا کڑکھانہ والا سوٹ تک دکھائی دے رہا تھا مگر آپ آپ ایک شہزادی کا ذکر کرنا بھول گئیں جو برسوں سے ہمارے ساتھ ہے۔ میرا مطلب ہے شہزادی عظمیٰ آفاق، آپ نے اپنی شہزادی کو کیوں نہیں شامل کیا؟“ (پیاری صبا! مجھے اس بات کا پکا یقین تھا کہ میں بہت سے نام لکھنے بھول جاؤں گی۔ اس لیے عظمیٰ کا نام تصداق نہیں لکھا تاکہ کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ اپنی بیٹی کا نام یاد رہا اور ہمارا نہیں جبکہ دیگر بھی میرے لیے میری بیٹیوں سے کم نہیں ہیں)

”ایشل شاد دیاں، گولارچی سے۔“ آپ نے میری نظم، مجھے محبت کی تلاش ہے کومرسلہ کے طور پر شائع کیا جبکہ وہ میری اپنی محنت تھی میں نے خود لکھی تھی۔ ناہید سلطانہ اختر کا زندگی بہت ہی زبردست ناول تھا۔ اس کا ایڈ بہت زبردست رہا۔ حجاب اور سیف علی کے ملنے نے ہمیں حیران کر دیا۔ بہت زبردست ناول تھا حقیقت سے بھرپور اور سبق آموز۔ میری طرف سے ڈھیروں ڈھیر مبارک باد قبول کیجیے۔ رفعت سراج کا نیا شروع ہونے والا ناول امانت جس کے بارے میں ابھی کچھ نہیں لکھی تھی کیونکہ ابھی کچھ رازوں سے پردہ اٹھنا پائی ہے۔ ہاں اتنا ضرور کہوں گی کہ درود مارا کتنا زکی دوستی سے مجھے ایک لڑکی یاد آئی اس نے بھی کالج میں ایک لڑکی سے دوستی کی تھی دونوں کا ایک دوسرے کے بغیر تھوڑی دیر بھی رہنا مشکل تھا۔ ساڑھے رضا کی ہارے بھی تو بازی مات نہیں پڑھ کر لوگوں کی عقلوں پر دکھ ہوا۔ حدیث دل نے دل کو چھو لیا بہت ہی اچھی تحریر تھی بلکہ بہترین تھی۔ یہ پاکیزہ کی بیسٹ خرید لگی مجھے۔ عظمیٰ انتظار جی مبارک باد کو کرنا نہیں بلکہ



ٹک قبول کیجئے۔“ (تبرکے کا شکر یہ)

شاکر عزیز، کراچی سے۔ ”اس مرتبہ آپ نے ہم جیسے نالائقوں اور نکلوں کو اتنے پیار سے شہزادیوں میں شمار کیا کہ قلم اور ہاتھ رک نہ سکے۔ بڑی نوازش کہ آپ اور عظمیٰ مجھے ہر سوسے میں یاد رکھتی ہیں۔ دراصل ڈراما لکھتے، لکھتے میں افسانہ گویا لکھنا بھول ہی گئی ہوں۔ عزیز سید کا ناول ضرور پڑھوں گی۔ وہ شہزادی کیا لکھتے ہیں، رفعت سراج سے لفظ کا نواز کے معنی دریافت کرنا نہیں کہ فون کر کے تھک گئی شاید واشک مشین لگا رکھی ہو (رفعت شہین اور چکن ضرور سنبھاتی ہیں) محفل میں جو بحثیں مجرب نئے اور نوٹے بتاتی ہیں ان کے لیے جزاک اللہ، میں بھی لڑکیوں کی شادی کے لیے ایک مجرب آزمودہ طریقہ بتا رہی ہوں کہ جس لڑکی کی شادی مطلوب ہو وہ رات کو تمام کاموں سے فارغ ہو کر بستر پر لیٹ کر کچھ اوڑھنے سے قبل دوسرے سورہ قریش پڑھ کر چادر یا لحاف جو بھی اوڑھنا مقصود ہو اوڑھ کر لیٹ جائے پھر کسی سے بات کیے بغیر سو جائے۔ انشاء اللہ بہتری کے آثار جلد نظر آئیں گے۔“ (جزاک اللہ)

✉ ڈاکٹر زاہدہ پروین، بہاول پور۔ آپ کا طویل خط ملا توجہ دلانے کا شکریہ..... اللہ تعالیٰ ہماری غلطیوں کو معاف کرے..... جو جانے انجانے میں ہو جاتی ہیں مگر آپ جیسی بہنوں کے خطوط ہمیں مزید الٹ کر دیا کرتے ہیں۔ رہی بات ناول جان جان کی کہ تو وہ ایک نئی مصنفہ کی تحریر تھی اب وہ یقیناً بہت اچھی کہانیاں لکھیں گی۔

✉ سمیرا کنول، ڈیرا غازی خان سے۔ ”ناٹھل سالگرہ کی مناسبت کے حساب سے مجھے کچھ خاص نہیں لگا۔ مجھے کچھ کہنا ہے میں آپ کی پرائز باتیں پڑھیں جو کہ سالگرہ نمبر کے حوالے سے اچھی تھیں۔ کہانیوں میں امانت، رفعت سراج جس وسوسہ سے آگے بڑھا رہی ہیں۔ میرا اندازہ ہے کہ امین خان ہی رابی وغیرہ کے والد محترم ہیں۔ کہیں ویپ حلے کہیں دل قیصرہ حیات نہ جانے کیوں اس میں روئیل اور داک کی شادی کے بارے میں پڑھ کر اچھا نہیں لگا۔ ثریا انجم کا مکمل ناول اس ماہ کا بہترین ناول تھا جو کہ سالگرہ کا خاص تحفہ سمجھا میں نے، عزیز سید آتے ہی چھا گئیں۔ شام شہر یاروں کے ساتھ افسانے تو تمام اچھے تھے لیکن سر پر ان کے سبب فرخ نے کمال کا لکھا۔ باقی افسانے زیادہ سے زیادہ شامل اشاعت کیا کریں کیونکہ مجھے افسانے پڑھنا ہمیشہ سے اچھا لگتا ہے۔ صائمہ اکرم کا ناول کا لاشاہ کا لاشہ دغوان منفرد کرداروں کے ناموں سمیت پسند آیا۔ انجم باجی آپ بھی افسانہ یا ناول لے کر جلد آئیں یا وہ آئے بزم میں آئیں پلیز ہمیں شدت سے انتظار ہے۔ وہ آئے بزم میں نہت اصغر نے میری فیورٹ رائٹر حسنینہ مبین کا انٹرویو لے کر سالگرہ نمبر کو چار چاند لگا دیے۔ نہت جی ویری ویلڈن (شکریہ) اور اب آتی ہوں اپنی فیورٹ محفل میں جس کے لیے آج خط لکھا ہے۔ جی ہاں آپ بالکل ٹھیک سمجھیں۔ میں بہنوں کی محفل ہی کی بات کر رہی ہوں۔ پاکیزہ اکٹالیسویں سال میں پہنچ گیا۔ گریٹ یعنی مجھے پاکیزہ پڑھتے ہوئے قریباً دس سال ہو گئے ہیں۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ پاکیزہ کا معیار ہمیشہ اچھا ہی رہا۔ کبھی بھی پاکیزہ کو چھوڑنے کا خیال نہیں آیا۔ انجم باجی بہنوں کی محفل میں آپ کی گفتگو اور ستر معذرا رول کا پیغام پڑھا۔ مجھے اس میں یہ بات پسند آئی کہ آپ آنے والی تمام تحریروں کو انتہائی توجہ سے پڑھتے ہیں۔“ (بالکل)

✉ فصیحہ آصف خان، ملتان سے۔ ”بس قدر سننے اور اچھوتے انداز میں آپ نے سب کو شہزادی کہا، مان بڑھ گیا۔ اتنی پزیرائی اور آپ کی محبت پر انکھیں نم ہو گئیں۔ محبتوں کی انتہا تو آپ پر ہے۔ کاش میں آکر آپ کے گلے لگ جاتی اور ہاتھ چوم لیتی، ویسے گلے بھی چوم لیتی میں ناراض تو نہیں ہوں گی۔ آپ کی محبت اور شفقت اور توجہ، پیار اور خلوص ہے کہ پاکیزہ نو سال سے نوے سال کی عمر والے لڑکے، لڑکیاں مرد، عورتیں اور بزرگ پڑھتے ہیں۔ میں یہ بات پورے وقت سے کہہ سکتی ہوں کہ رسالوں میں پاکیزہ کا کوئی ثانی نہیں اور آپ جیسی شخصیات کا بھی کوئی ثانی نہیں۔ بخدا یہ لغاطی یا مالغہ آرائی ہرگز نہیں۔ میرے دل کی جی آواز ہے اور پلیز یہ کاہے گا نہیں..... ضرور لکھیے گا۔ سالگرہ نمبر کا..... وردق نظروں میں سامیا نہیں۔ بہت زیادہ سرخ رنگ اسے ناپسندیدہ بنا رہا تھا۔ ہو سکتا ہے باقی بہنوں کو پسند آیا ہو..... خبر جی آگے چلتے ہیں۔ ادب حق و سچائی زندگی کا لازمی جزو ہیں۔ بعض تحاریر افسانوی رنگ سے بھی ماوراء ہوتی ہیں۔ معاشرہ خبروں سے پرورش پاتا ہے اور خبر سوچ کے درو کرتی ہے۔ یہی خبر افسانوی رنگ اوڑھ لے تو دلچسپ کہانی کی شکل میں

## بھنوں کی محفل

دھل جاتی ہے سو آپ کی دل آویز باتیں دل میں اتر گئیں۔ امانت میں رابی کا جانا حسب توقع تھا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کہاں جاتی ہے اور ڈاکٹر مہر کی جان پر کیا بنتا ہے، کہانی دلچسپ موڑ پر آگئی ہے تاہم کچھ الجھاؤ باقی ہے۔ سیکندر فرخ کی تخیلاتی ساس، معاشرے میں خال خال پتی ہے، میرا ذاتی خیال ہے کہ بہنیں تو رسالے پر مبنی ہیں اور ساس، بیماری اور کمزور نظری کے سبب کم مطالعہ کرتی ہیں، چلیں جن بہنوں نے ساس بننا ہے ان کے لیے کاردار ہے گی۔ شام شہر یاروں پر تبصرہ محفوظ ہے۔ مذاق بچکانہ تحریر لگی کا لاشاہ کالا نے بھی زیادہ متاثر نہیں کیا۔ اسٹج ڈراما جیسی تحریر لگی۔ شیریں حیدر نے بے حد خوب صورت تحریر لکھی جاندار اور شاندار۔“ (شکریہ)

✉ عزیز بہنو! ہمارے لیے تمام مصنفات، شاعرات، تبصرہ نگار اور تمام قارئین بے حد اہم ہیں بلکہ خاص الخاص ہیں اور ہم کسی کو بھی کسی پر فوقیت دینے کے قائل نہیں ہیں مگر بعض مرتبہ..... ایسی صورت حال بھی پیدا ہو جاتی ہے کہ دماغ کھوم جاتا ہے۔ جیسا کہ میں نے نرگشہ شمارے میں بتایا تھا کہ راحت وفا کے نام سے دو مصنفات لکھ رہی ہیں۔ اب ان دونوں بہنوں کے ناراضی میں رہے خطوط ہمارے پاس آئے ہیں اور میں جانتی ہوں اس کا فیصلہ بہنوں کی عدالت میں کیا جائے۔ آپ اس بارے میں اپنی مختصر آراء دیں کہ ہم کیا کریں مگر اس کے لیے آپ کو ان دونوں کے خطوط پڑھنے ہوں گے اور یہ پہلا خط ہے لاہور والی راحت وفا کا۔

✉ راحت وفا، لاہور سے۔ ”ایک بات جو میں کرنا چاہتی ہوں اپنی ہم نام راحت وفا، ملتان سے۔ مجھے پتا چلا ہے کہ وہ بہت ناراض ہیں مجھ سے۔ یہ انہوں نے مجھ پر یہ الزام لگایا ہے کہ میں نے مشہور ہونے کے لیے ان کا نام وفا اپنے نام کے ساتھ لگایا ہے۔ میری بہن میں بہت سالوں سے لکھ رہی ہوں، شاعری، حراہیہ کہانیاں، سچی کہانیاں اور افسانے، گت 1999ء میں لاہور کے ایک میگزین کی طرف سے مجھے بیٹ رائٹر ایوارڈ دیا گیا ہے۔ سب لوگ مجھے جانتے ہیں یا پڑھتے ہیں وہ راحت وفا کو ہی پڑھ رہے ہیں۔ میں نے آپ کا نام استعمال نہیں کیا، وفا بچپن سے میرے نام کے ساتھ ہے، میرے والد مرحوم نے بہت محبت سے مجھے ایک نظم لکھنے پر غفلت دیا تھا اور تب سے لے کر آج تک یہ میرے نام کا حصہ ہے۔ اب آپ کا نام منظر عام پر آیا ہے اور لوگوں کو مجھے آپ سے کرنا چاہیے کہ آپ نے بعد میں آکر یہ نام استعمال کیا ہے پھر بھی مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ آپ کا ناول ایک نئی دنیا، پاکیزہ میں آ رہا تھا تو میرے جاننے والے مجھ سے پوچھتے تھے کہ یہ آپ کا ناول ہے تو میں انہیں بڑی خوشی سے بتاتی تھی کہ یہ ایک اور راحت وفا ہیں جو کہ ملتان میں رہتی ہیں۔ میری بہن میں لاہور اردو بازار میں رہتی ہوں ارد گرد بہت سے پہلی کیشز ادارے ہیں، روزانہ ڈھیروں کتابیں مارکیٹ میں آتی ہیں، ان لوگوں کی بھی جن کا نام کوئی جانتا بھی نہیں ہے، کوئی بھی چھوڑے میں ہزار لگا کر صاحب کتاب بن سکتا ہے۔ یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے پھر بھی میں نے آپ کی خاطر اور میڈم انجم کے کہنے پر اپنے نام کے ساتھ راحت وفا راجپوت لکھوایا پھر بھی آپ ناراض ہیں۔ میں نے آپ کا کوئی افسانہ چوری کیا ہے جو آپ برامان رہی ہیں۔ میرا اپنا انداز ہے، آپ تو شاید شاعری نہیں کرتیں اور میری انشاء اللہ افسانوں سے پہلے شاعری کی کتاب چھپی کی، میں نے انجم انصار کو ثبوت کے طور پر اپنے برائے افسانوں کا حوالہ بھیجا ہے۔ ہم کون سے بین الاقوامی رائٹر ہیں جو ایک دوسرے کا نام استعمال کر کے فائدہ حاصل کریں گے۔ بڑے بڑے ناموں والے بھی گزرتے آج کوئی ان کا ذکر بھی نہیں کرتا۔ یاد رکھیے طرز تحریر ہماری پہچان ہونی چاہیے۔ لہذا میڈم انجم آپ سے گزارش ہے کہ میرا نام راحت وفا ہی لکھا کریں، جس طرح اس ماہ نظم اور کہانی پر لکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ پاکیزہ کو اور ترقی دے۔“

✉ اب آئیں ملتان والی راحت وفا کا بھی خط پڑھ لیں۔

✉ راحت وفا، ملتان سے۔ ”میرا آٹھویں سفر 1979ء سے شروع ہوا۔ پاکیزہ سے میرا تعلق 1980ء سے ہے۔ الحمد للہ اپنا نام، مقام بنانے کے لیے میں نے طویل جدوجہد کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ریڈیو پاکستان، ملتان، ایف ایم ملتان، وسب ٹی وی چینل، بی بی وی ملتان، اس کے علاوہ اخبارات، جرائد میں آجکل، خواتین، شاعر، نازنین، فنون، اردو ڈائجسٹ، منج اور پاکیزہ کے لیے لکھا ہے۔ افسانہ میری شناخت ہے، نوائے وقت ملتان میں ہفتہ وار کالم لکھتی ہوں، گرلز کالج میں لیکچرار ہوں، سات کتابیں مارکیٹ میں ہیں، انٹرویوز برطرح ہے۔ دو بی وی چینلوں سے ڈرامے کا معاہدہ ہوا ہے..... یہ سب باتیں آپ کو اس



## بھنوں کی صفحہ

بھ غزالہ عزیز کراچی سے۔ ”مارچ کا پاکیزہ کا شمار ہاتھ میں آتے ہی آپ کا ادارہ مجھے کچھ کہتا ہے پڑھا اور آپ کی سوچ اور خیال کی صداقت پر دل تابندہ کے لیے بے ساختہ مکرانٹھا کہ جوانی اور بڑھاپے کی حقیقت کے تناظر میں ماضی اور حال کی مثال صادق تھی کہ ہم ماضی کو نہیں دراصل اپنی جوانی کو یاد کرتے ہیں اور حال یعنی بڑھاپے کو جوان انسانوں کے ساتھ خوش آمدید نہیں کہتے۔ اگر انگلیں جوان رہیں تو بہاریں تادیر قائم رہتی ہیں۔ اب شاعرے کے دیگر سلسلوں کی طرف آتے ہیں۔ شائد انجمن کے آئیڈیل کی شکل میں مختصر اور مچر تحریر لکھی۔ قول و فعل کے تضاد کی بہترین نقاشی کی گئی۔ پہلا قدم میں فاطمہ خان نے بہت اچھا پیغام دیا کہ اندام میں راسخ و مضمون کے لیے راستے میں دیا جلا ناپڑتا ہے چاہے اسے اپنے راستے میں بھیجے گا نٹوں سے الجھتا پڑے مگر جیت جگ کی ہوتی ہے۔ عقلیت حق نے ایک خواہش لا حاصل میں پرانے موضوع کو اپنے قلم کی فراثر جدت طرازی سے اثر انگیز بنایا۔ واقعی ہم انسان کبھی کبھی تقدیر سے تدبیر کا مقابلہ کرنے بیٹھ جاتے ہیں۔ زہر، نگہت، افسوس نے بھی اچھا لکھا۔ اس ماہ کی بہترین تحریر سائرہ رضا کی ہارے بھی تو بازی مات نہیں رہی فرسودہ روایتوں کے بند درپچوں میں ٹھن بڑھ جائے تو چور دروازے کھل جاتے ہیں۔ ضرورت فرسودہ روایتوں کو ختم کرنے کی ہے۔ وہ آئے بزم میں مہنا زمر جومہ کی چچی اور کھری باتوں نے بحیثیت قوم کے ایک فرد کے شرمندگی میں جلا کر دیا کہ ہم اپنے کو ہر نایاب لوگوں کی قدر نہیں کرنے والی قوم ہیں، یہ بات ہی نہیں مقام بھی قابل افسوس ہے۔ پاکیزہ کے باقی مستقل سلسلے بھی اچھے رہے۔ خاص طور پر انجمن آلی کا جلتنگ کراچی میں سرودی سے متعلق خیال آفرینی زبردست رہی۔“ (تبصرے کا شکریہ)

بھ غزالہ شاہد، کراچی سے۔ ”خوب صورت ٹائٹل کے ساتھ ایک اچھا شمارہ لگا۔ سب ہی تحریریں کم و بیش اچھی تھیں مگر سیکند فرخ، شیریں حیدر اور ثریا انجم کی تحریریں بازی لے گئیں۔ مستقل سلسلے بھی اچھے تھے۔ کارنر زبھی آپ نے ساگرہ کی مناسبت سے متاثر کن لگائے مگر یہاں پر مجھے آپ کے ہاں چلنے والے قسط وار سلسلوں پر ضروری بات کرنی ہے۔ عمیزہ سید کا ناول تو خیر ابھی شروع ہوا ہے۔ چار اقساط کے بعد پتا چلے گا مگر رفعت سراج اور قصیرہ حیات کی تحریریں زیادہ متاثر نہیں کر رہی ہیں۔ رفعت سراج نے بے شک ہمیشہ بہت اچھا لکھا مگر موجودہ تحریر عجیب بوجھل انداز لیے ہوئے ہے۔ اس قدر سخت گیر ڈاکٹر مہر جان وہ بھی نیوروجن اپنے مریضوں کا کیا حشر کرتی ہوگی بار بار ان کی شخصیت کے مخفی اوصاف کا تذکرہ نہایت گراں گز رہا ہے۔ اس پرستم یہ کہ ان کے نوکر یا ملازم اسل خان کا کردار بھی واضح نہیں ہو پارہا۔ ایسے مکالمے بار بار آ رہے ہیں جسے ذہن برداشت نہیں کر پارہا، اس سلسلے میں رائٹر کی جانب سے بھی کچھ ضرور کٹیرٹس ہونی چاہیے کہ وہ کیا بیان کرنا چاہ رہی ہیں۔ معلوم نہیں آپ اپنی تنقید شامل کریں گی یا نہیں بہر حال قصیرہ حیات کا ناول بھی ریو کی طرح کھنچا جا رہا ہے۔ اس کا پیغام ابھی تک واضح نہیں ہوا سوائے ساس ہو کی نفرت کے یا موبائل فون کا دھڑا دھڑا استعمال..... معذرت کے ساتھ۔“ (غزالہ بہن اس محفل میں خوش آمدید، رفعت سراج اور قصیرہ حیات ہماری مایہ ناز مصنفات میں شامل ہیں۔ ناول میں بعض مرجہ ایسے مواقع بھی آ جاتے ہیں جہاں کسی بات کو تفصیل سے بھی بیان کرنا ہوتا ہے۔ آپ جلد یہ یہ دیکھیں گی کہ وہ کس طرح اپنی بات کے ساتھ کہانی کو آگے بڑھا گئی تنقیدی خط کا شکریہ آپ بہنوں کے تبصرے ہمارے لیے بہت اہمیت کے حامل ہوتے ہیں)

پاکیزہ کی محفل کے صفحات کا کوئی ختم ہوا۔ اب آئیے ہم سب مل کر دعا مانگتے ہیں یا رحم الرحیم! میرے جسم کو شفا دل کو اپنی ذات کا یقین کامل اور آنکھوں کو نور بصیرت عطا فرما اور جب تک زندہ رہوں اپنے ذکر کو صبح شام میری زبان پر جاری فرمادے اور ایسی جگہ سے مجھے رزق دے جو بلا رکاوٹ ملتا ہی رہے۔ یا رب العالمین تو مجھ سے میری آل، اولاد سے ہمیشہ راضی رہتا، بے شک ہمارا رب برکت اور بلندی والا ہے، آمین ثم آمین!

یا مجیب، یا مجیب، یا مجیب۔

دعا گو آپ کی حاجی  
انجم انصار

لیے بتا رہی ہوں کہ آپ سمجھ سکتی ہیں نام اور ساکھ دونوں کتنے قیمتی ہوتے ہیں۔ مختصر راحت و فاقہ جو کہ لاہور سے تعلق رکھتی ہیں..... میری گزارش ہے کہ وہ کسی صورت بھی اس پورے نام کے ساتھ نہیں چھپ سکتیں..... آپ سوچیں، عمیزہ احمد کے نام سے کوئی آپ کے پاس چھپنا چاہے تو کیا آپ چھاپیں گی، رفعت سراج، حسنین وغیرہ ان ناموں سے کوئی لکھے تو کوئی بھی ادارہ انہیں چھاپے گا آپ سے گزارش ہے کہ لاہور والی محترمہ کا نام اور کام آپ چھاپیں مگر صرف راحت راجپوت کے نام سے راحت و فاقہ کے نام سے نہیں کیونکہ یہ کسی لحاظ سے بھی جائز نہیں..... آپ کا ادارہ مجھے اخلاقی، قانونی طور پر سپورٹ کرے گا۔ ان کو مسلسل راحت و فاقہ کے نام سے چھاپا جا رہا ہے۔ آپ پلیرس پراسیکشن لیں، میرے قاری مجھ سے کیا پوچھیں گے؟ یہ آپ جانتی ہیں وہ کچھ لکھیں، ساکھ تو میری بخیر ہوئی..... لہذا آپ تردید کی بیان شاہد کریں اور ان کا نام راحت راجپوت کے نام سے بے شک چھاپیں۔“

بھ ام طغور، گوجرانوالہ سے۔ ”اس ماہ شائد انجمن کا افسانہ آئیڈیل بہت اچھا لگا۔ سائرہ جی کا ہارے بھی تو بازی مات نہیں زبردست تھا۔ عظمیٰ انصاری صاحبہ کا حدیث دل بے حد اثر انگیز ناول تھا۔ مجھے اس ناول کا نام حدیث دل بہت بھایا۔“ (شکریہ)

بھ بنت عزیز الرحمن، راول پنڈی سے۔ ”آپ کو پہلی بار خط لکھا اور جواب مل گیا۔ بخدا اتنی خوشی ہوئی کہ بتا نہیں سکتی جی بارغ باغ ہو گیا۔ حوصلہ ہوا۔ میں پاکیزہ میں پہلے جلتنگ پڑھتی ہوں، یہ صفحات میرے پسندیدہ صفحات ہیں۔ پاکیزہ کے سلسلے بہت خوب ہیں، کس کس کی تعریف کروں اللہ ان سب مصنفات کا زور قلم اور زیادہ کرے۔ کچھ اشعار آپ سے متعلق بھیج رہی ہوں۔ اگر پسند آئیں تو اپنی ڈائری میں نوٹ کر لیں۔ جب کبھی ڈائری پڑھیں تو ہم بھی یاد آ جائیں۔“ (میں نے نوٹ کر لیے ہیں، شکریہ)

بھ فریدہ فری یوسف زئی، لاہور سے۔ ”سب سے پہلے مجھے کچھ کہنا ہے پڑھا، بے حد اچھا لکھا پھر راحت و فاقہ سے فیضیاب ہوئے پھر افسانے پڑھے تقاضے دلوں کے، سر پرانز، مذاق راحت و فاقہ نے اچھا لکھا۔ صائمہ اکرم کے ناول کا لا شاہ کا لانے بے حد بنایا شکریہ صائمہ جی مکمل ناول بے حد پسند آیا ثریا انجم جی ویلڈن۔ مجھ سے ملنے میں شازبہ عمران کا انٹرویو اچھا لگا مگر ان کی امی کے وفات کا پڑھ کر دکھ بھی ہوا۔ وہ آئے بزم میں حسنین کا تعارف بہت پسند آیا، پاکیزہ کی مصنفات کے پیغامات تمام بہت اچھے تھے تصویریں بھی بیماری تھیں مگر یہ خلفہ شیش تو نہیں لگ رہی تھیں۔ بہنوں کی محفل میں سب کے خطوط موجود تھے سوائے میرے، پاکیزہ ڈائری میں سب نے اچھا لکھا۔ واہ واہ جلتنگ پڑھ کر بے حد مزہ آیا۔“ (شکریہ)

بھ صدف نورین، لاہور سے۔ ”پاکیزہ کی ایک سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ نئے نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ پاکیزہ کا ٹائٹل ہمیشہ سے اچھا رہا ہے۔ امانت کی پہلی قسط نے اسے سحر میں جکڑ لیا تھا۔ بہت ہی دروہری تحریر ہے۔ زندگی کا اختتام بھی اچھا رہا۔ باقی تمام سلسلے بھی اپنی مثال آپ ہیں، بہنوں کی محفل بھی لا جواب ہے۔ آئی جی اگر میرا خط بھی پاکیزہ کی زینت بن جائے تو میں اپنے آپ کو بھی قسمت تصور کروں گی۔“ (پیاری بھاج بھجی اس محفل میں خوش آمدید)

بھ تمغیلہ زائد، کراچی سے۔ ”سب سے پہلے عمیزہ سید کے سلسلے وار ناول کی پہلی قسط پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ انہوں نے ہمیں پہلی قسط میں ہی اپنی تحریر کے سحر میں جکڑ لیا ہے۔ اگلی قسط کا بے چینی سے انتظار ہے گا۔ سر پرانز میں سیکند فرخ نے ساس کا اپنی بہو کے ساتھ جو منفرد رویہ دکھایا تو سوچا کاش ایسی محفل مزاج اور صاحب فراست ساس ہر گھر میں موجود ہوں تو ہر بہو اور ساس کی زندگیاں سکون کا گہوارہ بن جائیں۔ صائمہ اکرم کا مسکراتا ناول کافی دنوں بعد پڑھنے کو ملا۔ شیریں حیدر کا پیار سے ہے ایسا انجمن بچوں کو موضوع بناتے ہوئے نگارنا بی لڑکی کی زندگی کو کوئی مشکل موڑ پراترے جڑے جڑے دکھایا گیا تھا۔ انجمن آئی! میری سب سے چھوٹی بہن ایک انجمن جلتنگ ہے میرا ذاتی تجربہ ہے اللہ تعالیٰ ایسے گھر میں اپنا خاص فضل اور برکتیں نازل کرتا ہے جہاں ایسا کوئی بچہ ہو اور اس کی پرورش بہت توجہ اور محبت سے کی جائے۔ باقی تمام کہانیاں اپنی جگہ اچھی تھیں۔ ہاں آپ نے بہنوں کی محفل میں ساگرہ کے اس موقع پر جس انداز میں اپنے پاکیزہ محفل کی شہزادیوں کا جس انداز میں ذکر کیا ہے پڑھ کر مزہ آیا۔ عافہ مسعود کا خط توجہ طلب تھا۔ ان کا شکریہ جنہوں نے ماؤں کو ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کی طرف راغب کیا۔“ (تبصرے کا شکریہ)





### حمد باری تعالیٰ

حمد تیری ہستی کی اور پھر بیاں میرا  
راز داں کہوں کس کو تو ہے راز داں میرا  
تو کہے تب ہی مجھ پر رحمتوں کی بارش ہو  
یہ زمیں ہی میری ہے اور نہ آسمان میرا  
میں بشر ہوں تو خالق کیا ترے لیے لکھوں  
نور ہے تیرا پیکر گنگ ہے گنگاں میرا  
شعر جب کسی کے بھی قلب میں اترتا ہے  
تیری مہربانی ہے ورنہ کیا نشان میرا  
تو بصیر ہے یارب تو مجھے بصیرت دے  
مصلحت تیری سمجھوں یہ شرف کہاں میرا  
خود ہی رحم کی صورت میرے گرد میں چھا جا  
گر بھی مقدر سے ہو جو امتحان میرا  
جب بھی تیری الفت میں ڈوب ڈوب دیکھا ہے  
ہر طرف لگا جیسے ہو گیا جہاں میرا  
شرک سے بچا مجھ کو راستہ دکھا مجھ کو  
راہ وہ عطا کر دے ہو نہ امتحان میرا  
حمد کو قلم اٹھا سوچتا ہوں یوں محسن  
اب تو اس کی جنت میں ہوگا گلستاں میرا  
شاعر: محسن علوی

مرسلہ: نیم نیازی، لاہور

### نعت رسول مقبول ﷺ

اسرار نور حق کا نشان آپ ﷺ ہی تو ہیں  
میرا یقین میرا گماں آپ ﷺ ہی تو ہیں  
بوھنے لگیں جو نام سے کچھ دل کی دھڑکیں  
ان دھڑکوں کے روح رواں آپ ہی تو ہیں  
سانسوں میں میری آپ ﷺ کی الفت ہے دم بدم

آنکھوں کا نور دل میں نہاں آپ ہی تو ہیں  
قرآن ہے کتب خدائے عظیم کی  
اس معجزے کا اصل بیاں آپ ہی تو ہیں  
ہے کون جس کے خلق کی ملتی نہیں مثال  
اے تاجدار کون و مکاں آپ ہی تو ہیں  
محشر میں کس کے دامن رحمت کا آسرا  
آیا یہی خیال کہ ہاں آپ ہی تو ہیں  
ہے کون جس کے ذکر سے دل کو ملے قرار  
قدموں میں جن کے پاؤں اماں آپ ہی تو ہیں  
ڈوبا ہوں ان کے عشق میں ان سے کہوں یہ بات  
ہر دم حضور ﷺ و در زباں آپ ﷺ ہی تو ہیں  
محسن ان ہی کے نام سے گزرے ہے زندگی  
آخر ہمارے جسم کی جاں آپ ﷺ ہی تو ہیں  
شاعر: محسن علوی

مرسلہ: اشیل شادیان، گولارچی

### اچھی باتوں پر عمل کی تلقین

حضرت حرمہ غبرؓ سے روایت ہے کہ ایک  
مرتبہ میں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور  
عرض کی یا رسول اللہ ﷺ مجھے کوئی وصیت فرمائیں،  
نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ سے ڈرا کرو اور  
جب کسی مجلس میں شریک ہونے کے بعد وہاں سے  
اٹھو اور ان (مجلس والوں) سے کوئی اچھی بات سنو تو  
اس پر عمل کرو اور کسی بری بات کا تذکرہ کرتے ہوئے  
سنو تو اسے چھوڑ دو۔

(مسند احمد بن حنبل)  
مرسلہ: فائزہ فاروق سحر، ماڈل ٹاؤن، لاہور

### خیر و برکت کیوں رک جاتی ہے

حضرت حکیم بن حزام سے روایت ہے فرماتے  
ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے ایک مرتبہ سوال کیا  
تو آپ ﷺ نے مجھے کچھ عنایت فرمایا۔ دوسری مرتبہ  
ماٹھا تو آپ ﷺ نے پھر عنایت کیا اور فرمایا: ”حکیم  
یہ مال و دولت، سرسبز اور شیریں ہیں، جو کوئی اس کو  
خوشی سے قبول کرے گا تو اس کے لیے (اس میں)  
برکت عطا فرمادی جائے گی اور جو شخص لالچ سے کام  
لے گا تو اسے خیر و برکت عطا نہیں کی جائے گی اور وہ  
آدمی اس شخص کی طرح ہوگا کہ جو کھاتا تو ہے لیکن اس  
کا پیٹ نہیں بھرتا۔ نیز آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا  
”اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے۔“

سنن نسائی شریف  
مرسلہ: منیل ملک، شاہدرہ

### اپنے رب کو منالو

حضرت امام جعفر فرماتے ہیں، بچہ دنیا میں  
صرف ایک ہنر لے کر آتا ہے اور وہ اس ایک ہنر  
سے اپنی ماں سے سب کام کروا لیتا ہے۔ اس لیے  
اپنے رب کے سامنے رونا سیکھو اور اپنے رب کو منالو  
بے شک تمہارا رب ستر ماؤں سے زیادہ پیار کرنے  
والا ہے۔ سبحان اللہ۔

مرسلہ: قمر شمس الحق، جھنگ صدر

### انمول موتی

☆ طرز وہ تیرے جو شہد میں بھی بھگو کر  
مارا جائے پھر بھی اس کی چین کم نہیں ہوگی۔  
☆ جس گھر میں عورت دھمی رہتی ہو اس گھر  
میں خوشیاں مہمان کی طرح دستک دے کر آتی ہیں۔  
☆ ہر چیز کی قیمت ہوتی ہے انسان کی قیمت  
اس کی خوشیاں ہیں۔

☆ اپنی زبان کی تیزی اس ماں پر مت آزمائو  
جس نے تمہیں بولنا سکھایا۔

### پاکیزہ ڈائری

☆ اختیار، طاقت اور دولت ملنے پر لوگوں کے  
چہرے بدلے لیتے ہیں بلکہ بے نقاب ہوتے ہیں۔  
مرسلہ: پروین افضل شاہین، بہاول نگر

### سالگرہ

سالگرہ کی شام مبارک  
شام کے لب پر  
میری یاد.....  
چلتی رہنے دینا  
اپنے حصے کی سب شمعیں  
گل کر دینا..... لیکن  
میرے نام کی آدمی شمعیں  
جلتی رہنے دینا

مرسلہ: امینہ عندلیب..... سلاٹوالی

### کیسی خوشی

شوہر..... ”تمہارے باپ کی آگ لگانے کی“  
عادت گئی نہیں؟“  
بیوی..... ”کیوں کیا ہوا؟“  
شوہر..... ”آج پھر پوچھ رہے تھے کہ میری  
بیٹی سے شادی کر کے خوش ہونا؟“  
مرسلہ: حمیرا کلیم، واہ کینٹ

### کچھ کھٹا کچھ کڑوا

گھر میں کڑی کا شیشہ ٹوٹ گیا تو شوہر نے  
بیوی سے کہا۔ ”یہ تم نے توڑا ہے، تم ہی نیا شیشہ  
لگواؤ۔“  
بیوی نے کہا۔ ”یہ تمہاری غلطی کی وجہ سے ٹوٹا  
ہے، میں نے سینڈل تمہیں ماری تھی۔ تم آگے سے  
بٹ گئے ورنہ یہ شیشہ نہ ٹوٹتا۔“

☆☆☆

ایکشن میں ایک امیدوار کو صرف تین ووٹ  
ملے، اس کی بیوی نے نتیجہ سنا تو رونے بیٹھ گئی اور کہنے



گلی۔

”میں تو پہلے ہی جانتی تھی کہ تم کسی اور سے بھی عشق کر رہے ہو، اب تو ثبوت بھی مل گیا ہے میرے اور تمہارے دو دوٹوں کے علاوہ تیسرا دوٹ اسی کلمہ ہی کا ہی ہو سکتا ہے۔“

☆☆☆

نشے کی جھونک میں ایک شرابی شوہر نے اپنی بیوی سے کہا۔ ”تم دنیا کی سب سے بری اور بد صورت عورت ہو۔“

اس کی بیوی جل کر بولی۔ ”اور تم دنیا کے سب سے زیادہ، اودھ باز، بدست شرابی۔“  
شرابی نے ہنس کر کہا۔ ”مگر میں تو کل صبح بالکل ہوش مند نظر آؤں گا اور تم.....؟“

مرسلہ: سامعہ تبسم، ملتان

### غزل

کیا تو کیا نہ کیا اُس کی ایک خوشی کے لیے  
مگر یہ دل ہے کہ روتا رہا اُسی کے لیے  
تمہیں مائل بہ کرم کرنے کی خاطر جانا  
میں نے ہر دور پہ صدا دی ہے مصطفیٰ کے لیے  
کیا ضروری ہے محبت میں فنا ہو جانا.....؟  
طریقے اور بھی رائج ہیں خود کشی کے لیے  
گر میرے درد کی تشہیر تیری شہرت ہے  
تو یہ تشہیر کریں گے تیری خوشی کے لیے  
وہ اپنے اشک تمہیں دان کر گیا ہے کرن  
تم نے ہر غم کو سہا جس کی ایک ہنسی کے لیے

شاعرہ: مہناز کرن، پشاور

### ظالم

مدت ہوئی تیری  
بے وفائی پر میری آنکھوں  
نے رونا چھوڑ دیا ہے  
مگر ظالم!

میرادل اب بھی روتا رہتا ہے

شاعرہ: بشری باجوہ..... اوکاڑہ

### بات ہے کام کی

معافی مانگتا یہ ظاہر نہیں کرتا کہ آپ غلط اور دوسرا فریق صحیح ہے بلکہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ آپ کے رشتے کی اہمیت آپ کی انا سے بڑھ کر ہے۔

مرسلہ: عبیدوسم، گوجرانوالہ

### کامنی لڑکی

وہ رنگ برنگی

تقلی جیسی

نازک پھول کی

خوشبو جیسی

خوابوں جیسی آنکھوں والی

کلیوں سی مسکان والی -

ہنستی کھیلتی

لڑتی جھگڑتی

ہوا کے چنچل جھونکے جیسی

گھبرائی ہوئی ایک ہرنی جیسی

کسی مندر کی گھنٹی جیسی، کامنی لڑکی

پریم نگر کی سیر کو جا کے

چمکھنوں سے

چپ چپ سی ہے

پیامن کے سپنوں کا

انجام نہ جانے

خوش خوش سی ہے

شاعرہ: سیدہ علیشاہ، بہاول پور

### کوئی تو ہو

کوئی تو ہو جو  
میری ہتھیلی پہ اپنی چاہت کے گلاب رکھ دے  
کوئی تو ہو جو  
میری پلکوں پہ اپنی رفاقت کے خواب رکھ دے

کوئی تو ہو جو

میری حیات کے سب دکھوں کو

ایک حرف کی سی سے ماند کر دے

کوئی تو ہو جو

میری سیاہ راتوں کو اپنے چہرے کی

روشنی سے چاند کر دے

کوئی تو ہو

کوئی تو ہو.....

شاعرہ: راحت وفاق، لاہور

### موتی مالا

☆ آنسوؤں کو بہہ جانے دو، یہ غموں کو  
مایوسیوں میں تبدیل ہونے سے روکتے ہیں۔  
☆ خوشی صرف ہنسنے ہنسانے اور تھپہ لگانے کا نام  
نہیں بلکہ رگ و پے میں طمانیت بس جانے کا نام ہے۔  
☆ غصہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم دوسروں  
کا انتقام اپنے آپ سے لیتے ہیں۔  
مرسلہ: سارہ کلثوم، ضلع کل مروت

### نظم

میرے چارہ گر!  
میرے در کی تجھے کیا خبر  
تو میرے سفر کا شریک ہے  
نہیں ہم سفر  
میرے چارہ گر، میرے چارہ گر  
میرے ہاتھ سے تیرے ہاتھ تک  
وہ جو ہاتھ بھر کا تھا فاصلہ  
کئی موسموں میں بدل گیا  
اسے تاپتے، اسے کانٹے  
میرا سارا وقت نکل گیا  
نہیں جس پہ کوئی نشان پا  
میرے سامنے وہ رہگزر  
میرے چارہ گر

### پاکیزہ ڈائری

میرے درد کی تجھے کیا خبر

شاعر: امجد اسلام امجد

مرسلہ: سامعہ تبسم، ملتان

### گلدستہ زندگی

☆ بھروسا ایک ایسا پھول ہے جو شک کی بو  
سوگھتے ہی مڑ جھکا جاتا ہے  
☆ جو لوگ تعریف کے بھوکے ہوتے ہیں وہ  
باصلاحیت نہیں ہوتے۔  
☆ محبت دور کے لوگوں کو قریب اور قریب  
کے لوگوں کو دور کر دیتی ہے۔  
☆ دنیا تمہیں اس وقت تک نہیں ہرا سکتی جب  
تک تم اپنے آپ سے نہ ہار جاؤ۔  
☆ کتابوں کی قیمت جواہرات سے بھی زیادہ  
ہے کیونکہ جواہرات ظاہری چمک دمک دکھاتے ہیں  
جبکہ کتابیں باطن کو مضبوط کرتی ہیں۔  
☆ زندگی..... دوستی، خوشبو اور اچالے کا نام ہے۔  
مرسلہ: ناہیدہ بنت نور، واہ سیمنٹ ورکس

### سعدیہ کے لیے

سرسبز رکھے تم کو میرا رب خزاؤں میں  
چادر مسکھ کی رہے تم پر تند و تیز ہواؤں میں  
روشن اس طرح سے ہو تیرا گھر ہمیشہ  
ایک چاند کا ہالہ ہو کالی گھٹاؤں میں  
کچھ پھول تیرے گلشن کے مہکتے رہیں سدا  
بسی رہے خوشبو تیرے من کی فضاؤں میں  
کبھی نہ جھننے پائے تیرے پیار کا جلتا دیپ  
روشنی رہے دائم تیرے ہیبت کی وفاؤں میں  
موتی تجھے رہیں تیرے تن کے ساگر پہ  
چوڑیاں لٹکتی رہیں تیری دوؤں بانہوں میں  
تاروں سے بھرا ہو تیرے گھر کا امبر  
کروں کی ندا ہو میرے دل کی دعاؤں میں  
مرسلہ: صدف جاوید، ہری پور ہزارہ

✽





## مشورے والیاں

فاکہ اپنے شوہر کو اپنی انگلیوں پر نچا کر اس حد تک لے آئیں کہ انہوں نے اپنی ماں سے از خود کہہ دیا کہ اب وہ سب بھائیوں کے ساتھ اکٹھے نہیں رہ سکتے۔

”کوئی تکلیف ہے ساتھ رہنے میں؟“ باپ نے پوچھا۔

”ہاں، بچوں پر برا اثر پڑ رہا ہے۔ یہاں ہر وقت کوئی نہ کوئی آتا رہتا ہے۔ بہنوں کے بچوں کو جتنی گالیاں آتی ہیں ان سب کی گالیاں میرے بچے سیکھ گئے ہیں اور وہ آپس میں بہن بھائیوں سے لڑتے ہوئے ادا کرتے ہیں۔“

”کیا تم یہ چاہتے ہو کہ ہم اپنے گھر میں تمہاری بہنوں کا آنا جانا روک دیں؟“ ماں نے پوچھا۔  
”وہ تو کسی طرح بھی نہیں روکا جاسکتا ہے نہ روکنا ہے اور نہ ہی وہ لوگ روک سکتی ہیں۔ کہیں دوسری جگہ بھی جانا ہو تو پہلے ہمارے گھر اس وجہ سے آتی ہیں کہ یہاں سے ڈرائیور اور گاڑی مل جائے گی تو انہیں جانے میں آسانی رہے گی۔“

”اپنی غریب بہنوں پر طعنے کر رہے ہو؟“  
”نہیں، یہ طعنہ نہیں ہے حقیقت ہے جو بہن امیر ہے ان کا بھی یہی دتیرا ہے۔“

”بیٹیاں اگر والدین کے ہاں نہیں آئیں گی تو پھر بیٹیاں کہاں جائیں گی ہمیں چونکہ یہاں تکلیف ہے اس لیے چلے جاؤ۔“

ذکی اپنے آفس کی جانب سے ملے ہوئے شاعرانہ میٹلوں میں چلے گئے اور اسے انتہائی خوب

صورتی سے سنبھالیا۔ عزیز احباب آتے تو وہ مکان کی سجادت کی تعریف کا اصل متن اپنی بیگم کو ٹھہراتے اور فاکہ نفاست سے اپنے شانے اچکا کر ایک اچھلتا کودتا قہقہہ لگاتیں۔ فاکہ کا خیال تھا ذکی علیحدہ ہو جانے کے بعد انگلیوں سے ہٹ کر ان کی ابرو کے اشارے پر ناچا کریں گے مگر ذکی کی حالت تو ایسی ہو گئی جیسے کسی چھوٹے بچے کو ماں سے علیحدہ کر دیا جائے۔

آفس جاتے تو پہلے ماں کے پاس جاتے، آفس سے اٹھتے تو پہلے ماں، باپ کے پاس آتے اور وہاں ایک دو گھنٹے بیٹھ کر گھر کی راہ لیتے۔ چھٹی کا دن آتا تو بچی بچوں کو لے کر اماں کے گھر آ جاتے۔ بیوی شروع شروع میں تو آتی رہیں بعد میں وہ بل کر بولیں۔

”علیحدہ رہنے کا فائدہ ہی کیا ہے کہ آپ ہر دوسرے دن کھینچ کر ہمیں اسی جنجال پورے میں لے جاتے ہیں۔“

”اب کیا تکلیف ہے؟“ انہوں نے پوچھا۔

”آپ کے بھائیوں اور بہنوں کے بچے میرے بچوں کو تنگ کرتے ہیں۔ ان کا مذاق اڑاتے ہیں اور نئے گھر کا طعنہ دیتے ہیں جیسے یہاں سے جا کر ہم نے کوئی گناہ کیا ہو۔“

”ٹھیک ہے تم مت جاؤ، بچے نہ جائیں مگر میں تو ضرور جاؤں گا۔“ ذکی نے کہا۔

”ہاں، ہاں شوق سے جائیں۔“ فاکہ نے غصے سے کہا اور سسرال جانا بند کر دیا۔ اب ذکی صبح شام کے ساتھ ساتھ چھٹی کا دن بھی وہیں گزارنے

لگے۔

”کچھ پتا بھی ہے تمہارے سسرال والے ذکی بھائی کے لیے رشتہ دیکھ رہے ہیں۔“ ایک شام فاکہ کی کھینچ نے بتایا۔

”کیا کہہ رہی ہو تم؟“ وہ پریشان ہو گئی۔

”ہاں، تمہاری بڑی نند کا فون آیا تھا وہ کہہ رہی تھیں کہ کوئی اچھی سی لڑکی ذکی بھائی کے لیے بتاؤ۔ میں نے کہا کہ ان کی تو شادی ہو چکی ہے تو وہ بولیں ان کی پہلی بیوی بچے ہمارے گھر آتے جاتے نہیں ہیں..... کوئی ایسی لڑکی بتاؤ جو سسرال میں رہے۔ ہاں ہماری گارنٹی ہوگی کہ ذکی اپنا زیادہ وقت یہاں گزاریں گے۔ دوسری بیوی کا پہلی بیوی سے کوئی لینا دینا نہیں ہوگا اور ہمارے لیے دوسری ہی اصل بھائی ہوگی۔“

”اچھا یہ بات ہے۔“ فاکہ کے تو ہاتھ پیر پھول گئے۔ رات گئے ذکی آئے تو وہ بولیں۔

”کیا کیا بات ہوئی آپ خود تو اماں، ابا کے پاس چلے جاتے ہیں اور مجھے اس اجاڑ گھر میں چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ اب میں آپ کے ساتھ ساتھ چلا کروں گی۔“

”میں تو صبح آفس جانے سے پہلے بھی جاتا ہوں۔“ ذکی مسکراہٹ دیا کر بولے۔

”کوئی بات نہیں، میں صبح بھی آپ کے ساتھ چلا کروں گی واپسی پر ڈرائیور مجھے گھر چھوڑ دیا کرے گا۔“

”ارے میری بہنوں کے بچے بہت بدتمیز ہیں..... بہت گالیاں دیتے ہیں اور ساری بری عادتیں تمہارے بچوں کو اگر سکھادیں تو؟“

”کوئی بھی نہیں، آپ کی بہنوں کے بچے تو سب اچھے ہیں۔ ہمارے بچوں کو کمپیوٹر میں اور پڑھنے میں کس قدر مدد تو کرتے ہیں اور بڑے بچوں کے ساتھ رہنے کی وجہ سے چھوٹے بچے کچھ سیکھتے ہی ہیں۔“

## طنزنگ

”ٹھیک ہے جیسی تمہاری مرضی۔“ ذکی نے اپنی خوشی چھپاتے ہوئے کہا کہ ان کی ذرا سی چالاکی کام آگئی تھی کہ فاکہ اپنی کھینچ کے ہر مشورے پر جی جان سے عمل کیا کرتی تھیں اور وہ یہ بات خوب اچھی طرح جانتے تھے۔

## وہ آئیں گھر ہمارے

”نجمہ وہ پھر کب تک چکر لگائیں گی؟“ میں نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔ بات فون پر ہو رہی تھی مگر میرا لہجہ یقیناً لچلچاہوا سا تھا۔

”ڈیکھو ویسے تو وہ بڑی بڑی ہیں، میں نے ذکر کیا تھا تمہارا ان سے۔“

”تو کیا بولیں وہ؟“ میں نے پوچھا۔  
”سلی ویسے میں ان کے زیادہ پیچھے نہیں لگتی۔ وہ اپنی مرضی کی مالک ہیں جہاں دل چاہتا ہے وہاں جاتی ہیں اور جہاں ان کا دل راضی نہیں ہوتا وہاں انہیں لاکھ بولو وہ اس کچی سے نہیں گزریں گی۔“ اب نجمہ تفصیلی بات کر رہی تھی۔

”خیر اب میں فون رکھ رہی ہوں۔ ابھی ابھی وہ آئی ہیں اگر انہیں فوراً ریسو نہ کرو تو ناراض ہو جاتی ہیں۔“ نجمہ نے خدا حافظ کہہ کر فون رکھ دیا۔  
”سنیں.....“

”ہوں سن رہا ہوں۔“  
”میں نے آج نجمہ سے بات کی تھی ان کے لیے۔“ اپنے شوہر سے رات کے وقت سرگوشی کرتے ہوئے بتایا۔

”ارے سلی چپ ہو جاؤ۔ زور سے مت بولو۔ دیواروں کے کان ہوتے ہیں۔ اگر کسی نے سن لیا ناں کہ تم نے اُن کو اپنے گھر بلانے کے لیے بات چلائی ہے تو تمہیں پتا ہے ناں کیا ہوگا۔ سب کے سب ان کے پیچھے پڑ جائیں گے اور تمہارا کام رہ جائے گا جو ان کے آنے سے ہو سکتا ہے۔“ میرے شوہر مجھے بڑے پتے



کی بات سمجھا رہے تھے۔

”تندیں، دیور.....؟“

”ارے، ارے اس کی تو پروا ہی نہ کریں۔“  
میں نے بات کاٹتے ہوئے انہیں سمجھایا۔ ”ہماری  
سب سے لڑائی ہے اور ہماری دشمنیاں تو نسل در نسل  
چلتی ہیں۔“

”میں یہی جانتا چاہ رہی تھی کہ ملنے جلنے والے  
کتنے لوگ ہیں، آنا جانا کیسا ہے آپ کے گھر؟“

”ارے اس کی تو فکر ہی نہیں کریں آپ۔“ میں  
نے ہستے ہوئے انہیں سمجھایا۔

”تو پھر ٹھیک ہے، میں کل سے آپ کے گھر  
صفائی کرنے اور برتن دھونے آ جاؤں گی پر ٹائم میری  
مرضی کا ہوگا۔“ انہوں نے ہامی بھری۔

”ٹھیک ہے، بالکل ٹھیک ہے۔“ اور میں تائید  
میں سر ہلا رہی تھی۔

### کوفت

خوب صورت مکانوں خوب صورت چہروں  
میں ایک مماثلت ضرور ہوتی ہے کہ دونوں شاندار  
ہوتے ہیں۔ فرق ہوتا ہے تو صرف اتنا کہ کسی بھی  
شاندار مکان کو دیکھ کر اطلاع ٹھٹھی بجانے سے قبل اس  
کے مکینوں کا شجرہ از خود معلوم ہو جاتا ہے۔ مکان  
سے متعلقہ مکین کتنے پانی میں ہیں، اس کا اندازہ  
صرف مکان کی بیرونی لوکیشن کو دیکھ کر ہو جاتا ہے مگر  
چہرے چغل خور ہونے کے ساتھ ساتھ کچھ کائیاں بھی  
ہوتے ہیں بعض چہرے جن کی شکلیں دیکھ کر ”معاف  
کرو“ کہنے کو دل چاہتا ہے..... وہ پوتروں کے رئیس  
نکل آتے ہیں۔ اپنی ان غلطیوں کو دیکھ کر بعض دفعہ  
متعلقہ لوگوں کے حسب نسب تک تبدیل کرنے کو دل  
چاہتا ہے اور جب نہیں کر پاتی تو مت پوچھیے کہ کتنی  
کوفت ہوتی ہے مجھے۔

”سلی تم دراصل بے وقوف عورت ہو۔ اسلم  
بھائی، اشرف بھائی ہر ایک کے گھر لڑکی بیٹھی ہے اور  
لڑکیاں بھی ایسی کہ چلی بھی توڑ کر نہ دیں۔ سو اگر وہ  
ہماری پروین کو بھی ایسا سمجھیں پھر.....؟“ شوہر کی  
باتیں اب آہستہ آہستہ میری سمجھ میں آرہی تھیں اور پھر  
آخر کار میرے بار بار اصرار پر مجھ نے انہیں میرے گھر  
آنے پر راضی کر لی لیا تھا۔

”سنو بچو، آج وہ ہمارے گھر آنے والی ہیں  
سب گھر صاف کر کے رکھنا، کپڑے ذرا ڈھنگ کے  
پہننا۔“ میں نے بچوں کو آہستہ سے سمجھاتے ہوئے کہا۔  
”امی، ناشتے میں کیا ہوگا؟“ بڑی بیٹی نے  
سمجھداری کا سوال کیا جو میں گھبراہٹ میں بھولے ہی  
جا رہی تھی۔

”بیٹا ہر چیز گھر کی ہو تو سلیقے کا پتا چلتا ہے  
تو وہی بڑے، چھوٹے، بردست اور لٹی ٹھیک رہے  
گی۔“ میں نے ہدایات دیں اور پھر وہ ہمارے گھر  
آہی گئیں۔ ان کو عزت سے بٹھایا گیا۔ بڑی بیٹی  
ناشتا لے کر آئی پورے گھر کو چکا کر رکھا تھا سوا ایک،  
ایک جگہ دکھائی گئی۔

”بہن ابھی نیابتی ہم نے گھر بنوایا ہے، اللہ کا شکر  
ہے کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔ بچیاں سلیقہ شعار، تمیز دار  
اور تہذیب والی ہیں۔ گھر کو چندن سا بیٹا سنا کر رکھتی  
ہیں۔“ میں نے تعریفیں کرنا شروع کیں۔

”وہ تو ٹھیک ہے سلی، بہن لیکن پھر بھی ہر چیز  
دیکھنا ہوتی ہے۔ لوگ کہاں کے ہیں، شوہر کہاں کام  
کرتے ہیں، گھر اپنا ہے یا کرائے کا۔ ہر بات کا پتا چلانا  
ضروری ہوتا ہے۔“

”نہیں، نہیں، بہن گھر ہمارا اپنا ہے، میاں بھی  
سرکاری ملازم ہیں، نوکری پکی ہے۔“ میں نے تسلی  
دی۔

”کتنے لوگ ہیں آپ کے خاندان میں یعنی



## میں اکثر گنگناتی ہوں

### صغریٰ زیدی

☆ ارم کمال..... فیصل آباد

مخلوق بے نوا کو نہ یوں بے کسی میں چھوڑ  
ایسا نہ ہو کہ لوگ کہیں تو خدا نہیں  
کتنے نگر ہیں جو کبھی اجڑے کبھی بے  
اُجڑا جو ایک بار یہ دل پھر بسا نہیں

☆ بنت عزیز الرحمن..... راول پنڈی

اُن کے آنے کی خبر پھول کے پھلنے سے ملی  
چاندنی آج میرے آنکھن میں اتر آئی ہے  
باوصا پھرتی ہے اٹھلائی ہوئی لہرائی ہوئی  
پھول رقعات ہیں گلشن میں بہار آئی ہے

☆ نگہت زیدی..... بہارہ کوہ

تیری ابھی ہوئی زلفوں کو سنواریں کیسے  
زندگی تو ہی بتا تجھ کو گزاریں کیسے

☆ نگہت آصف..... اسلام آباد

میرا احساس ہے گھائل میری آنکھیں نم ہیں  
میرے چہرے پہ لکھا ہے مجھے کیا غم ہیں  
اپنے ممکن سے نہیں ترک تعلق ممکن  
ورنہ اس شہر میں جینے کے مواقع کم ہیں

☆ غزالہ شاہد..... کراچی

وہ آہ وزاری بہ سوگوازی، ہر اک چہرے پہ موت طاری  
لٹی محبت ملنا سکوں ہے، ہمارے اُقبل ہمارا خوں ہے

☆ غزالہ طارق..... سرگودھا

اب نہ مڑگاں میں وہ زدے نہ نگاہوں میں توڑ  
ترش حسن میں اس کے نہ رہا تیر کوئی

☆ عروہ ناز..... کوئٹہ

کم بضاعت جتنے ہیں کرتے ہیں وہ جوش و خروش  
توڑ ہوتا ہے کسی دریا میں کب سیلاب کا

☆ فریدہ فری یوسف زئی..... لاہور

جی رہی ہوں اس اعتماد کے ساتھ  
کہ زندگی کو میری ضرورت ہے

☆ راحت وفا..... لاہور

تم اتنے قریب سے ہم کو نہ دیکھ پاؤ گے  
کہ دیکھنے کے لیے فاصلہ ضروری ہے  
تم اپنے بارے میں ہم سے بھی پوچھ سکتے ہو  
نہیں یہ کس نے کہا آئینہ ضروری ہے

☆ کائنات عبدالحلیم..... میرپور خاص

وہ درد بے اثر ہے جو سینے میں گھٹ گیا  
چٹا ہی غم وہی ہے جو دیوانہ وار ہو  
معتول فرد جرم ہے تو بین عشق کی  
شاید ہی اب جواز میں کوئی پکار ہو

☆ نقیہ آرا..... پلائے ای

یہ کھیل ایسا نہیں یونہی جیت ہو جائے  
کسی مقام پہ ہستی کو ہارنا ہوگا  
عجیب لوگ ہیں جتنے ہیں خوش گلی کے لیے  
تمہاری یاد کو دل سے اتارنا ہوگا

☆ ایلیا عباس..... لاہور

شہرے پانی میں یہ پھر کس طرف سے آ گیا  
ہر طرف بے چینی سے کچھ دائرے بڑھتے گئے  
چاک داماں نے ہمیں کچھ پرکشش سا کر دیا  
اس گلی سے اس گلی تک رابطے بڑھتے گئے





# خوش ذائقہ پاکیزہ بینیں



## چاکلیٹ کی برنی

اشیا کھویا، دو پیالی۔ شکر، ایک پیالی۔ چاکلیٹ (کوکو)، ایک کھانے کا چمچ۔ لالہ چھوٹی، بارہ عدد۔ (دائے نکال کر پکالیں) دو، کھانے کا ایک چمچ۔ گھی، چائے کا ایک چمچ۔

برنی بنانے کی ترکیب کڑائی میں کھویا اور شکر ملا کر ہلکی آگ پر پکائیں جب آمیزہ گرائی کی دیواریں چھوٹنے لگے تو لالہ بھی ملا لیں۔ ایک تھال میں ڈالنا گھی لگا کر اسے اس میں ڈالیں اور ڈھنڈا ہونے دیں۔ جمانے سے پہلے انداز ایک بڑا چمچ الگ کر لیجیے۔

چاکلیٹ کی تہہ جمانے کی ترکیب کھاپ پکائی ہوئی برنی کڑا، اسی میں ڈال کر کوکو اور دودھ ملا لیں اور ہلکی آگ پر پکائیں، جب ایک جان لیپ بن جائے تو پتی کوکو کی تہہ برنی پر جمادیں۔ چھوٹے چھوٹے ہیروں کی شکل میں کاٹ لیجیے۔

## حاضرین..... کراچی

## بگھارے بینیں

اشیا بینیں گول، آدھا کلو۔ (ہریٹنگن کو پون حصے تک چار، چار شکاف دے دیں) پیاز، ایک عدد۔ (باریک کاٹ لیں) لہسن، چھ جڑے۔ (پین لیں)

ادرک، دو انچ کا کٹوا۔ لال مرچ، حسب فضا۔ خشخاش، ایک چمچ۔ ہلدی، اسی، آدھا چمچ۔ (توے پر سینک کر الگ الگ پیس لیں) کھوسا کھوا، دو انچ کا کٹوا۔ دھنیا، چار چمچ۔ سفید زیرہ، دو چمچ۔ تل، دو چمچ۔ مونگ پھلی، دو چمچ۔ اٹی، حسب فضا (ایک پیالی پانی میں بھگو دیں) ہری مرچ، چھ عدد۔ ہرا دھنیا، چند ڈنڈیاں۔ (باریک کاٹ لیں) پودینا، چند ڈنڈیاں۔ کڑی پتا، چند پتے۔ نمک، حسب ذائقہ۔

ترکیب کھپلے تھوڑا سا سینکا ہوا مسالا اور نمک بینگن کے اندر بھر کر ایک گھنٹے تک رکھ دیں۔ اب گھی میں پیاز بادامی رنگ کی تل لیں اور سارا پیسا ہوا کچا مسالا ملا کر تین منٹ تک بھونیں پھر باقی ماندہ سینکا ہوا مسالا ڈال کر ہلائیں پھر بینگن ڈال کر ڈھکن بند کر دیں اور اسے ہلکی آگ پر پکائیں۔ جب بینگن گل جائیں تو کٹنا ہوا ہرا مسالا اور ثابت ہری مرچ ڈال دیں اور ڈھکن بند کر کے ہلکی آگ پر رکھیں۔ گھی چھوٹے لگے تو اتار لیں۔

فائزہ احمد..... سیالکوٹ

## مونگرے گوشت

اشیا کھ گوشت، آدھا کلو۔ مونگرے، ایک پاؤ۔ (چھوٹے چھوٹے) پیاز، ایک پاؤ۔ لہسن، آدھی کھٹی۔ نمٹا، آدھا پاؤ۔ نمک، امرچ، حسب ذائقہ۔ گرم مسالا پیسا ہوا، ایک چمچ۔ ہرا دھنیا، ایک کھٹی۔

ترکیب کھ گوشت کو پیاز لہسن ڈال کر اچھی طرح بھونیں۔ جب سب مسالوں کے ساتھ بھن کر تیار ہو جائے تو مونگرے دونوں طرف سے کاٹ کر اور دھوکراں میں ڈال دیں اور بھوتے رہیں یہاں تک کہ مونگرے کا رنگ پیلا ہو جائے، اب اس میں نمٹا ڈال دیں اور اتنا پانی ڈالیں کہ گل جائیں۔ جب مونگرے گل جائیں اور پانی خشک ہو جائے تو تھوڑا سا بھون لیں تاکہ گھی چھوڑ دے۔ اب اس میں ہرا دھنیا اور پیسا ہوا گرم مسالا ڈال کر دم پر رکھ دیں۔ چند منٹ بعد اتار لیں۔

رفتہ رضا..... راول پنڈی

تمہارے راستے میں بیٹھ جاتی پھول بن کر ہماری تو قدر نہیں ان پھولوں ہی کی چاہ ہوتی ☆ عرشہ جنید..... کراچی

کس کو نیل کی آس میں اب تک ویسے ہی سرسبز ہوتم اب تو دھوپ کا موسم ہے برسات گزر گئی جانان ☆ عزیز دہم..... گوجرانوالہ

ہم یاد تو نہ آئیں گے لیکن بچھڑتے وقت تارہ سا اک خیال تری چشم تر پہ تھا ☆ امینہ میسر..... نئی دہلی، بھارت

حیرت سے دیکھتا ہے سمندر مری طرف کشش میں کوئی بات ہے یا یادیاں میں ہے بیٹھے رہیں گے شام تنگ تیرے شیشہ گر یہ جانتے ہوئے کہ خسارہ دکاں میں ہے

☆ لالہ رخ..... پشاور

آنکھوں میں رہا دل میں اتر کر نہیں دیکھا کشش کے مسافر نے سمندر نہیں دیکھا پھر مجھے کہتا ہے میرا چاہنے والا میں موم ہوں اس نے مجھے چھو کر نہیں دیکھا

☆ نزہت بیں ضیا..... کراچی

مجھے منزلوں سے عزیز ہیں تری راہ گزری مسافتیں کہ گئی ہیں میرے نصیب میں ابھی عمر بھر کی مسافتیں بس ایک پل کی تلاش میں جسے لوگ کہتے ہیں زندگی تری راہ گزریں میں بھر گئیں میری عمر بھر کی مسافتیں

☆ صائمہ امین..... لاہور

اب کے برس کچھ ایسی تدبیر کرتے ہیں مل کے ایک شہر محبت تعمیر کرتے ہیں خزاں کی اجازت شائیں نہ آئیں اگلے سال اس بہار مٹ کو زنجیر کرتے ہیں

☆ ممتاز خانم..... کراچی

میں تیری یاد سے نکلوں تو اور کچھ سوچوں قدم قدم پہ یہ دل تیرے اختیار میں ہے ☆☆☆

☆ ماہ نور قیصر..... راول پنڈی

وہ پھول تھا مگر اس کی سرشت میں تھا یہ وہ آگ ہی کو ہوا میں اچھال کر رکھتا

☆ صاحبزادہ..... دہلی

کلی کا پھول بنا اور بکھر جانا مقدر ہے یہ قانون فطرت ہے تو فطرت کب بدلتی ہے جو دل پہ نقش کر جائے اور آنکھوں میں سمٹ آئے علامت ہے یہ چاہت کی تو چاہت کب بدلتی ہے

☆ فضلہ بول..... اسلام آباد

گئے دنوں کی محبت کا واسطہ تھ کر پلٹ کے آجا کوئی تیرے انتظار میں ہے تلاشتے ہیں اسے لوگ کیوں عداوت میں وہ اک خوشی جو محبت میں ہے جو پیار میں ہے

☆ سائرہ عباس..... کراچی

ہم کو اندازہ نہیں ہے اس کا وہ بدلتا ہے لہو دے کتنے کتنی باریک ہیں چاکلیں اس کی اور ہم لوگ ہیں سادے کتنے

☆ رابعہ شاہد..... یو ای ای

ہر چند اختلاف کے پہلو بہت سے ہیں دل ہے کہ اختلاف کی باتوں سے دور ہے تم جانتے ہو کوئی ہمارا نہیں قصور ہم پھر بھی مانتے ہیں ہمارا قصور ہے

☆ زینب نقوی..... پٹنوں عاقل

تو قد و قامت سے شخصیت کا اندازہ نہ کر جتنا اونچا پیڑ تھا اتنا گھٹا سایہ نہ تھا ☆ فیصہ آصف خان..... ملتان

دیکھنے کا انداز بھی کیا خوب ہے اس کا دل دھڑک جاتا ہے، آنچل سرک جاتا ہے ☆ شبنم تنول..... حافظ آباد

کاش تمہیں غیروں کی چاہ نہ ہوتی تمہارے دل میں میری بھی کوئی راہ ہوتی



## جھوٹا ہاتھی

ایک گاہک غصے کی حالت میں شوپس کی دکان میں داخل ہوا اور دکان دار سے کہا۔  
”میں نے آپ کی دکان سے ہاتھی دانت کی بنی ہوئی کچھ چیزیں خریدی ہیں لیکن گھر جا کر دیکھا تو وہ سب پلاسٹک کی تھیں۔“  
دکان دار نے مکاری سے کہا۔

”جناب غصہ نہ ہوں، اصل بات یہ ہے کہ ہاتھی نے مصنوعی دانت لگائے ہوئے تھے۔“  
مرسلہ: ذکیہ خانم، اورنگی ٹاؤن، کراچی

## بڑے لوگوں کی بڑی باتیں

1۔ آپ کے ساتھ اچھی گاڑی میں سواری کرنے کے لیے بہت سے لوگوں کی خواہش ہوگی مگر آپ کی زندگی میں کوئی ایسا شخص ہے جو گاڑی خراب ہونے پر آپ کے ساتھ بس میں سفر کر سکے۔  
2۔ بیماری نے دولت سے کہا تم کتنی خوش نصیب ہو کہ ہر کوئی تمہاری تمنا کرتا ہے اور میں تیری بد نصیب ہوں کہ ہر کوئی مجھ سے دور بھاگتا ہے۔  
دولت بولی۔ خوش نصیب تو تم ہو کہ جب تم آتی ہو تو لوگ اللہ کو یاد کرتے ہیں، میری بد نصیبی کہ مجھے پا کر لوگ اللہ کو بھول جاتے ہیں۔

مرسلہ: عروج حسن، بفرزون، کراچی

## جرم

1۔ اپنی خوشی کے لیے دوسروں کی مرمت کو خاک میں نہ ملاؤ۔  
2۔ کردار ایک ایسی کتاب ہے جسے اندھے اور جاہل بھی پڑھ سکتے ہیں۔  
3۔ کسی کی کردار کی شکل سے بھی بڑا جرم ہے۔

مرسلہ: امینہ عنایلیہ، سلاوالی

## ماں کے نام

☆ دنیا کی سب سے خوب صورت اور شیریں شے ماں کا پیار ہے۔

☆ میری ہر تکلیف اور ہر غم میں میری ماں کا تصور میرے لیے فرشتہ نجات بن کر آتا ہے۔  
☆ ہر شخص انسانیت کی حقیقی تصویر اپنی ماں کے چہرے میں دیکھ سکتا ہے۔

☆ ماں کے قدموں کی خاک چوم لو دونوں جہانوں میں شہرت نصیب ہوگی۔  
☆ ماں کی چاہت میں اپنی انا کو بھول جاؤ تمہارا دامن خوشیوں سے بھر جائے گا۔

☆ ماں کے قدموں میں جھک جاؤ، رفعت و بلندی ملے گی۔

مرسلہ: پروین افضل شاہین، بہاول نگر

## دعا کے لیے

بد نصیب ہے وہ شخص جو ماں باپ کی خدمت کر کے دعائیں نہ لے اور لوگوں سے کہتا پھرے کہ میرے لیے دعا کرو۔ بد نصیب ہے وہ جو عشا کی نماز نہ پڑھے اور دوائیوں میں نیند تلاش کرے۔

مرسلہ: سہیل ملک، شاہدرہ

## آنکھیں

ابھی جو تم روندتے گزرے ہو وہ گریہ بچھی آنکھیں کسی اور کی نہیں میری تھیں وہ آنکھیں پھر میں مسکرانا بھول جاتی ہوں بخیاور آتی ہیں تصور میں کسی مظلوم کی بیگی آنکھیں شاعرہ: بخیاور بلوچ، لوی بلوچستان

## داد

ایک سکھ درخت پر الٹا لٹکا ہوا تھا۔  
بیوی: تم درخت پر کیوں لٹک رہے ہو؟  
سکھ: سردرد کی گولی کھانی تھی نہیں پیٹ میں نہ چلی جائے۔

مصباح رضا سعید، فیصل آباد

خوشیاں اس کے قدموں میں ہوں

آئیں

مرسلہ: ذوالنورین، ہری پور ہزارہ

## سالگرہ مبارک ہو

کوئی تو ہو جو  
دل کا درد جان سکے  
ان رشتوں کے بھوم میں  
یہ عالم تنہائی  
ہے دل انتظار میں  
دو بول ملی کے  
کوئی پیار سے  
لبوں کی مسکان سے  
نرم گرم لہجے میں  
دھیرے سے کہہ دے  
کہ!  
سالگرہ مبارک ہو

مرسلہ: عنبر وسیم، گوجرانوالہ

## افسوس

افسوس انسان اشرف المخلوقات ہے لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ انسان کے جاگنے سے پہلے یہ پرندے جاگ جاتے ہیں اور انسان سوتے رہ جاتے ہیں۔

مرسلہ: مسز فرح امجد، ٹاؤن شپ، لاہور

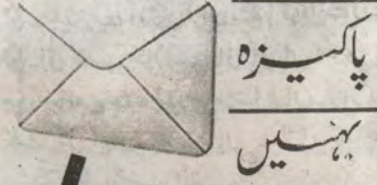
## مشاورہ

جاتے ہوئے رک کر کہا تھا  
اس نے  
سنو!

تم بہت سادہ اور معصوم ہو  
میرا اک مشورہ ہے  
ہمیشہ ایسی ہی رہنا  
شاید کہ کبھی میں لوٹ آؤں پھر سے۔

شاعرہ: بشری باجوہ، اوکاڑہ

# سندھ سے



پاکیزہ  
پہنیں

## تحفہ

یاد کر سکی

درجن بھر چوڑیاں اور سرخ پرانہ  
تیری سالگرہ پر دیا تھا میں نے  
اور تو نے صرف ایک میلا سا  
رومال دیا ہے مجھے

جس میں تیرے پسینے کی مہک رچی ہوئی ہے  
کیا تو مجھے، اپنا وہ موبائل نہیں دے سکتی  
جو تجھے تیرے بھائی نے لا کر دیا ہے  
اور تجھے اس کو استعمال کرنا بھی نہیں آتا

شاعرہ: عظمیٰ آفاق سعید

مرسلہ: انیلا ناہید، لیہ

## میری باجی کے نام

بھروے ایک، ایک موتی  
خوشیوں کا اس کی زندگی کی  
مالا میں یارب  
کہ کبھی پھر بھی جائے ٹوٹ کے تو





میاں بیوی میں محبت

پیدا کرنے کے وظیفے

میاں بیوی میں یا گھر کے دیگر افراد میں کہیں بھی اختلاف ہو تو اس کے لیے کچھ وظیفے لکھے جاتے ہیں۔ اہتمام سے ان پر عمل کریں اور پھر خوب عاجزی کے ساتھ دعا مانگیں کہ اے اللہ! ہم دو میں یا ان دو میں سچی محبت پیدا فرما۔

1۔ دو مسلمانوں میں اختلاف یا جھگڑا شیطان کی سب سے بڑی کامیابی ہے، جھگڑا نیکیوں کو ایسے ہی موٹتا ہے جیسے استرابالوں کو موٹتا ہے، بڑے سے بڑے سمندر اتفاق نہ ہونے کی وجہ سے خشک ہو جایا کرتے ہیں، اس لیے جھگڑے سے بچنے کے لیے شیطان مردود سے بچنے کی بہت فکر کی جائے، جن چیزوں سے گھروں میں شیطاں آتے ہیں ان سے بچا جائے اور جن اعمال سے شیطان سے حفاظت ہوتی ہے ان اعمال کا اہتمام کیا جائے، اس لیے ایک عمل یہ ہے کہ گھر میں سورۃ بقرہ کا ختم کرے، جن میاں بیوی میں جھگڑا ہو تو شوہر یا بیوی کوئی بھی گھر میں سورۃ بقرہ پڑھ کر اپنے اوپر اور اپنے پورے گھر پر دم کر دے۔

حدیث ہے ”قسم ہے اس ذات کی جس کے قفسے میں محمد ﷺ کی جان ہے کہ شیطان اس گھر میں ٹھہر نہیں سکتا جس میں سورۃ بقرہ تلاوت کی جائے۔“

2۔ گھر میں کثرت سے تلاوت کا اہتمام کریں، حدیث میں آتا ہے۔ جس گھر میں قرآن کریم کی تلاوت کی جاتی ہے اس میں خیر و برکت زیادہ ہوتی ہے، ملائکہ اس میں حاضر ہوتے ہیں اور شیطان نکل جاتا ہے اور جس گھر میں تلاوت نہ ہو وہ گھر لوگوں پر تنگ ہو جاتا ہے، اس میں خیر و برکت کم ہوتی ہے، شیطان اس گھر میں اپنا مسکن بنالیتا ہے، فرشتے وہاں سے چلے

جاتے ہیں۔ اس لیے ہر مسلمان مرد و عورت کو چاہیے کہ گھر میں روزانہ تلاوت کا خوب اہتمام کریں۔

3۔ شوہر اس بات کا اہتمام کرے کہ گھر میں جب بھی داخل ہو تو پہلے دو رکعت پڑھے، اسی طرح گھر سے باہر جانا ہو تو دو رکعت پڑھ کر باہر نکلے، اس سے بھی... انشا اللہ تعالیٰ بہت ہی فائدہ ہوگا، ایک شخص نے حضرت عبداللہ بن رواحہؓ کی وفات کے بعد ان کی بیوی سے نکاح کیا اور فرمایا: تم جانتی ہو میں نے تم سے نکاح کیوں کیا؟ پھر فرمایا۔ میں نے تم سے نکاح اس لیے کیا کہ تم مجھے حضرت عبداللہ بن رواحہؓ کے عمل کے بارے میں بتاؤ کہ ان کے گھر میں کیا معاملات تھے تو ان کی اہلیہ نے فرمایا۔

”جب وہ گھر سے نکلنے کا ارادہ کرتے تو دو رکعت نماز پڑھتے اور جب گھر میں داخل ہوتے تو دو رکعت نماز پڑھتے اور اس پر عمل پر ہمیشگی فرماتے تھے۔“

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں۔

”میں نے اس کو دیکھا کہ جب بھی گھر سے نکلے ہیں تو دو رکعت پڑھ کر نکلے ہیں۔“

لہذا دو رکعت کا اہتمام ہر مرد و عورت کو کرنا چاہیے، فرض کے اہتمام کے ساتھ ساتھ ان نوافل کا اہتمام خیر و برکت کا سبب ہوگا اور گھروں سے جھگڑوں کے ختم ہونے کا ذریعہ ہوگا، شوہر اور والد کو چاہیے کہ گھر میں داخل ہوتے ہی سلام کر کے پہلے دو رکعت نفل پڑھے پھر کوئی بات کرے، اسی طرح گھر سے نکلے ہوئے دو رکعت نفل پڑھے۔ انشا اللہ تعالیٰ اس کے اہتمام سے گھروں کی بہت سی پریشانیاں دور ہو جائیں گی۔

4۔ آیت کریمہ سورج پڑھ کر محبت کے لیے دعا مانگیں۔

5۔ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ 40 مرتبہ پڑھ کر دعا مانگیں۔

6۔ یا ارحم الراحمین... پانچ سو مرتبہ یا ستر مرتبہ یا سات مرتبہ پڑھ کر دعا مانگیں، اے اللہ! ہم دونوں میاں بیوی میں محبت پیدا فرما۔

ان وظائف کے اہتمام سے بہت ہی فائدہ ہوگا۔ مستقل پابندی سے پڑھیں اور اہتمام سے لگنا ہوں سے بچیں اور گوشش کریں کہ کسی طرح کوئی ایسا کام نہ ہونے پائے جس سے اللہ تبارک و تعالیٰ ناراض ہو جائے۔ اس لیے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی ناراضی کے ساتھ دنیا و آخرت کی کوئی نعت حاصل نہیں ہو سکتی اور بشری تقاضے سے اگر کبھی گناہ ہو بھی جائے تو فوراً توبہ استغفار کرے۔

7۔ بیوی کو چاہیے کہ وہ تحفہ دہن اور مثالی مال ان دونوں کتابوں کا مطالعہ کرے اور شوہر تحفہ دو لکھا اور مثالی باپ کا مطالعہ کرتا رہے۔ ان کتابوں کے پڑھنے اور ہدایات پر عمل کرنے سے... انشا اللہ تعالیٰ بہت ہی فائدہ ہوگا۔

اللہ تعالیٰ سے اولاد مانگنے کی دعائیں

1۔ جس شخص کی اولاد نہ ہو یا زینہ اولاد نہ ہو، وہ ذیل کی دعا کثرت سے مانگا کرے۔ حضرت زکریاؑ نے طلب اولاد کے لیے دعا مانگی تھی جس کو اللہ تبارک و تعالیٰ نے قبول فرما کر ان کو حضرت یحییٰؑ جیسا بیٹا عطا فرمایا۔ (دعا موجود ہے، بارہ ۷ سورۃ انبیاء آیت ۸۹)

رَبِّ لَا تُؤْخِرْ لِيْ قَوْلًا وَّ اَنْتَ خَيْرُ الْوَارِثِيْنَ

ترجمہ: اے میرے پروردگار! مجھے تنہا نہ چھوڑ دو تو صبر داروں سے بہتر ہے۔

اگر ہو سکے تو دو رکعت صلوٰۃ الحاجۃ کی نیت سے پڑھے اور پھر دعا مانگیں، اس لیے کہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ جو شخص تنہائی میں دو رکعت نماز پڑھے، جس کو اللہ اور اس کے فرشتوں کے سوا کوئی نہ دیکھے تو اس کو جہنم کی آگ سے بری ہونے کا پروا نمل جاتا ہے۔

اور جو شخص دو رکعت نماز پڑھ کر اللہ تبارک و

تعالیٰ سے کوئی دعا مانگتا ہے تو حق تعالیٰ شانہ وہ دعا قبول فرماتا ہے خواہ فوراً یا لمسی مصلحت سے کچھ دیر کے بعد مگر قبول ضرور فرماتا ہے۔

ایک پیاری دعا

وَاَجْعَلْ هُمْتِيْ وَهْوَ اِيْ فَيَمَّا تُحِبُّ وَتَرْضٰی

آپ ایسی ایسی دعا میں یقین فرما گئے ہیں کہ انسان ان کا تصور نہیں کر سکتا۔ یعنی ”اے اللہ! میرے دل میں آنے والے خیالات کو اپنی خشیت اور اپنے ذکر میں تبدیل فرما دے۔“

انسان کی خاصیت یہ ہے کہ اس کا دماغ کبھی خیالات سے خالی نہیں ہوتا، کوئی نہ کوئی خیال اس کے ذہن میں ہر وقت رہتا ہے۔ مثلاً ہاتھوں سے کچھ کام کر رہا ہے لیکن دماغ کہیں اور لگا ہوا ہے اور خیالات مسلسل آرہے ہیں، کوئی لمحہ خیالات سے خالی نہیں ہوتا، لہذا یہ دعا کر کہ یہ جو فضول خیالات آرہے ہیں، جن کا کوئی فائدہ نہیں ہے، یا اللہ یہ خیالات بدل کر ترازو اور تیری خشیت میں تبدیل ہو جائیں، جو خیال بھی آئے وہ یا تیرا ہی تیری خشیت کا ہو، تری یاد کا ہو، ترے سامنے حاضر ہونے کا ہو، تری جنت کی نعمتوں کا ہو، دوزخ کے عذاب کا ہو اور تیرے دین کے احکام کا خیال ہو اور اے اللہ! میرے دل کے خیالات اور میری خواہشات کا رخ موڑ کر ان چیزوں کی طرف کر دے جو تجھے پسند ہوں، یہ دعائی کریم ﷺ نے یقین فرمائی اور ساتھ ساتھ یہ دعا بکثرت کرنی چاہیے۔

2۔ رَبِّ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَمَزَاتِ الشَّيْطٰنِ وَاَعُوْذُ بِكَ رَبِّ اَنْ يَّحْضُرُوْنَ

ترجمہ: اے میرے پروردگار! میں شیطان کے ڈالے ہوئے وسوسوں سے تیری پناہ مانگتا ہوں، اے میرے پروردگار! میں اس بات سے بھی تیری پناہ مانگتا ہوں کہ یہ شیطان میرے پاس آئیں۔

☆☆☆





میرا دوسرا مسئلہ روز بروز

بڑھتا ہوا مٹاپا ہے۔ سب سے زیادہ میرا پیٹ بڑھا ہوا ہے اور کولہے ضرورت سے زیادہ بھاری ہو گئے ہیں اور پسینا کم سے کم ہوتا جا رہا ہے۔ میں شادی شدہ ہوں۔ میرے چار بچے ہیں اور میں جاب کرتی ہوں۔ جاب پر سب لوگ موٹا ہونے کی وجہ سے مجھے پسند نہیں کرتے جو کہ مجھے اچھا نہیں لگتا۔ اور سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ مجھے بھوک بہت لگتی ہے۔ کھانا کھانے کے بعد بھی بھوک لگتی ہے۔ میری آپ سے گزارش ہے کہ میرے ان مسئلوں کا کوئی حل بتائیں تاکہ میں بھی ایک عام عورت کی طرح دکھائی دوں۔ میں آپ کی بہت شکر گزار ہوں گی۔ ایک بات میں آپ کو بتانا بھول گئی کہ میرے پاؤں میں بہت درد رہتا ہے۔ ان تمام مسائل کے جواب کا انتظار کروں گی۔

جواب:- نی بی لگتا ہے کہ آپ کو ڈپریشن ہے۔ نیند نہ آنے کی وجوہات پر غور کریں۔ ذہنی طور پر بہت تھک جاتی ہیں، رات کو کھانا کھانے کے فوراً بعد بستر پر چلی جاتی ہیں۔ گھریلو ماحول کیسا ہے (شوہر، بچے، ساس، آفس والے، وغیرہ) نیند نہ آنے سے یا مناسب نیند نہ لینے سے آنکھوں کے گرد حلقے بڑھتے ہیں اور مٹاپا بھی ہو جاتا ہے۔ جب بھی بھوک لگے تو کھیرے کا استعمال کیا کریں۔ ڈپریشن کے مریض کھانا زیادہ کھاتے ہیں۔ ڈاکٹر ولمار شوایب جرمنی کی Laikan کی ایک گولی تین مرتبہ صبح، دوپہر، شام لیں۔ جبکہ سونے سے آدھا گھنٹا پہلے Velaxan کی دو گولیاں تھوڑے پانی کے ساتھ لیں۔ ایک ماہ بعد کیفیت سے مطلع کریں۔

بادی اور خونی دونوں ہوتی ہے۔

جواب:- آپ کے احوال سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ غذائی قلت کا شکار رہتی ہیں۔ اس لیے یہ تمام مسائل پیدا ہوئے ہیں۔ سر کے بال گرنے کی کئی وجوہات ہوتی ہیں جن کو دیکھ کر ہی دوا کا تعین کیا جاسکتا ہے۔ لیکوریا کمزوری سے ہوتا ہے (لیکوریا کا رنگ، خارش، جلن، کب زیادہ ہوتی ہے، لکس) اور یو اسیر کی عموماً وجہ فیض ہوتی ہے اس لیے پہلے تو متوازن غذا استعمال شروع کریں اور سبزیاں اور فروٹ کا استعمال بڑھائیں۔ ایک ماہ تک ڈاکٹر ولمار شوایب جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کریں۔

Natr Mur 30 Acid Phos 30  
Kreosote 30 Aesculus 30  
Hamamelis 30

ہر دوا کے 5،5 قطرے آدھا کپ پانی میں ڈال کر دن میں تین مرتبہ استعمال کریں۔

**مٹاپا اور آنکھوں کے گرد طقے**

**صائمہ.....کراچی**

سوال:- ڈاکٹر صاحب میرے مسائل تو بہت زیادہ ہیں۔ لیکن پاکیزہ ڈائجسٹ میں آپ کے بہت سارے اچھے مشورے دیکھ کر مجھے ایسا لگا کہ میں بھی آپ سے اپنے مسائل کا حل پوچھوں اور امید کرتی ہوں کہ آپ مجھے مایوس نہیں کریں گے اور حل بتا کر شکریہ کا موقع فراہم کریں گے۔

میرا مسئلہ یہ ہے کہ میری آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے ہیں جو ختم ہی نہیں ہوتے اور نہ مجھ کو نیند آتی ہے۔ جس کی وجہ سے مجھے نیند کی گولیوں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ کبھی بھی ایک گولی لیتی ہوں اور کبھی بھی دو بھی ہو جاتی ہیں تب کہیں جا کر نیند آتی ہے۔



From Nature.  
For Health.

**شوایب**  
**ہومیوکلینک**



اس بات کی ضرورت کافی عرصے سے محسوس کرائی جا رہی تھی کہ کسی مستند ادارے کے تحت ماہر تجربہ کار ہومیوپیٹھک ڈاکٹروں کا بورڈ ہو جو لوگوں کی صحت کے مسائل کو اپنی ماہرانہ رائے اور تجربے کی روشنی میں نہ صرف حل کرے بلکہ ان کی رہنمائی بھی کرے۔ لہذا اس سلسلے کے تحت ہماری کوشش ہوئی کہ ہم آپ کو مختلف امراض کے متعلق آگاہی بھی فراہم کریں اور آپ کے جو صحت کے مسائل ہوں اس کو بورڈ کے ماہر و تجربہ کار ڈاکٹر کے ذریعے حل کرائیں تاکہ آپ کا معیار صحت بلند ہو لہذا آپ کے جو بھی صحت کے مسائل ہیں انہیں ہمیں اس پتے پر لکھ بھیجیں پوسٹ بکس نمبر 733 کراچی۔ ہم ماہانہ پاکیزہ کے ذریعے آپ کی بیماری کے متعلق آپ کی رہنمائی کریں گے لیکن اس کے لیے اپنا مکمل نام، عمر، پتہ اور جو کام کرتے ہیں اس کے متعلق، از دوا جی حیثیت، بیماری کے متعلق، کب سے ہوئی، کیا علاج کیا؟ کسی قسم کی کوئی رپورٹس ہوں تو اس کی فوٹو کاپی جو پڑھنے کے قابل ہوں ساتھ بھیجیں تاکہ صحیح تشخیص کی جا سکے اور دوا بھی صحیح تجویز ہو۔

گرے کہ میرا گھٹن پین ظاہر ہونے لگا اور پھر رفتہ رفتہ سارے بال گر گئے۔ پہلے ڈاکٹر سے علاج کر دیا مگر کوئی خاص افادہ نہیں ہوا، پھر میں نے حکیم کی میڈیسن لیں اس سے میرے بال تو آگئے مگر ان کی جڑیں بہت کمزور ہیں۔ نیچے سے بال سفید ہوتے ہیں اور اوپر جا کر کالے۔ میرے بالوں کی چنیا ایک انگلی کے برابر ہوتی ہے۔ بالوں کی گروتھ بھی کم ہے۔ پلیز اس کا کوئی حل بتائیں۔

میرا دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ مجھے لیکوریا ہے۔ اور میرے مینسٹر آتے تو صبح ناٹم پر ہیں مگر شروع ہونے سے پہلے دو دن ایسے آتے ہیں جیسے آخری دنوں میں آتے ہیں اور دو دن بعد نائل شروع ہو جاتے ہیں۔ مگر ایسا کبھی کبھی ہی ہوتا ہے۔

تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ مجھے بارہ سال سے یو اسیر ہے۔ مستقل تو مجھے نہیں رہتی مگر جب میں بد احتیاطی کروں تو ہو جاتی ہے۔ میں اس کے لیے اسپینول کا چھلکا استعمال کرتی ہوں۔ مجھے یو اسیر

**بال، لیکوریا، یو اسیر**

**نام شائع نہ کریں، شجاع آباد**

سوال:- میرا پہلا مسئلہ یہ ہے کہ ایک سال پہلے میرے بال گرنا شروع ہوئے تھے اور اتنے

**ٹوکن**

**برائے شوایب ہومیوکلینک**

**جون 2013**

اپنا مسئلہ اس ٹوکن کے ساتھ روانہ کریں۔ ٹوکن کے بغیر آئے ہوئے مسئلوں پر توجہ نہیں دی جائے گی۔ اپنا مسئلہ جس مینسٹر بھیجیں اسی مینسٹر کا ٹوکن استعمال کریں۔

نام:

پتہ:



## ناک کا مسئلہ مسز نواز شعلی ضلع اٹک

سوال:- آپ کے کالم میں، میں پہلے بھی خط لکھ چکی ہوں لیکن جواب نہیں آیا، دوبارہ جسارت کر رہی ہوں۔ امید ہے کہ اس بار آپ شنوائی ضرور کریں گے۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ پچھلے کئی سالوں سے نزلہ گلے میں گرتا ہے۔ پہلے سے بہت زیادہ، کبھی ایک طرف سے تو کبھی دوسری طرف سے اور کبھی کبھی دونوں طرف سے۔ پہلے ناک بند ہو جاتی تھی اب ناک تو بند نہیں ہوتی مگر کیرا مسلسل گرتا ہے۔ بہت پہلے ڈاکٹر نے آپریشن بتایا تھا جو کہ معاشی تنگی کے باعث نہیں کروا سکے۔ ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ ناک کی ہڈی بڑھ گئی ہے۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ ایک تو گلے میں ریشہ ہر وقت گرتا ہے اور دوسرا منہ سے بہت زیادہ بدبو بھی آتی ہے۔ منہ کا ذائقہ ہر وقت خراب رہتا ہے، کسی کے پاس بیٹھ کر بات نہیں کر سکتی۔ معدہ اور نظام ہاضمہ دونوں خراب رہتے ہیں، جسم میں خون نہیں بنتا، اعصابی کمزوری بہت زیادہ ہے۔ آپ سے التماس ہے کہ میرے لیے اچھی سی دوا لکھ دیں تاکہ میں بھی صحت مند زندگی گزار سکوں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس کا اجر دے گا۔

دوسرا مسئلہ میرے بیٹے کا ہے جس کی عمر تقریباً چودہ سال کے لگ بھگ ہے۔ اس کی ناک بھی کبھی ایک طرف سے تو کبھی دونوں طرف سے بند رہتی ہے۔ ریشہ گلے میں گرتا ہے۔ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ اس کا قد عمر کے لحاظ سے بہت چھوٹا ہے اور کمزوری بھی بہت زیادہ ہے۔ دانت ہر وقت صاف کرتا ہے لیکن دانت صاف نہیں ہوتے۔ رات کو سوتے ہوئے منہ سے رال بہتی ہے۔ منہ سے پانی آتا ہے

جو کہ بدبودار ہوتا ہے، ساتویں جماعت میں پڑھتا ہے۔ پڑھائی میں ماشاء اللہ بہت اچھا ہے۔ اس کی صحت کے بارے میں، میں ہر وقت فکر مند رہتی ہوں۔ بچے کے لیے بھی کوئی اچھی سی دوا لکھ دیں جس سے اس کی ناک بھی ٹھیک ہو جائے اور اس کے قد میں بھی اضافہ ہو جائے۔ ساری زندگی آپ کو دعا کریں دوں گی۔

جواب:- ہمیں جب بھی کوئی خط ملتا ہے ہم جواب ضرور دیتے ہیں۔ لیٹ بے شک ہو جاتا ہے لیکن اس کا جواب ضرور دیا جاتا ہے۔ آپ ڈاکٹر ولمار شوہلے جرمنی کی Teucrium mar 30 Merc sol 30 'Nux vomica 30 کے 5,5 قطرے ہر کھانے کے بعد آدھا کپ پانی میں استعمال کریں۔ ایک ماہ بعد کیفیت سے مطلع کریں۔ بیٹے کے لیے بھی

teucrium mar 30  
Merc.sol 30 Staphysagria 30  
Baryta carb 30  
دوا کے پانچ پانچ قطرے آدھا گلاس پانی میں ڈال کر تین مرتبہ دن میں استعمال کریں اور ایک ماہ بعد کیفیت سے آگاہ کریں۔ یاد رکھیں ادویات ڈاکٹر ولمار شوہلے جرمنی کی ہی ہوں۔ ٹھنڈی اور کھٹی چیزوں سے پرہیز کریں۔

### بریسٹ میں گلٹی

### مس فردوس.....کوہاٹ

سوال:- میں پاکیزہ کی مستقل اور پرانی قاری ہوں۔ پاکیزہ کے توسط سے اکثر ہومیوپیتھک میں اپنے مسائل کے لیے شرکت کرتی رہتی ہوں۔ پاکیزہ میں ہومیو ڈاکٹر نے ہومیو بورڈ کا سلسلہ بہت اچھا اور مفید شروع کیا ہے۔ یہ دیکھی

انسانیت کی بہت بڑی خدمت ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس نیک کام کا اجر عظیم عطا فرمائے۔

ڈاکٹر صاحب مجھے آپ سے ایک گلہ ہے۔ وہ یہ کہ آپ قارئین کے خطوط کے جوابات بہت کم دیتے ہیں یا پھر دیتے ہی نہیں ہیں۔ حالانکہ آپ کے خطوط کے جواب سے ہزاروں لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں اور صحت مند زندگی گزارتے ہیں۔ آپ کہیں گے کہ میں یہ کیسے کہہ سکتی ہوں تو اس کا جواب یہ ہے کہ میرا یہ آپ کو پانچواں خط ہے۔ اس سے پہلے چار خط آپ کو ارسال کر چکی ہوں لیکن آپ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ لیکن اس دفعہ پھر بڑی امید کے ساتھ آپ کو خط لکھ رہی ہوں کہ مایوس نہیں کریں گے اور میرے خط کا جواب ضرور دیں گے۔

ڈاکٹر صاحب میرا مسئلہ یہ ہے کہ میری عمر تقریباً 26-27 سال کے درمیان ہے اور میں غیر شادی شدہ ہوں۔ تقریباً آج سے پانچ سال پہلے ایک دن نہانے کے دوران مجھے اپنی سیدھی طرف والے بریسٹ میں گلٹی سی محسوس ہوئی۔ یہ گلٹی کافی سخت اور چوڑی سی ہے۔ چڑے کے اندر ہے اوپر سے نظر نہیں آتی۔ ہاتھ لگانے سے یا دبائے سے اس میں کوئی خاص تکلیف نہیں ہوتی۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ زور سے دبائے سے اگر جسم میں کوئی چیز زیادہ ہو تو ضرور اس میں ٹھوڑی بہت تکلیف ہوگی۔

میں اسی ہاتھ سے گھر کے سارے کام کرتی ہوں۔ اسی طرف سوتی ہوں لیکن کوئی خاص تکلیف نہیں ہوتی۔ ہاں مینسز شروع ہونے سے پہلے اور کبھی کبھی مینسز شروع ہونے کے بعد کے دنوں میں اس میں اکثر تکلیف، پیچھن اور جلن سی محسوس ہوتی ہے۔ یہ گلٹی جتنی نمودار ہوئی تھی اتنی ہی ہے۔ یعنی بڑی کچھ بھی نہیں ہوئی۔ اتنے سالوں میں اس میں کچھ بھی تبدیلی نہیں آئی۔ گلٹی کی جگہ اور اس کے ارد



گرد بریسٹ کی بالکل صاف ستھری اور نارمل اسکن ہے۔ میں اس گلٹی کی وجہ سے بہت پریشان ہوں۔ آپ کو معلوم ہے کہ آج کل کے زمانے میں نئے نئے موڈی امراض پیدا ہو رہے ہیں۔ میرے دل میں بھی طرح طرح کے خیالات پیدا ہوتے ہیں کہ کہیں یہ نہ ہو جائے، کہیں وہ نہ ہو جائے۔

میں نے ایک ڈاکٹر صاحب سے مشورہ کیا تو انہوں نے کہا کہ پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے گی نقصان دہ نہیں ہے۔ ڈاکٹر صاحب سچی بات یہ ہے کہ میں نے اس گلٹی کا ابھی تک جم کر علاج نہیں کروایا۔ یعنی مستقل علاج نہیں کروایا، تھوڑا بہت کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب میں نے ہومیو پیٹھک کی بہت تعریف سن رہی ہے کہ ہومیو پیٹھک میں ان گلٹیوں کا کامیاب علاج موجود ہے۔ ایلو پیٹھک میں ان گلٹیوں کا سوائے چیر پھاڑ یعنی آپریشن کے علاوہ ان کے پاس اور کوئی علاج نہیں ہے۔ میں آپریشن کروانا نہیں چاہتی۔ کیونکہ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ آپریشن کے بعد گلٹیاں موڈی امراض میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب میری آپ سے درخواست ہے کہ پلیز میرے لیے کوئی بہت اچھا اور تیر بہدف نسخہ تجویز کر دیجئے کہ میری یہ گلٹی ختم ہو جائے۔ جتنے عرصے علاج کروانا پڑے گا میں کرواؤں گی جو یہ ہیز ہے وہ بھی کرواؤں گی مگر میری یہ گلٹی جڑے سے ختم ہو جائے۔

جواب:- ہمیں یہ پہلی دفعہ آپ کا خط ملا ہے اور اس کا جواب بھی دے رہے ہیں۔ آپ بہت بڑی غلطی کر رہی ہیں۔ آپ کو اپنے گھروالوں کو یا پھر کم از کم اپنی ماں کو اس کے متعلق ضرور بتانا چاہیے تاکہ علاج صحیح طور پر ہو سکے۔ الٹراساؤنڈ کر کر پورٹ بھیجیں



کہا تھا کہ گھٹنے بالکل ناکارہ ہو چکے ہیں اور آپ کو آپریشن کروانا پڑے گا، مگر میں نے انکار کر دیا تھا۔ اب اس عمر میں کیا آپریشن کرواؤں گی۔ آج ہوں، ہل نہیں۔ آپ نے بلڈ ٹیسٹ کے لیے پوچھا وہ ابھی تو نہیں کروایا مگر 2009 میں آغا خان اسپتال سے کروایا تھا جس کی ڈپلی کیٹ آپ کو بھیجوا رہی ہوں۔

ڈاکٹر صاحب آپ سے گزارش ہے کہ مہربانی فرما کر کوئی ایسا نسخہ لکھ دیں کہ جب زیادہ درد ہو تو میں وہ کھا لوں تاکہ کچھ آفاقہ ہو جائے کیونکہ اب گھٹنوں کا کیا علاج ہو سکتا ہے۔

جواب:- ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Calc Carb 30

Arnica 30 اور Bryonia 30 کے 5,5 قطرے آدھا کپ پانی میں ڈال کر دن میں تین مرتبہ استعمال کریں۔ چہل قدمی ضرور کیجیے گا اور دودھ کا استعمال بھی کیجیے گا۔ پانی ہمیشہ بیٹھ کر پیئیں۔

### پانی پینے کے اوقات

صبح نہار منہ  
کھانا کھانے سے قبل  
کھانا کھانے کے ۲ گھنٹے بعد

### پانی پینے کا طریقہ

بسم اللہ پڑھ کر

بیٹھ کر

3 سانس میں

### احتیاط کریں

گرمی سے پاکو سے آکر یا بھاگ دوڑ کر اور ورزش کے بعد پانی بالکل بھی نہ پیئیں۔

تاکہ حتمی طور پر تشخیص ہو سکے۔ اس وقت تک Calc Fluor 30 ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی دن میں تین مرتبہ پانچ قطرے آدھا کپ پانی میں ڈال کر استعمال کریں۔

### قد کا مسئلہ

#### ایمان ضمیر.....کراچی

سوال:- میری بیٹی کا نام ایمان ہے۔ اس کی عمر چودہ سال ہے۔ اس کا قد پانچ فٹ دو انچ ہے۔ اور وزن 35 کلو ہے۔ بھوک بہت کم لگتی ہے اور کھانا بھی بہت کم کھاتی ہے۔ چہرہ بھی خراب ہوتا جا رہا ہے۔ برائے مہربانی کوئی دوا تجویز فرما دیجئے جس سے میری بیٹی کا قد بڑھ سکے۔

جواب:- بی بی قد بڑھانے میں خاندانی قدو قامت کی بڑی اہمیت ہے۔ وہ آپ نے نہیں بتایا۔ اچھی غذا، مناسب ورزش اور ذہنی سکون بھی قد بڑھانے میں بڑے معاون ہوتے ہیں۔ فی الحال آپ Alfalfa-Q کے 10 قطرے ایک گھنٹہ پانی میں دن میں تین مرتبہ کھانے سے پہلے اور Calc Phos 30 کے 5,5 قطرے دن میں تین مرتبہ کھانے کے بعد لیں۔ یہ ادویات ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی لیں پھر ایک ماہ بعد آکر ملیں۔ نمبر ڈائجسٹ والوں سے لے لیں۔

### گھٹنوں کا درد

#### جمیلہ بیگم.....کراچی

سوال:- آپ نے پاکیزہ ڈائجسٹ کے ذریعے جواب دیا تھا۔ عرض ہے کہ گھٹنوں کا ابھی ایکس رے کروایا تھا اور اس کو دیکھنے کے بعد ڈاکٹر نے



**Dr. Willmar Schwabe, Germany.**

Available at All Leading Medical & Homoeopathic Stores